144

Rs. 4-00

اگر آپ جھٹ پٹ رونے نہیں لگ جاتے تو آپ جھٹ پٹ شعر بھی نہیں کہہ سکتے۔ ایک قہقہہ بلند ہوا۔ لیکن میں گھبرایا نہیں۔ کم از کم نصف صدی پہلے ایک انگریز کے کہنے کی بات پیدا ہی نہیں ہو سکتی تھی وہ کہنے لگا شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن یہ مت سمجھئے کہ ہم دل نہیں رکھتے ہم بھی آپ کی طرح تیز محبت یا نفرت غم و غصہ رکھتے ہیں لیکن ہم تلملاتے نہیں، دل پر قابو پا لیتے ہیں۔ آپ ہمیں سرد یا خشک کہہ دیں لیکن اگر آپ اپنے ادب میں میکبیتھ (ہملٹ [illegible])

جیسا دردناک ڈرامہ

جیسی غمناک نظم پیش کریں۔ تو میں آپ کی بات مان لوں گا۔

"اچھا میں دکھاؤں گا۔ صوفی تبسم نے کہا اور کچھ دیر خاموش رہے لیکن بحث ختم نہ ہوئی کہنے لگے "بات یہ ہے کہ آج کل بہت نے اردو شاعری کو مغربی ادبی اصولوں سے جانچنا شروع کر دیا ہے جو سراسر غلط ہے۔ ہر ملک کی شاعری اپنے اصول رکھتی ہے۔ ہم مرزا غالب اور علامہ اقبال کو ٹی ایس ایلیٹ

کے معیار سے نہیں ناپ سکتے ہیں۔

اب مجھ سے نہ رہا گیا میں نے کہا۔ اگر مرزا غالب اور علامہ اقبال عظیم شاعر ہیں جیسا کہ میں مانتا ہوں کہ وہ ہیں تو شاعری کے کسی بھی معیار پر پرکھے جا سکتے ہیں۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ ہماری ادبی تنقید انگریزی تنقید سے کچھ مختلف ہے اور ہماری تشبیہیں اور استعارے بھی مختلف ہیں۔ اور کچھ ادبی رواج بھی یعنی شراب چونکہ شرعی طور پر اسلام میں ممنوع ہے اس لئے ممنوع پھل کا مزا لینے کے لئے ہماری بیشتر شاعری شراب اور ساقی پر ہے۔ اور ہم رند و زاہد اور میخانہ کی تشبیہیں استعمال کرتے ہیں۔ جو انگریزی شاعری میں نہیں ہوتیں۔ نیز ہمارا محبوب عام طور پر مذکر ہوا کرتا ہے۔ جو انگریزوں کی سمجھ میں نہیں آتا۔ لیکن اس سے شاعری کی اصلیت نہیں بدل جاتی شاعری جذبات اور تخیل کی پیداوار ہے جو ہر ملک میں ایک سے ہوتے ہیں۔

مشاعرے میں آپ سن رہے تھے کہ جس شعر پر زوردار داد ملی تھی لیکن میری سمجھ میں نہیں آیا۔ کہ اس شعر میں کیا خوبی ہے۔ کیا ایک دو الفاظ سے شعر عالی بن جاتا ہے میں یہ بھی مانتا ہوں کہ شاعری اپنی ہی زبان میں ہو سکتی ہے اور اپنی ہی زبان کی شاعری اچھی طرح پرکھی جا سکتی ہے اس لئے اگر میں کچھ اعتراض کر رہا ہوں تو اس سے مقصود نہیں نہ ہی اردو شاعری کا میں نے انگریزی شاعری

چالیس سال سے بھی زیادہ عرصہ پڑھی پڑھائی ہے اور انگریزی میں کیٹس، براؤننگ اور شیکسپیئر میرے محبوب ترین شاعر ہیں۔ لیکن سچ مانیے کہ میں ان سے اتنا محظوظ نہیں ہوتا۔ جتنا غالب اور اقبال، اور میر سے لیکن میری جانچ کا معیار دونوں قسم کی شاعری میں ایک جیسا رہا ہے

اب صوفی صاحب بولے کہ اگر آپ کو مشاعرہ پسند نہ آیا تو آپ آخر دم تک وہاں بیٹھے کیوں رہے اور میں دیکھ رہا تھا۔ کہ آپ کا سر بھی پینڈولم کی طرح ہل رہا تھا۔" ایک قہقہہ پھر بلند ہوا۔

میں یہ تو نہیں کہہ رہا کہ مشاعرہ مجھے پسند نہیں آیا لیکن میری پسندیدگی کی وجہ شاعری نہیں تھی۔ مشاعرے کا ماحول تھا۔ شعر تو کبھی کبھی کوئی اچھا سنا جاتا تھا میرے سر گھمانے اور داد دینے کی وجہ یہ بھی تھی کہ آپ نے مجھے اگلی صف میں بٹھا دیا تھا۔

اور مشاعرے میں سیٹ کی وجہ سے بھی سامعین کی ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ اگر آپ مجھے مسند پر اپنے ساتھ بٹھاتے تو میں بھی آپ کی طرح گاؤ تکیہ کو رد دیتا اور خوشی سے اچھل پڑتا۔

"تم محظوظ تو ہوتے رہے، ہنستے اور تالیاں بھی بجاتے رہے اور کہتے ہو کہ کوئی شعر بھی پسند آ گیا تو کیا اس درد بھری دنیا میں یہ سب کچھ قیمتی نہیں؟"

"میں یہ مانتا ہوں کہ میں مشاعروں سے حظ اٹھاتا ہوں اور نہایت شوق سے جاتا ہوں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں کیوں بیکار وقت ضائع کرتا۔ یہ بھی ہمارا درست کہ بہت کچھ نہ سمجھ سکا لیکن ہم سب سے زیادہ ہنستا رہا۔ اور یہ بات مجھے یہ قطعی نہیں کہا کہ میں نے اس کا وقت ضائع کیا ہے لیکن ہمیں سمجھ لینا چاہئے۔ کہ ہم کس بات سے حظ اٹھا رہے ہیں اور ہنس رہے ہیں وہاں تو ہر شخص کے سے گئے تھے جیسے ہم ایک معمولی سینما کیبرے یا فٹ بال کا میچ دیکھنے جاتے ہیں۔ عظیم شاعری کا تو میں اور بھی اپنے کمروں میں مطالعہ کرتے ہیں۔ ہماری بحث یہاں ختم ہو گئی۔

گو چنداں تنقیص اور نکتہ چیں بننے کی ضرورت نہیں۔ لیکن ہمیں محسوس کرنا چاہئے کہ ہم کیا کر رہے ہیں اور کس بات سے حظ اٹھا رہے ہیں۔ شعر کی داد دے کر شاعر کی حوصلہ افزائی کرنے میں کچھ برائی نہیں بلکہ اچھائی ہی ہے لیکن ہمیں سمجھ لینا چاہئے۔ کہ جو کچھ ہم دیکھ یا سن رہے ہیں۔ وہ کوئی نہایت بلند چیز نہیں معمولی چیز ہے اور معمولی چیزوں سے حظ اٹھاتے رہنے سے ہمارے معیار بھی معمولی رہ جاتے ہیں۔ مشاعرہ بڑی چیز

نہیں لیکن اگر ہم نے شاعری کی ترقی کے لئے مشاعرے ہی کو معیار بنا رکھا تو ہم ذوق تک ہی پہنچ پائیں گے۔ غالب اور اقبال کا رتبہ نہیں پاسکیں گے اگر ہمارے استعارے شمع و پروانہ رند و زاہد اور گل و بلبل وغیرہ ہی تک رہے تو ہم وہیں کے وہیں رہ جائیں گے۔ آگے قدم نہیں اٹھا سکیں گے۔ میں یہ مانتا ہوں کہ ایک عظیم شاعر اپنے وقت کے معمولی معیاروں سے دب نہیں سکتا۔ لیکن شاعر کو بھی اپنے ارتقا کے لئے گہرائی کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ ایک سنہری ایام GOLDEN AGE میں ہی بہترین شاعر کیوں پیدا ہوتے ہیں اور اٹھارہویں صدی کی شاعری انیسویں صدی سے کیوں مختلف ہوتی ہے؟

غالب نے کہا تھا ؎

"نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا"

مجھے ڈر ہے کہ آجکل مشاعروں کی داد اور سینما کا صدہا روپیہ شاعروں کو نیچے لے جا رہا ہے اور کئی اچھے شاعروں کو تباہ کر رہا ہے شاعری فکر کی دیوانگی سے نہیں لکھی جاتی۔ احسان دانش نے کہا تھا ؎

دل امنڈ آیا ہے احسان بھر آئے آنسو
جب سنا ہے کسی فنکار نے فن بیچ دیا

غالب کے دنوں میں سینما کا ایجاد بھی نہیں ہوا تھا۔ اگر ایجاد ہوا بھی ہوتا تو بھی ذہن نہیں سمجھ سکتا کہ وہ اپنی تنگدستی کے باوجود فلموں میں شامل ہوتا۔ بادشاہ ظفر کے کہنے سے اس نے پچاس روپیہ ماہوار پر مغلیہ خاندان کی تاریخ لکھنا شروع کی تھی لیکن آدھی بھی نہیں لکھ پایا تھا اور وہ بھی دو چار ماہ کا کام چار سالوں میں مرا اور ہمایوں تک پہنچ کر چھوڑ دیا۔ اور جو بھی لکھا تھا اس کے بارے میں تفتہ کو لکھ بھیجا کہ وہ شائع کرنے کے لائق نہیں ہے وہ ایسی شاعری کہنے کے لئے بنا ہی نہیں تھا۔

دوسری طرف شاعروں کی ستائش بھی شاعری کو ترقی کی راہ پر لگانے کے بجائے تنزل کی طرف لے جا رہی ہے۔ شاعر سامعین کی بے تحاشا داد کو اپنی عظمت سمجھ لیتا ہے اور اسی عارضی عظمتوں میں مست رہتا ہے۔ ماضی کے مشاعروں کا پھر بھی ایک معیار تھا۔ اچھے شعر پڑھنے والی داد وزن رکھتی تھی مشتملین مشاعرہ شعراء اور سامعین میں ایک اخلاقی رابطہ قائم تھا جو اب بالکل ختم ہو گیا ہے۔ اب مشاعرے پورے طور پر پیشہ وارانہ حیثیت اختیار کر گئے ہیں مسند مشاعرہ پر اب جہلا نابعض ہوتے جا رہے ہیں۔

کسی وقت مشاعرے کے لئے مصرع طرح دیا جاتا تھا اب اس کا رواج کم ہوتا جا رہا ہے طرحی مصرع کی شاعری عجیب طرح سے لکھی جاتی ہے۔ مدت ہوئی جب میں بھی اسی کھیل میں شریک ہوا کرتا تھا کھیل پورے ایک مشاعرے کی طرح تھی: ؎

مجھ کو بیمار کیا تجھ کو مسیحا کر کے

اب دیکھئے غزل کیسے پیدا ہوتی ہے۔ مشاعروں میں غزلیں پڑھی جاتی ہیں۔ تاکہ ہر شعر پر داد ملے نظم کے لئے مشاعروں میں گنجائش کم ہے۔ سامعین نظم کے ختم ہونے تک انتظار نہیں رہتے۔ غزل لکھنے سے پہلے قافیہ کے کر زیر الفاظ ڈھونڈھنے پڑتے ہیں۔ مسیحا کے مطابق غاد ہیں دریا قطرہ نالہ صحرا دنیا عقبیٰ ان کو لینے دوزی نے دے غافے سے ملتے جاؤ۔ شعر بنتے جائیں گے یعنی دریا کے ساتھ ساحل یا قطرہ سیل کے ساتھ محمل یا مجنوں دنیا کے ساتھ عقبیٰ وغیرہ بس غزل مکمل ہو گئی۔ عام طور پر غزلیں اسی طرح لکھی جاتی ہیں۔ غالب نے تفتہ کو ایک خط میں تنبیہ کی تھی کہ کیا تم مجھے بھی ایسا ہی شاعر سمجھتے ہو کہ کسی غزل کے قافیئے لئے اور اس کے بعد پر غزل لکھ دی میں مانتا ہوں کہ غالب ایسا نہیں کرتا تھا۔ لیکن اس کی تنبیہ سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ عام طور پر شعرا اسی طرح کرتے ہیں۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ میرے جس شعر پر مشاعرے میں نہایت پرجوش نعرے لگے تھے وہ شعر یہ تھا ؎

بجھ گئی یوں بزم میں جل جانے سے کیا ملتا ہے
شمع نے پوچھا یہ پروانے کو رسوا کر کے

کیا ہے اس شعر میں؟ یہ ٹھیک ہے کہ بزم، شمع اور پروانہ اردو شاعری کے شاعرانہ الفاظ ہیں۔ لیکن اس وقت شعر لکھتے ہوئے میرے دل میں کسی قسم کا احساس نہیں تھا۔ صرف رسوا سے ہی شعر نکل آیا۔ بس اسی ذاتی گواہی کے ساتھ اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔ ❀

اردو لکھئے، اردو بولئے، اردو پڑھئے

نجیب رامش

بحران

بڑا تناور درخت تھا، کتنا ٹھوس تھا۔ تندو تیز آندھی سے لڑگیا تھا۔
مگر ہوا نے جب اس کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا
تو اس کی تقلید کرنے والا وہ ننھا پودا
سہم گیا۔
اس کو عقل آئی۔
اور اپنی شاخوں کو اس نے اتنی لچک عطا کی کہ آندھیوں کا جلال سہہ سکیں۔
وہ نخلِ طوفانِ بادوباراں کو جھیل کر آج تک ہرا ہے۔
مگر ہوا کی اب اس سے تکرار عجیب سی ہے۔
وہ ٹھوس چیزوں میں اپنی پہچان گم کردے
اور اپنا پیکر رقیق کرلے۔!
پھر اس کو جن قالبوں میں ڈھالیں
انہیں کی شکلیں قبول کرلے!!
اور اپنی یہ شکل بھول جائے!!
وہ نخل اس کشمکش میں غلطاں کہ خود کو کیسے رقیق کرلے
اور اپنی پہچان بھی بچالے۔!!!

● ۲۸/۳ رانی شنکر نگر ۔ بھوپال

اطہر راز

ترجمے اور ترجمان

ایزرا پونڈ

بدن کی قبر پہ روشن ہے
زندگی کا چراغ
گذر رہی ہے حوادث کے ساتھ
عمرِ رواں
کچھ اس تپاک سے
جیسے کہ کھیت میں چوہا
چلے تو اس کی صدا
کوئی سن نہیں پاتا

بھگت کبیر

مرے وجود میں اک نورِ غیب شامل ہے
یہ کون نغمۂ ابدی سنا رہا ہے مجھے
صفاتِ ذاتِ مسلسل ازل سے
رقص میں ہیں
صدائے سازِ اناالحق بھی
سن رہا ہوں میں۔

● 21 COLWOOD GARDENS COLLIERS WOOD
LONDON SW19 2DS

ہیگل

مکمل طور پر کوئی یہاں حق پر نہیں ہو
نہ میں حق پر نہ تم حق پر
ہمارے درمیاں بس
ایک نقطہ ہے جہاں حق ہے
اٹھو ہم دونوں اب اس
نقطۂ تفہیم کو ڈھونڈیں

وکٹر ہیگو

معاشرے میں انا کا شکار
وہ افراد
جو اقتدار کے میداں میں
شہسوار بھی ہیں
غریب لوگوں کو
روٹی تو دے نہیں سکتے۔
سزائیں دیتے ہیں
مجرم بناتے رہتے ہیں

صدیق عالم

۳۰/۳، باشی بگان روڈ، کلکتہ-۱۴

کائنات ایک خود کار مشین

کردار:- سلیم، نسیمہ، کہانی کار، اس کے پانچ کردار۔

منظر:- سنگل اسٹیج۔ دائیں حصے پر ایک آرام کرسی، سٹول رکھی ہے۔ اسٹیج کی عقبی دیوار پر ایک بڑی کھڑکی ہے جس میں باری باری سے سورج اور چاند روشن ہوتے ہیں۔

پردہ اٹھنے پر سلیم آرام کرسی پر بیٹھا نظر آتا ہے۔ سر سے کمر تک چھوٹی اٹھا رکھی ہے۔ آنکھوں پر گہرے نیلے رنگ کے چشمے۔ عمر تیس اور چالیس کے درمیان۔ نسیمہ ٹول پر بیٹھی اونی دستانے بُن رہی ہے۔ جوان، تندرست، خوبصورت۔ پردہ اٹھنے کے تقریباً ایک منٹ بعد ڈرامہ کے شروع ہونے کی گھنٹی بجتی ہے۔

سلیم۔ (چونک کر آرام کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اسٹیج کے آگے جاکر، آنکھوں پر ہاتھ کا سایہ سا کر، تماشیوں کی طرف تاکتا ہے۔) یہ آواز کیسی تھی؟

نسیمہ۔ (دستانے بننا چھوڑ دیتی ہے۔ قدرے دھیمی آواز میں۔) تم... ڈرامہ شروع ہو چکا ہے، واپس آجاؤ... حرکت کر رہے ہو؟

سلیم۔ اوہ! میں تو بھول ہی گیا تھا۔ (واپس آکر آرام کرسی میں ڈھیر ہو جاتا ہے۔ ایک بار اسٹیج کی دونوں جانب نظریں دوڑاتا ہے جیسے کہیں سے کسی اشارے کا منتظر ہو۔ پھر...) تو... کیا پہلے میں ڈائلاگ کی ابتدا کروں؟

نسیمہ۔ (دستانے بنتے ہوئے) اسکرپٹ دیکھ لو۔

سلیم۔ کیوں نہ ڈائرکٹر سے پوچھ لوں۔ (مڑ کر پس منظر سے) ہیلو، کیا ڈائلاگ کی شروعات میں کروں؟

ایک مردانی آواز۔ اس ڈرامے میں کوئی ڈائلاگ نہیں ہے۔

سلیم۔ (جھلا کر سر کھجانے لگتا ہے۔) واقعی، میں تو بھول ہی گیا تھا۔ (یکایک چونک کر گرد و پیش کا جائزہ لیتا ہے۔) ارے، ابھی ڈرامہ شروع تو نہیں ہو گیا؟!

نسیمہ۔ شروع ہو بھی جائے تو مجھے کیا۔

سلیم۔ ظاہر ہے ڈرامہ شروع ہو جائے تو ہم ڈائلاگ کیسے بول سکتے ہیں اس ڈرامہ میں کوئی ڈائلاگ ہوتے ہی نہیں (قدرے توقف کے بعد) مگر ڈائلاگ کے بغیر کہانی آگے کیسے بڑھے گی؟

پس منظر سے۔ اس ڈرامے میں کوئی کہانی نہیں ہے۔

سلیم۔ واقعی۔ (رومال نکال کر چہرہ پونچھنے لگتا ہے۔ عینک گود سے نیچے گر جاتی ہے۔ اسے اٹھا کر) ریہرسل کے وقت تو سب کچھ تھا۔

نسیمہ۔ مجھے یاد نہیں، اس وقت میں اپنی ماں کی کوکھ میں تھی۔

سلیم۔ (سوچتے ہوئے تشویش کے ساتھ...) شاید، مجھے بھی لگتا ہے اب تک ریہرسل شروع ہی نہیں ہوئی ہو۔ مگر ڈائلاگ اور کہانی نہ رہے تو اس ڈرامے میں رہ ہی کیا جاتا ہے؟ صرف اداکاری، فٹ لائٹس، ساؤنڈ ایفکٹس، بیک گراؤنڈ میوزک۔ کہیں یہ گونگے بہروں کا ڈرامہ تو نہیں؟!

پس منظر سے پہلی آواز۔ گونگے بہروں کے ڈراموں میں ڈائلاگس ہوتے ہیں۔

دوسری آواز۔ کہانی ہوتی ہے۔

پہلی آواز۔ ایکشن ہوتا ہے۔

دوسری آواز۔ اداکاری ہوتی ہے۔

نسیمہ۔ اور وہ سب کچھ ہوتا ہے جس کا ابھی تم ذکر کر رہے تھے۔

سلیم۔ عجیب مصیبت ہے (سیٹ سے اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ رخ اسٹیج

اختر سعید خان

دفترِ غم سمیٹ لو، دیدۂ نم اٹھا رکھو
سنتا ہے کون دل زدو شرحِ الم اٹھا رکھو

دیر ہوئی کہ جل بجھیں فکر و نظر کی بستیاں
سادہ دلانِ زندگی خوابِ ارم اٹھا رکھو

اپنے مزاجِ درد کے یہ بھی نہیں ادا شناس
دیکھ لئے تراش کر اب یہ صنم اٹھا رکھو

دل کی فضاؤں میں پھر اک سکوتِ نغمہ بار
ہجر نصیب ساعتو نوحۂ غم اٹھا رکھو

روز کے ضبطِ گریہ سے اپنا بھی دل اچاٹ ہے
تم سے بھی ہو تو کوئی دن مشقِ ستم اٹھا رکھو

کتنا دکھا ہوا ہے دل تم کو ابھی خبر نہیں
در دیکھ اور بڑھ نہ جائے سعیِ کرم اٹھا رکھو

رات کی کروٹوں کے ساتھ صبح کی آہٹیں بھی ہیں
چپکے سے کہہ رہی ہے شام آج کے غم اٹھا رکھو

● اندرون اتوارہ، بھوپال ــــ (ایم ۔ پی)

وامق جونپوری

ہم کو ہر دورِ محبت کا ہے نقشہ معلوم
تیغ و نار و رسن و زہر و چلیپا معلوم
ماورائے سحر و شام سفر ہے درپیش
کس کی منزل ہے کہاں کچھ نہیں ہمتا معلوم
اس ملک اپنے سے خود کون پہنچ سکتا ہے
جس کو ہے اس کا پتہ اس کا پتہ نامعلوم
ماں کی آغوش میں بچے کی ہنسی اس کی خوشی
غیض میں آئے تو ہو آگ بگولا معلوم
پاس آجائے تو آنکھوں میں اندھیرا چھا جائے
دور ہو جائے تو ہو آنکھوں کا تارا معلوم
اس سے دلداری کی باتیں کریں یا شکوۂ جبر
دونوں کا ایک نتیجہ ہے نتیجہ معلوم
آبِ حیواں میں کہاں تشنہ لبی کی لذت
خضرِ ذی جاں کو شہادت کا مزا کیا معلوم
لبِ شاعر سے غزل نکلی ہے فردوس بگوش
دستِ قرطاس میں ہوتی ہے صحیفہ معلوم
قاضیِ شہر کے دفتر میں ہے اب تک ترا نام
تجھ کو وامق نہیں کیا حرکتِ[1] خفیہ معلوم

---

[1] "حرکت" بمعنی خفیف الحرکاتی کو عرفِ عام کی سند حاصل ہے۔

● لال کوٹھی، پوسٹ کاج گاؤں، ضلع جونپور

کالی داس گپتا رضا

سی ۲، جی درشن ۳۳۔ اے، فریدہ نوروز جی ہنسی، ورلی بمبئی ۔ ۳۶

توقیتِ داغ

۴۸ تا ۱۷۵۰ء کے لگ بھگ — قاسم جان، عالم جان اور عارف جان، تین بھائی احمد شاہ (۱۷۴۸ء تا ۱۷۵۴ء) کے عہد میں ہندوستان آئے۔ دو ایک برس حکومت دہلی کی طرف سے مرزا محمد بیگ صوبہ دار رہتک کے یہاں عارضی طور پر ٹھہرے۔
قاسم جان اور عالم جان جلد ہی آگے دہلی کی طرف روانہ ہو گئے مگر عارف جان کئی برس مرزا محمد بیگ کے یہاں رہ کر کام میں ان کی مدد کرتے رہے۔

۱۷۶۰ء کے لگ بھگ — مرزا محمد بیگ کی بیٹی سے عارف جان کی شادی

۱۷۶۲ء کے لگ بھگ — عارف جان کا پہلا بیٹا نبی بخش خاں پیدا ہوا

۱۷۶۵ء کے لگ بھگ — عارف جان کا دوسرا بیٹا احمد بخش پیدا ہوا

۱۷۶۶ء کے لگ بھگ — (شروع سال؟) عارف جان شاہ عالم (۱۷۵۹ء – ۱۸۰۶ء) کی طلبی پر دہلی (مع عیال و اطفال) چلے آئے۔ قیاس ہے کہ احمد بخش تیس برس کی عمر تک یعنی مولانا فخر الدین چشتی کی وفات تک دہلی ہی میں رہے۔)

۱۷۶۷ء (آخر سال؟) — دہلی میں الٰہی بخش خاں (بعد میں خسر غالب) عارف جان کا تیسرا بیٹا پیدا ہوا

۲۰ نومبر ۱۷۸۵ء — مولانا فخر الدین چشتی کی وفات۔ احمد بخش خاں ان سے بیعت تھے۔ ایک دن جب احمد بخش خاں انہیں وضو کرا رہے تھے تو مولانا صاحب نے احمد بخش خاں کو والیِ میوات کہہ کر پکارا۔ جو بات آگے سچ ثابت ہوا۔

۱۷۸۶ء تا ستمبر ۱۷۹۹ء — اس بارہ تیرہ سال کے عرصے میں احمد بخش خاں پہلے گوالیار میں زمرۂ سواران میں ملازم ہوئے۔ بعد میں اگست ۱۷۹۹ء کے بعد اجمیر سے دہلی آتے ہوئے راجا بختاور سنگھ والیِ الور سے ملاقات ہو گئی اور وہ ان کی ملازمت میں الور چلے گئے۔

۱۸۰۳ء کے لگ بھگ — احمد بخش خاں کی بہن کی غالب کے چچا نصر اللہ بیگ خاں سے شادی

یکم نومبر ۱۸۰۳ء — لسواڑی کی لڑائی میں احمد بخش خاں کے ایما پر الور کا فوجی دستہ بھی انگریزوں کی مدد کے لیے شامل۔ احمد بخش خاں بہت بہادری سے لڑے اور ایک انگریز سالار فریزر کی جان بچا لی۔ انگریزوں کی فتح۔

۲۲ دسمبر ۱۸۰۳ء — جب فتح کا دربار منعقد ہوا تو لارڈ لیک نے راجا بختاور سنگھ کو ۱۴ محال جاگیر میں عطا کیے۔ احمد بخش خاں کا نام سند میں "فخر الدولہ دلاور الملک نواب احمد بخش خاں بہادر رستم جنگ" تحریر ہے۔ اور جاگیر کے طور پر فیروز پور جھرکا، پونہانہ، بچھور، سانکرس، نگینہ وغیرہ اضلاع عنایت فرمائے۔ بعد میں راجا بختاور سنگھ نے اپنی طرف سے لوہارو کا اضافہ کیا۔ اس طرح احمد بخش خاں نواب احمد بخش خاں والیِ فیروز پور جھرکا و لوہارو ہو گئے۔

۱۸۰۷ء کے لگ بھگ — ایک مقامی عورت مُندی سے تعلق
گمانا شیش یا ضلع گڑگانوہ کے مسا رام نامی میو کی دو بیٹیاں تھیں ایک کا نام مُرتی تھا اور دوسری کا نام مُندی۔ مُرتی راجا بختاور سنگھ نے اپنے ہاں رکھ لی اور مُندی نواب احمد بخش خاں نے

۱۸۰۹ء — احمد بخش خاں کے بیٹے شمس الدین احمد خاں کی ولادت مُندی کے بطن سے

۱۸۱۲ء کے لگ بھگ — احمد بخش خاں کی برلاس مغل نیاز محمد بیگ کی بیٹی بیگم جان سے شادی۔ (بیگم جان کا انتقال ۴ نومبر ۱۸۲۶ء کو ہوا)

۱۸۱۳ء کے لگ بھگ — وزیر بیگم عرف چھوٹی بیگم والدۂ داغ کی ولادت۔ یہ یوسف

تو اور چلانا، شاہ بازی وغیرہ فنون میں تعلیم پائی۔

۱۸۴۵ء مرزا خورشید عالم کی ولادت (خورشید عالم ۱۸۶۲ء) در

۱۸۴۵ء داغ کی ذہانت اور طبع کو دیکھ کر صاحب عالم ولی عہد نے ذوق کا شاگرد قرار دیا۔

۱۸۴۵ء پہلے پہل مشاعرے میں شرکت نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے یہاں۔ داغ کی غزل کا مطلع تھا۔

شرر و برق نہیں شعلہ و سیماب نہیں
کس لئے پھر یہ ٹھہرتا دلِ بے تاب نہیں

۱۸۴۵ء زینت باڑی کے مشاعرے میں شرکت۔ امام بخش صہبائی نے اس شعر پر اٹھ کر گلے سے لگایا ؎

لگ گئی چپ تجھے اے داغِ حزیں کیوں یک
مجھ کو کچھ حال تو کہہ بخت بستہ آیا

۱۸۴۶ء مرزا داغ کی شادی خالہ زاد بہن فاطمہ بیگم کے ساتھ

۱۸۵۲ء ۳ رجون؟ لال قلعے کا مشاعرہ۔ اس شعر پر بادشاہ ظفر نے داغ کو اپنے پاس بلایا۔ اور پیشانی پر بوسہ دیا۔

ہوئے مغرور وہ جب آہ میری بے اثر دیکھی
کسی کا اس طرح یارب نہ دنیا میں بھرم نکلے

۱۸۵۶ء ۱۰ جولائی مرزا فخرو ولی عہد سلطنت کی جار تنہ ہیضہ بانزیر خوانی ۳۸ سال کی عمر میں وفات۔ والدہ داغ چھوٹی بیگم پھر بے شوہر کی ہو گئیں اور داغ پھر سے بے باپ کے۔

۱۸۵۷ء مئی ہنگامہ شروع۔ پہلا دیوان تلف (کچھ غزلیں جو حافظے کی مدد سے گلزارِ داغ میں شامل کر لی گئیں تھیں)

۱۸۵۷ء آخر والیِ رام پور نواب یوسف علی خاں کے دامنِ عاطفت میں۔ داغ کو نواب رام پور نے اپنے عہد میں ہمیشہ بطور مہمان رکھا۔

۱۸۶۵ء ۲۱ اپریل نواب یوسف علی خاں کا انتقال۔ نواب کلب علی خاں مسند نشیں

(۱۸۵۷ء سے ۱۸۶۶ء تک داغ بطور مہمان رہے لیکن اسی دوران میں ان کا دہلی آنا جانا رہا بلکہ کئی بار دہلی کی سکونت کافی لمبی بھی ہوتی رہی۔)

۱۸۶۶ء ۱۴ اپریل۔ ۷۰ روپیہ ماہوار باقاعدہ تقرر۔ معتمد خاص کارخانہ جات و اصطبل گاڑی خانہ و شتر خانہ۔

۱۸۶۶ء تقریباً آخر ایک روز داغ جب صبح کے وقت اصطبل پہنچے تو دروازے پر ایک کاغذ چسپاں دیکھا جس پر یہ شعر لکھا ہوا تھا ؎

شہر دہلی سے آیا اک مشکی
آتے ہی اصطبل میں داغ ہوا

کہتے ہیں کہ یہ شعر احمد علی رسا رام پوری (متوفی ۱۸۹۱ء) کا تھا اور رشک و رقابت کی وجہ سے کہا گیا تھا۔

۱۸۶۶ء دسمبر نواب رام پور کے ساتھ کلکتہ کا سفر

۱۸۷۲ء نواب رام پور کے ہمراہ حج کرنے گئے (نومبر ۱۸۷۲ء تا مارچ ۱۸۷۳ء)

۱۸۷۸ء پہلا دیوان گلزارِ داغ کی اشاعت

۱۸۷۹ء منی بائی حجاب کی بے نظیر باغ کے میلے میں شرکت۔ داغ اس کے حلقۂ زلف کے اسیر۔

۱۸۷۹ء چھوٹی بیگم والدہ داغ کا انتقال

۱۸۸۲ء (حجاب داغ کے بلانے پر صرف ایک بار اور بے نظیر باغ کے میلے میں آئیں۔ ورنہ وہ داغ کو کلکتے ہی ملتی رہیں۔)

اپریل میں داغ خود کلکتے کے لئے روانہ اور وہاں ۳ جولائی کو واپس ہوئے اور ۹ جولائی کو رام پور پہنچ گئے (کلکتہ میں جاتے ہوئے پٹنہ میں اور پھر کلکتہ میں کئی مشاعرے ہوئے اور داغ کی بڑی شہرت ہوئی۔)

۸۳/۱۸۸۲ء مثنوی فریادِ داغ کی تصنیف (دو دن میں کہی گئی؟ سالِ فکر و تکمیل ۱۳۰۰ھ)۔

۸۵/۱۸۸۴ء مثنوی فریادِ داغ چھپی سالِ طباعت ۱۳۰۲ھ

۱۸۸۵ء دوسرے دیوان آفتابِ داغ کی اشاعت

۱۸۸۷ء ۲۳ مارچ نواب کلب علی خاں کا انتقال۔ انتظامِ ریاست اعظم الدین خاں کے ہاتھ میں۔

۱۸۸۷ء ۸ دسمبر دربار رام پور سے مستعفی

۱۸۸۸ء جنوری تا مارچ مسلسل سفر میں رہے امرتسر کشن کوٹ اجمیر آگرہ علیگڑھ متھرا بھرت پور وغیرہ۔

۱۸۸۸ء ۱۰ اپریل کو حیدرآباد پہنچے اور بازار سید ی (سعدی) عنبر میں قیام کیا۔ داغ کا مکان اسی سے متصل اور سیف الحق دہلوی ادیب، مترجم اخبارات سرکار کے

بیادِ سیماب

راز آشنائی کا راز آشنا جانے
دل سے جو نہ ہو آگاہ دل کی بات کیا جانے
اُس کی بے نیازی کا وزن کوئی کیا جانے
جو نہ سیر دامن ہو اور نہ مانگنا جانے
عشق ہے تجاہل کیش، حُسن ہے تغافل خو
میرا زندہ دارِ غم کون ہے خدا جانے
جانتا ہے وہ اُس کا رازِ جلوہ پیرائی
جو نگاہ کی حد سے دور دیکھنا جانے
یہ تو میری نظروں نے دلنوازیاں دی ہیں
ورنہ وہ نظرِ ستم التفات کیا جانے
میری ہر نظر سجدہ، میرا ہر نفس تسبیح
اور کس کو کہتے ہیں بندگی خدا جانے
اس کو دیکھتے ہیں وہ اُس سے بات کرتے ہیں
جو نہ دیکھنا جانے اور نہ بولنا جانے
حُسنِ ظن ہے بے معنی سوءِ ظن ہے لاحاصل
کیا مآلِ ہستی ہو، کیا نہ ہو، خدا جانے
جھک گئی جبیں میری رہگزار میں اُس کی
سجدہ تھا کہ سودا تھا، اب یہ نقشِ پا جانے
دل نے مطمئن ہو کر ایک بار اُسے دیکھا
پھر مرا سکونِ دل کیا ہوا، خدا جانے
حُسن رنگ و نور اس میں بھر رہا ہے پیوستہ
کس قدر بجھا تک تھی زندگی خدا جانے
اُس کو خود نہیں فرصت کاوشِ مسلسل سے
حُسن کیوں فسردہ ہے عشق کی بلا جانے
میں کسی سے دنیا میں آشنا نہیں سیماب
خود ہی جو مسافر ہو وہ کسی کو کیا جانے

میں ہوں اک مستقل عنوان ہستی کے فسانے میں
مجھے تاریخ دہراتی رہے گی ہر زمانے میں

ڈاکٹر سید عبداللہ

"لوحِ محفوظ" ایک مستقل تحریر نہیں حضرت سیمابؔ کے طویل سلسلۂ سخن کی ایک کڑی ہے جس پر اظہارِ خیال کا فخر حاصل کر رہا ہوں، اگرچہ پریشان گفتاری پر بجائے پریشان روزگاری کر رہا ہوں پھر بھی بپاسِ خاطرِ احباب جرأت کر رہا ہوں اور چشمِ آفریں بھی رکھتا ہوں۔ حضرت سیماب اکبرآبادی ماضیٔ قریب کے ایک زریں دورِ شاعری کی ایک فردِ کامل ہیں جس میں شاعری کیفیاتِ باطن کے عجائبات اور زبان و بیان شیرینیوں اور سحرکاریوں کے کمال پر پہنچ چکی تھی۔ سیمابؔ اس سلسلۂ جمال کے مفردین میں سے ایک تھے۔ ابتدا میں ان کا رجحان زیادہ تر دینی شاعری کی طرف رہا جس کے نتیجے میں "الہامِ منظوم" اور "وحیِ منظوم" دو مجموعے ہمارے سامنے آئے۔ "سازِ حجاز" میں حمد و نعت کو جمع کیا گیا ہے۔ موجودہ نسخہ "لوحِ محفوظ" ان کی غزلوں کا آخری مجموعہ ہے۔

سیمابؔ بنیادی طور پر نہایت پرگو اور زود گو شاعر ہیں۔ شاعری میں انفرادیت کے قائل ہیں روایت سے بھی یکسر پہلو تہی نہیں کرتے لیکن اُسے مہارت سے جدید رنگ میں سمو دیا ہے۔ ان کی شاعری کا بنیادی سرچشمہ علم، روحانی تجربہ اور مشاہدۂ کائنات ہے۔ انہوں نے شاعری کی ہر صنف پر قلم اٹھایا ہے۔ انہوں نے زبان و بیان پر قدرتِ کاملہ کے زور سے ہر صنف میں روایت کو جدید اسلوب میں ڈھال کر شعر کی ایک نئی عمارت تعمیر کی۔ ہر جگہ قدیم اور جدید دونوں قسم کے اربابِ ذوق سے اپنی قدرت اور عظمت کو منوایا ہے۔

سیمابؔ کی غزل گوئی کو دو بڑے ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ان کی کچھ غزلیں وہ ہیں جن کا تعلق تقسیم سے قبل کے دور سے ہے اور باقی وہ جو تقسیم کے بعد کی ہیں۔

سیمابؔ ایک حساس شخصیت کے مالک ہیں انہوں نے اپنے دور کو بہت گہری نظر سے دیکھا ہے جس کے نتیجے میں اُن کی شاعری میں ان کا احساس، ان کا تجربہ، ان کا مشاہدہ اور شخصی ردِعمل، جو مثبت ہے صاف نظر آتا ہے۔ انہوں نے مشکلات اور مصیبتوں کا سامنا بڑی حوصلہ مندی سے کیا ہے، اور ان کے سامنے کبھی نہیں جھکے۔ یہی ان کا وصفِ خاص ہے جو انہیں دوسروں سے ممتاز کرتا ہے لہٰذا ان کا پیغام ہے، عزتِ نفس، خودداری، حمیت، حوصلہ مندی اور بے طمعی وہ ذہنی اخلاقی اور روحانی ضابطے ہیں جو انسان کو ایک عظیم مخلوق اور انسانیت کو بلند ترین قدر سمجھتے ہیں غیرت و خودداری ان کی سب سے بڑی فضیلت ہے چنانچہ فرماتے ہیں

سجدے کروں، سوال کروں، التجا کروں
یوں دی تو کائنات مرے کام کی نہیں
وہ خود عطا کریں تو جہنم بھی ہے بہشت
مانگی ہوئی نجات مرے کام کی نہیں

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

حضرت سیمابؔ اکبرآبادی شاعری کے اس دور سے تعلق رکھتے ہیں جسے اب اصطلاحی طور پر کلاسیکی دور کہا جاتا ہے اور غالباً اس کلاسیکیت سے مراد محض ایک دورِ قدیم اور اس دور کی شاعری کی بعض امتیازی خصوصیات ہیں۔ یہ وہ دور ہے جس میں ولی، میر، درد، سودا اور غالب پیدا ہوئے اور یہی سلسلہ عصرِ حاضر کے شعرا تک پہنچا ہے۔ اس دور میں اردو شاعری پر ترقی پسندی، جدیدیت اور اس طرح کی اصطلاحات اور تجربات کی یلغار نہیں

دل میں جذبۂ بے نیازی کے امانت کر دیے
آپ نے دونوں جہاں مجھ کو عنایت کر دیے
دل کے ٹکڑے پھول کلیوں میں امانت کر دیے
یہ خزانے میں نے گلشن کو ودیعت کر دیے
وہ خودی جس نے خدائی حوصلوں کے ساتھ کی
اُس سے یہ پوچھو کہ انساں کتنے غارت کر دیے
چھیڑ دی میں نے جو اپنی داستانِ زندگی
ساری دُنیا کے فسانے بے حقیقت کر دیے
جن سے دورِ حال کی تہذیب کا امکان تھا
میں نے ماضی کے وہ سب آثار رخصت کر دیے
فکرِ دنیا، کاوشِ عقبیٰ، غمِ عشق و وفا
جتنے غم تھے، سب خدا نے مجھ کو قسمت کر دیے
خوئے استغنا کی بے چارہ نوازی دیکھیے
خاک کے ذرّے مرے دامن میں دولت کر دیے
خود نمائی، خود پرستی، خود روی، خود مطلبی
یہ گنہ کس نے شریکِ آدمیت کر دیے!
سامنے ہے منزلِ مقصود، اور اک دو قدم!
حوصلے کیوں پست یارانِ طریقت کر دیے
جس قدر انسانیت کے منتشر جذبات تھے
جمع سب ہم نے بہ عنوانِ محبت کر دیے
ناخدا کو اُن کی غرقابی کا کیوں الزام دوں
جو سفینے خود مری غفلت نے غارت کر دیے
آئینے کیا، دشتِ ہستی سے اُٹھا ایسا غبار
محفلِ عالم کے دل بھی پُر کدورت کر دیے
اللہ اللہ تیرہ بختی کی کرم فرمائیاں
کچھ ستارے بھی انیسِ شامِ غربت کر دیے
حشر کے دن کیا نچھاور اُن کے قدموں پر کروں
جتنے سجدے تھے وہ سب نذرِ عبادت کر دیے
فکر کو سیماب آزادی کی دے کر وسعتیں
مرتبے ہم نے غزل کے بے نہایت کر دیے

رہے کا اندازہ ہے۔ سیماب نے داغ کے رنگ کو خیرباد کہنے کے بعد غالب کی روایات کو اپنانے کی کوشش کی جو اُردو کی جدید شاعری، درحقیقت جدید غزل کا سنگِ بنیاد بننے والی تھیں۔ غزل کے جدید رنگ کے ساتھ انہوں نے نظم نگاری بھی اختیار کی اور نظموں کے کئی مجموعے چھوڑ گئے جن کے موضوعات میں بڑا تنوع پایا جاتا ہے۔ انہوں نے مثنوی مولانا روم اور قرآنِ حکیم کے منظوم ترجمے بھی کیے ہیں، جو ان کی قادرالکلامی کا ثبوت ہیں لیکن انہیں صرف ایک قادرالکلام شاعر کہنا ناانصافی ہوگی۔ جوش ملیح آبادی ان کے نہایت ممتاز معاصرین میں سے تھے لیکن وہ اب تک جوش کا نہیں اقبال کا ہم عصر تصور کرتے تھے۔

سیماب نے غزلوں کے تین مجموعے چھوڑے ہیں (۱) کلیمِ عجم (۲) سدرۃ المنتہیٰ (۳) لوحِ محفوظ۔ کلیمِ عجم کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۶ء میں قصرالادب آگرہ سے شائع ہوا تھا اور دوسرا ایڈیشن بھی وہیں سے ۱۹۴۷ء میں چھپا تھا۔ اب یہ تیسرا ایڈیشن سیماب اکاڈمی پاکستان کراچی سے شائع ہو رہا ہے۔

مجھے سیماب کی غزلوں کے دوسرے دیوان سدرۃ المنتہیٰ کو دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ ان کا تیسرا دیوان لوحِ محفوظ ان دنوں میرے مطالعے میں ہے۔ اور اس کے متعلق ڈاکٹر سید عبداللہ کا یہ قول مجھے بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے کہ لوحِ محفوظ کوئی منقطع تحریر نہیں حضرتِ سیماب کے طویل سلسلۂ سخن کی ایک کڑی ہے۔ ایک غزل گو کی حیثیت سے نہ صرف ان کا اسلوب کلیمِ عجم میں متعین ہو چکا تھا بلکہ ان کی شاعرانہ اہمیت بھی اسی مجموعۂ کلام سے مسلم ہو چکی تھی۔ لوحِ محفوظ تک ان کی غزلیں اسی رنگ و آہنگ کا تسلسل معلوم ہوتی ہیں جو کلیمِ عجم کی پہچان ہے۔ شاید یہ کہنا غلط نہ ہو کہ سیماب کی غزلوں کے تینوں دواوین میں سب سے اہم دیوان کلیمِ عجم ہی ہے۔ ان کی غزلوں کے جن اشعار کو قبولِ عام حاصل ہو چکا ہے وہ کلیمِ عجم ہی کی غزلوں کے اشعار ہیں۔ ان کی غزلوں کے بنیادی رنگ و روش کو سمجھنے کے لیے کلیمِ عجم ہی کا مطالعہ کافی ہے۔

جس زمانے میں کلیمِ عجم کا پہلا ایڈیشن منظرِ عام پر آیا ہے اُردو کی وہ جدید غزل جس کی ابتدا حسرت موہانی، اصغر گونڈوی، فانی بدایونی اور جگر مرادآبادی سے ہوئی تھی ارتقا کے بہت سے مرحلے طے کر چکی تھی۔ اقبال کی غزلوں نے تو غزل کی دُنیا ہی بدل دی تھی لیکن غزل کے معاملے میں اُردو شعر و ادب کی دُنیا اقبال کے انقلابی رنگ سے متاثر نہ تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ اقبال نے غزل میں جو انقلاب پیدا کر دیا ہے اس کی تعریف جس قدر آسان ہے اس پر عمل کرنا اتنا ہی دشوار ہے۔ اس دوران میں فراق کی نرم آواز آہستہ آہستہ لوگوں کے دلوں میں سرایت کر رہی تھی۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد یگانہ کے سخت لہجے والی شاعری بھی اپنا جادو جگانے لگی۔ اگر میرا اندازہ غلط نہیں تو دوسری جنگِ عظیم یا قیامِ پاکستان سے لے کر اس وقت تک یگانہ اور فراق اُردو غزل پر نسبتاً زیادہ اثر انداز رہے ہیں ویسے اس دوران میں فیض کی تقلید بھی بہت ہوئی ہے۔ بات خاصی پھیلتی جا رہی ہے۔ مجھے کہنا یہ تھا کہ بیسویں صدی کی اُردو غزل کی صورت گری میں جہاں دوسروں کا حصہ واضح ہے وہاں سیماب کا حصہ بھی نمایاں ہے۔ اگر حسرت اور ان کے رفقا نے داغ اور امیر کی چھیڑ چھاڑ اور چھین جھپٹ کی شاعری سے منہ پھیر لیا تھا تو کوٹھے پر ننگے پاؤں آنے اور شراب و کباب والی شاعری کو بھی بعد کے شعرا نے ترک کر دیا تھا۔ اُردو غزل کی اس تطہیر میں سیماب نے جو کردار ادا کیا وہ قابلِ قدر ہے۔ انہوں نے حالی کی طرح عاشقانہ شاعری سے ناصحانہ شاعری کی طرف جست نہیں لگائی۔ اُردو کی عشقیہ شاعری کو خس و خاشاک سے پاک کر دینا کافی سمجھا ◆

علامہ سیماب کے مشہور شعری مجموعے کلیمِ عجم کا ... اور لوحِ محفوظ ... پاکستان ... جنھیں ...

علامہ سیماب کی بیاض سے

[illegible]

(یہ غزل علامہ سیماب کے پوتے ڈاکٹر رضوان سیماب کی عنایت سے شائع ہو رہی ہے)

رشید امجد

سی/۵۲، بین نمبر ۱۰۷، گلستان کالونی۔ راولپنڈی (پاکستان)

یخ بستہ شام

دستک دھیمی دھیمی مدھم - آہستہ آہستہ تیز ہو رہی تھی، اس کی کھوپڑی میں حرکت ہوئی کہ اب اس کے جسم پر صرف آنکھیں ہی متحرک تھیں، سرمئی اندھیرے میں کچھ نظر نہ آیا۔ بس دستک کی مسلسل آواز کانوں کے رستے دل میں اترتی رہی۔ پھر لمحہ بھر کے لئے آواز رک گئی اور ایک بچے کی معصوم آواز ابھری

"دروازہ کھولیں۔ پلیز دروازہ کھولیں۔

اس نے کروٹ لے کر آواز کی سمت محسوس کرنے کی کوشش کی لیکن جسم نے حرکت نہ کی، بس ایک جھرجھری اٹھ کر رہ گئی۔

"دروازہ کھولیں۔ پلیز۔ معصوم آواز میں ایک التجا تھی۔

اس نے چاہا کہ کسی کو پکارے لیکن لب پھڑپھڑا کر رہ گئے۔ آواز نہ نکلی

"پلیز دروازہ کھولیں، مجھے سردی لگ رہی ہے"

لگا جیسے ایک ٹھنڈی لہر اس کے سارے بدن میں اتر گئی ہے۔ لمحہ بھر کے لئے جسم میں ہلکی سی حرکت ہوئی لیکن فالج زدہ جسم مٹی کے ڈھیر کی طرح اسی طرح پڑا رہا۔

"دروازہ کھولیں۔ مجھے" آواز میں شامل کپکپاہٹ سردی کی شدت کا احساس دلا رہی تھی۔

اس نے ساری توانائیاں اکٹھی کرکے آواز دینے کی کوشش کی لیکن آواز ہونٹوں کی پھڑپھڑاہٹ سے آگے نہ بڑھی۔

"کوئی بھی نہیں سن رہا، کوئی بھی نہیں سنتا" اس نے اپنے اندر کسی سے کہا۔

سرمئی اندھیرے میں رچی ٹھنڈک سارے جسم کو تھپک رہی تھی

"پلیز۔ کھولیں" بچے کی آواز میں گڑگڑاہٹ تھی اور عاجزانہ نمی پیدا ہو گئی تھی۔

اس نے آنکھوں کی حرکت سے آس پاس کو ٹٹولا، لیکن کسی طرف سے کوئی جواب نہ ملا۔

دستک کی آواز پھر ابھری اور تادیر مسلسل سنائی دیتی رہی، پھر دستک کی کوکھ سے ایک درد بھری سسکی ابھری اور آواز آئی "پلیز — کھولیں"

آواز میں بے بسی مایوسی اور دکھ شامل تھا۔ پھر یوں لگا جیسے کوئی دیوانہ وار دستکیں دیئے جا رہا ہے۔ مسلسل نہ تھمنے والی دستک،

اس کے وجود کے اندر کہیں ایک گرم سا نقطہ پیدا ہوا اور تیزی سے پھیلنے لگا، یوں لگا جیسے وہ اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھ سکے گا۔ لیکن تمام کوششوں کے باوجود جسم کے ایک عضو نے بھی اپنی جگہ سے حرکت نہ کی۔ تیزی سے پھیلتا نقطہ آہستہ آہستہ تیز نکیلی ٹھنڈک میں تبدیل ہو گیا۔

دستک تھم گئی۔ کچھ دیر خاموشی رہی پھر وہی معصوم آواز کانوں کو چیرتی اس کے اندر اترنے لگی۔ "پلیز۔ دروازہ کھولیں، پلیز" تکرار سے یہی جملہ دہرایا جاتا رہا، پھر چند لمحوں کے لئے خاموشی چھا گئی

یوں لگا جیسے کوئی سسکیاں لے رہا ہو

"مجھے ٹھنڈک لگ رہی ہے۔ پلیز"

تیز نکیلی ٹھنڈک اس کے وجود کو ادھیڑنے لگی۔

"کوئی نہیں سنتا" اس نے اپنے آپ سے کہا۔ لمحہ بھر کے لئے یوں لگا جیسے وہ خود دروازے پر کھڑا ہے اور دستکیں دے رہا ہے۔

"دروازہ کھولیں۔ مجھے"

ٹھنڈی لہریں پورے وجود پر دوڑ رہی تھیں "مجھے۔۔"!

اس کے لب ہلے، لیکن آواز نہ نکلی۔

"کوئی نہیں سنتا۔ یہ سب کہاں چلے گئے ہیں"

"مجھے ٹھنڈ۔"

اس نے آنکھیں گھما کر چاروں طرف دیکھا۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا

"یہ سب کہاں۔؟"

مایوسی اداسی اور دکھ سے پور پور بھیگ گیا۔ "سب مجھے چھوڑ گئے ہیں۔"

دستک کی آواز پھر ابھری، تا دیر سنائی دیتی رہی، پھر معصوم بچی کا اور اداس آواز ابھری۔ "دروازہ کھولیں۔ پلیز دروازہ کھولیں۔"

"میری آواز کسی کو سنائی نہیں دیتی" جلتے ہونٹ آہستہ آہستہ ساکت ہو گئے۔

سردی کی شدت میں اضافہ ہو گیا، یوں لگا جیسے پاؤں کی طرف سے ایک یخ پتھر تیزی سے اوپر کی طرف پھیل رہا ہے۔

دستک کی آواز میں نقاہت آ گئی۔ جیسے دستک دینے والے کے ہاتھ شل ہو گئے ہوں۔

"دروا۔ زہ۔ کھو۔" آواز ٹوٹ گئی۔

اس نے اپنے وجود میں پھیلتے۔ یخ پتھر کو پھیلنے سے روکنے کی آخری کوشش کی۔ لیکن جسم کے کسی عضو میں ذرہ بھر حرکت نہ ہوئی

"دروا۔ زہ" اس نے پوری قوت سے چیخنا چاہا لیکن اس بار ہونٹوں کے کونے بھی۔ پھر پھرا کے آنکھیں تھیں کسی کو تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن لگا جیسے آنکھوں کے کونے بھی پتھر ہوتے جا رہے ہیں۔

"تو یہ" لیکن آگے سوچنے سے پہلے ہی [illegible] دستک کی مدھم سی آواز لمحہ بھر کے لئے ابھری پھر ایک دم ٹوٹتی صدا سنائی دی۔ "در۔ دا۔ ٹھن۔ ڈ"

چھت سے بھی اونچی سرد لہر نے اس کے سارے وجود کو اپنے اندر سمیٹ لیا۔ اس کے اندر پھیلتا۔ یخ پتھر آنکھوں میں اتر آیا۔

پتھرائی آنکھوں سے لمحہ بھر کے لئے بس یہ دیکھ سکا کہ وہ سرد لہر کی تہہ میں ڈوبا جا رہا ہے۔

اسی وقت کمرے کا دروازہ کھلا نرس اندر آئی چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر قریب آ کر اس نے اس کی نبض ٹٹولی، کچھ دیر چپ رہی پھر پیچھے مڑ کر کسی سے کہنے لگی۔ "مجھے افسوس ہے۔" ❁

کرناٹک کے بزرگ ادیب
ملا عبدالغنی
کا
ایک شگفتہ ناولٹ
نقشی کٹورا
اس ناولٹ میں سرزمین بمبئی اور کرناٹک کی زرخیز روایات اور معتدل موسم کی خوشگوار حیات کے لمس قاری کو اپنی گرفت میں لیں گے۔
ضخامت ❁ ۱۶۹ صفحات
قیمت ❁ ۸۰ روپے
رابطہ
فیض ارشد ملا۔ جامع مسجد جنگلی پیٹھ
پرانی ہبلی۔ ہبلی ۵۸۰۰۲۴

شبنم مناروی

پھر یوں بہار آئی کہ نقشے بدل گئے
گل کا عروج دیکھ کے سب خار جل گئے

ساگر سے جا ملے تھے غمِ دل کے سلسلے
کہسار ریزہ ریزہ تھے پربت پگھل گئے

ہم بے اماں بھی، وقت کے دشت اماں میں تھے
قسمت کی یاوری سے بُرے وقت ٹل گئے

کیا دل ربا سے لوگ تھے کھلتے ہوئے کنول
ہنس ہنس کے مسکراہٹیں چہروں پہ مَل گئے

تھا چاند کتنا دور چکوروں کی پہنچ سے
کھولی جو آنکھ گل نے تو کلیں مچل گئے

کتنے دلوں کی جذبۂ الفت نے کی کشود
کتنے دماغ بغض و کدورت سے جل گئے

شبنم وہی حسین ہے جسے تم حسیں کہو
سن کر تمہارا فیصلہ جانِ غزل گئے

● پوسٹ بکس ۲۷۰۴۰، ریاض ۱۱۴۱۷

عزیز اندوری

اس طرح جہل کے انبوہ میں افکار گرے
جیسے طوفاں میں کوئی شاخِ ثمر دار گرے

وہ زمیں باعثِ تقدیسِ وطن ہے جس پر
قطرۂ خونِ شہیداں طرحِ دار گرے

تم نے وعدے بھی کئے وعدہ شکن بھی نکلے
اس قدر دنیا میں انساں کا نہ کردار گرے

دب نہیں سکتی ہے ناقوس و اذاں کی آواز
ٹوٹ میں دو چار کلس یا کوئی مینار گرے

سوچنا یہ ہے کہ کب ظلم کی زنجیر کٹے
دیکھنا یہ ہے کہ کب ہاتھوں سے تلوار گرے

وقت کی سخت چٹانوں میں شگافیں پڑ جائیں
اس قدر تیز تو پانی کی کوئی دھار گرے

جانے کب وقت چڑھا دے ہمیں سولی پہ عزیز
جانے کب سر پہ یہ ٹنگی ہوئی تلوار گرے

● شعبۂ اُردو اسلامیہ کریمیہ کالج — اندور

اختر بستوی

یوں تم سے رہے ہیں مری آشاؤں کے رشتے
جیسے کسی گلشن سے ہوں صحراؤں کے رشتے

احساس میں کجلائیں وفاؤں کی شبیہیں
یاد آئے مجھے دھوپ میں جب چھاؤں کے رشتے

اک بوند اگر تشنہ لبی کا ہو مداوا
پیاسوں کے لئے بوجھ ہیں دریاؤں کے رشتے

لگتا ہے اسے شہر میں ہر شخص پرایا
شاید نہیں بھولا وہ ابھی گاؤں کے رشتے

مدت سے جو اختر مرے خوابوں کی ڈگر سے
اس سے کبھی قائم نہ ہوئے پاؤں کے رشتے

● شعبۂ اردو، گورکھپور یونیورسٹی گورکھپور ۲۷۳۰۰۹

انور قمر
۴-اے گل اپارٹمنٹس - ۲۴۳ - بی سینٹ اینڈریوس روڈ، باندرہ، ممبئی - ۵۰

میرا باپ صندوق میں سوتا ہے

مجھے معلوم نہیں تھا۔

معلوم تو اس روز ہوا، جس روز ماں کی طبیعت اچانک بگڑ گئی۔
وہ سودا سلف لے کر بازار سے گھر لوٹی تھیں، دہلیز پر آتے ہی گر پڑیں۔
میں گھر ہی پر تھا، انھیں اٹھا کر اندر لایا پھر میں نے انھیں پلنگ پر لٹا دیا۔

ان کا سانس تیز تیز چل رہا تھا۔ وہ کراہ رہی تھیں۔
میں نے ڈاکٹر کو بلانے کا ارادہ ظاہر کیا تو انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

بس بولیں کہ تھوڑے سے دودھ میں سونٹھ اور گڑ ڈال کر گرم کر کے انھیں دے دوں۔
ان کے کہنے کے مطابق دودھ تیار کر کے میں نے انھیں دے دیا۔
دودھ پی چکیں تو میں نے دیکھا کہ وہ معمول کے مطابق سانس لے رہی ہیں۔
انھوں نے کہا کہ میں ان کے قریب ہی بیٹھا رہوں، وہاں سے نہ اٹھوں۔

بیٹھے بیٹھے میں ان کا سر دبانے لگا۔ وہ سوتے سوتے کراہتی رہیں پھر سو گئیں۔

میں نے سوچا کہ اب ڈاکٹر کو بلایا جا سکتا ہے وہ ایک بار ماں کو دیکھ لے گا تو بہتر ہوگا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ماں کو کیا ہو گیا ہے میں اٹھنے لگا تو ان کی آنکھ کھل گئی۔ میرا ہاتھ پکڑ لیا، پھر بولیں
"کہاں جا رہے ہو بیٹھو۔"
میں نے کہا کہ "ڈاکٹر کو بلا لاتا ہوں، ذرا دیکھ لے گا۔"
بولیں:
"یہاں سے مت ہلنا۔ وقت کم ہے۔ میں تمھیں تمھارے باپ کے حوالے کرنے جا رہی ہوں۔"

"باپ کے حوالے؟"
میں زیر لب بڑبڑایا۔
"یہ کیا کہہ رہی ہو ماں"
"ہاں بیٹا، آج میں تمھیں، تمھارے باپ کے حوالے کر دیتی ہوں۔
برسوں میری سرپرستی میں رہے ہو اب وقت آ گیا ہے کہ میں تمھیں تمھارے باپ کے حوالے کر دوں۔"

میں نے کبھی اپنے باپ کو نہیں دیکھا تھا۔ آج ماں کے منہ سے یہ سن کر حیران ہو رہا تھا۔ ہاں ایک [illegible] تھا، جو بچپن سے میرے وجود کا جز بن گیا تھا۔ ایک کمرہ جس میں ماں کے سوا کوئی اور نہیں جا سکتا تھا۔ اسے وہ ہمیشہ مقفل رکھتیں۔
میں نے ماں سے پوچھا تھا کہ وہ کمرہ بند کیوں رہتا ہے تو وہ جواب دیتیں
"چھوٹا موٹا سامان ہے، ضرورت کے وقت کام آئے گا اس کی حفاظت کے تحت ضروری ہے کہ بند رکھا جائے۔"
"ایسا ہے تو وہ چیزیں مجھے دکھا کیوں نہیں دیتیں؟"
"دیکھ لینا بیٹا آخر جلدی کس بات کی ہے" وہ تمھارے ہی کام آئیں گی اور آج ..

انھوں نے سرہانے کہیں سے ایک چابی نکال کر مجھے دی اور کہا
"بیٹا، میرے سے قفل کھولو، اندر جاؤ، ایک طرف ایک الماری ہے، اس کے قریب ہی ایک کرسی رکھی ہے، اس کرسی پر چڑھ جانا، الماری پر تمھیں ایک صندوق رکھا نظر آئے گا، اسے احتیاط سے نیچے اتار لانا دھیان رہے صندوق بھاری ہے [illegible] اسے میرے پاس لے آؤ۔"
میں نے قفل کھولا، شدید اضطراب کی حالت میں کمرے کے اندر داخل ہوا۔ کمرہ اندر سے تاریک تھا۔ اندر [illegible]

رکھی ہیں کمرہ صاف ہے۔ کیس جالے ہیں۔ کسی ناگوار بو کا بھی احساس نہیں ہو رہا تھا۔ ماں کی ہدایت کے مطابق کرسی پر چڑھ کر میں نے وہ صندوق اتار لیا اور اسے ماں کے کمرے میں لا کر فرش پر رکھ دیا۔ ماں بے صبری سے میرا انتظار کر رہی تھیں۔ انھوں نے مجھے تاکید کی کہ میں دروازے کو پھر سے قفل لگا دوں سو میں نے ویسا ہی کیا۔ ماں نے نجانے کہاں سے ایک اور چابی نکالی بستر سے اٹھ کر صندوق کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔ دھیرے سے انھوں نے قفل کھولا۔ پھر صندوق کو۔ ایک آدمی صندوق میں لیٹا ہوا تھا اس کے چہرے کی کیفیت بتا رہی تھی کہ وہ ابھی ابھی نیند سے جاگا ہے

ماں نے کہا:

"بیٹا یہ تمہارے باپ ہیں آج میں تمہیں ان کے سپرد کرتی ہوں"

میں مجسم حیرت بنا ہوا تھا۔ باپ صندوق میں لیٹا مسکرا رہا تھا۔

"بیٹا! انھیں صندوق سے باہر آنے میں مدد دو۔"

میں نے ہاتھ بڑھایا۔ ہاتھ تھام کر باپ صندوق سے باہر آ گیا۔

"کیا حال ہے تمہارا؟"

اس نے ماں سے پوچھا۔

ماں نے کہا:

"مت پوچھو، بہت بیمار ہوں چند دنوں کی مہمان، تم اسے پہچانتے ہو؟"

وہ مسکرایا:

بیٹا ہے میرا؟ تم ...؟

"ہاں بڑا ہو چکا ہے۔ بہت سنبھالا تمہارے لڑکے کو۔ ہر سرد و گرم سے بچائے رکھا۔ تم بھی تو اپنی ذمے داری نبھاؤ۔ کب تک صندوق میں پڑے رہو گے؟"

باپ نے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بے زاری تھی۔

ماں نے میرا ہاتھ تھام کر باپ کے ہاتھوں میں دینے کی کوشش کی کہ اچانک سانس اکھڑ گئی میرا ہاتھ ان کے ہاتھوں میں رہ گیا۔ باپ نے دھیرے سے ماں کے ہاتھوں سے میرا ہاتھ الگ کیا۔ بجلی کی سی رو میرے جسم میں دوڑ گئی۔ ماں کی آنکھیں کسی نامعلوم خلائی منزل پر جمی ہوئی تھیں باپ نے جھکتے ہوئے انھیں ڈھک دیا۔ مجھے دوسری بار اپنی ذات کے کٹ جانے کا احساس ہوا۔ نہ جانے کب تک، ہم اسی کیفیت میں ماں کے قریب کھڑے رہے۔

باپ کی آواز پر میں چونکا۔ وہ افسردہ لہجے میں کہہ رہا تھا:

"جاؤ! ... اس کے کفن دفن کا سامان کرو۔"

میں نے کہا:

"آپ مجھ سے کہہ رہے ہیں؟ میں کیا جانوں، کہاں جاؤں، کہاں سے کفن لاؤں، اور کس کو بلاؤں۔ کون غسل دے گا، کون تلاوت کرے گا، کون قبرستان پہنچائے گا، کون نماز جنازہ پڑھے گا۔"

مجھے ان ساری باتوں کا کوئی علم نہ تھا۔

باپ نے کہا:

"پڑوسیوں یا محلے والوں کو اطلاع دے دو، وہ سارا کام سنبھال لیں گے۔ ہاں! مجھے نہ الجھانا ان معاملوں میں۔ مت بتانا کہ میں بھی موجود ہوں۔ یوں بھی چند منٹوں میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

"تو کیا میں اکیلا رہ جاؤں گا؟"

اپنے تنہا ہو جانے کے احساس نے مجھے متوحش کر دیا

وہ میرے قریب آیا اور بولا:

"صبر رکھو۔ یوں بھی تمہارا اور میرا تعلق سدا سے برائے نام رہا ہے تمہاری ماں کے کہنے پر میں آیا کہ تمہیں متعارف کرا دیا۔ ورنہ میں اسی صندوق میں سوتا رہتا تمہیں بالکل خبر نہ ہوتی کہ میں موجود ہوں۔"

ایک پتنگا نہ جانے کہاں سے چلا آیا اور جس مسہری پر ماں پڑی تھیں اس کے گرد چکر کاٹنے لگا۔

جب میں پڑوسیوں کو ماں کے انتقال کی خبر دے کر لوٹا۔ تو میں نے دیکھا کہ میرا باپ وہ صندوق ہاتھوں میں لیے جانے کے لیے تیار کھڑا ہے۔

میں اس کے سینے سے لپٹ کر رونے لگا۔ اس کا بھی دل بھر آیا۔ اس نے مجھے اٹھا کر گلے لگایا ماتھے پر بوسہ دیا۔ دعائیں دیں اور گھر سے چلا گیا۔

یہ پندرہ بیس برس ادھر کی بات ہے۔

ایسا دور میں بندرگاہ کے علاقے میں، ایک ویران سے کیفے میں شام کے اخبار کا معمہ حل کر رہا تھا۔ میں نے تمام افقی خانے مکمل کر لیے تھے اور عمودی بھی لیکن ایک عمودی خانہ مکمل نہیں ہو پا رہا تھا ذہن پر مسلسل زور ڈالنے اور ہر کوشش کے باوجود مجھے وہ حرف نہ سوجھا کہ معمہ مکمل ہو جاتا لہٰذا میں نے مناسب سمجھا کہ کیفے سے باہر چلا جاؤں اور بندرگاہ کی سیر کی جائے ممکن ہے کہ سمندر کے کنارے ٹہلتے ہوئے وہ حرف سوجھ جائے کافی کا بل ادا کر کے میں باہر آ گیا اور سنسان راستے

میں نے کہا کہ ہاں۔ لیکن تمہیں کیسے معلوم؟

انھوں نے کہا کہ جس شخص کو یہ جانتے ہیں اور جس کی شکل مجھ سے ملتی جلتی ہے وہ بھی اکیلا ہی ہے۔

میں نے کہا کہ محض صورت شکل میں مشابہ ہونے کی بنا پر اس شخص کا مجھ سے ناطہ قائم کرنا مناسب نہیں۔

انھوں نے کہا کہ مجھے یہ بتاؤ کہ تمہارا کیا نام ہے۔

میں نے نام بتایا۔ انھوں نے میرا لقب پوچھا میں نے وہ بھی بتا دیا

اس پر وہ پھڑک گئے۔ انھوں نے کہا کہ جس شخص کو وہ جانتے ہیں اس کا لقب بھی یہی ہے اب مجھے بھی ہنسی آ گئی۔ تبھی میں دل جیسی پیدا ہوئی سمندر کی طرف سے جب مرغابیاں اڑتی ہوئی ہماری طرف آ رہی تھیں، یہ دیکھ کر دل عجیب سا ہو گیا تھا۔

میں نے کہا کہ وہ آدمی کیا کرتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ وہ نوادرات کا تاجر ہے۔

ان کے شہر میں اس کی دکان ہے۔ میں نے کہا کہ وہ جو کوئی بھی ہو اسے میرا سلام کہیے اور اس ملاقات کا ذکر کریں۔

وہ کچھ دیر خاموش رہا، پھر کہنے لگا کہ یہ ممکن نہ ہو گا

میں نے وجہ معلوم کی تو اس نے بتایا کہ اس کی شخصیت کا ایک عجیب و غریب رخ ان کے سامنے آیا ہے جس کے باعث انھوں نے تہیہ کر لیا ہے کہ وہ اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھیں گے۔ میں نے وجہ معلوم کی تو اس نے بتایا کہ سفر پر روانہ ہونے سے پہلے وہ اس کے پاس گئے تھے کہ معلوم کریں کہ اسے کسی خاص ملک سے کسی چیز کی ضرورت ہو تو وہ اسے لیتے آئیں۔ اس کی دکان بند تھی۔ جب لاکھ کھٹکھٹانے پر دروازہ نہ کھلا تو انھوں نے پڑوسیوں سے پوچھ گچھ کی۔ انھوں نے بتایا کہ دکان عرصے سے بند ہے اور اس کا مالک بھی نظر نہیں آتا۔

انھوں نے اس حلقے کے سرکاری لوگوں کی مدد سے دکان کا اندرونی تالا کھلوایا۔ اندر داخل ہوئے۔ دکان کے پچھلے حصے میں اس کی رہائش تھی۔ جہاں ایک مسہری کے ساتھ ساتھ ضرورت کا سارا سامان موجود تھا جب انھوں نے ان سرکاری لوگوں کی اجازت سے چیزوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا وہ مسہری سمجھ رہے تھے، اصل میں ایک صندوق تھا۔ انھوں نے صندوق پر بچھی ہوئی چادر اور اس کے نیچے بچھا ہوا کھیس ہٹایا تو انھوں نے دیکھا کہ صندوق بند ہے۔ اسے کھولا تو صندوق کے اندر انھوں نے اس شخص کو سوتا ہوا پایا۔

یہ سن کر میں ہنسنے لگا۔ بڑی دیر تک ہنستا رہا۔ لیکن ان کے چہرے کے تاثرات سے مجھے اندازہ ہوا کہ انھیں میرا ہنسنا ناگوار گزرا ہے۔ انھوں نے ہنسنے کی وجہ پوچھی تو میں نے بتایا۔

"اس کے سونے کا یہی انداز ہے"

"کیا مطلب؟" انھوں نے خفگی سے پوچھا

"مطلب یہ کہ وہ صندوق ہی میں سوتا ہے"

"وہ بھی؟"

"وہی، جس کا ذکر ہو رہا ہے"

انھوں نے حیرت سے پوچھا

"کیا تم اسے جانتے ہو؟"

"کیا کوئی اپنے آپ کو نہیں جانتا؟"

"[illegible] ہو تم"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں میرے سائے کے سونے کا یہی انداز ہے

"وہ ہمیشہ صندوق میں سوتا ہے۔"

"یہ کہہ کر میں آگے بڑھ گیا۔ اسٹریٹ لیمپوں کی روشنی میں وہ راستہ اب مجھے زیادہ روشن نظر آ رہا تھا۔ ایک لیمپ کے نیچے رک کر، میں نے صفحے کے اس چھوڑے ہوئے خانے میں ایک حرف لکھ دیا۔

بقیہ صفحہ ۲۴ — آپ سوچ

میں دم ہے۔ مورچہ خود سنبھال لے گی — اس سوچ کا نام نظریاتی تو آپ نے خوب رکھا ہے — اس کے منہ میں ایک نعرۂ بلند آہنگ بھی رکھ دو تو اس کی ہیبت ناک چنگھاڑ سے ارسطو صاحبان کی فلک کے دل دہل جائیں گے — ان کے کانوں کے پردے روئی کے گالوں کی طرح ہوا میں اڑتے نظر آئیں گے —

"نعرہ — ؟ وہ کیا — ؟" مسٹر فاعلن نے حیرت سے پوچھا۔

"انقلاب! زندہ باد" علامہ اڑن دستہ نے کہا — اور چلتے بنے۔

اپنا زرِ سالانہ وقت پر ارسال کیجیے

شاعر کی توسیع اشاعت میں تعاون دیجیے

رؤف خیر

صبحِ کاذب

یہ سچ ہے جھوٹی حکایتیں من گھڑت لطیفے سنا سنا کے یہ کہا تھا
کہ لومڑی باز کی بہن ہے
جو شاخِ زیتون شوق سے نوش کر رہی ہے
تمام نابستہ شیر سرکس کے اپنے پنجروں میں جا چکے ہیں
جناب دجّال ایک مہدی کے روپ میں
گاہ مشرق میں گاہ مغرب میں جلوہ فرما ہیں
اوس و خزرج میں پھر لڑائی ٹھنی ہوئی ہے
فرات گنگا میں مل رہا ہے
نشان ہر شہر ہے فلسطین بے نشاں کا
گماں کیا کیا ہے بدگماں کا۔

پھر اس روایت کے بعد راوی نے یہ بھی چپکے سے کہہ دیا تھا
کہ ذکر اس کا کہیں نہ کرنا
یہ جھوٹ ہے سب یقیں نہ کرنا
اور اس قدر زور کا قہقہہ پڑا تھا
جو دیدۂ تر میں آ گئے آ کے ٹوٹا
یہ سچ ہے۔

۱۹/ ۲-۲-۱۰-۹ بیت الخیر رسالہ بازار گولکنڈہ، حیدرآباد - ۸

مشتاق سنگھ

مہلت

ہتھیلیوں میں فولادی کیلوں کی چمک
پاؤں میں زنجیرِ آہن
زباں پہ دہکتے انگاروں کی دمک
نفس نفس تار تار
مہربانو! کچھ کرنے کی جرأت تو دو!
حکمرانو! جرم کرنے کی مہلت تو دو!!

تاریخ شاہد ہے
سزا کے وقت ہم لاشوں میں ڈھل جاتے ہیں
اپنے مشاغل کے صلے میں
رونقِ مقتل میں بدل جاتے ہیں
زیرِ لب مسکراہٹیں لئے
ہم طرفِ زنداں نکل جاتے ہیں
راہوں میں پھنکارتے ہوئے
ہم کچھ نہ کچھ سانپوں کے سر کچل جاتے ہیں

اسپِ وقت کی رفتار پکڑنے والو!
جرم کی مہلت تو دو
ہاں سزا کے وقت تم بھی کوئی کمی نہ کرنا!
ہاں کمی نہ کرنا!!

13 - GREENFORD AVENUE
SOUT HALL MIDDLESEX
UBI 2AA (U K)

جیتندر بلو

ریپ

سنا ہے
میری زمیں، میری قبر پہ
چالیس منزلہ عمارت کھڑی کر رہے ہو
مگر یاد رکھنا
میں زمیں دوز موجود ہوں
کسی روز بھوت بن کر اٹھوں گا
ہر منزل، ہر فلیٹ میں بھٹکوں گا
تمہارے گلے میں کھوپڑیوں کی مالا ڈال
ساتھ تمہارے رقص کروں گا
تم چیخو گے، چلاؤ گے
ہاہاکار مچاؤ گے
پر میں ہنستا کھیلتا
تمہاری انگلی تھام کر
قبر میں لوٹ جاؤں گا۔

1. ALFRED ROAD
ACTON, LONDON
W3 - 6LN ENGLAND

شمیم احمد

ای-۴/۲۳۹، ایرا کالونی، بھوپال-۴۶۲۰۱۶

اپنے آپ کو سخن گرِ اعظم کہنے والے مرزا فاضل تمہ ڈھالنے کے لیے تلاش مضامین میں شہر کے گلی کوچوں کی خاک چھانتے چھانتے کسی گلی میں جا گھسے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ دو بڑی بی خواتین کے درمیان جنگِ عظیم چھڑی ہوئی ہے۔ ایک دوسرے کو کوسنے کاٹنے اور جھنجھوڑ کرنے کے لیے دونوں خواتین پوری طرح مسلح بند تھیں۔ دونوں کے ایک ہاتھ میں تو مدّ ہوتی تھی۔ دوسرے میں پانی سے بھرا گلاس — اور منہ پر حریف کے خلاف کا شکوہ۔ ایک مرتبہ ان کے پیر و مرشد علامہ ارات دستہ نے فرمایا تھا کہ جب دو یا دو سے زائد شریف خواتین باہم دگر لڑنے کے انتہائی ضروری اور مہذب کام میں پوری دلچسپی اور شغف کے ساتھ مصروف ہوتی ہیں تو ان کے ایک ہاتھ میں جھاڑو اور دوسرے میں پانی کا گلاس ہوا کرتا ہے۔ اس کے پیچھے فلسفہ یہ ہوتا ہے کہ جنگِ عظیم میں اگر بھی ہتھیار بوٹھے پڑتے نظر آئیں اور جنگ کا فیصلہ باقی ہو تو جھاڑو کا استعمال ضروری ہو جاتا ہے — اگر لڑائی زبانی بھی رہنا ہی سے فیصلہ کن موڑ پر پہنچی محسوس ہوتی ہو۔ تو ان ہتھیاروں کو مزید کٹیلا اور آب دار بنانے کے لئے ایک گلاس پانی درکار ہوتا ہے تاکہ پینترہ بدلتے وقت ایک گھونٹ پانی پی کر جنگ کی حکمتِ عملی کو موثر اور ہتھیارِ دہن کو تیز کر لیا جائے۔ جنگ کے اس باقاعدہ اعلان شدہ مقابلے کو خواتین کی حسّی اصطلاحات میں کوسنا کہا جاتا ہے۔ ملک کا بچہ بچہ واقف ہے کہ جنگ کے اس طریقے کی کامیابی کے لیے گھونٹ گھونٹ پانی پینا کس قدر ضروری ہے۔ پانی پی پی کر کوسنا جنگ کا ایک موثر ہتھیار ہی نہیں۔ مہذب اسلوب بھی ہے۔

مرزا فاضل خواتین کے اس اسلوبِ جنگ سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انھوں نے فوراً یہ بات دل میں ٹھان لی کہ اب وہ بھی، کوس تو سکتے نہیں کیوں کہ وہ خاتون نہیں ہیں۔ پانی پی پی کر سوچا کریں گے۔ بہتر اور نتیجہ خیز سوچ کے لئے ایک گھونٹ پانی تریاق ثابت ہو سکتا ہے۔ چنانچہ موصوف نے سخن گری کی تلاش کا بستر لپیٹا اور ناک کی سیدھ اُڑ کر اپنے گھر آئے۔

ایک صراحی میں ٹھنڈا ٹھنڈا شفاف پانی بھر کر رکھا۔ کانچ کا ایک اُجلا اُجلا گلاس اس کے پاس دھرا۔ آلتی پالتی مار کر صراحی اور گلاس کے سامنے آنکھیں بند کر کے بیٹھ گئے — کچھ سوچنے کے لیے۔ مگر سوچنے کا کوئی موضوع ہاتھ نہ آیا۔ فوراً دیدے پھاڑے تو ذہن کے کسی گوشے میں سوچ کی دیوی نے سرگوشی کی۔ میاں پانی تو پیا نہیں اور بیٹھ گئے سوچنے — پانی پیو اور سوچو۔ مرزا فاضل نے جھٹ صراحی سے بہ صدائے قل قل ایک گلاس پانی لیا۔ غٹاغٹ پورا گلاس حلق سے نیچے اتارا۔ دوسرا گلاس بھر کر سامنے رکھا، پھر سے آنکھیں بند کیں — کیا سوچیں؟ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا — پانی نے اثر دکھایا — ایک دم خیال آیا — سوچ تو خود ایک دلچسپ موضوع ہے جس کے مختلف پہلوؤں پر گھنٹوں سوچا جا سکتا ہے۔ مگر کسی مفکر نے آج تک اس بات پر سوچا ہی نہیں کہ خود سوچ کیا ہے، اور اس کے مبادیات کیا ہیں؟ واہی تباہی موضوعات پر سوچ سوچ کر فلسفے چھانٹے ہیں۔

مرزا فاضل نے ایک گھونٹ پانی اور پیا اور سوچا۔ سوچ کے بارے میں سوچا تو بڑے عمدہ نتیجے نکلے ہیں۔ ہمارا نام و تخلص فاضل جس کے کوئی معنی نہیں — کوئی پوچھے کہ غالب کون ہے تو ہم کیا بتلائیں گے کہ فاضل کون ہے — اس بے معنی نام و تخلص نے ہمیں اور ہماری سخن گری کو نئے معنی عطا کئے بلکہ ہماری شخصیت کو اونچا بھی کیا — گویا کہ بے معنویت ہی معنی کا سرچشمہ ہے۔ بے معنویت ہی سے معنی کی کلی پھوٹتی ہے اور یہی پھول بن کر خوشبو اڑاتی ہے — تو دو اور دو چار کی طرح نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ زمانۂ قدیم میں کہا گیا مگر آج کی زندگی کی قدروں کے مطابق بے علمی ہی علم کی اصل کسوٹی ہے جو جتنا بے علم اور جاہلِ مطلق ہے وہ اتنا ہی باعلم اور عالم فاضل سمجھا جاتا ہے۔ اس کی مثالیں ہر جگہ موجود ہیں — ہم ہیں۔ استاد علامہ ارات دستہ ہیں۔ سیاسی لیڈر اور وزیر ہیں — چشمِ بد دور کوئی کمی تو ہے نہیں۔ اشراف حضرات اور پروفیسر صاحبان بھی، اس فہرست میں درجہ بند ہونے کے خواہش

ہند نظر آتے ہیں۔

سوچ پری نے مسٹر فاعلن کے کسی ذہنی گوشے سے اپنا سلام پڑھوا کر کہا: حضور! آپ کی سوچ بھٹک رہی ہے۔ آپ کو اس نشست میں زیادہ اتنا سوچنا ہے کہ میں ۔ یعنی! خود سوچ لیا ہے؟ آنکھیں کھولیے اور ایک گھونٹ پانی پیجئے۔

مسٹر فاعلن نے آنکھیں کھولیں۔ ایک گھونٹ پانی پیا۔ پھر آنکھیں بند کیں اور سوچنا شروع کیا۔ سوچنے کا عمل جب بہت گہرا ہو جاتا ہے تو وہ فلسفہ بن جاتا ہے۔ اسی لئے گہری اور بے انت سوچ والے شخص کو لوگ فلسفی کہتے ہیں۔ اس کی اس سوچ کو فلسفیانہ فکر بھی کہا جاتا ہے اور وہ خود مفکر بھی کہلا سکتا ہے۔ افلاطون، ارسطو، برگساں، مارکس، فرائڈ سبھی فلسفی یا فلسفیانہ مفکر تھے۔ مگر سوال یہ ہے کہ سوچنے کا کام کیا صرف فلسفی ہی کرتے ہیں۔ ہم جیسے آدمی بھی تو سوچتا ہے۔ عام آدمی کی سوچ بھی تو لا محدود ہے۔ مارکس وغیرہ کے فکری نتائج کو اس نے فلسفہ یا فلسفیانہ فکر کا نام دیا [illegible] صفحات پلٹ کرنے کے باوجود عام آدمی اس تک نہیں پہنچ پاتے۔ عام آدمی کی سوچ سے بالاتر فکر ہی کا نام فلسفہ ہے۔ مگر عام آدمی کی فکر وہ ہوتی ہے جسے قاری جلد ہی سمجھ لیتے ہیں اور اپنے ہی دل کی طرف اسے کھینچا ہوا بھی پاتے ہیں۔ عام آدمی کی زندگی سے قریب تر سمجھ میں آنے والی سوچ کا بھی تو کوئی معنی اور سچا نام ہونا چاہیئے۔ مسٹر فاعلن نے سوچا۔ ان کی سوچ صحیح ترکیب پر چل رہی ہے۔ اب صرف اصطلاح کا سوچنا باقی ہے۔ جس کے لئے ایک گھونٹ پانی پینے کا یہ مناسب ترین موقع ہے۔ چنانچہ انھوں نے آنکھیں کھولیں۔ ایک اور گھونٹ پانی پیا اور پھر سے آنکھیں بند کر کے سوچنا شروع کیا۔

مسٹر فاعلن نے سوچا عام آدمی کی سوچ کے نتائج کو "افکار" کہنا چاہیئے۔ مگر پھر خیال آیا کہ مفکران فلسفہ کی سوچ کے گودام کو بھی "افکار" کہا جاتا ہے۔ بھوپال کے ایک بزرگ اردو ہندی اخبار اور [illegible] کراچی والے رسالے کا نام بھی افکار ہے۔ افکار سن کر کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکے گا کہ یہ تھوتھو خان صاحب اور مسٹر فاعلن کی سوچ کا اصطلاحی اور یونی ورسٹی میں پڑھایا جانے والا مضمون ہے۔ ایسے سستے ہی لوگ کسی فلسفی کے سمجھ میں نہ آنے والے "افکار" یا بھوپال اور کراچی کے اخبار رسالے کا نام سمجھ بیٹھیں گے۔ لہٰذا یہ نام تو مناسب نہیں ہے۔

فکرِ بسیار کے بعد آخر فاعلن کامیاب ہوئے اور انھوں نے عام آدمی کی تھوتھو خان اور فاعلن سوچ کے نتائج کا نام رکھا ــــ "فکریات"۔ اس نام کے سلسلے میں بھی انھیں ایک خدشہ ضرور تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو مسٹر فکر تونسوی کے کسی مجموعہ مضامین کا نام "فکریات" ہے۔ مگر اس کا حل انھوں نے یہ ڈھونڈ نکالا کہ اگر خدا نخواستہ ایسا ہوا بھی تو وہ مجموعے کے ناشر کو عدالتی نوٹس بھجوا دیں گے اور کہیں گے کہ اس نام کے جملہ حقوق پبلک انٹرسٹ میں تھوتھو خان صاحب اور مسٹر فاعلن کے نام پر محفوظ کر دیئے گئے ہیں۔ اس لئے وہ آئندہ اشاعتوں میں مسٹر فکر تونسوی کے مجموعے کا نام "تونسویات" یا کچھ اور رکھ دیں۔

پبلک انٹرسٹ میں دیا گیا یہ عدالتی نوٹس فوراً اثر دکھائے گا کیونکہ گورنمنٹ ہر قدم اور ہر عمل پبلک انٹرسٹ ہی میں اٹھاتی ہے۔ [illegible] انھوں نے وزیر اعظم کو ایک کروڑ روپئے کی رشوت پبلک انٹرسٹ میں دی تھی۔ پبلک انٹرسٹ ہی میں [illegible] اس الزام کی پرزور تردید کی ہے۔ پبلک انٹرسٹ ہی میں اخبار والوں نے اس سنسنی خیز خبر کو نمایاں طور پر چھاپا ہے۔ [illegible] گھوٹالوں کی تفصیلیں [illegible] پبلک انٹرسٹ ہی میں کی جاتی ہے۔ پبلک انٹرسٹ جو دراصل وہ چڑیا ہے گورنمنٹ اور پبلک دونوں کے سروں پر پھدکتی رہتی ہے۔ جس کے لئے یہ شعر مناسب ہو سکتا ہے۔ اس شعر کو وہ اثر ہوا کہ جو عرصہ دراز پیشتر مولانا [illegible] خان کا ہوا تھا اور جس کا ماتم حضرت اسد اللہ خان نے یوں کیا تھا ۔۔ ؎

دھمکی میں مر گیا، جو نہ باب نبرد تھا
عشق نبرد پیشہ، طلب گارِ مرد تھا

اس خدشے سے ہر طرح نبرد آزما اور مطمئن ہو چکنے کے بعد مسٹر فاعلن نے سوچا کیوں نہ اب اپنے اس ایجاد کردہ مضمون "فکریات" کو یونی ورسٹیوں میں بھیج دیں تاکہ وہ [illegible] پر مشتمل اس نئے مضمون کو اپنے تعلیمی نصاب میں داخل کریں اور طلبہ کو سمجھنے کا موقع عنایت کریں کہ فلسفیوں کے گودام بائے افکار زندگی سے محض نظریاتی پہلوؤں کو پیش کرتے ہیں جبکہ تھوتھو خان اور فاعلن فکریات انھیں زندگی کے عملی رموز و نکات کا درس دیں گی۔

مسٹر فاعلن نے آنکھوں کو ذرا سا کھول کر پانی کا ایک گھونٹ پی کر جھٹ سے پھر کس کر بند کر لیا کہ ان کی فکر کا سلسلہ نہ ٹوٹے۔ مسٹر فاعلن نے سوچا یہ مضمون تازہ یونی ورسٹیوں کے حوالے کرنے سے قبل یہ بھی طے ہونا ضروری ہے کہ اسے درسیات کی کس فیکلٹی سے منسوب کیا جائے

کیونکہ آج کل یونیورسٹیوں میں مختلف النوع فیکلٹیاں گاجر مولی کی طرح اُگ آئی ہیں۔ اللہ رکھے جس زمانے میں ہم یونیورسٹی کی پڑھائی کے مارے پر کالک پوتا کرتے تھے تب انگوٹھے کو چھوڑ کر ہاتھ کی بہ قدر چہار انگشت ہی فیکلٹیاں ہوا کرتی تھیں۔

سود خوار بنیوں بقالوں کی تعلیم کے لئے ایک فیکلٹی ہوا کرتی تھی۔ تجارت کی جسے علمی وقعت دینے کے لئے کامرس فیکلٹی کہا جاتا تھا۔ جمع خرچ کی کھتونیاں اس کے مضامین ہوا کرتے تھے۔ جھوٹ کے ہمہ جہتی فروغ کے لئے ایک قانون کا شعبہ ہوتا تھا جسے لا فیکلٹی کہا جاتا تھا عقلاء کے لئے سائنس فیکلٹی اور چھٹے ہوئے بے عملوں کے لئے آرٹس فیکلٹی ہوا کرتی تھی اللہ اللہ خیر صلا۔ سائنس میں فزکس، کیمسٹری، جیالوجی، اور لائف سائنسوں کے مضامین باٹنی، زوالوجی ہوتے تھے۔ ان سے جو بچتا تھا مثلاً جغرافیہ، تاریخ، سیاسیات، سماجیات، اقتصادیات، فلسفہ نفسیات، بشریات، زبان و ادب، اصل فنون مثلاً ڈرائنگ پینٹنگ اُن سب کو ریلوے کے دوسرے درجے کی طرح آرٹس فیکلٹی میں ٹھونس دیا جاتا تھا۔

کالج کی زندگی نے جب مسٹر فاعلن کو طلاق دی، تو اُن پر ایک دن یہ راز منکشف ہوا کہ تقسیم ہند کی طرح آرٹس فیکلٹی کا بھی بٹوارہ ہو گیا ہے بٹوارہ ہی نہیں بلکہ اس کا وجود ہی ختم ہو گیا ہے۔ زبان و ادب اور خالص فنون لطیفہ پر مشتمل فیکلٹی کا نام ہیومینیٹیز ہو گیا ہے۔ باقی ماندہ سبھی مضامین نے اپنی علیحدہ مملکت بنا کر اس کا نام سوشل سائنسز فیکلٹی کر لیا ہے۔ اور اس طرح اس نئی فیکلٹی نے خالص سائنسوں سے قریبی رشتہ قائم کرتے انسانی قدروں اور اصول ہائے فنون سے ناطہ توڑ لیا ہے۔ چنانچہ اب انسان سے تعلق خاطر رکھنے کا اعزاز صرف زبان و ادب اور فنون لطیفہ ہی کو حاصل ہے۔ خالص سائنسوں اور سوشل سائنسوں کا انسان سے اب کوئی تعلق باقی نہیں رہا ہے۔ ابھی یہ مسئلہ غور طلب ہے کہ انسان نے انھیں اپنی عملداری سے خارج کیا ہے۔ یا انھوں ہی نے میاں انسان اور ان کی بوسیدہ انسانیت کو دھتا بتایا ہے۔ اس نازک مسئلے پر مسٹر فاعلن سوچنے کا کوئی اختیار نہیں رکھتے، اس کے لئے کسی افلاطون ثانی کو پھر جنم لینا پڑے گا۔

اس وقت تو مسٹر فاعلن کی سوچ کا مرکزی مضمون ہے، جسے انھوں نے ایجاد کیا ہے۔ اور اس کا نام فکریات رکھا ہے۔ مسٹر فاعلن اسے کسی درسیاتی فیکلٹی سے منسلک کرنا چاہتے ہیں۔ اب تک اس کا حل تلاش نہیں کر سکے ہیں۔ یہ بات تو ان کو سمجھ میں آ چکی ہے، کہ مضمون فکریات کا تعلق نہ خالص سائنسز سے استوار کیا جا سکتا ہے۔ نہ کامرس سے اور نہ قانون سے۔ کھینچا تانی صرف ہیومینیٹیز اور سوشل سائنسز کے مابین ہے۔ مسٹر فاعلن نے بہت دیر سے پانی کا گھونٹ نہیں لیا تھا، اس لئے انھوں نے سوچا کہ مسئلے کا حل اسی لئے نہیں نکل رہا ہے۔ چنانچہ جھٹ سے انھوں نے آنکھیں کھولیں، اور ایک کی جگہ دو گھونٹ پانی پیا۔ اور آنکھیں بند کر کے سوچنے کا سلسلہ پھر جاری کیا۔

حضرات! مسٹر فاعلن کی قوتِ فکر منجدھار میں پھنسی ڈول رہی ہے اُسے کنارا نہیں مل رہا ہے۔ یہ وہ نازک وقت ہوا کرتا ہے کہ جب علامہ اُرک دستہ مسٹر فاعلن کے الجھے ہوئے معاملات چٹکی بجاتے حل کر دیا کرتے ہیں۔ علامہ صاحب نازل ہو گئے ہیں۔ مسئلے کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد علامہ نے مشورہ دیا۔

"میاں! تمہاری آپ سوچ کے مطابق ارسطو وغیرہ کی سوچ اتنے اونچے درجے کی ہے کہ وہ فلسفہ بن گئی ہے ـــ تھمو خان صاحب اور آپ کی سمجھ میں نہیں آتی ـــ اسی لئے وہ کتابوں میں بند ہو گئی ہے۔ اور آپ نے اپنی سوچ سے جو مضمون تازہ ایجاد کیا ہے۔ وہ آپ کی اور تھمو خان صاحب کی طرح ہر عام آدمی کی سمجھ میں آ سکتا ہے۔ مطلب یہ کہ آپ کی یہ چیز ارسطو صاحبان کی فکر کے بالکل برعکس، بلکہ متضاد ہے۔ اس لئے اُسے اُس شعبے سے منسلک کیجئے جہاں ارسطو صاحبان موجود نہ ہوں"

مسٹر فاعلن نے استاذ محترم کے مشورے پر غور کرنے کے بعد کہا۔

"استاد! بات یہ ہے کہ بعض یونیورسٹیز میں، جہاں سوشل سائنسز کی علاحدہ فیکلٹی نہیں ہے، وہاں سوشل سائنسز کے مضامین بھی ہیومینیٹیز کی فیکلٹی میں گھسے ہوئے ہیں۔ ایسی صورت میں ہمارا یہ مضمون تازہ ارسطو صاحبان کی فکر و فلسفہ کی صف میں آ جائے گا اور یہ خواص اس بیچارے عوام الناس کی سوچ کا گلا دبا دیں گے۔ آپ تو جانتے ہیں کہ پلسپلی بے چارے عام انسان ہی کے حصے میں آتی ہے۔"

"میاں! یہ کوئی گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ تمہارا مضمون تو بقول تمہارے عمل کا لنگوٹ کسے ہوئے ہے ـــ اسے میدانِ عمل میں دیکھ کر ارسطو صاحبان کی کتابی فکر اپنی دُم اپنے خول میں سمیٹ کر چپکی سادھے بیٹھ جائے گی۔
میاں! بسم اللہ کرو اسے ہیومینیٹیز کی فیکلٹی میں ڈالو۔ جن یونیورسٹیوں میں سوشل سائنسوں کی علاحدہ فیکلٹی ہے، وہاں تو ٹکراؤ کا سوال ہی نہیں ہوگا۔ جہاں نہیں ہے، وہاں، اگر آپ کی اور تھمو خان صاحب کی سوچ

[باقی صفحہ ۲۰ پر دیکھئے]

کاوش پرتاب گڑھی

کتھا گھاٹ سے چل پڑی، چکنی چپڑی بات
اجلی چادر اوڑھ کے، اب آئے گی رات

تیز ہوا سے شہر میں پھیلا کیسا روگ
اک دوجے کو روندتے دوڑ رہے ہیں لوگ

کہاں کہاں گھومے نہیں، بدل بدل کر بھیس
ہم نے اپنے آپ کو ڈھونڈا، دیس بدیس

شاعر بھوکا مر گیا، گھر تک رنج و شور
متشاعر کی موت پر ماتم چاروں اور

کاوش! گھر والے ہیں خوش تو کیوں رہے اداس
جگ میں سدا سپوت کو ملتا ہے بن باس

● بی ڈی ۔ ۱۹۰، بلجیت نگر، نئی دہلی ۔ ۱۱۰۰۰۸

احمد سعدی

اسے جو دیکھا تو وہ معتبر لگا مجھکو
وہ اجنبی تھا شناسا مگر لگا مجھکو

بلند سب سے فضا میں اس کی تھی پرواز
وہ اک پرندہ جو بے بال و پر لگا مجھکو

تمام لوگوں میں چرچے اسی کے ہوتے تھے
ہمہ صفت تھا مگر بے ہنر لگا مجھکو

ہمیشہ لب پہ تبسم لئے جو پھرتا تھا
غم حیات کا وہ وہ بحر و بر لگا مجھکو

زمانے بھر کے وہ احوال جانتا تھا مگر
خود اپنے حال سے بھی بے خبر لگا مجھکو

مسافروں میں بہت گرچہ اس کی شہرت تھی
گھنا شجر تھا مگر بے ثمر لگا مجھکو

قلم ہوا ہے جو مقتل میں بے خطا سعدی
کسی کا سر ہو وہ اپنا ہی سر لگا مجھکو

● نیوما بوپورہ، پوسٹ آفس سیدپور نلپھاماری (بنگلہ دیش)

محمد مختار علی

◆

کب تمنا وصال کی ۔ کی ہے
بندگی بس خیال کی ۔ کی ہے

ہار قسمت میں اس کی تھی لیکن
جنگ اس نے کمال کی ۔ کی ہے

لوگ کیوں مشتعل ہوئے تم نے
بات ہی اشتعال کی ۔ کی ہے

دست قدرت نے کس طرح تنظیم
گردش ماہ و سال کی ۔ کی ہے

میری چاہت بھی بے بدل تھی مگر
اس نے نفرت کمال کی ۔ کی ہے

ہم نے کی ہے خلوص کی پوجا!
اس نے مال و منال کی ۔ کی ہے

● مدیر ہفت روزہ کلیم حسن پروا، روڈ

حیدر قریشی
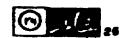
SUDREMOT 75, 65795 HATTERSHEIM
GERMANY

شناخت

"پاکستان کا مطلب کیا ۔ لا الہ الا اللہ "

"پاکستان ۔ پلیدستان"

" لے کے رہیں گے پاکستان "

" ست سری اکال ... "

" حیّ علی الصلوٰۃ ...."

" بانگ نئیں دیں دماں گے، ساڈیاں رتاں گیاں جاندیاں نئیں"

" مسجد شہید گنج ...."

گورو گوبند سنگھ جی دے بچے ...."

" ہندو مسلم بھائی بھائی

" جئے ہند ۔ جئے ہند "

ایک زوردار دھماکہ ہوا ۔ زندگی کانپنے لگی ۔ پاکستان آزاد ہوگیا ۔ اس کے ذہن میں سارے منظر ۔ ساری تاریخ اتھل پتھل ہوکر رہ گئی ۔ کوئی منظر ٹھیک طرح سے آنکھوں میں نہیں سما رہا ۔ تاریخ کا کوئی حصہ ڈھنگ سے ذہن میں نہیں آرہا ۔ چاروں طرف آگ اور خون کا منظر تھا ۔ ان کے قافلے پر حملہ کردیا گیا تھا ۔ بچے بوڑھے، جوان عورتیں سب گاجر مولی کی طرح کٹ رہے تھے ۔

اس کی آنکھوں میں گہرا اندھیرا اتر آیا تھا مگر اچانک اس اندھیرے میں ہلکی سی روشنی کی لکیر ابھری ۔ قریبی کھیتوں میں اس روشنی کی لکیر کے سہارے وہ چھپتے چھپاتے ساتھ والے گاؤں جا نکلی تھی مگر وہاں پہنچ کر اس کی آنکھوں میں اترا ہوا اندھیرا اور گہرا ہوگیا تھا اور روشنی کی اس ہلکی لکیر نے بھی اس اندھیرے میں دم توڑ دیا تھا ۔

" کون ہو تم ؟ .."

" جی ۔ مم ۔ میں رشیدہ ہوں "

" ہا ہا ہا .. ہا ہا ہا ... "

" مجھے میری ماں کے پاس پہنچا دیں ۔ خدا کیلئے مجھے میرے پاکستان بھجوا دیں "

" سنو تم اب رشیدہ نہیں پرکاش کور ہو "

جانے اس میں یکایک کہاں سے اتنی قوت آگئی ۔ اس نے نہایت جرأت کے ساتھ کہا :

" میں مسلمان ہوں اور میرا نام رشیدہ ہے، رشیدہ ! "

تب سکھ لیڈر کے اشارے پر سات سکھوں نے اسے دبوچ لیا اور اسے بازوؤں، ٹانگوں اور بالوں سے پکڑ کر کسی انجانی سمت لے جانے لگے ـــــ رستے میں سکھ لیڈر نے طنزاً کہا :

" اب بتاؤ پاکستان کا مطلب کیا ہے ؟ "

" لا الہ الا اللہ ... " انہوں نے اس کے منہ پر سختی سے ہاتھ رکھ دیا مگر پھر بھی اس نے پورا کلمہ پڑھ دیا ... محمد الرسول اللہ ۔

وہ اسے ایک خالی مکان میں لے گئے اور وہاں جاکر ایک کمرے میں زور سے پٹخ دیا "

لیڈر سکھ نے باقی سکھوں کو باہر جانے کا اشارہ کیا اور خود اس پر تھپڑوں کی بارش شروع کردی ۔ تشدد کے باوجود اسے اصرار تھا کہ وہ رشیدہ ہے اور اسے اس کی ماں کے پاس یا پاکستان پہنچایا جائے ۔ تب لیڈر سکھ نے نہ صرف اس کی آبروریزی کی بلکہ اس عمل کے دوران اسے باور کراتا رہا کہ وہ اب رشیدہ نہیں پرکاش کور ہے کیونکہ وہ اب مسلمان نہیں سکھ ہے ۔ تکلیف اور اذیت کے عالم میں " لے کے رہیں گے پاکستان " " جئے ہند " اور " ست سری اکال " کے سارے نعرے بھی اسے " دیپا " کرتے رہے اور اسے اس کا نیا نام یاد کراتے رہے ـــــ وہ چیختی چلاتی

تو لیڈر سکھ نے دھمکی دی کہ اگر وہ درست نہ ہوئی تو وہ اپنے گروہ کے باقی سات جوانوں کو بھی اندر مدعو کر لے گا۔ تب وہ نہایت بے بسی کے ساتھ سسک پڑی اور درست ہوگئی اور اسے یقین آگیا کہ اس کا نام رشیدہ نہیں پرکاش کور ہے اور پھر وہ سچ مچ پرکاش کور بن گئی۔ لیڈر سکھ سریندر سنگھ کی بیوی!

اس کے اندر کی رشیدہ اس سے گزرے ہوئے، بھوگے ہوئے اور سہے ہوئے واقعات کی کوئی بات کرتی تو وہ اسے سختی سے ڈانٹ دیتی کسی نعرے کا مطلب پوچھتی تو اسے ٹوک دیتی۔ سکھوں کے دور میں مسلمانوں کی اذانوں پر پابندی ہو یا مغلیہ دور میں گورو گوبند سنگھ جی کے بچوں کے قتل کا واقعہ۔ پاکستان کا مطلب لا الٰہ الا اللہ ہو یا پلیدستان — وہ تو اپنا مطلب اپنے معانی گم کر بیٹھی تھی اس کے لئے اب ہر چیز بے معنی تھی — اس نے اپنی بے معنی زندگی سے سمجھوتہ کر لیا اور اس سمجھوتے نے بے معنویت سے ایک سی معنویت پیدا کر دی۔ دو گبھرو بیٹے اور ایک خوبصورت بیٹی — لیکن وہ جب بھی اپنے ماحول سے مطمئن ہونے لگتی اندر کی بے اطمینانی اور بڑھ جاتی — اطمینان اور بے اطمینانی کی اسی حالت میں زندگی کو جھیلتے، بھوگتے وہ بڑھاپے کی منزل تک آگئی۔

تب یکایک ایک اور دھماکہ ہوا۔ زندگی کانپنے لگی۔

"اندرا گاندھی قتل ہوگئیں"

انتہا پسندوں کی آڑ میں تخریب کار اور سماج دشمن عناصر کو کھل کھیلنے کا موقعہ مل گیا۔ سکھوں کا قتل عام شروع ہو گیا — اس کے ذہن میں خوفناک وسوسے اور اندیشے سر اٹھانے لگے۔ وہ اپنے کمزور اور بوڑھے ہاتھوں سے اپنی جوان بیٹی کو مضبوطی سے تھامے لگی — فساد شدت اختیار کرنے لگا۔ سریندر سنگھ سرکاری حفاظتی کیمپوں میں رہائش کا بندوبست کرنے گیا ہوا تھا۔ تب اس کے گھر کی دہلیز پر ہی اس کے دونوں جوان بیٹے قتل کر دیئے گئے اور گھر کو آگ لگا دی گئی۔ وہ اپنی جوان بیٹی کو ساتھ لے کر گھر کی پچھلی طرف سے دیوار پھاند گئی۔ ابھی وہ چند قدم ہی آگے گئی ہوگی کہ پیچھے سے للکار سنائی دی: "ٹھہرو —
کون ہو تم؟"

"جی — جی — وہ بھلائی ہوئی سینتیس سال پہلے کا زمانہ پھر اس کے سامنے آگیا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"پرکاش کور — نہیں — رشیدہ — نہیں — رشیدہ"

"جھوٹ بولتی ہو۔ تم مسلمان نہیں سکھ ہو"

"گورو کی سوگند — خدا کی قسم — میں رشیدہ ہوں اور یہ میری بیٹی ہے چترا — نہیں۔ اس کا نام چترا نہیں اس کا نام . . . . ." وہ پریشان ہو کر سوچنے لگی۔ سوچتی رہی، سوچتی رہی — اس کے سوچتے سوچتے اور دیکھتے دیکھتے سامنے کا منظر بدل چکا تھا۔ چترا ایک مکان کے کمرے میں مقید تھی اور وہ برآمدے میں بے بس بندھی کھڑی تھی آٹھوں بدمعاش اس کی بیٹی کو ریپ کر رہے تھے۔ چترا بے ہوش ہو چکی تھی مگر سوائیوں کے انتقام کی آگ ابھی ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی۔ اس کے ذہن میں سارے منظر، ساری تاریخ اتھل پتھل ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کی حالت ایسے انسان کی طرح تھی جس کے چاروں طرف الگ الگ موضوعات کی کئی فلمیں چل رہی ہوں اور اسے کچھ بھی نہ سوجھ رہا ہو، اسے محسوس ہوا کہ اس کے سامنے چترا نہیں وہ خود پڑی ہوئی ہے اور وحشیوں کا یہ غول اسے اس کا نام یاد کرا رہا ہے۔ ہر آدمی اسے سریندر سنگھ نظر آتا ہے۔

"رشیدہ نہیں پرکاش کور — پرکاش کور نہیں رشیدہ"

تب اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کوئی نام نہیں، اور کوئی مذہب نہیں۔

وہ صرف ایک لڑکی ہے۔ ایک عورت ہے۔

یہی اس کا نام ہے۔

یہی اس کا مذہب ہے۔ ❁

اپنے بچوں کو اُردو پڑھائیے

دست برگ کے بعد ستیہ پال آنند

کا

نیا شعری مجموعہ

ستر اردو نظمیں جنھیں عالمی سطح پر عصری یورپی اور امریکن شاعری
کے مدِ مقابل رکھنے میں کوئی پیش و پس نہیں ہوتا

دیدہ زیب طباعت اور گیٹ اپ

قیمت ۱۲۰ روپے

سیمانت پرکاشن ۔ ۹۲۲ کوچہ روہیلہ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ماہنامہ شاعر مکتبہ قصرالادب ممبئی سینٹرل پوسٹ آفس پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶ ممبئی

کسی زبان کا ادب، زبان کے ساتھ ساتھ تخلیق نہیں پاتا بلکہ زبان جس قدر منجھتی اور نکھرتی جاتی ہے اور اس میں جس قدر قوت و وسعت پیدا ہوتی جاتی ہے اس میں اتنا ہی ادبی سامان پیدا ہوتا جاتا ہے۔ الفاظ کی فراوانی، محاورات کا انضباط، اسالیب کا تعین فصاحت و بلاغت کی تحدید ہر زبان کے ادب کے لئے ضروری اجزا ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ اسباب کسی زبان کے ساتھ پیدا نہیں ہوتے بلکہ پیدا کئے جاتے ہیں۔

[۱۶؍اپریل ۱۹۳۳ء]

سیماب اکبرآبادی

آثارِ لفظ لفظ

Hafeez

Shahnama-i-Islam

۱/۱۲/۹

برادرم اعجاز صدیقی صاحب السلام علیکم

[illegible]

حفیظ جالندھری

حفیظ جالندھری بنام اعجاز صدیقی

حفیظ جالندھری (پ : ۱۴ر جنوری ۱۹۰۰ء – م : ۲۱ دسمبر ۱۹۸۲ء) اس خط سے واضح ہوتا ہے کہ ۴۰ سال کی عمر ہی میں انہوں نے شاہنامہ اسلام کو اپنے لیٹر ہیڈ پر نمایاں کر لیا تھا۔ شاعر کا اجرا ۱۹۳۰ء میں ہوا تھا لیکن ۱۹۲۹ء تک کوئی شمارہ نہ تو ان کی نگاہ سے گذرا اور نہ ہی انہیں اس رسالے کی آگہی تھی اس خط سے ایک اچھے مدیر اور ایک اچھے قلمکار کے مزاج اور رویوں کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ۱۹۳۵ء کے بعد حفیظ جالندھری مرحوم متعدد بار شاعر میں شائع ہو چکے ہیں۔ حفیظ، شاہنامہ اسلام اور سیماب کے تعلق سے بعض روایتیں اب بھی گردش کرتی رہتی ہیں۔

ساقی فاروقی

◆

ہم تو بس ایک درد کی رحمت سے تنگ آ گئے
سینے میں آگ جل اٹھی لہجے میں رنگ آ گئے

اک دن جو احتیاط کا غرفہ ذرا سا کھل گیا
دیکھا کہ دور دور سے نفرت کے سنگ آ گئے

لاکھوں توہمات کے حالے پڑے ہیں ذہن میں
مشرق کے مرغزار میں اہلِ فرنگ آ گئے

ثابت قدم عجیب ہیں آنکھیں تری تشبیہ سے
خالی ہوئیں تو روح میں بھر کے امنگ آ گئے

وحشت کے سائباں نہیں ساقی کہیں اماں نہیں
یادوں کے ساحلوں پہ بھی کیا کیا نہنگ آ گئے

100, SUNNY GARDENS ROAD.
LONDON NW4 1RY

جگن ناتھ آزاد

◆

ہماری جن سے رہیں آشنائیاں کیا کیا
ہمیں دکھاتے رہے کج ادائیاں کیا کیا
یہ جان کر کہ بس اب بات کھلنے والی ہے
اڑی ہیں چہرے پہ ان کے ہوائیاں کیا کیا
وہ آج جن کا ہر اک سانس نالۂ غم ہے
انھیں بھی یاد تھیں رنگیں نوائیاں کیا کیا
جو تیرے در کا گدا تھا اسی نے توڑی ہیں
سخن کے ملک میں فرمانروائیاں کیا کیا
تجھے خبر ہی نہیں ہے ترے سبب سے مری
ہوئی ہیں چار طرف جگ ہنسائیاں کیا کیا
تم اپنا دورِ جفا کیوں بھلا رہے ہو کہ جب
دکھائیں تم نے ہمیں کج ادائیاں کیا کیا
مرے خدا! تجھے شاید خبر بھی اس کی نہیں
بتوں نے دہر میں کی ہیں خدائیاں کیا کیا
جو کامیابِ محبت ہیں ان کو کیا معلوم
کسی کے ساتھ ہوئیں بے وفائیاں کیا کیا
انھیں کے دم سے ہوں آزاد تاجدارِ سخن
مرے نصیب میں تھیں نارسائیاں کیا کیا

اے ۲۵، گورنمنٹ کوارٹرس، گاندھی نگر - جموں

فردوس حیدر
۵۱۰۴۔ ڈیفنس گارڈن، ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی۔ کورنگی روڈ، کراچی

کھویا ہوا گیت

وہی ایک کمرہ۔ روشن دان اور کھڑکی کے بغیر۔ دروازے پر پہلے دو کتے۔ اس نے ہمیشہ کی طرح دروازے کی جانب بڑھنا چاہا لیکن کتوں کے خوف سے وہ رک گئی۔ اس نے چاروں طرف دیکھا دیواریں کھسکتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھیں۔ وہ سہمی ہوئی کمرے کے عین وسط میں کھڑی ہو گئی لیکن دیواریں لحظہ لحظہ قریب آ رہی تھیں اسے محسوس ہوا کوئی قوت ان دیواروں کو دھکیل رہی ہے

وہ زور سے چیخی

"شاہد۔ مجھے بچاؤ"

کوئی جواب نہ ملا۔

دیواریں اسی طرح آگے بڑھتی رہیں۔ ان کا فاصلہ کم ہوتا رہا وہ دھاڑیں مار کر رونے لگی۔ مگر اسے احساس ہوا اسے اپنے رونے کی آواز سنائی نہیں دے رہی۔ اس نے ذہن پر زور ڈالا اسے اپنی چیخ بھی سنائی نہیں دی تھی۔

اسی لئے شاید میری مدد کے لئے نہیں آیا۔ اس نے سوچا "کیا وہ بھی میری آواز نہیں سن سکتا۔ کیا میں قوت گویائی سے محروم ہو گئی ہوں یا قوتِ سماعت سے؟

صورت حال پیچیدہ تھی۔ وہ مزید پریشان ہوئی۔ دیواریں آہستہ آہستہ سرک رہی تھیں۔

اب اس کے وجود اور دیواروں کے درمیان بہت کم فاصلہ رہ گیا تھا۔ جیسے موت کا آخری لمحہ آن پہنچا ہو۔

اس نے سوچا۔

"یہ دیواریں مجھے بھینچ لیں گی۔ کسی کو علم بھی نہ ہو گا مجھ پر کیا بیتی مر گئی یا غائب ہو گئی۔ مر گئی تو کہاں اور کیسے۔ غائب ہو گئی تو کیوں اور کیسے؟

کیا کوئی اغوا کر کے لے گیا یا اپنی مرضی سے۔ اس نے ایک بار پھر پوری قوت سے شاہد کو آواز دی لیکن کوئی جواب نہ ملا۔

اس نے گھبرا کر ہاتھ بڑھایا۔ شاہد کو ٹٹولنا چاہا لیکن وہ کہیں بھی نہ تھا۔

"شاہد کہاں ہے؟" اس نے سوچا اور نڈھال ہو کر گر گئی۔ پھر اپنے حواس پر قابو پا کر دونوں ہاتھ دائیں بائیں پھیلائے۔ اس کے ہاتھ میں کچی مٹی یا گندھے ہوئے آٹے جیسی کوئی چیز تھی۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے چیخ کر کہا "میں کہاں ہوں؟"

وہ سنبھل کر اٹھی اور پھر بیٹھ گئی۔ اسے بیک وقت اپنے پاؤں کے پھسلنے اور سر کے چکرانے کا احساس ہوا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کیا ہو رہا ہے

بچپن میں جب کبھی وہ خواب دیکھتی تو نانی اماں فوراً کالا مرغا اس کے ہاتھ سے چھوا کر صدقہ کر دیتیں۔ خود اسے بھی تسلی ہو جاتی کہ کوئی آفت ٹل گئی۔ بڑے وقت سے بچ گئی۔ نہ جانے کیا ہونے والا تھا جو ہوتے ہوتے رہ گیا۔ شادی کے بعد زندگی کا اسٹائل بدل گیا۔ شاہد نے خوابوں کے خوف سے صدقے خیرات کو توہم پرستی کہہ کر رد کر دیا۔ لیکن وہ خواب بند نہ کر سکا۔ دہشت زدہ خوابوں کا سلسلہ جاری رہا وہ نیند میں چیختی۔ شاہد کو پکارتی تو وہ اسے اپنے بازوؤں کے حصار میں لے کر کہتا

کسی بھی خوف کا مقابلہ کرنے کے لئے کوئی باہر سے نہیں آتا تم اپنے اندر قوت پیدا کرو۔ وہ خوف جو بچپن سے تمہارے اندر پل رہا ہے۔ اور تمہاری نانی نے تمہارے ساتھ اس خوف کی بھی پرورش کی ہے، جو بچپن کے کسی حادثے یا سانحے کا سبب تم اس خوف پر تم خود قابو پاؤ گی۔

"تم ٹھیک کہتے ہو اس دنیا میں کوئی کسی کا دوست نہیں ہوتا" دبلے آدمی نے زمین پر تھوکتے ہوئے کہا "اسی لیے میں تمہیں حمی کہتا ہوں مجھے معلوم ہے یہ تمہارا اصلی نام نہیں۔ پکارنے کے لیے کوئی اشارہ یا علامت تو چاہیئے نا؟۔ میں تمہیں اے۔ بی سی یا بی ٹا بھی کہہ سکتا ہوں۔ لیکن انسان کا کوئی نہ کوئی نام ہوتا ہے اسی لیے تم حمی ہو"

" ہاں یہ میرا اصلی نام نہیں" موٹے آدمی نے اداس لہجے میں جواب دیا" تمہارا اپنا کیا ہے ؟ نام اپنا نہ زندگی بس کرائے کے ٹٹو ہیں"

"ہم اسی زندگی کے عادی ہو گئے ہیں" دُبلا آدمی بھی اُداس ہو گیا "کاش میں عادی ہو جاتا" موٹا آدمی اسی لہجے میں بولتا رہا "یوں لگتا ہے میں الٹا لٹکا ہوں۔ برسوں سے سیدھا ہو کر چلنے کی کوشش کرتا ہوں تو میری ایک ٹانگ دائیں اور دوسری بائیں جانب کھینچنے لگتی ہے۔ جیسے کوئی مجھے عین بیچوں بیچ دو حصوں میں چیرتے ہوئے کہہ رہا ہو خبردار جو سیدھا ہونے کی کوشش کی۔ میں خوفزدہ ہو کر واپس ہاتھوں کے بل کھڑا ہو جاتا ہوں"

"پھر تو تمہیں کسی کا چہرہ نظر نہ آتا ہو گا" دبلے آدمی نے حسرت سے موٹے آدمی کو دیکھا "اپنی ماں کا نہ باپ کا چہرہ۔ تم کتنے خوش نصیب ہو ایک عذاب سے بچے ہوئے ہو۔ میں مستقل آزار میں مبتلا ہوں"

"عذاب سے بچا ہوا ہوں" موٹا آدمی طنزیہ مسکرایا

"تمہیں نہیں معلوم میرے باپ نے میری ماں کو کسی سے ناجائز تعلق کی وجہ سے قتل کر دیا تھا" دبلے آدمی نے اپنی بات جاری رکھی "میں نے غصے میں اپنے باپ کو قتل کر دیا میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میری ماں بدچلن ہو سکتی ہے بعد میں پتہ چلا کہ میرا باپ سچا تھا۔ میں اپنے آپ کو آج تک معاف نہیں کر سکا" دوبارہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی موٹے آدمی نے بات کی۔ اس کے چہرے پر مزید اداسی چھا گئی دبلا آدمی سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔

"کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ یہ فیصلہ صرف وقت کرتا ہے۔ انسان صرف عذاب میں مبتلا رہتا ہے۔"

دبلا آدمی اسی طرح دیکھتا رہا۔

"اس عورت میں شوہر کو کوئی دلچسپی نہیں۔ اس نے رقم دینے سے انکار کر دیا ہے۔"

وہ جھری میں موٹے آدمی کا مایوس چہرہ دیکھتے ہوئے مسکرائی "شاہد اب تک پولس اور فوج کی مدد سے دہشت گردوں کے ٹھکانوں پر چھاپے مار چکا ہو گا۔ پولس کے اعلیٰ افسران اس کے دوست ہیں۔ وہ سب اُسے تسلی دے رہے ہوں گے عنقریب پولس مجھے برآمد کرے گی اور ملزموں کو کڑی سزا دے گی" اس نے ایک بار پھر کمرے کو غور سے دیکھا۔ نہ جانے یہاں کس کس کو اذیت دی گئی ہو گی۔ بے دردی سے مارا گیا ہو گا کتنے سہاگ اجڑے ہوں گے۔ کتنی مائیں اور بہنیں بے سہارا ہوئی ہوں گی۔ کس کس کی عزت لٹی ہو گی۔ دیواروں اور فرش پر لگے خون کے دھبوں میں سے ابھرتے ہوئے چہرے بین کر رہے تھے۔ رو رہے تھے۔ اس کے بدن کا ہر عضو بے حس ہو گیا۔ جیسے خون یک لخت منجمد ہو گیا ہو۔

"شاہد" اس نے ایک بار پھر اپنے حواس مجتمع کرنے کی کوشش کی دروازہ زور سے کھلا اور وہ دونوں اس کے سامنے تھے۔

"تمہارا شاہد اب کبھی نہیں آسکے گا۔ وہ اس وقت کسی دوسری عورت کی باہوں میں جھول رہا ہے" موٹے آدمی نے قہقہہ لگایا

"نہیں وہ دیوتا ہے تم جھوٹ بول رہے ہو" وہ چیخی

"ہم جینے کے لیے خود اپنا ایک دیوتا بنا لیتے ہیں اور اسے پوجتے رہتے ہیں" موٹا آدمی گرجا۔ اس وقت تم مجھے اپنا دیوتا بنا لو کیونکہ تمہارے شوہر نے تمہیں واپس لینے سے انکار کر دیا ہے۔"

"وہ کہتا ہے اب استعمال شدہ چیز مجھے واپس نہیں چاہیئے" دبلا آدمی بھی ہنسی میں شریک ہو جاتا ہے۔ وہ تمہیں قتل کرنے کے لیے رقم دینے کو تیار ہے۔"

"تمہاری موت کے بعد وہ تمہاری جائیداد پر قبضہ کر لے گا اور اپنی محبوبہ کے ساتھ خوشی خوشی جیئے گا۔"

"وہ کئی بچوں کا باپ بننا چاہتا ہے اور تم نے ایک مرا ہوا چوہا بھی پیدا نہیں کیا۔

وہ دونوں باری باری بولتے رہے اور قہقہے لگاتے رہے اسے یوں لگا وہ ایک طویل خواب دیکھ رہی ہے۔ ایک اذیت ناک خواب۔ اس کی کئی بار آنکھ کھلی اور پھر سو گئی۔ جاگنے اور سونے کی کیفیت میں وہ چیختی رہی۔ روتی رہی۔ نہ جانے کیا کہتی رہی۔

[باقی صـ پر دیکھیے]

بہ خط شاعر

شبنم رومانی

ہائیکو

۲۰۷ گھڑیالی بلڈنگ
صدر کراچی

نسیم سید

اپنے لئے

"وقت"

606, COUNTER ST.
KINGSTON ONTARIO.
K7 M3L6 CANADA

عذرا نقوی

پوسٹ بکس نمبر ۸۵۱۱۷، ریاض ۔ ۱۱۴۳۳، سعودی عربیہ

بلاعنوان

مجھے امام باڑے پہنچنے میں کافی دیر ہوگئی تھی آج سینٹرڈے نائٹ تھی، گرمی کا موسم، لہٰذا ٹریفک بہت تھا اور مزید مصیبت یہ کہ جس راستے سے مجھے آنا تھا وہ فورم اسٹیڈیم کے سامنے سے ہو کر گذرتا تھا۔ اور آج فورم میں کسی مشہور سنگر کا کنسرٹ تھا اس لئے پون گھنٹے کا راستہ ڈیڑھ گھنٹے میں طے ہوا۔ اور پھر یہ ہوا کہ جس سڑک پر امام بارگاہ تھا اس کا نام بھول گئی، یا مٹرپات کی سڑکوں کے نام بھی سارے مشہور فرانسیسی صفحات ناموں پر ہیں۔ یاد رکھنا مشکل ہوتا ہے خدا خدا کر کے وہ سڑک ملی جس کا نام تھا × Zonal - Group × نہ جانے کس سابق جنرل کا ہوگا اس نام کا! بہرحال، مجھے امام باڑہ تو مل گیا۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ گاڑی پارک کہاں کی جائے، آج محرم کی آٹھویں تاریخ تھی بہت لوگ مجلس میں آئے ہوئے تھے بمشکل ایک جگہ نظر آئی وہیں میں نے کار لگادی۔ یہ لور مڈل کلاس لاطینی لوگوں کا محلہ کہلاتا تھا۔ جس میں پہلے یہاں امام باڑے کی عمارت خریدی گئی تھی عمارت کیا تھی ایک پرانا ware house تھا اس کی مرمت کرائی گئی سب نے خوب دل کھول کر چندہ دیا تھا امام باڑہ خریدنے کے لئے۔

امام باڑے کے اندر گھستے ہی حلیم اور سموسوں کی خوشبو نے استقبال کیا۔ مرثیے کی آواز آ رہی تھی میں نے سوچا چلو کوئی زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ اپنے بیٹے علی کو میں نے مردانے ہال میں جانے کا راستہ دکھایا اور خود زنانے ہال میں آ گئی جو آج پورا بھرا ہوا تھا دروازے کے قریب ہی مسز جعفری اور زہرا بیٹھی تھیں میں وہیں بیٹھ گئی۔

ہال میں دو ۱ ٹی وی لگے تھے جن پر مردانے ہال کا منظر نظر آ رہا تھا ویڈیو سسٹم کے ذریعے مجلس اندر زنانے ہال میں نشر ہو رہی تھی اب مرثیے خوانی ختم ہو چکی تھی مولانا پر فوکس آ رہا تھا مسز جعفری مولانا منبر پر آ گئے ہیں۔ انھوں نے سورہ فاتحہ پڑھی اور مجلس شروع کی مجھے یہ دیکھ کر ہی ہوئی یہ پہچان گئی کوئی گجراتی بولنے والے خوجے مولانا ہیں۔ حالانکہ وہ بڑے موٹے موٹے الفاظ بولنے کی سخت کوشش کر رہے تھے۔

زہرہ آپا نے اپنے خاص انداز میں سرگوشی کی جو کافی بلند تھی "ملے سے یہ آٹھ تاریخ کو کس نے سو نیچے سوچے، کرنے والے کو منبر پر بٹھا دیا؟" پچھلے چار پانچ سال تک حسین رضوی عشرہ پڑھتے تھے یہاں۔

مسز جعفری نے آنکھیں بند کر لیں۔ "خدا کے لئے زہرہ آپا ذرا آہستہ بولئے یہ مولانا اسی سال لندن سے مجلس پڑھنے بلوائے گئے ہیں۔ آپ کو تو پتہ ہے کہ امام باڑے کو خریدنے کے سلسلے میں خوجوں نے کتنا پیسہ دیا ہے صرف علی بھائی تقی ران نے ہی ۲۰ ہزار ڈالر دیئے تھے۔

مسز جعفری نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

پچھلی میٹنگ میں یہ بات بھی نکل تھی کہ ایک دن مجلس کسی زبان میں پڑھی جائے۔ اور ان مولانا نے تو شروع کی مجلسیں کافی حد تک انگریزی میں پڑھیں تاکہ ہمارے بچے بھی تو کچھ سمجھیں۔

مسز جعفری کے میاں امام باڑے کے بہت سرگرم رکن تھے۔ برسوں سے لنڈا ڈاؤن میں رہ رہے ہیں۔ ایک بہت بڑی کمپنی میں کوالٹی کنٹرول انجینئر ہیں یہ کمپنی کسی بڑی امریکی کمپنی کے لئے جنگی جہازوں کے پرزے بناتی ہے۔ زہرہ آپا باز آنے والوں میں سے نہیں تھیں بولیں۔

"توبہ ہے اب کہاں کم انگریزی میں نوحے تو نہ پڑھوائیں۔ سال بھر اسی انتظار میں رہتے ہیں کہ محرم میں تو کم سے کم اچھی اردو سننے کو ملے گی۔" نزدیک کی بیٹھی ہوئی بیبیوں نے ہمیں گھور کر دیکھا۔ میں نے مجلس کی طرف دھیان دینے کی کوشش کی مولانا کہہ رہے تھے۔

"اور یہ ننگے سر، نیم عریاں لباسوں میں فاطمہ زہرا کی کنیزیں ہیں؟ مومنات! قیامت کے دن خدا انہیں پوچھے گا کہ کتنے ڈالر کمائے ....

حضرت علی نے فرمایا تھا کہ دنیا کی دولت میری نظر میں بکری کی ایک

آج بہت بھیڑ تھی بہت سے لوگ منتیں مان رہے تھے یا اتار رہی تھیں۔
مسز مہدی نے حضرت عباس کا علم چڑھایا تھا۔ انہوں نے اپنے بیٹے
کے LAW میں داخلے کی منت مانی تھی زیدی صاحب کی چھوٹی بہو ماتم
کرتے ہوئے بے ہوش ہو گئی تھی۔ زہرہ آپا نے میرے کان میں کہا
"منا ہے بے چاری اپنے میاں اور ساس کے ہاتھوں بہت پریشان
ہے" ماتم اور نوحوں کا سلسلہ جاری تھا مجھے واپس جانے کے لئے جلدی
تھی۔ باہر نکل کر علی کو ڈھونڈا وہ مردانے ہال کے دروازے پر کھڑا
کافی بیزار نظر آ رہا تھا۔ دروازے کے قریب تبرک بانٹنے والوں کی
بھیڑ تھی۔ آج بہت سے لوگ تبرک بانٹنے لائے تھے، چاکلیٹ، سموسے
وغیرہ تو پہلی میں عام تھے علی بہت خوش ہوا کہ مسز نقوی ان کی طرف سے
آج آئس کریم کے بھرے گلاس تقسیم ہو رہے تھے۔ انہوں نے پچھلے
سال سینٹ کیتھرین اسٹریٹ پر SWENSON کا آئس کریم
پارلر خریدا تھا۔ اس کے منافع بخش کاروبار کی منت مانی تھی
انہوں نے اسی سلسلے میں آئس کریم بانٹی۔ یہ تھیں علی انہیں پہچان گیا
کہ یہ تو وہی آنٹی ہیں جو SWENSON میں اکثر کاؤنٹر پر ہوتی ہیں
مسز حق حلیم کا دیگچہ پکا کر لائی تھیں اور سب سے اصرار کر رہی
تھیں کہ لوگ کھائیں سب لوگ کھا کھا کر آئے تھے تو انہوں نے
STYROFOAM کے کپ میں بھر بھر کر حلیم سب کو تھما دی اور اس پر
تاکید بھی کر دی کہ نذر کی چیز ہے زمین پر نہ گرے۔
ان سب تبرکات سے لدی پھندی جب میں باہر نکلی تو اندازہ
ہوا کہ موسم بہت خوشگوار ہے اندر بہت گرمی ہو گئی تھی رات
کے ساڑھے دس بج گئے تھے۔ لیکن خوشگوار موسم کی وجہ سے
اس علاقے کے لوگ اپنے گھروں کی بالکنی یا سیڑھیوں پر بیٹھے
بیئر پی رہے تھے۔ گرمی کی وجہ سے عورتوں اور دوسرے لوگوں نے
مختصر شارٹس اور نیکر پہنے تھے۔
میں جلدی میں تھی کیونکہ ساڑھے دس بجے مجھے یونیورسٹی
سے بیٹی کو لینا تھا اس کا امتحان تھا۔ یہ اس کا انجینئرنگ کا
آخری سال تھا۔ میں تیز تیز چلتی ہوئی ایک بوڑھے آدمی سے ٹکرا گئی
جو نشے میں دھت تھا۔ ہاتھ میں اس کے بھی کاغذ میں لپٹی ہوئی
بیئر کی بوتل تھی اس نے سر سے ٹوپی اتار کر مسخرے انداز میں سینے
پر ہاتھ رکھ کر مجھ سے معافی مانگی۔
"معاف کیجئے مادام! میں نے ایک سیپ خالق کے لئے"
اور اس نے منہ سے بوتل لگا کر باقی ماندہ بیئر بھی حلق میں انڈیل لی۔
اور مسکرا کر آگے بڑھ گیا۔
کار کے پاس پہنچی تو دیکھا ونڈ اسکرین پر پارکنگ ٹکٹ لگا ہے
کیونکہ میں نے آتے وقت جلدی میں یہ نہیں دیکھا تھا کہ گاڑی آگ
بجھانے والے نل کے پاس کھڑی کر رہی ہوں۔ ۵۰ ڈالر کی چپت تھی
میری گاڑی سے ٹیک لگائے ایک نوجوان جوڑا دنیا و مافیہا
سے بے خبر ایک دوسرے کو KISS کر رہا تھا۔ ہماری
آہٹ پا کر چونکے ہمیں دیکھ کر مسکرائے لڑکے نے کہا کتنی خوبصورت
رات ہے پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھا مختصر سا ایک
KISS کیا اور چل دیئے
میرے دس سالہ بیٹے علی نے مسکرا کر خالص فرانسیسی انداز
سے کندھے اچکائے علی جب گاڑی میں بیٹھا تو بولا
"ممی ہماری گاڑی تو آج پاکی کی طرح SMELL
کر رہی ہے۔" وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ میں نے سوچا صبح آفس جانے
سے پہلے مجھے سر دھونا پڑے گا تاکہ حلیم اور سموسوں کی بو نکل جائے۔

بیانِ ملکیت اور دیگر تفصیلات شاعر بمبئی

(مطابق فارم نمبر ۴ دفعہ نمبر ۸)

مقامِ اشاعت — بمبئی
پرنٹر و پبلشر — ناظر نعمان صدیقی
پتہ — دینا ناتھ بلڈنگ تیسرا منزلہ ماکنڈ روڈ بمبئی ۴
ایڈیٹر — افتخار امام صدیقی
پتہ — دینا ناتھ بلڈنگ تیسرا منزلہ ماکنڈ روڈ بمبئی ۴
وقفۂ اشاعت — ماہنامہ
قومیت — ہندوستانی
ملکیت — ناظر نعمان صدیقی
قومیت — ہندوستانی

میں ناظر نعمان صدیقی اعلان کرتا ہوں کہ
مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین
کے مطابق درست ہیں۔

دستخط — ناظر نعمان صدیقی ۲۸ فروری ۱۹۹۴ء

شاهد کبیر

اس قدر جھک کے گزرنے کو مقدر نہ بنا
یہ دریچہ ہے، مروت میں اسے در نہ بنا

میں ترے لمس کے احساس میں ڈھل جاؤں گا
دور سے دیکھ لے، چھو کر مجھے پتھر نہ بنا

پیار سے جتنی گزر جائے غنیمت ہے یہاں
لفظ کو دھار نہ دے، بات کو خنجر نہ بنا

اگتے سورج کی کرن سرخ دوپٹے سے نہ چھان
صبح کی دھوپ سے یوں شام کا منظر نہ بنا

چند ہی روز میں بک جائیں گے چھپر شاہد
یہ حسینوں کا محلہ ہے، یہاں گھر نہ بنا

● محمد علی روڈ، مومن پورہ — ناگپور

پروین کمار اشک

مرے خلاف آکاش میں کوئی سازش کرتا رہتا ہے
میری قسمت والا تارہ گردش کرتا رہتا ہے

یا تو آگ دکھاتا رہتا ہے وہ میری فصلوں کو
یا پھر میرے کھیتوں پر وہ بارش کرتا رہتا ہے

پہنچ کے منزل پر بھی بھولا نہیں سفر کے محسن کو
پھٹے پرانے جوتے پر بھی پالش کرتا رہتا ہے

دودھ کی خالی بوتل سے بھی بچے کا ہے عشق عجیب
تھک جاتے ہیں ہونٹ، مگر وہ کاوش کرتا رہتا ہے

باغ انگور کا چھوڑ آیا تھا سرحد پار جوانی میں
پاگل بوڑھا پل پل کشمش کشمش کرتا رہتا ہے

● کرشنا مارکیٹ، پٹھان کوٹ (پنجاب)

ہمایوں ظفر زیدی

صدا سکوت کی سن، شور شہر سے باہر آ
پکارتا ہے تجھے دشت، گھر سے باہر آ

یہاں نہ دے گا کوئی دشت آبلہ پائی
ہے اب بھی وقت، طلسم سفر سے باہر آ

ہے ایک جسم ترے انتظار میں کب سے
کبھی تو روح کے سونے نگر سے باہر آ

طلسم ہوش ربا ہے یہاں کا ہر منظر
اگر تو حلقۂ دام نظر سے باہر آ

نیا جہان ہے اک وقت کی حدوں سے پرے
فریب گردش شام و سحر سے باہر آ

● پوسٹ بکس نمبر ۳۴۴۵ روی ۱۲
مسقط (عمان)

کے عقب کی طرف موڑ کر چھڑی کی نوک سے اشارہ کرتا ہے۔)
مسٹر ڈائرکٹر! مسٹر ڈائرکٹر! یہ کیا مذاق تھا۔ آپ کے ڈرامے میں
نہ کہانی ہے، نہ ڈائلاگ، نہ کردار۔ تو پھر ہمیں کس لئے بلایا گیا ہے۔

پس منظر۔ ہم خود بھی حیران ہیں! [illegible] سب یہاں جمع ہوئے ہیں
کہ مجھے معتبر ذرائع سے خبر ملی ہے کہ ڈرامے کا کہانی کار آنے والا
ہے۔ وہ ہمیں کہانی دے گا۔ ڈائلاگس دے گا۔ اور کیا چاہئے
تمہیں؟

سلیم۔ (مطمئن ہو کر آرام کرسی کی طرف واپس لوٹتے ہوئے۔) نہیں!
مجھے اطمینان ہو گیا۔ اب مجھے کچھ نہیں چاہئے۔ باقی سب کچھ میں
کہانی کار سے طے کروں گا۔

(ایک طویل اکتا دینے والی خاموشی)

نسیمہ۔ (دستانے سے سر اٹھا کر۔) یہ ایک بہت بڑی خوش خبری ہے۔

سلیم۔ کیا؟

نسیمہ۔ کہ ڈرامے کا کہانی کار آنے والا ہے۔

سلیم۔ یہ خوش خبری کیسے ہو گئی؟

نسیمہ۔ ہم ان سے اچھی کہانی سنیں گے۔

سلیم۔ اچھے کردار تخلیق کروائیں گے۔

نسیمہ۔ اچھے ڈائلاگس لکھوائیں گے

سلیم۔ مگر جب تک وہ آ نہیں جاتا ہم کیا کریں؟

نسیمہ۔ ہمیں کچھ کرنا چاہئے۔ کیوں نہ ہم کسی پچھلے ڈرامے کا سین
دہرائیں۔

سلیم۔ میں نے اس سے پہلے کبھی کسی ڈرامے میں کام نہیں کیا۔

نسیمہ۔ (مایوسی کے ساتھ) اور نہ ہی میں نے۔

پس منظر۔ اور نہ ہم نے۔

(ایک اکتا دینے والی خاموشی)

نسیمہ۔ آخر ایسا کیوں ہے؟

سلیم۔ (بور ہو کر) کیا ایسا کیوں ہے؟

نسیمہ۔ کہ ہم لوگوں کی کوئی اہمیت ہے ہی نہیں۔ جب تک کہانی نہ
بن جائے، کردار نہ طے ہو جائیں اور ڈائلاگس نہ لکھ لئے جائیں
ان تمام چیزوں کے لئے ایک ہی آدمی پر بھروسہ رکھنا پڑتا ہے،
کہانی کار پر۔ انسان نے اتنی ترقیاں کر لی ہیں! کیا وہ کہانی
کار کی اجارہ داری نہیں توڑ سکتا۔

پس منظر۔ خاموش! کہانی کار آ رہا ہے۔

(اسٹیج نیم تاریکی میں ڈوبنے لگتا ہے اور ایک لمبا سا
دوزخی کے قدموں پر آ کر گرتا ہے۔)

سلیم اور نسیمہ۔ (ایک ساتھ) کیا یہ تم ہو کہانی کار؟ (اسٹیج روشنی کی
طرف واپس لوٹتا ہے)

(کہانی کار اندر داخل ہوتا ہے۔ کچے پکے بال، ریتیا نوسی کوٹ،
اس نے دو فیٹ طویل ایک قلم اپنے کندھے پر گدے
کی طرح رکھا ہوا ہے۔ دوسرے ہاتھ کی پانچوں انگلیوں سے
پتلی پتلی زنجیریں نکل کر اسٹیج کے اس رنگ کی طرف کھنچی ہوئی ہیں
جس سے وہ نمودار ہوا ہے۔) کیا تم نے پچھلے اس ڈرامے کی کہانی
لکھی ہے۔

کہانی کار۔ (اپنے آپ سے) کہانی کار! جواب دے۔

سلیم۔ کیا تم نے اتنے سارے ڈرامے اسی قلم سے لکھے ہیں؟

کہانی کار۔ (اپنے مضحکہ خیز قلم سے مخاطب ہو کر۔) قلم جواب دے۔

نسیمہ۔ کتنا انتظار کروایا تم نے۔ ہم تو مایوس ہو کر گھر لوٹنے والے
تھے۔

کہانی کار۔ (اپنی دستی گھڑی پر کان لگاتے ہوئے۔) سمے جواب دے۔

سلیم۔ (اس جانب اشارہ کرتے ہوئے جدھر زنجیریں کھنچی ہوئی ہیں)
کہانی کار یہ لوگ کون ہیں۔ تم نے انھیں زنجیریں کیوں پہنا رکھی
ہیں؟

(کہانی کار زنجیروں کو زور سے جھٹکا دیتا ہے اور پانچ کردار
گرتے پڑتے اندر داخل ہوتے ہیں۔ انھوں نے اس بری طرح سے
میک اپ کیا ہوا ہے کہ نظروں کو کھل رہا ہے۔ پانچوں کردار
بالترتیب اس طرح کے ہیں۔ ایک ہونق، ہر وقت باچھیں کھلی
ہوئی، اس نے ایک نقلی ناک چڑھا رکھی ہے۔ ایک عورت سنجیدہ
عینک پوش، کتاب کھول کر مطالعہ میں مصروف ہے۔ ایک عیاش
شخص جو ہر وقت عورت پر ہوس کی نظریں رکھے ہوئے ہے
اور رہ رہ کر سینٹ کی شیشی پتلون کی جیب سے نکال کر اپنی
بغلوں کو اسپرے کر رہا ہے۔ نتھنے سکوڑ رہا ہے۔ ماتمی لباس اوڑھے
ہوئے ادھیڑ عمر کا ایک مرد جو ہمیشہ ہونق کردار کے بغل میں
دکھائی دیتا ہے۔ آخری کردار ایک انتہائی خوفناک آدمی ہے،
آنکھیں سرخ، چندیا صاف، گال پر زخم کا نشان۔

نسیمہ۔ (سلیم سے) دوبارہ وہی سوال کرو۔
سلیم۔ کون سا؟
نسیمہ۔ وہی جو ابھی تم نے کیا تھا۔
سلیم۔ (لاپرواہی سے شانے اچکا کر۔) مجھے یاد نہیں۔
نسیمہ۔ تو میں پوچھتی ہوں۔ (کہانی کار سے مخاطب ہو کر۔) کہانی کار: تم نے انہیں زنجیریں کیوں پہنا رکھی ہیں۔ کون ہیں یہ لوگ؟
کہانی کار۔ (کرداروں سے مخاطب ہو کر۔) جواب دے، جواب دے۔
چوتھا کردار۔ (سلیم اور نسیمہ سے مودبانہ مخاطب ہو کر۔) سوال؟
سلیم۔ کون ہو تم لوگ؟
کردار۔ (کہانی کار سے۔) جواب؟
کہانی کار۔ میری کہانی کے کردار ہیں۔
نسیمہ۔ تمہارے کرداروں میں صرف ایک لڑکی کیوں ہے؟ یہ تو عورتوں کے ساتھ بے انصافی ہے۔
کہانی کار۔ کہانی کار کیا کرے۔ وہ مجبور ہے۔ وہ اردو میں ڈرامے لکھتا ہے۔ اسے عورتوں کے کردار نبھانے کے لئے لڑکیاں نہیں ملتیں۔
سلیم۔ تمہارا یہ کردار اس لڑکی کو بھوکی نظروں سے کیوں گھور رہا ہے؟
کہانی کار۔ (عیاش کردار سے) جواب دے۔
عیاش کردار۔ سوال؟
سلیم۔ تم کیوں اس لڑکی کو ہوسناک نظروں سے تاک رہے ہو؟
کردار۔ (کہانی کار سے۔) جواب؟
کہانی کار۔ کیونکہ یہ اتنا بے وقوف ہے کہ اپنی ہوس پر شرافت کا پردہ ڈال نہیں سکتا۔
نسیمہ۔ یہ لڑکی کون سی کتاب پڑھ رہی ہے؟ کیا ہر وقت وہ کتابیں ہی پڑھتی رہتی ہے؟
کہانی کار۔ (لڑکی سے) جواب دے!
لڑکی۔ (کتاب سے چہرہ اٹھاتے ہوئے۔) سوال؟
نسیمہ۔ کون سی کتاب اتنے غور سے پڑھ رہی ہو تم؟
لڑکی۔ (کہانی کار سے) جواب؟
کہانی کار۔ وہ اپنے ڈائلاگس یاد کر رہی ہے۔ نہیں دیکھتی تم کہ وہ زیر لب بڑبڑا رہی ہے۔ اسے کبھی اپنے ڈائلاگس یاد نہیں رہتے۔ اس لئے روانی میں وہ جو کچھ کہہ ڈالتی ہے ہم اسے ہی ڈائلاگ مان کر آگے بڑھتے جاتے ہیں۔
عورت کردار۔ مجھے ڈائلاگ یاد آ گیا۔ جب بچہ مر جاتا ہے تو میرا ڈائلاگ ہوتا ہے اوں، اوں، اوں (رونے کی اداکاری کرتی ہے)
کہانی کار۔ شاباش! (مڑ کر نسیمہ اور سلیم سے) سچ تو یہ ہے کہ میں نے جو کہانی لکھی ہے اس میں کسی بچے کا سرے سے وجود ہی نہیں لیکن اب ہمیں اس میں ایک بچہ ڈالنا ہوگا اور اسے مارنا بھی ہوگا ورنہ ہم اتنے بڑے ڈائلاگ سے محروم ہو جائیں گے۔ کتنا اچھا ڈائلاگ ہے اوں، اوں، اوں۔
نسیمہ۔ میرا خیال ہے بہتر ہوگا اگر تم بچے کو رونے کا کام اس کو سونپ دو (غضبناک کردار کی طرف اشارہ کرتی ہے۔)
کہانی کار۔ اس کا ایک بڑا ہی گھناؤنا نام ہے جو میں لینا نہیں چاہتا۔ لیکن اندر سے یہ اتنا برا نہیں جتنا اوپر سے نظر آتا ہے۔
نسیمہ۔ پھر وہ اتنی حیوانیت سے دوسروں کی طرف تاک کیوں رہا ہے؟
کہانی کار۔ (کردار سے تھیٹریکل انداز میں) جواب دے! جواب دے!
کردار۔ جب چہرے کھلتے ہیں تو میں ان کے اندر جڑیں پھیلاتا ہوں۔ جڑیں چہروں کے اندر پھیلتی ہیں۔ چہرے میرے اندر جڑیں پھیلاتے ہیں۔ میں جڑوں کے اندر پھیلتا ہوں۔ چہرے جڑوں کے ساتھ میرے اندر... میں جڑوں کے ساتھ چہروں کے اندر... چہرے میرے ساتھ جڑوں کے اندر... اندر، اندر، اندر...
نسیمہ۔ کیا بکواس ہے۔ یہ تو کوئی پاگل لگتا ہے۔
کہانی کار۔ نہیں، پاگل تو یہ ہے (ساتویں کردار کی طرف اشارہ کرتا ہے۔)
سلیم۔ (چونکتا ہو کر) کیا یہ وائلنٹ قسم کا پاگل ہے؟
کہانی کار۔ کوئی ضروری نہیں ہے۔ لیکن اس کے پاگل پن کا تعلق چاند سے ہے۔
سلیم۔ کیا مطلب؟
کہانی کار۔ یہ چاند کی روشنی برداشت نہیں کر پاتا۔ چاند کو دیکھ کر یہ کتے کی طرح بھونکنے لگتا ہے، آدمیوں کو کاٹنے دوڑتا ہے۔ دیکھو دیکھو میری پیٹھ پر اس کے کاٹنے کے سو نشان تو ہوں گے۔ (کوٹ، قمیض اور بنیان ایک ساتھ پشت پر پلٹ دیتا ہے۔)
(چونکتا ہو کر کہانی کار کی ننگی پیٹھ کا جائزہ لیتا ہے۔ دونوں کان جھاڑتا ہے۔ ہنستا ہے، منہ پھیر لیتا ہے۔ پل بھر کی خاموشی کے بعد۔) چاند سے رات آتی ہے۔ رات کی وجہ سے انسان پیدا

ہوتی ہے۔ انسان جو اشرف المخلوقات ہے۔

کہانی کار۔ (کپڑے برابر کرکے مڑتا ہے) اب چپ سادھ لے! انسان اشرف المخلوقات ہے۔ اور اسی اشرف المخلوقات کو تو کاٹتا پھرتا ہے۔

سلیم۔ تمہارا ایک بھی کردار صحیح ڈھنگ کا نہیں لگتا۔ ہم کیسے ان سے کام چلائیں گے؟

کہانی کار۔ تمہارا کیا خیال ہے؟ دنیا میں ڈھنگ کے لوگ موجود ہیں۔ صرف تم ٹھیک سے نہیں دیکھ سکتے ورنہ لوگ تمہیں پتھر کی قدیم مورتیوں سے بھی زیادہ ٹوٹے پھوٹے نظر آتے ہیں۔

سلیم۔ پھر بھی اداکاری کے لئے کچھ تو ذہنی توانائی چاہئے۔ مجھے نہیں لگتا کہ ہم تمہارے کردار کام میں لگا پائیں گے۔

کہانی کار۔ تو کیا خیال ہے۔ مجھے چلا جانا چاہئے (کرداروں سے مخاطب ہو کر) تو حرامزادو کسی دوسرے دروازے پر چلتے ہیں۔ کیوں؟ تم لوگ ایسا کچھ کیوں نہیں کرتے کہ پسند کر لئے جاؤ!

بونق کردار۔ اچھا، اچھا۔ تو میں یوں کرتا ہوں کہ کم بے وقوف نظر آؤں۔ کیوں؟ تو میں سمجھتا ہوں اس کے لئے سقراط کا ایک مقولہ کہنا کافی ہوگا۔ نہیں؟ تو میں آئنسٹائن کی تھیوری آف ریلیٹی وٹی پیش کرتا ہوں۔ پھر بھی نہیں؟ تو میں غالب کی شاعری میں فلسفہ لامعنویت کی جڑیں ڈھونڈتا ہوں۔ وہ بھی نہیں! تو میں کیا کروں؟

کہانی کار۔ بہتر ہوگا اگر تم اپنی نقلی ناک جیب میں رکھ لو۔

بونق کردار۔ نہیں۔ میں یہ نہیں کر سکتا۔ یہ تو میرا پیشہ ہے۔ نقلی ناک کے بغیر لوگ مجھے قبول نہیں کرتے۔ میں یہ نہیں کر سکتا۔

کہانی کار۔ (عورت کے کردار سے) اور تم' میری بیسویں صدی کی جین آسٹن!

عورت کا کردار۔ میں سمجھتی ہوں میں انٹلکچول نظر نہ آؤں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ (کتاب زمین پر پھینک دیتی ہے۔) اب میں ایک عام گھریلو عورت ہوں۔ اب میرا بھی ایک مزاجی خدا ہے جو ہر بات میرے اندر ایک طوائف ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہے۔ کاش میرے پاس ایک برقعہ ہوتا تو میں دکھا سکتی میں کتنی پردہ دار ہوں۔

کہانی کار۔ اس سے کام نہیں چلے گا بی بی۔ تمہیں آنکھ سے یہ عینک بھی اتارنی ہوگی۔

عورت کا کردار۔ اس کے بغیر تو میں کچھ بھی نہیں دیکھ سکتی۔

کہانی کار۔ اس سے تمہیں کوئی فرق پڑنے والا نہیں کیوں کہ اپنی پوری تاریخ میں تم نے ایک اندھے کا رول ہی ادا کیا ہے۔ کم آن' یہ عینک اتار کر مجھے دے دو۔

عورت کا کردار۔ نہیں، نہیں (پیچھے ہٹتے ہوئے) دیکھو میرے پاس صرف یہ آنکھیں ہی تو ہیں۔ جب سے تم لوگوں نے تہذیبیں ڈھالی ہیں مجھ سے میری آنکھیں چھین رکھی ہیں۔ اب جو میں تھوڑا بہت دیکھ سکتی ہوں تو مجھ سے یہ آنکھیں تو نہ لو۔ کم از کم مجھے ہر چیز کی صحیح تصویر تو دیکھنے دو۔

کہانی کار۔ (حقارت سے ہنستا ہے) صحیح تصویر' عورت تم پھر انٹلکچول ہو رہی ہو۔ بہتر ہوگا کہ تم اپنی کتاب اٹھا لو (کتاب اٹھا کر اسے دیتا ہے۔ مڑ کر عیاش کردار سے مخاطب ہوتا ہے) آہا!! میرے محو شاہ رنگیلے۔ آپ کے پاس اپنے آپ کو سدھارنے کا کون سا نسخہ ہے؟

عیاش کردار۔ (اپنی بغلوں میں اسپرے کرتے کرتے رک جاتا ہے۔ سینٹ کی شیشی کہانی کار کی طرف پھینکتا ہے جو اسے تھام لیتا ہے۔) میں سمجھتا ہوں میں پادری بن جاؤں (کھنکھار کر گلا صاف کرتا ہے۔ جیب سے ایک کیتھولک ٹوپی نکال کر سر پر رکھتا ہے اور تقریر کرنے لگتا ہے۔) حضرات! یہ ایک عیاش شخص بول رہا ہے جس کی آنکھیں خداوند یسوع مسیح نے کھول دی ہیں۔ ہم آج ایک عظیم روحانی انقلاب کے سامنے کھڑے ہیں۔ سائنس نے خود اپنی موت کا اعلان کر دیا ہے۔ کسی بھی لمحے آسمان زمین پر ٹوٹ سکتا ہے بلکہ اسے نگل سکتا ہے۔ ایسے لمحے میں کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم اپنی عبادت گاہوں کی سفیدی کروائیں، راہباؤں کو نئی عبادیں تاکہ وہ خوبصورت نظر آئیں اور کیا یہ ضروری نہیں کہ ہمارے پادری سر پر کم بال اگائیں کہ وہ عالم دین کی علامت بن سکیں اور جب آسمان زمین کو نگلے تو خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے؟

کہانی کار۔ (عیاش کردار کے سر سے ٹوپی نوچ کر اسے شیشی تھما دیتا ہے) کاش میں تیرے سر کے سارے بال نوچ کر تجھے تیرا آئیڈیل پادری بنا سکتا۔ کاش یہ آسمان تجھے نگل سکتا۔ (وہ غضبناک کردار کی طرف مڑتا ہے۔ کردار اس سے آنکھیں چرانے کی کوشش

کرتا ہے۔ کہانی کار ہنستا ہے۔) چلو شاباش شروع ہو جاؤ۔
غضبناک کردار۔ جب چہرے کھلتے ہیں....
کہانی کار۔ تو تم ان کے اندر جڑیں پھیلا کے۔ یہ نہیں چلے گا۔
غضبناک کردار۔ اچھا تو پھر میں سمجھتا ہوں مجھے یوں شروع کرنا چاہئے
جب سورج نکلتا ہے (مڑ کر کھڑکی میں روشن سورج کو دیکھ کر تصدیق
کرتا ہے۔) جب سورج نکلتا ہے تو بڑے شہر کے چھوٹے چھوٹے لوگ
بڑی بڑی عمارتوں سے باہر آتے ہیں۔ باہر جہاں بڑی بڑی سڑکیں
ہیں۔ چھوٹی چھوٹی گلیاں ہیں، بڑے بڑے خلائی اڈے ہیں۔ بڑے
بڑے پل ہیں۔ باہر جہاں آسمان روشن ہے دریا بہہ رہا ہے، پرندے
اڑ رہے ہیں اور جمبو جیٹ آسمان کے پردے پر سفید لکیریں ڈال
رہے ہیں۔ یہ ایک ایسے شہر کی کہانی ہے جو بجلی اور گیس لین سے زندہ
ہے۔ یہ ایسے لوگوں کی داستان ہے جو کسی طرح زندگی گزار کر اپنی
اپنی قبروں میں اترنا چاہتے ہیں۔ یہ ایک ایسی تہذیب کا قصہ
ہے جس نے انسان سے اس کے آنسو تک چھین لئے ہیں۔ دنیا سکے
کی طرح گول ہے اور اسی کے گرد گھومتی ہے۔ انسان جانور سے
اونچا ہے کیونکہ وہ اپنے دو پیروں پر کھڑا ہے اور اس کا ایک
قومی ترانہ ہے اور ایک راشن کارڈ اور ایک کیلنڈر اور اس کی
بیوی کسی دوسرے کے ساتھ نہیں سوتی۔ اچھا حضرات کیا آپ نے
کبھی کسی خرگوش کو اخبار پڑھتے دیکھا ہے۔ کیا کبھی سنا ہے کہ کوئی
شیر ایل پی جی سینڈر کے لئے قطار میں کھڑا ہو، یا کوئی سانپ
مباشرت کے بعد سگریٹ پی رہا ہو۔ ہاں، مینڈک ووٹ نہیں
دیا کرتے۔ کتے چائے دانی اور دودھ دانی کا فرق نہیں جانتے۔
الو نے شیکسپیئر کو نہیں پڑھا ہے، گدھے سینگ فین سے تنگ کر
خودکشی نہیں کیا کرتے، شمپانزی یہ نہیں جانتا کہ ایک اچھے درزی
کے بغیر ہم اکیسویں صدی میں نہیں جا سکتے۔ تو کیا ان سب باتوں
سے ثابت نہیں ہوتا کہ ہم اشرف المخلوقات ہیں۔ لیکن... لیکن...
(تھوک نگلتے ہوئے) لیکن... (آنکھیں باہر کی طرف ابل پڑتی ہیں
جیسے کوئی ان دیکھا ہاتھ گلا گھونٹ رہا ہو)... جب چہرے کھلتے
ہیں...
کہانی کار۔ (دونوں کان ہتھیلیوں سے دبا کر۔) اس سے کہو کہ اپنا مرثیہ
بند کرے۔ یہ آؤٹ آف فیشن ہو چکا ہے۔ اوہ، اوہ، کیا میں
واقعی اتنا غریب ہو گیا ہوں کہ اب ایک صحیح کردار بھی مجھ سے

نہیں لکھا جاتا۔
ماتمی کردار۔ جسے دیکھو اپنے وجود کی ٹریجڈی پر بحث کرنے میں مصروف ہے۔
کہانی کار۔ (چونک کر ماتمی کردار کے قریب آتا ہے۔ اس کے چاروں
طرف چکر لگاتے ہوئے اس کا جائزہ لیتا ہے جیسے وہ فنِ سنگ
تراشی کا کوئی نمونہ ہو) یہ تمہاری آواز تھی نا؟
ماتمی کردار۔ (سر اٹھاتا ہے۔) میں نے کچھ نہیں کہا۔
کہانی کار۔ (سلیم اور نسیم سے مخاطب ہو کر...) کہتا ہے میں نے کچھ نہیں
کہا۔ (مڑ کر ماتمی کردار کے سر پر ایک دھول جماتا ہے۔ ماتمی
کردار سر اٹھاتا ہے۔)
ماتمی کردار۔ چاند سے رات آتی ہے۔ رات جو سکون کی علامت ہے۔ سکون
جو مختلف لوگوں کے لئے مختلف معنی رکھتے ہیں۔
کہانی کار۔ تمہارے لئے یہ کون سا معنی رکھتا ہے؟
ماتمی کردار۔ (سر اٹھاتا ہے۔) میں نہیں جانتا۔
کہانی کار۔ (سلیم اور نسیم سے مخاطب ہو کر۔) کہتا ہے میں نہیں جانتا۔
(مڑ کر ماتمی کردار کے سر پر ایک دھول جماتا ہے۔ ماتمی کردار
سر اٹھاتا ہے۔)
ماتمی کردار۔ میرے لئے سکون سورج کے پیچھے ہوئے گولے کی طرح ہے
جس کے پاس ہم جا نہیں سکتے۔ مگر جس کے بغیر ہماری زندگی بھی
ناممکن ہے۔
کہانی کار۔ اور میرے لئے سکون ایک گدھے کی طرح ہے جسے ہم اپنی پیٹھ
پر اٹھائے پھرتے ہیں۔
ماتمی کردار۔ دنیا میں سکون صرف گدھوں ہی کو نصیب ہے کیوں کہ
کپڑے دھونے کی مشین ملک میں آچکی ہے اور ہمارا روایتی دھوبی
کارخانے میں مزدور یونین کا سکریٹری ہے۔
کہانی کار۔ (سلیم اور نسیم سے مخاطب ہو کر۔) سنا تم نے۔ اب وہ پاگل
نہیں رہا۔ خدا کی قسم وہ پاگل نہیں رہا۔ میں ابھی ثابت کر سکتا
ہوں کہ وہ پاگل نہیں رہا۔ (پاگل کو کندھے سے پکڑ کر کھڑکی کے
نزدیک لے جاتا ہے جس میں اب چاند چمک رہا ہے۔) دیکھو، دیکھو۔
اب وہ چاند کو دیکھ کر بھی نارمل ہے، بالکل نارمل۔ (ماتمی کردار
کھڑا ایک ٹک چاند کو دیکھتا رہتا ہے۔ کہانی کار اس کی طرف
اپنی پشت موڑ کر تماشبین سے مخاطب ہوتا ہے۔) دوستو!
آخرکار مجھے ایک کردار ہاتھ آ ہی گیا ہے جسے میں آپ کے سامنے

پیش کر سکوں۔ جاؤ شہر میں منادی کرا دو کہ ہیں کردار مل گیا ہے۔ ڈرامہ اب شروع ہونے والا ہے۔ حضرات! سانسیں تھام کر بیٹھئے بس تھوڑی ہی دیر میں آپ دوسری دنیا ہوں گے۔ ہم آپ کو ایک بھرپور تفریح کی ضمانت... (جملہ ادھورا چھوڑ دیتا ہے کیونکہ باقی کرداروں نے کتے کی طرح بھونکنا شروع کر دیا ہے۔ پھر وہ تیزی سے مڑتا ہے۔ کہانی کار کی گردن تھام کر اس کی پشت پر اپنے دانت گاڑ دیتا ہے۔ کہانی کار کی چیخ پھیل جاتی ہے۔ وہ منہ کے بل زمین پر جا گرتا ہے۔ تمام کردار باقی کردار کو حلقے میں لے کر اس کی پیٹھ ٹھونکتے ہیں۔ بے ہوش کہانی کار کو سر پر اٹھائے ہوئے آخرکار... آخرکار کا نعرہ لگاتے ہوئے باہر چلے جاتے ہیں۔ اچانک اسٹیج اندھیرے میں غرق ہو جاتا ہے۔ دل کو دہلا دینے والا سناٹا۔ دور کسی کتے کے بھونکنے کی آواز۔ کھڑکی سے ایک قرمزی روشنی سلیم اور نسیمہ پر گرتی ہے۔ اسٹیج کا باقی حصہ اندھیرے میں غرق رہتا ہے۔ قریب ہی ایک دروازے کے کھلنے کی چرچراہٹ سنائی دیتی ہے۔

نسیمہ۔ (خوفزدہ ہو کر۔) مجھے ڈر لگ رہا ہے۔

سلیم۔ ڈر؟ کس چیز کا ڈر؟

نسیمہ۔ کتنا بھیانک سناٹا ہے۔ میں نے قریب ہی کسی دروازہ کے کھلنے کی آواز سنی ہے۔

سلیم۔ تمہیں وہم ہوا ہے۔ وہ تو دروازہ کے بند ہونے کی آواز تھی۔

نسیمہ۔ بند ہونے کی؟ پھر ہم اسٹیج سے باہر کیسے جائیں گے؟

سلیم۔ باہر جانے کی ضرورت ہی کیا ہے کیونکہ باہر بھی اندر ہے۔ کوئی دروازہ کہیں نہیں کھلتا۔ یہ سب انسان کا وہم ہے۔

نسیمہ۔ ہم لوگ اندر کیسے آئے؟

سلیم۔ ہم اندر نہیں آئے ہیں۔ ہم ہمیشہ اندر ہی تھے۔

نسیمہ۔ کتنی المناک بات ہے۔

سلیم۔ ہاں یہ واقعی المناک ہے۔ بلکہ اس سے بھی بدتر ہے۔

نسیمہ۔ اس سے بدتر کیا ہو سکتا ہے؟

سلیم۔ اس سے بدتر یہ ہے کہ یہ کچھ بھی نہیں ہے۔ ہر بات، ہر واقعہ اپنے آپ میں ایک مفروضہ ہے۔ ایک فرضی ایکس، وائی، زیڈ

نسیمہ۔ کیا اس ایکس، وائی، زیڈ کے باہر کوئی چیز نہیں۔؟

سلیم۔ نہیں۔ ایک چیز ہے۔

نسیمہ۔ وہ کیا؟

سلیم۔ ایکس، وائی، زیڈ

(اچانک اسٹیج پر روشنی ہو جاتی ہے۔ سورج کھڑکی میں چمک رہا ہے۔ سلیم آرام کرسی میں لیٹا ہو کر دستی چھڑی کو ہوا میں گردش دینے اور سیٹی بجانے لگتا ہے۔ نسیمہ اونی دستانے بُننے لگتی ہے۔ پل بھر کی خاموشی کے بعد نسیمہ دستانے سے سر اٹھاتی ہے۔)

نسیمہ۔ کتنا اچھا ہوتا اگر کہانی کار کو وہ لوگ نہ لے گئے ہوتے۔

سلیم۔ بیچارہ کہانی کار، اس کے کردار ضرورت سے زیادہ ہی زندہ ثابت ہوئے۔

نسیمہ۔ مگر میں کہتی ہوں تم نے جلدی کی۔

سلیم۔ کیسی جلدی؟

نسیمہ۔ تم صرف کہانی کار کے کرداروں ہی سے الجھ رہے۔ کم از کم کہانی کار سے کہانی تو سن لیتے۔

سلیم۔ مجھے نہیں لگتا اس کے پاس کوئی کہانی ہوگی۔

نسیمہ۔ پھر بھی تم نے جلدی کی۔

سلیم۔ کیسی جلدی؟

نسیمہ۔ کم از کم اس سے ڈائلاگس تو سن لیتے۔

سلیم۔ ڈائلاگس! یعنی اوں، اوں، اوں (رونے کی نقل کرتا ہے)

نسیمہ۔ پھر بھی تم نے جلدی کی۔

سلیم۔ کیسی جلدی؟

نسیمہ۔ کم از کم اس سے ہمارے رول کے بارے میں کچھ تو معلوم کر لیتے۔

سلیم۔ یہ ہم ڈائرکٹر سے پوچھ لیں گے (پس منظر سے مخاطب ہو کر) مسٹر ڈائرکٹر، مسٹر ڈائرکٹر!

ایک مردانی آواز۔ اس ڈرامے کا کوئی ڈائرکٹر نہیں ہے۔ سارے معاملات اپنے آپ ہی طے ہوتے ہیں۔ یہ کائنات ایک خودکار مشین ہے۔

(پردہ گرتا ہے) ❀

احمد وصی

الف لیلیٰ کی کتاب کا ایک ورق

یہ شہر، شہرِ طلسمات تو نہیں پھر بھی
یہاں کے لوگوں کو کس جادوگر کے جادو نے
سڑک کے موڑ پہ پتھر بنا کے چھوڑ دیا
سنا ہے میری طرح پہ بھی آ گئے تھے یہاں
انھیں بھی میری طرح اک تلاش لائی تھی
مگر انھوں نے ذرا پیچھے مڑ کے دیکھ لیا

تمام شہر میں ہلچل ہے اور صدا بھی نہیں
یہاں ہوائیں دھواں کیوں اڑاتی رہتی ہیں
یہاں فضاؤں میں کیوں زہر پھیلا رہتا ہے
وہ ایک سونے کا پنجرا کہ میں جس میں پنچھی تھا
کسی نے بیچ لیا اور اڑا دیا پنچھی
سنا ہے دیو بھی ان سازشوں میں شامل ہے
فصیلِ شہر نے دی ہے پناہ دشمن کو
امیرِ شہر نے دشمن سے دوستی کر لی

نہ جانے کس کی دعاؤں سے ہے بچا ورنہ
یہ شہر کب کا زمیں دوز ہو گیا ہوتا

● ۲/۱۳ ای، مہ جبیں نگر، اندھیری (ایسٹ) بمبئی ۴۰۰۰۹۳

شعیب نظام

سرگوشی

اک ذرا ہاتھ جو رکتا بھی ہے ستانے کو
کوئی سرگوشی سی کر دیتا ہے
یہ زمیں تیری ہے
یہ چاند ستارے تیرے
جو بھی ہیں زیرِ زمیں
سارے دفینے تیرے
سارے موتی بھی ترے
سات سمندر تیرے
سب کے سب ثابت و سیار ترانے تیرے
پھول سے کہکشاں تک ہے حکومت تیری
ہاتھ میں تیغِ جنوں
آنکھ میں امید لئے
اپنے خوابوں کا محافظ بن کر
وار پہ وار کئے جاتا ہوں
پھر بھی یہ جنگ ہے جانے کیسی
سر تو ہوتی ہے
یہ فیصل نہیں ہونے پاتی
ہر بڑا معرکہ سر کرنے پر
اک نیا مورچہ کھل جاتا ہے
اپنے بچپن سے ضعیفی کی حدوں تک میں بھی
برسرِ جنگ ہوں دیکھو اب تک
اک ذرا ہاتھ جو رکتا بھی ہے ستانے کو
کوئی سرگوشی سی کر دیتا ہے۔

● معرفت شاہد اختر۔ ۲/۲۲۷، جوہی لال کالونی، کانپور

اعجاز رضوی

مجھے رحم آتا ہے

مجھے رحم آتا ہے،
رکی ہوئی گھڑی
پر کٹے پرندے
شیشے میں بند مچھلی
آنکھ میں ٹھہرے آنسو
اور دریا میں بہتی ہوئی لاش پر،

مجھے رحم آتا ہے
نام و نمود کی کرسی
زرکی بوس منبر
دھند میں لپٹے خطیب
اور لفظوں کو سچا ثابت کرتی ہوئی تلوار پر

مجھے رحم آتا ہے
کھیل کی بے ایمانی
ٹھہرے ہوئے پانی
سرسبز درختوں کو کاٹتے ہوئے کلہاڑے
اور نگینوں کو پیٹتے ہوئے ہتھوڑے پر
مجھے رحم آتا ہے
اپنے آپ پر
اپنے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے لفظوں کی کھال پر
ماضی کے ظرفوں سے سجے ہوئے اپنے حال پر
مجھے رحم آتا ہے

● ماہنامہ تخلیق۔ ۱۹۔ اے ایبٹ روڈ لاہور

جب تک ہم اپنی شاعری کی زبان کو جہلا اور عوام کی زبان سے ممیز نہ کردیں، ہمیں کوئی تفوق اور ادبی امتیاز حاصل نہیں ہوسکتا۔ ہر زبان کا علمی اور ادبی حصہ عوام کی زبان سے فائق ہوتا ہے۔ جب ہماری شاعری رفعتوں کی حامل ہوگی تو ہمارے ہم آہنگ و ہمنوا بھی مجبور ہوجائیں گے کہ وہ ہمارے معیار تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ جو لوگ کم مائیگی و کم سوادی سے ہمارے معیار تک ہوا نہ کرسکیں گے انھیں فطرت خود آگاہ کردیگی کہ وہ شاعر نہیں فطرت خود آگاہ کردے گی کہ وہ شاعر نہیں اور انھیں اس میدانِ وسیع میں اپنی تگ و تاز ختم کردینی چاہیئے۔

[۲۸ر اکتوبر — ۱۹۳۳ء]

سیماب اکبرآبادی

مدیر

افتخار امام صدیقی

●

معاون

ناظر نعمان صدیقی

قیمت	۶ روپے

زرِ سالانہ ۶۰ روپے ◆ لائبریریوں سے ۷۵ روپے

تاعمر خریداری ۱۰۰۰ روپے ◆ معاونین سے ۱۰۰ روپے

ممالکِ غیر سے
۲۵ ڈالر — ۱۵ پونڈ

مظہر امام

کے نام مرحوم ادیبوں اور شاعروں کے خطوط

نصف ملاقات

مکتوب نگار

اثر لکھنوی
اختر انصاری
اشک امرتسری
باقی
حرمت الاکرام
خیر بہوروی
راہی معصوم رضا
ذکی انور
سہیل عظیم آبادی
شاہد احمد دہلوی
عبدالحمید شمس
فراق گورکھپوری
محمد طفیل
ممتاز حسین

اجمل اجملی
اختر اورینوی
اطہر پرویز
پرکاش پنڈت
حسن نعیم
ڈاکٹر ذاکر حسین
رشید احمد صدیقی
سجاد ظہیر
سید حسن
شکیل بدایونی
عصمت چغتائی
کرشن چندر
محمود احمد ہنر
مہجور شمسی

احتشام حسین
اختر قادری
اعجاز صدیقی
پرویز شاہدی
خلیل الرحمن اعظمی
راجندر سنگھ بیدی
رگھوپر سہائے
سلام مچھلی شہری
شاذ تمکنت
ظ۔ انصاری
علی عباس حسینی
کلیم الدین احمد
مخمور جالندھری
سید نذر امام

احمد جمال پاشا
ارشد کاکوی
امجد نجمی
جمیل مظہری
خواجہ احمد عباس
راجہ مہدی علی خاں
زرینہ ثانی
سلیمان اریب
شانتی رنجن بھٹاچاریہ
ظفر پیامی
غیاث احمد گدی
لطف احمد اکبرآبادی
ڈاکٹر مسیح الزماں
نریش کمار شاد

نشور واحدی

مرتب: ڈاکٹر امام اعظم ❁ قیمت: سو روپے

تقسیم کار: انجمن ترقی اردو (ہند) اردو گھر راؤز ایونیو نئی دہلی

نئے قلمکاروں کی حمایت میں

موجودہ مادی صورت حال کے پیش نظر چھوٹے شہروں میں ہر سال کئی ادبی اور غیر ادبی اخبار و رسائل ترتیب پا رہے ہیں. لیکن ایک طرح سے ایک عجیب خاموشی بھی ان حلقوں میں طاری ہے. اور ایک مبہم سا شور پیدا ہو رہا ہے. نئے پرانے ادیب و شعراء حرکت میں تو ہیں اور مصروف کار بھی لیکن عمومی طور پر اس جمود میں بھی ایک کیفیت بہت نمایاں ہے. اور جمود کا احساس دلا رہی ہے. جس کا سارا اسکوپ نئے قلم کاروں کو لگ رہا ہے کہ وہ اگر آزادانہ طور پر ادب تخلیق کر رہے ہیں. تو وہ کیا ہے اور کتنا تخلیقی اور کتنا غیر تخلیقی ہے. نئے قلم کاروں کی عصری ذہنی کو دیکھنا ہے. ملکی زبانوں کے ادب اور عالمی سطح پر تخلیق کے ابھرنے والے اہم عصر شعر و ادب کے تناظر میں نیا شعر و ادب کیسا ہے. ان کی انفرادی ذہنی تربیت اور اجتماعی تہذیبی شعور کو سنوارنے کی کوشش کس قدر کی جا رہی ہے. ایسا جب ترقی پسند تحریک کے زوال اور جدیدیت کے بکھراؤ کے بعد عالمی اصطلاحات میں کچھ اور نئے نظریے اور رویے کام کر رہے ہیں. ساختیات، پس ساختیات، جدیدیت، پس جدیدیت سے بہر کیف تنقید تک ہیں لیکن اردو شعر و ادب میں نئے نظریوں اور رویوں کے اثرات مرتب ہو رہے ہیں کہ نہیں. یہ ایک اہم سوال ہے مگر ان مسائل کو گرفت میں لینے اور غور کرنے سے قبل ان حالات کا جائزہ لینا ناگزیر ہو گیا ہے. جو نئے قلم کاروں کو در پیش ہیں

اردو کے نئے قلم کاروں کا اولین مسئلہ یہ ہے کہ وہ جس زبان میں ادب تخلیق کر رہے ہیں. وہ آزادی کے بعد سے مسلسل سیاست کا شکار رہی ہے اور اپنے رسم الخط سے دور ہوتی جا رہی ہے. مسلمان اور پاکستان سے وابستہ کی جانے والی اردو زبان "کو ہندوستان میں اپنا دفاع کرنا مشکل ہو رہا ہے. پھر یہ کہ سیاسی منصب داروں کی خواہش اور حوصلے نے خود اردو والوں میں منافقین پیدا کر دیئے ہیں. جو ریاکاری کی نیکیاں کما رہے ہیں، بلکہ اسی میں خوش ہیں. اپنی زبان و ادب سے دستبردار ہونے والے بہت سارے بزرگان ادب اب خاموش تماشائی بن گئے ہیں. اردو والوں کا سارا ذہنی اور جسمانی عمل اردو اکادمیوں، اردو کے سرکاری اداروں اور اردو کے نام پر ہونے والی روزی کمانے کے ذرائعوں تک محدود ہو گیا ہے. اپنے اپنے دائروں میں ہر ادیب اور شاعر خوش فہمیوں کا شکار ہے. جس سے کوئی امکان نہیں ابھر رہا ہے کہ جو اردو کے مستقبل کے لئے تقویت کا باعث ہو. ہمارے درمیان ایک انتشار پھیلتا جا رہا ہے اور اب اردو کے نئے قلمکار ہندی کی طرف جا رہے ہیں. شاید یہ میلان ہندوستان کے مشترکہ کلچر کے لئے اس وقت بے حد روشن تصور کیا جاتا جب ملک کی قومی زبان ہندوستانی ہوتی یا پھر ہندی اردو' مشترکہ قومی زبان ہوتی. مگر آج کا بڑھتا ہوا یہ رجحان رسم الخط کے لئے کتنا مفید اور کتنا مضر ہو سکتا ہے!

نئے قلم کاروں کے مسائل میں ایک اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ ملک کی موجودہ سیاسی صورت حال ان کے لئے توجہ نہ دینے کا سبب بنی ہوئی ہے کہ ان کی تخلیق طرز اظہار کیا ہو؟ سماجی حقیقت نگاری بے حد پیچیدہ، تہہ دار' اور پر اسرار عمل ہے. بے حد نازک بھی کہ ادب اور صحافت کا فرق فن پارے سے ظاہر ہو جاتا ہے کیا ہو. سپاٹ نثری بیان، وقتی سنسنی خیزی، برہنہ گفتاری، سب کچھ کتنا تخلیقی اور کتنا غیر تخلیقی ـــــ اور پھر ان سب کا رد عمل!؟. سچ تو یہ ہے کہ ختم ہوتی ہوئی بیسویں صدی تک آتے آتے انسان تو مر گیا ہے. مگر آدمی ابھی زندہ ہے. اور یہ زندہ آدمی سرحدوں کے اندر باہر ایک دوسرے سے دست و گریباں ہے. اس ادھورے آدمی کی آگہی میں روشنی معدوم ہوتی جا رہی ہے. نام نہاد ترقی پذیر سرحدوں کے اندر انتشار اور کشت و خون کچھ زیادہ ہی ہے اور پھر اردو کے قلم کار میں بہت پیچھے ہو رہے ہیں کے مصائب کی زد پر ہیں. انہیں آج بھی اپنی وفاداری کا ثبوت دینے کے لئے مجبور ہونا پڑتا ہے. ہندوستان میں شعر و ادب کا تصور پانچ ستارہ تہذیب کی ضرورت اور عوامی تفریح تک محدود ہو گیا ہے. اردو کے لئے سرکاری اعانتوں کے نتیجہ جو 'ہیت' کا مظہر ہے اس کا حال سب کو معلوم ہے. نئے قلم کاروں کو ہر قدم پر دشواریوں کا سامنا ہے. وہ اپنی منزل کی جستجو میں تو ہے مگر اپنے مستقبل کے لئے بھی فکر مند ہے وہ کیا کرے؟؟؟ .

یہ چند ضروری مگر بنیادی مسائل تو ہیں. مگر ان سے بھی زیادہ تکلیف دہ مسائل اور بھی ہیں جن کا تعلق گروہی نقادوں، شعبۂ اردو سے وابستہ استادوں اور فکر معاش سے پریشان ان کے شاگردوں بزرگان ادب، ابن الوقت بے چارے لوگ، مدیران رسائل، شعر و ادب کے دلال (مافیا گروپ) اور ان کے پھیلائے ہوئے مصنوعی مسائل اور مفروضے. ان سب پر مصلحتوں کے بغیر لکھنے کی ضرورت ہے. آئندہ شماروں میں خوف زدہ نئے قلمکاروں کے لئے مسرت و بصیرت کی سامگری مہیا کی جائے گی.

خاندان سیماب اور شاعر سے رابطے کیلئے نیا تبدیل شدہ ٹیلیفون نمبر نوٹ کر لیجیے (۲۸۲۹۹۰۴)

یوم چکبست

۱۲ر فروری سنہ ۱۹۳۹ء بروز یکشنبہ چکبست مرحوم کی یاد تازہ کرنے کیلئے ایک ادبی جلسہ بمقام قیصر باغ بارہ دری لکھنؤ منعقد ہوگا۔ جلسہ کی صدارت رائٹ آنریبل ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو پی۔ سی۔ کے۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ ایل۔ ایل۔ ڈی نے قبول فرمائی ہے۔ جلسہ کی دو نشستیں ہونگی پہلی ۱۲ بجے دن سے ۲ بجے دن تک اور دوسری ۶ بجے شام سے تا اختتام جلسہ۔

پہلی نشست میں مرحوم کے متعلق نظمیں اور عنوانات ذیل پر مقالات پڑھے جائینگے۔

(۱) چکبست بحیثیت شاعر
(۲) چکبست بحیثیت نثار و نقاد
(۳) چکبست بحیثیت مصلح و وطن پرست
(۴) چکبست پیامبر دور جدید
(۵) چکبست کی انفرادیت
(۶) چکبست کا پیام
(۷) اردو ادب میں چکبست کا مرتبہ

دوسری نشست میں حسب ذیل طرح پر مشاعرہ ہوگا۔

تنگ ہے میرے لئے چاک گریباں ہونا۔ گریباں، ارماں وغیرہ قافیہ "ہونا" ردیف۔

آپکی ادب نوازی سے امید ہے کہ تشریف لاکر جلسہ کو کامیاب بنائینگے۔

نیاز کیشان

برج کشن ٹوپہ جج خفیفہ لکھنؤ
آنریری سکریٹری برج نرائن چکبست میموریل فنڈ

آنند نرائن ملا۔ گولہ گنج لکھنؤ

● وصل بلگرامی [م: ۱۸ اکتوبر ۱۹۴۲ء] اور آنند نرائن ملا [پ: ۲۴ اکتوبر ۱۹۰۱ء] کی یہ تحریریں اس تہذیب کی مظہر ہیں جو آج بکھر چکی ہے۔ اپنے اسلاف کی قدر و منزلت، ادبی اجتماع کا شعور و معیار۔ یہ سب کچھ 'یوم چکبست' کے دعوت نامے اور دو بزرگوں اور ایک جوان قلم کار کے مابین ذہنی ہم آہنگی کا پتہ دیتے ہیں۔ وصل بلگرامی کی تحریر ۱۶ر جنوری ۱۹۳۹ء کی ہے۔ خط پر سنہ درج نہیں ہے لیکن دعوت نامے پر دیا گیا ہے۔ ملا صاحب اب ۹۳ سال کے ہونے والے ہیں۔ [ادارہ]

فضا ابن فیضی

دستِ دعا مفلوج ہے، کھولے کون، دعا کے دروازے
مدت سے چپ چاپ پڑے ہیں، شہرِ صدا کے دروازے

سب کو، بستی میں داخل ہو کر، اس کے پاس پہنچنا ہے
سانسوں کی دیواریں ٹھہریں، قصرِ فنا کے دروازے

مجھ سے خیر و خبر موسم کی، سبز پرندو! مت پوچھو
بند کئے بیٹھا ہوں میں تو، ابر و ہوا کے دروازے

میرے لئے بستی کا سفر بھی، تنگ حویلی جیسا ہے
رستوں کے یہ موڑ ہیں، یا نقشِ کفِ پا کے دروازے

خوش لفظانِ گلگوں شیوہ، آج بہت ہی یاد آئے
گونج رہے ہیں خوشبو کی دستک سے، صبا کے دروازے

یوں لگتا ہے، خوابوں کی دہلیز پہ، جب بھی اترا ہوں
مجھ سے باتیں کرتے ہیں، مشک اور حنا کے دروازے

ہمسایوں سے ربط و رفاقت، ایک پرانی بات ہوئی
سب نے تو دیواریں کھڑی کر لی ہیں، ہنسا کے دروازے

شاید کوئی آنکلے، بستی ہے مہاجر لوگوں کی
اس امید پہ پھرتا ہوں 'کاندھے' پہ اٹھا کے 'دروازے'

اک دن موسم نے کروٹ لی، اور کھنڈر ہو جائیں گے
ہم ہیں فضا پانی کے دریچے، اور، ہوا کے دروازے

مئو ناتھ بھنجن — یوپی

مخمور سعیدی

بمبئی ۱۹۹۳

کہیں ناریل کے درختوں کے پیچھے
کوئی سر جھکائے ابھی تک کھڑا ہے
مری دوستی کی امانت سنبھالے
مرا منتظر ہے

مگر میں
اداسی کے گہرے سمندر میں ڈوبا پڑا ہوں
مرے چاروں جانب
عداوت کی اونچی چٹانیں کھڑی ہیں
اگر میں چٹانوں سے سر مارتا ہوں
تو دشمن نہنگوں کے خوں خوار لشکر
لپکتے ہیں مجھ پر
میں چاہوں، کہ دشمن نہنگوں کی یلغار روکوں
انھیں بڑھ کے ٹوکوں
تو لگتا ہے جیسے
مرے دست و پا مضمحل ہو چکے ہیں
سکت کھو چکے ہیں

کوئی ناریل کے درختوں کے پیچھے
مرا منتظر ہے
مگر میں اداسی کے گہرے سمندر میں ڈوبا پڑا ہوں

۱۱۷ - غالب اپارٹمنٹس پرواز نگر، پیتم پورہ - د

سعید انجم
MESSETORGET 15
1266 OSLO 12 NORWAY

زرہ بکتر

"مجھے پہچانا؟" اوسلوا ئیرپورٹ پر ایک خوش مزاج لیکن والے مسافر نے پوچھا۔ عثمان کے سامنے مقبول تراش خراش کا کوٹ پہنے ایک نووارد کھڑا تھا۔ اس کے گلے میں پڑے سے فیتے نے اس کی عینک کی کمانیاں تھام رکھی تھیں۔

"میں انکار کیسے کرسکتا ہوں؟" عثمان نے خودکلامی کے انداز میں کہا۔

"یہی میرا خیال تھا!" مسافروں کی رہائش کیلئے مخصوص حصے میں وہ عثمان کے سامنے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "داڑھی، کرتا، شلوار اور قمیص غائب ہوجانے کے باوجود آپ مجھے پہچان ہی گئے۔"

"یعنی حلیہ بھی ایک زبان ہے۔ عثمان نے نووارد کی آواز، زبان اور لہجے میں مانوسیت محسوس کرتے ہوئے کہا۔ پھر ذہن پر زور ڈالتے ہوئے وہ بولا۔" بلکہ کہنا چاہئے کہ حلیہ انسان کی شناخت بھی ہے۔"

"واہ عثمان صاحب واہ!" وہ ہاتھ باندھ کر تعظیم کے انداز میں جھک کر بولا۔

"تو کہاں کی تیاری ہے آصف؟" اب عثمان نے اعتماد کے ساتھ نووارد کا نام لیا۔ گفتگو کے دوران داد دینے کا انداز اسی کے ساتھ مخصوص تھا۔ آصف کو وہ تک بھگ اپنا ہمسایہ کہہ سکتا تھا۔ کاریا لوکل ٹرین کی بجائے بس استعمال کرتے وقت دونوں کا اسٹاپ مشترکہ ہوتا تھا۔ ایک دفعہ وہ عثمان کے گھر بھی آیا تھا۔ سالانہ ٹیکس فارم پُر کرنے کیلئے اُسے مدد درکار تھی۔

"پاکستان جارہا ہوں جناب۔ لندن کے راستے۔" آصف نے بتایا۔ "میری بہن رہتی ہے وہاں۔ اس کا بھی دل تھا میرے ساتھ چلنے کو۔ میں نے کہا چل۔ چنانچہ ایک دو دن لندن میں پھر پاکستان...... اور آپ کدھر؟"

"میں تو صرف لندن تک جارہا ہوں۔" عثمان نے بتایا

"واہ جی واہ! موج ہوگئی!" آصف خوش ہوکر بولا۔ "ساتھ ہوگیا۔ پھر یک دم وہ اٹھتے ہوئے بولا "میں آپ کے پینے کے لئے کچھ لاؤں؟ فلائٹ میں تو ابھی وقت ہے عثمان کے کچھ بولنے سے پہلے ہی وہ کیفے ٹیریا کی لائن میں جا کھڑا ہوا۔

غیر متوقع ہمسفری کے خیال سے عثمان کو بہت کوفت ہوئی۔ وہ نینا کے تصور میں مگن تھا جو اسے غیر ملکی اخبارات کے سیکشن میں ملی تھی۔ اب وہ لندن میں اس کا انتظار کررہی تھی۔

"میری فہرست پر تم پہلے آدمی ہو جو اپنے وطن میں غریب تھے۔" نینا بولی جب وہ باتیں کرنے لائبریری سے باہر آگئے

"کیا مطلب؟" عثمان نے حیرانگی سے اُس کی طرف دیکھا

"جتنے بھی پاکستانیوں سے میں نے بات کی ہے وہ وطن میں غریب نہیں تھے۔"

"تمہارا مطلب ہے دوسروں نے خود کو غریب تسلیم نہیں کیا؟" عثمان نے پوچھا۔

"شاید ایسے کہنا ہی بہتر ہو۔" نینا سوچتے ہوئے بولی "لیکن کیوں؟؟"

"اس لئے کہ وہاں غربت انسان کی ذاتی خامی بن جاتی ہے" عثمان نے بتایا۔

"اچھا؟" نینا نے غیر واضح انداز میں کہا۔

"یہاں پر خود کو عزیب ماننے والا اس "صفت" کو اپنی ذاتی خامی نہیں سمجھتا۔"

عثمان نے وضاحت کرنے کی کوشش کی۔ "وہ یہاں کے سسٹم کو اس کا ذمہ دار سمجھتا ہے۔"

"اور کون سا اعتراف وہاں پر ذاتی خامی بن جاتا ہے؟" نینا نے پوچھا

"اعترافات کی بجائے اس وقت مجھے کچھ اعمال یاد آ رہے ہیں جو ذاتی خوبیاں بن جاتے ہیں۔"

عثمان کی آنکھوں میں شرارت ناچی

"اچھا!" نینا کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ "وہ کون سے؟"

"لڑکیوں کے ساتھ باتیں کرنا۔ ان کے ساتھ گھل مل جانا" عثمان شوخی سے بولا۔

..... پھر اپنی اپنی گھڑیاں دیکھتے ہوئے دونوں نے ٹیلیفون نمبروں کا تبادلہ کیا۔ خالی اوقات میں دوبارہ ملنے کا وعدہ کیا اور ایک دوسرے کو خدا حافظ کہتے ہوئے اپنی اپنی راہ چل دیئے۔

رات کو سونے سے پہلے عثمان نے ایک کتاب کھولی تو اس میں سے نینا جھانک رہی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے پائینتی کی دیوار پر ٹنگی گھڑی کو برا بھلا کہا، گویا وہی اس کو وقت میں کمی کی ذمہ دار ہو۔ بستر کے اوپر ٹنگی بتی بجھا کر وہ کپڑوں کی الماری کی طرف منہ کر کے لیٹ گیا۔ معلوم نہیں رات کا کونسا پہر تھا کہ الماری کا دروازہ آہستگی سے کھلا۔ شب خوابی کا لباس پہنے وہاں سے نکل کر لمبے بال کھول کر وہ بستر کے دوسری طرف سنگھار میز کے سامنے بیٹھ گئی۔ چھوٹی بڑی شیشیوں اور بوتلوں کے ملائم ڈھکن کھلتے بند ہوتے رہے اور خواب گاہ میں خوشبوئیں پھیلتی رہیں۔ وہ فارغ ہو گئی تو عثمان نے بستر پر اس کے لئے جگہ بنائی۔ لیکن وہ تو ہوا میں تحلیل ہو گئی۔ عثمان اٹھ بیٹھا۔

سامنے کی دیوار پر گھڑی کی جگہ سے ایک فریم نظر آیا جس میں نینا تصویر کی صورت مسکرا رہی تھی۔

عثمان ابھی ناشتے ہی میں مصروف تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ خالی اوقات کی فہرست کے ساتھ دوسری طرف نینا تھی تاکہ پاکستان دولی کے بارے میں مقامی معاشرے کے احمقانہ خیالات کی بابت گفتگو کرنے کے لئے اس کے پاس ملاقات کی ایک تجویز تھی ہنستے مسکراتے عثمان نے وقت طے کر لیا۔

باتیں کرتے اور خواب دیکھتے وقت تیزی سے گزر گیا نینا ایک پروجیکٹ کے لئے لندن چلی گئی۔ عثمان کے پاس ایک پرچھائیں رہ گئی جو چھونے کے خیال ہی سے ہوا میں تحلیل ہو جاتی۔ اب لندن کا ریٹرن ٹکٹ اس کے پاس تھا۔ نینا کو ویک اینڈ کیلئے عثمان کی ضرورت تھی۔ معلوم نہیں یہ ریسرچ پروجیکٹ کا کمال تھا یا اس میں کچھ حصہ چاہت کا بھی تھا۔

"یس جناب!" آصف ایک ٹرے اٹھائے واپس آ گیا۔

"ارے! اتنا کچھ لانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"یہ زیادہ تو نہیں ہے۔ بس میٹھا پھیکا ہے اور ٹھنڈا گرم" آصف نے بتایا۔

"کیا مطلب؟" عثمان نے شاید وضاحت چاہی

"یہ کوک ہے اور منرل واٹر چائے ہے اور کافی"

"تم کیا لو گے؟" عثمان نے پوچھا

"آپ اپنی پسند لیں۔ جو بچے گا وہ میرا۔" آصف نے بتایا۔

"کیوں؟"

"میرے لئے میٹھا ہو یا پھیکا۔ چائے ہو یا کافی ایک ہی بات ہے۔"

"ذائقوں سے ایسی لاتعلقی اچھی نہیں ہوتی۔" عثمان ناصحانہ انداز میں بولا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" آصف نے کہا۔ "دوسروں کو ان کی پسند کا ذائقہ مہیا کر کے مجھے خوشی ہوتی ہے۔"

جہاز کے ٹیک آف تک تو وہ اپنی اپنی سیٹوں پر رہے لیکن سگریٹ نوشی اور پیٹیاں باندھے رکھنے کی ہدایت والا نشان بجھتے ہی آصف عثمان کے ساتھ والی خالی سیٹ پر آن بیٹھا

"تم پیتے پلاتے نہیں؟" کھانے کے ساتھ وائن لیتے ہوئے عثمان نے پوچھا۔

"پیتا تھا کبھی۔ شادی کے بعد چھوڑ دی۔" آصف نے بتایا۔

"کیوں؟"

"میری بیوی کو شراب کی بو سے ڈر بہت لگتا ہے۔"

"تو بیوی کو خوش کرنے کے لئے چھوڑ دی؟" عثمان نے پوچھا۔

"یہی سمجھ لیں۔" آصف نے بتایا

"اور داڑھی کسی خوشی میں منڈوا دی؟"

"یار دوستوں کو خوش کرنے کے لئے۔"

"کیا مطلب؟" عثمان کچھ سمجھا نہیں۔

"داڑھی کے ساتھ پاکستان جاتا تو یار دوست کبھی خوش نہ ہوتے۔"

"کیوں؟" عثمان نے حیرانی سے پوچھا

"وہ کہتے "مولوی بننے کے لئے لندن جانے کی ضرورت کیا تھی؟"

"کیا سوٹ بھی کسی کو خوش کرنے کے لئے پہنا ہے؟" عثمان نے مزہ لینے کی خاطر پوچھا۔

"ہاں! آصف سنجیدگی سے بولا۔" شلوار قمیص کو دیکھ کر جہاز کا عملہ اور ایئر پورٹ کے لوگ خوش نہیں ہوتے۔ سوٹ پہن لو تو ان کا سلوک بدل جاتا ہے۔ وہ آپ کہہ رہے تھے نا..... لباس کی بھی ایک زبان ہوتی ہے۔

"یعنی تم سب کام دوسروں کو خوش کرنے کے لئے کرتے ہو؟" عثمان نے آصف سے پوچھا۔

"یہ تو مجھے پتہ نہیں"

"تم نے کبھی خود کو بھی خوش کیا ہے؟" عثمان کے سوالات جاری رہے۔

"ہاں" آصف مسکراتے ہوئے بولا۔ "جب میں دوسروں کو خوش کرتا ہوں تو مجھے خوشی ہوتی ہے۔ میرے عزیز و اقارب میرے خاندان کے لوگ، میری جان پہچان والے میرے لئے بہت اہم ہیں۔ ان کو خوش کرنے کے لئے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں جو لوگ مجھے اچھے لگتے ہیں ان کو خوش کر کے مجھے بہت خوشی ہوتی ہے۔"

"چیرز!" عثمان نے اپنا گلاس اٹھایا۔

"ایک بات اور بھی ہے جس میں مجھے بہت مزہ ملتا ہے۔" آصف نے بتایا۔ کھانے کے بعد سگریٹ پیتے ہیں۔ اب پینے کو دل کرتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے آصف اٹھا اور جہاز کی پچھلی سیٹ کی طرف چلا گیا۔ جو سگریٹ نوشی کے لئے مخصوص تھیں۔

"یہ بھی آصف ہے!" نینا نے بتایا۔

عثمان کے سامنے نئی چھپی ہوئی لئے ایک پاکستانی کھڑا تھا جین کی پتلون کے اوپر برطانیہ کی ایک یونیورسٹی کا مونوگرام اس کے سینے پر راکٹ کی صورت جھول رہا تھا۔

"ہیلو!" اس نے مسکراتے ہوئے عثمان کو کہا

"ہیلو" عثمان بھی بے دلی سے بولا۔

اس کی طبیعت کی شوخی بس اس وقت تک قائم رہی تھی جب تک نینا نے اس یونیورسٹی والے آصف کا ذکر نہیں کیا تھا۔

ایئر پورٹ پر وہ عثمان کو گرم جوشی سے ملی۔ اوسلو والے آصف سے ہاتھ ملایا اور تھوڑی دیر اس سے باتیں بھی کیں۔ پھر اسے خدا حافظ کہتے ہوئے عثمان کے ساتھ بس اور گاڑی اسٹیشن کی طرف چل پڑی۔ اس وقت تو عثمان کا جی بہت ہی خوش ہو گیا۔ جب چلتے چلتے نینا نے اپنا بازو عثمان کے بازو میں ڈال دیا۔

اس کے بال کھلے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی نینا سر جھٹکتی تو وہ ملائم بال عثمان کے چہرے سے چھو جاتے۔ وہ گھبرا کر نینا کی طرف دیکھتا کہ کہیں وہ ہوا میں تو تحلیل نہیں ہو گئی لیکن وہ مسلسل اس کے پہلو میں تھی۔

اب عثمان کو نینا کی خواب گاہ میں پہنچنے کا انتظار تھا۔ اسے یقین ہو چکا تھا کہ شب خوابی کا لباس پہنے جب نینا کپڑوں کی الماری سے نکلے گی تو اس بار وہ ڈریسنگ ٹیبل سے سیدھی بستر کی اس جگہ پر آن لیٹے گی جو عثمان اس کے لئے بنانے کا عادی ہو چکا تھا۔

ایک ریسٹورنٹ میں کھانا کھانے کے بعد وہ ریسرچ سینٹر کے ہوسٹل میں پہنچے تو عثمان کو معلوم ہوا کہ نینا نے اس کے لئے ایک الگ کمرے کا بندوبست کر رکھا ہے۔ اس کو لندن جانے

کا مقصد آصف نامی پاکستانی کا انٹرویو کرنا تھا تاکہ نینا مغربی ملک کی یونیورسٹی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ پاکستانیوں کی خوشی کے تصورات کو بھی جان سکے۔ پاکستان کے غیر تعلیم یافتہ لوگوں کے انٹرویو وہ عثمان کے ساتھ راولپنڈی میں کر چکی تھی۔

"میرے بعد آصف برطانیہ میں نینا کے لئے شاید وہی کام کرے گا جو میں نار وے میں کرتا رہا ہوں۔ عثمان نے سوچا۔

اگلے روز وہ تینوں ایک اوپن ریسٹورنٹ میں بیٹھ گئے لندن کے آسمان پر سورج چمک رہا تھا۔ فضا کا درجہ حرارت نارمل سے کہیں زیادہ تھا۔ آصف کی آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ تھا جس کی کمانیوں کو اس فیتے نے تھام رکھا تھا جو اس کے گلے میں پڑا تھا۔ اس کے سامنے رکھے بیئر کے گلاس میں جھاگ کے بلبلے پھوٹ رہے تھے۔ نینا نے متفکر آنکھوں کے ساتھ عثمان کی طرف دیکھا۔

"آپ خوش کب ہوتے ہیں؟" عثمان نے پوچھا

"خوش ہونا ایک کیفیت کا نام ہے۔" آصف نے جواب دیا۔"

"یعنی؟؟"

"اس کی تجسیم لفظوں میں ممکن نہیں۔" آصف بولا

"بیان کرنے کی کوشش تو کی جا سکتی ہے" نینا نے مشورہ دینے کے انداز میں کہا

"خوشی کا تعلق آزادی سے ہے...."

"ہاں ہاں!!" نینا لکھتے ہوئے بولی

"آزادی جو انسان کے لئے ایک مغلوب پروڈکٹ ہے۔"

"مغلوب پروڈکٹ سے کیا مراد ہے؟" عثمان نے پوچھا

"انسان کی آزادی خود اس کے پاس نہیں ہوتی۔ نظم و نسق کے نام پر کسی انتظامیہ کے پاس ہوتی ہے تو کبھی محبت کے نام پر خاندان کے پاس رہتی ہے۔"

آصف نے وضاحت کی۔

"یعنی جب تک آپ آزاد نہیں ہیں آپ خوش نہیں ہیں؟"

"درست! اس حقیقت سے واقف افراد ہر صورت حال میں اپنی آزادی خود اپنے پاس رکھنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن انسان کی آزادی اس کے پاس مستقلاً نہیں رہتی۔ دوسرے اُسے سلب کئے رکھتے ہیں۔ مجھے اپنی آزادی عزیز ہے اس لئے ہر لمحہ اپنی آزادی کی جنگ کے لئے تیار رہتا ہوں۔ میری خوشی کا لمحہ وہی ہوتا ہے جب میں آزاد ہوتا ہوں۔ لیکن یہ کوئی مستقل کیفیت نہیں ہے۔" آصف نے اپنی بات ختم کی۔

عثمان نے جماہی روکنے کے لئے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ نینا نے قلم بند کیا اور میز پر رکھے کاغذ کو تہہ کرنے لگی آصف نے چیرز کہتے ہوئے بیئر کا ایک بڑا سا گھونٹ بھرا۔

"تم جماہیاں کیوں لینے لگے تھے؟" آصف جا چکا تو نینا نے پوچھا

"اس کی بات میں کوئی نیا پن نہیں تھا۔" عثمان نے بتایا۔

"واقعی؟؟"

"ہاں! تمہارے ایک نامور مصنف JENS BJTNEBOE کا قول ہے کہ انسان کو اپنی آزادی ہر روز فتح کرنا ہوتی ہے۔" عثمان بولا۔ پھر وہ اپنا گلاس اٹھاتے ہوئے کہنے لگا۔ "لیکن تم نے قلم کیوں بند کر لیا تھا؟"

"ایسا میں نے ارادتاً نہیں کیا تھا۔" نینا نے بتایا

"ہاں! عجیب لوگوں کا اثر مجھ پر عجیب طرح سے ہوتا ہے۔"

"کل ایئرپورٹ پر بھی تم نے یہی کہا تھا۔" عثمان نے یاد دلایا

"وہاں پر آصف کے بدن پر گرم سوٹ تھا اور یہاں آصف کے بدن پر محض ایک لاکٹ" نینا نے بتایا۔

"سوٹ اور لاکٹ کو ان کا پہناوا مت سمجھو" عثمان بولا

"تو اور کیا سمجھوں؟"

"زرہ بکتر!"

"زرہ بکتر؟... کیوں؟؟"

"اپنے تحفظ کے لئے۔ مغرب کے تعصب کے خلاف تحفظ۔" عثمان بولا "اپنی اپنی عقل کے مطابق اپنی اپنی زرہ بکتر آصف نے مجھے بتایا تھا کہ سوٹ کی وجہ سے ایئرپورٹ اور ہوائی جہاز کے عملے کا سلوک اس کے ساتھ بدل جاتا ہے۔ لندن والے آصف کے پاس بھی ایسی ہی کوئی وضاحت ہوگی۔"

[باقی صفحہ ۱۹ پر دیکھئے]

حامدی کاشمیری

مسعود منزل، شالیمار۔ سری نگر۔ کشمیر

نئی نفسیات، نئی شعری کائنات
پر ایک نظر

مدیر شاعر افتخار امام صدیقی کی یہ مسلسل خواہش اور کوشش رہی ہے کہ نئی نسلوں کے باصلاحیت اور ذہین تخلیق کاروں کی مناسب حوصلہ افزائی کی جائے۔ اور ان کی نگارشات کو شاعر کے صفحات میں نمایاں جگہ دی جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ ادبی اقدار کے فروغ اور ترویج و اشاعت کے تعلق سے ایک مستحسن اور قابل قدر کام ہے۔ ادبی جرائد کے مدیروں سے یہ توقع کرنا بیجا نہیں کہ وہ مستند فنکاروں کے ساتھ ساتھ نوآمدہ قلمکاروں کو بھی مربوط اور موثر طریقے سے متعارف کریں۔ اور یہ کام معاصر مدیروں میں افتخار امام صدیقی جس لگن، ربط و تسلسل اور دردمندی سے انجام دے رہے ہیں۔ اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ ابھی چند ماہ قبل انہوں نے شاعر کی جلد ۶۴، شمارہ ۸ میں "نئی نفسیات، نئی کائنات" کے تحت ۲۶ نئے شعراء کی ان کی تصاویر کے ساتھ ۹۱ غزلیں / نظمیں شائع کی ہیں۔ اور اپنے اداراتی نوٹ میں مذکورہ عنوان کے تحت ان شعراء کی تخلیقات کے بارے میں بعض توجہ طلب نکات اور تاثرات کا اظہار بھی کیا ہے۔ ان شعراء کی منتخب تخلیقات ایک ساتھ پڑھ کر ان کے تخلیقی اور فنی رویوں کے بارے میں رائے زنی آسان ہو جاتی ہے، اور مجموعی طور پر نئی شاعری کے خدوخال کی خواہ وہ مبہم ہی کیوں نہ ہوں، پہچان ممکن ہو جاتی ہے، اور یہ اندازہ لگانے میں دقت نہیں ہوتی کہ نوآمدہ شعراء اکیسویں صدی کی دہلیز پر نمودار ہو کر اپنے ساتھ کیا سوغاتیں لے کر آئے ہیں۔

اردو نقادوں کی یہ پرانی عادت ہے کہ وہ اپنی ساری توجہ ماضی و حال کے معروف اور بزرگ لکھنے والوں ہی پر مرکوز کرتے ہیں۔ اور نوخیز فنکاروں کی تحریروں کو چھوتے بھی نہیں، وہ بقول سید احتشام حسین "آبگینوں کو ٹھیس لگانے سے" احتراز کرتے ہیں، مگر ایک اہم تنقیدی فریضے، یعنی نئی نسلوں کی تحسین شناسی کو پس پشت ڈال دیتے ہیں، یہ توجیہہ بھی کی جاتی ہے کہ نئے لکھنے والوں کے بارے میں کوئی تنقیدی رائے اس لئے قائم نہیں کی جا سکتی، کیونکہ وہ ذہنی ارتقاء کی منزلوں پر گامزن ہوتے ہیں، اور پختگی سے دور ہوتے ہیں جب تک قطرے سے گہر ہونے تک کا سفر ہے، جو حلقۂ صد کام نہنگ کے خطرات سے مملو ہے یہ دلیل خاصی معقول ہے، لیکن ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات کے مصداق، نوخیز شعراء کی چیدہ چیدہ تخلیقات بھی ان کی تخلیقی ذکاوت کا پتہ لگانے میں مدد دے سکتی ہیں۔ اور یہ کام جان جوکھم میں ڈالنے کی حد تک مشکل ہونے کے باوصف دلچسپ ہے، اور نتیجہ خیز بھی۔ فن پارے کو فنکار کی شخصیت سے الگ کر کے، اسے ایک خود مختار وجود کے طور پر تسلیم کرنے سے یہ کام بہت آسان ہو جاتا ہے۔ فنکار کے بجائے تخلیق شدہ فن ہی، خواہ بزرگ شاعر کا ہو یا نوخیز شاعر کا، معروضی مطالعے کی بنیاد فراہم کرتا ہے، اس لئے یہ لازم آتا ہے کہ وقفے وقفے سے نئی نسلوں کی ذہنی اور فکری تگ و تاز کا احتساب کیا جائے، تاکہ نئی تخلیقی سرگرمیوں کی سمت و رفتار کا کچھ اندازہ ہو سکے، اور نئے فنکاروں کو بھی اپنے تخلیقی اظہارات کے امکانات اور حدود کی واقفیت ہو، اور انہیں قارئین سے ترسیل و ابلاغ کے رشتوں کی اہمیت اور نوعیت کی آگاہی ہو۔

"نئی نفسیات، نئی شعری کائنات" کے تحت جن شعراء کی منتخب غزلوں / نظموں کو اکٹھا کیا گیا ہے، ان پر ایک تحسینی نظر ڈالنے
... نئی فضا کے تخلیقی ذہن کا سفر بلا رکاوٹ جاری رہا ہے، اور وہ اپنے لئے ستاروں سے آگے کے نادیدہ

جانوں کی تلاش میں ہے۔ یہ تخلیقات نئی نسلوں کی فکری تجربات، لسانی رجحانات اور تخلیقی ترجیحات کا رمزیہ اظہار ہیں، اور بہت کچھ سوچنے کی ترغیب دیتی ہیں، ان کے مطالعے سے شاعری کے نئے تخلیقی امکانات کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ امکانات نئے تنقیدی اقدار کے لئے راستہ ہموار کرتے ہیں،

محسن رضا، جو اس فہرست میں شامل ہیں لکھتے ہیں۔

سے فن پاروں سے ماخوذ ہیں تنقید کے اقدار فن پر کسی ناقد کا اجارہ تو نہیں ہے

ان شعراء کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ، جدید تر دور سے متعلق ہونے کے باوصف، اردو کی شعری اور لسانی روایات سے شعوری اور غیر شعوری طور پر منسلک ہیں، کوئی بھی جدت پسند شاعر روایت کے شعور سے بیگانہ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ روایت خون میں محلول ہوتی ہے، اور نسل بعد نسل فنکاروں تک منتقل ہوتی ہے۔ ایک سچا فنکار روایت کو کابوس نہیں بناتا، بلکہ اس کے شعور سے جدت پسندی کو بے راہ روی کا شکار ہونے سے بچاتا ہے۔ اور اپنی تخلیقی اپج کو صحیح سمت سے آشنا کرتا ہے، وہ معاصر بحرانی حالات کے زیر اثر شعور کی گہرائی کا احاطہ کرنے کے لئے اظہار کے نئے اسالیب تراشتا ہے۔ اقبال اس کی مثال ہیں نئے فنکار نئی صدی کے طلوع ہونے کے ساتھ ساتھ ابھر رہے ہیں، اس لئے نئے چیلنجوں کا سامنا کرنے، اور نئے شعور کے تقاضوں کے مطابق جدت پسندی کا مظاہرہ کرنے کے باوصف، اردو شاعری کی روایت سے بیگانہ نہیں، وہ کلاسیکی اور جدید شاعری کے ذخیرۂ الفاظ ہی کو اپنا سرمایۂ جاں سمجھتے ہیں۔

ملاحظہ کیجئے: رمز موسم، شجر سایہ دار، صبح فردا، جنگل، چراغاں، داغ، ستارے، پرندہ، آسیب، رہگزر، چشم گریہ ناک آسماں، منتظر، رات، محشر، تہ داماں، لب بام، محمل لیلیٰ، صحرا، سراب، عذاب، شمع، دھواں، شعلہ، دھوپ، افسردگیٔ جاں، گلزار، سمندر، حصار، گوشۂ سفر، دیواریں، لشکر،

وہ غزل کی مسلمہ صنف، اور نظم کی مقبول جدید ہیئتوں سے تجاوز نہیں کرتے۔ ترکیب سازی اور استعارہ کاری میں بھی وہ روایت ہی کو عزیز رکھتے ہیں، یہاں تک کہ مجموعی طور پر احساس ہوتا ہے کہ نئی شعری کائنات، ماقبل کی شعری کائنات سے الگ یا نئی نہیں بلکہ اسی کی توسیع ہے تاہم یہ حقیقت ہے کہ بعض مواقع پر نئے شعراء روایتی الفاظ سے دامن بچا کر روزمرہ کے سادہ الفاظ کی جانب رجوع کرتے ہیں، یہ ایک رجحان کی شکل اختیار کر رہا ہے، چنانچہ ان منظومات میں پودے، بچہ، پرچے، سگریٹ، آرام کرسی آلودگی، گیتا، قرآن، بائبل، گدی، پکوڑے، ریشمی شال، رزق، نوکری، سرخیوں، شبد، چمگادڑ، کتے، فساد، لطیفہ، منافق، ماں، بیوپار، بجلی اور زعفران کا برتاؤ ملتا ہے۔ اس ضمن میں غیر روایتی الفاظ کو نئے ذائقے سے آشنا کرانے میں شکیل جمالی نمایاں ہیں۔ انہوں نے اپنی غزلوں میں انتقام، معیار، مذاق، حلال رزق، نوکری، خلق نوازی رعایا، اعتراضات، سرخیوں، اختیارات، دستخط، عدالت اور موڑ جیسے الفاظ استعمال کئے ہیں، اس تبدیلی سے نہ صرف ان کے یہاں غزل کی فضا بدلی بدلی لگتی ہے بلکہ لہجہ بھی انوکھا سا لگتا ہے،

نئی شاعری کی اہم بات یہ ہے کہ نئی شعری فضا حد بندی، ضابطگی یا گھٹن کا احساس نہیں دلاتی بلکہ یہ بقول پروین رجا ایک روشن و آزاد و معطر فضا ہے، جو حقیقی زندگی کی مجبوریوں اور جبری پابندیوں سے دور، تخیلی سطح پر فکری آزادی اور جذباتی رنگا رنگی کو پیش کرتی ہے۔ بنیادی طور پر یہ تخلیقات اپنے آزادانہ وجود پر اصرار کرتی ہیں اس طرح سے نئے شعراء تخلیقی کارگزاری کو بامعنی اور موثر بنانے کے لئے آزادانہ ذہن کی شرط اوّل کو پورا کرتے ہیں، وہ عاید کردہ نظریات سے بیزار ہیں۔ بقول مدیر شاعر " وہ [تخلیقی ذہن] رد کر رہا ہے پہلے سے طے شدہ مفروضوں اور کلیوں کو، مابعد نیا ذہن قبل فکری اعتقادات اور سماجی مفروضات سے پیچھا چھڑانے کا خواہش مند ہے۔ یہ ایک خلق، ذہنی اور جبلی وجود ہے جو اپنی آرزوؤں، خوابوں اور جبلی تقاضوں کا اظہار چاہتا ہے، لیکن فطرت، سماج، سیاست، قانون اور اخلاق کی

عائد کردہ بندشوں کی بنا پر نفسیاتی الجھنوں اور ذہنی الجھنوں کا شکار ہے۔

یہ لمحہ لمحہ حسین دھوپ کے اترنے کا — عجیب سلسلہ ہے عمر کے گزرنے کا [عزیز پریہار]
چیخوں کی آوازیں آتی رہتی ہیں — میرے اندر کا زندانی زندہ ہے [ارشد عبدالمجید]
اے چشم گریہ ناک یہ منظر بھی دیکھنا — کشتی ہے سطح آب پہ ساحل ہے زیر آب [فرید پربتی]
کس قدر آباد ہے یہ آسماں — صبح دم پھر دیکھئے بنجر تمام [اکرم نقاش]
یہ آگ ان کے گھروں تک بھی جائے گی اک دن — فساد کو جو ابھی حادثہ سمجھتے ہیں [اشعر علیگ]
رات کھڑکی پہ چاند اترا تھا — دل سمندر کا جل رہا ہوگا [محبوب عالم]
اب جنگلے کا رستہ لے — شہر بہت خونخوار ہوئے [پرویز اختر]

اسی کی الجھنوں میں شدت اس وقت پیدا ہوتی ہے، جب اسے حالات کی قہر سامانیوں سے واسطہ پڑتا ہے، یہ آگہی کی کرب ناک صورت حال ہے، جو متضاد جذبوں کو جنم دیتی ہے، چنانچہ بعض شعراء کے یہاں بغاوت، پسپائی، حقیقت، اتباع، اقرار/انکار، امید/محرومی، قرب/دوری جیسے متضاد جذبات ملتے ہیں۔

وہ اپنا دوست قریب رگ گلو جو رہا — اسی سے مجھ کو رہا ہے بلا کا اندیشہ [محسن رضا]
خون سے لکھی ہوئی تحریر غنیمت ہے یہاں — ایک بھی چہرہ صحیفہ نہیں ہونے والا [خورشید اکبر]
سمندروں میں سراب اور خشکیوں میں گرداب دیکھتا ہے — وہ جاگتے اور راہ چلتے عجب عجب خواب دیکھتا ہے [سراج اجملی]
کئی راہیں نظر کے سامنے تھیں — عجب مشکل میں تھا جاتا کدھر سے [احمد محفوظ]
شب کا آسیب مرے سامنے استادہ تھا — صبح، سورج کی شعاعوں کا جو منظر یا ہوں [پروین راجہ]

نظموں میں یہ جذباتی الجھنوں، پرندہ، بے بسی، آنے والے وقت کی بنیاد کہاں رکھی جائے، یہ خوف تازہ میں ملتی ہیں آگہی کی شدت کبھی کبھی طنز کی صورت اختیار کرلیتی ہے، مثلاً

اسی لئے تو یہ سارا جہاں ہمارا ہے — کہ اس زمیں پہ کہیں اپنا کوئی گھر ہی نہیں [عالم خورشید]
ہم نے جنوں میں ساری رسمیں توڑی ہیں — ہم نے لوگوں کے مرجانے پر رقص کیا [شفق سوپوری]

جدیدیت کے حاوی رجحان کے تحت جو تخلیقی ادب (شعر اور افسانہ) سامنے آیا، وہ نمایاں طور پر میکانکی اور اجتماعی اداروں کے سامنے فرد کی بے بسی، گم شدہ، تنہائی اور محرومی کا نوحہ خواں رہا۔ وجودی سعیے کے فروغ نے شاعری کی اس تحریک کو اور زیادہ تیز کیا۔ یہاں تک کہ پورا شعری دفتر نقش فریادی، کا سماں پیش کرتا رہا، نزیادکی یہ لے دلوں میں اترتی گئی، کیونکہ سماجی اور تہذیبی بحران کے تحت تجربات کی تشدید اور سچائی سے انکار ممکن نہ تھا تاہم کئی آوازیں اس میں ایسی بھی شامل ہو گئیں، جو نقالی اور کلیشے کی تھیں، اس طرح سے تخلیقی فضا ایک مرحلے پر یک رنگی کا تاثر پیدا کرنے لگی، یہ بات بہرحال اطمینان بخش ہے کہ نئے شعراء جدیدیت کے تحت محسوس کئے جانے والے بعض تجربات مثلاً تنہائی اور انتشار کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ زندگی، فطرت، حسن اور معصومیت کے بارے میں مثبت رویئے کا اظہار کر رہے ہیں، اس سے اس خیال کی مزید توثیق ہوتی ہے کہ نیا ذہن کسی طے کردہ خیال، تصور یا منصوبے کا پابند نہیں، بلکہ اپنے داخلی ردعمل کی سچائی کو عزیز رکھتا ہے۔ اس طرح سے نئی نسلوں کے یہاں زندگی کو برتنے اور سمجھنے کا رویہ جیتا ہے، تقریباتی نہیں!

تو کیوں چپ گم صم بیٹھا ہے — چاند دوست کو پانی سے دے [عزیز پریہار]
تصور بستر ہو جاتا ہے اک جنگل نکلتا ہے — فضا میں پھیلتی آلودگی کا حل نکلتا ہے [احمد منظور]
چاند تاروں کی نمائش ہو رہی ہے — رات اپنی جھولی کھولے سو رہی ہے [ارشد عبدالمجید]

بوجھ سینے پہ بہت ہے لیکن
مسکرا دینے میں کیا لگتا ہے [شکیل جلالی]

دھنک کا پھیلنا کیا ہے
تری آواز لہرانا [اکرم نقاش]

آنکھوں سے اتر آیا ہے جو میری رگوں میں
وہ اس کا جمال رخ زیبا تو نہیں ہے [محسن رضا]

میری نظروں کا لمس کافی ہے
اس کا چہرہ گلاب ہو جانے [اشعر علیگ]

[illegible] کی میز پہ تازہ لطیفہ چھوڑ جاتا ہے
نئے تیور سے جینے کا سلیقہ چھوڑ جاتا ہے [خورشید اکبر]

کون تھا وہ فصیل کے پیچھے
آج شب ماہتاب کچھ دیکھ [شفق سوپوری]

پنجرے چھوڑ کر انہیں اوپر اچھال دو
اڑتے ہوئے پرندوں کا یارو یہ گھر نہیں [معصوم نظر]

ایک دن ہم اچانک بڑے ہو گئے
کھیل میں دوڑ کر اس کو چھوتے ہوئے [طارق متین]

جس کی خوشبو سے معطر تھا مرا لمس جنوں
میری آنکھوں میں ابھی تک وہ مہکتی ہے [نکہت زریں]

گلزار و سبزہ زار و شجر بھی مرے لئے
یہ رنگ رنگ برگ و ثمر بھی مرے لئے [راشد جمال]

اندھیری شب کا یہ منظر بڑا ہی دلکش ہے
فلک پہ دیکھ ستاروں کا جال، باہر آ [احمد محفوظ]

اس ہوائے تازہ میں تھی زعفرانوں کی مہک
پہلے بھی کتنا ہی نکھرا تھا مگر ایسا نہ تھا [پروین راجہ]

نظموں میں نجات، نور کی ہدایتوں کا پیش لفظ، نرگس اور رت بدل گئی اس ضمن میں قابل ذکر ہیں

ان شعراء کے یہاں لسانی برتاؤ کے دو نمایاں رویے ملتے ہیں، اول روایتی الفاظ و تراکیب، دوم سادہ اور روزمرہ کی زبان، یہ دونوں رویے ماقبل کے ادوار میں بھی مروج رہے ہیں، لسانی برتاؤ کے حوالے سے البتہ یہ بات نئی ہے کہ شعراء نئے الفاظ سے خائف نہیں، اور غزل لسانی آب و رنگ کی بنا پر نظم کے قریب ہو گئی ہے ۔

آخر میں یہ بھی عرض کردوں کہ ان شعراء میں کی نوجوانا ابھی تک معنی و اظہار کی کشاکش کے مرحلے میں ہیں، ان کا نئے موثر ترسیل پر حاوی نہیں، ان کے یہاں الفاظ کے غیر ضروری استعمال کے علاوہ بیانیہ عنصر، توضیح، تکرار اور تقلید کی کارفرمائی ملتی ہے تاہم بقول اقبال ؎

نومید نہ ہو ان سے اے رہبر فرزانہ
کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں راہی

بقیہ صفحہ ۱۴ زرہ بکتر

"لوگوں کی زرہ بکتر کو تم کیسے دیکھ لیتے ہو عثمان؟" نینا نے پوچھا

"ایک عینک کی مدد سے" عثمان نے جواب دیا۔

"عینکیں تو دونوں آدمیوں کے پاس تھیں" ، نینا نے یاد دلایا۔"

"میرے پاس بھی ہے لیکن وہ نظر نہیں آتی ۔" عثمان نے کہا۔

رات کو سونے سے پہلے عثمان نے ایک کتاب کھولی تو اس میں سے نینا جھانک رہی تھی۔ مسکراتے ہوئے اس نے بستر کے اوپر لنگی بچھائی اور تکیے پہ سر رکھ کر لیٹ گئی۔ معلوم نہیں رات کا کون سا پہر تھا کہ شب خوابی کا لباس پہنے نینا نکلی۔ میز پر آن بیٹھی۔ وہ فارغ ہو گئی۔ لیکن عثمان نے اس کے لئے بستر پر جگہ نہیں بنائی۔

"آج بھی مجھے جگہ نہیں دو گے؟" نینا نے پوچھا

"نہیں!" عثمان نے جواب دیا

"نہیں؟؟"

"...... ضرورتیں بدلتی رہتی ہیں۔" عثمان نے بتایا۔ "تمہارا ہوا میں تحلیل ہونا آج میری ضرورت ہے۔"

منظور ہاشمی

جدا ہوتے ہوئے، ہم اپنی آنکھیں چھوڑ آئے ہیں
اس سے ایک رشتہ، درد کا بھی جوڑ آئے ہیں

کوئی آواز آئی تھی، چٹخنے کی، بکھرنے کی
نکلتے وقت گھر سے، جانے ہم کیا توڑ آئے ہیں

یہی سچ ہے، کہ طغیانی میں سب مجبور ہوتے ہیں!!
ہمیں بھی چھوڑ دیتے وہ، جنھیں ہم چھوڑ آئے ہیں

چلے تھے جب، تو لگتا تھا کہ سیدھا ہے یہی رستہ
اسی رستے میں لیکن کیسے کیسے موڑ آئے ہیں!!

وہ ساعت آخرش آ ہی گئی، جس کو نہ آنا تھا
کہ اک لمحے میں، ہم برسوں کے رشتے توڑ آئے ہیں

ہمارے بعد بھی وہ راستے آباد ہیں کتنے
جہاں ہم گونج اپنی، اپنے سائے چھوڑ آئے ہیں

یہاں تک آتے آتے، ہو گئے ہم دوسرا کوئی!!
تو اپنے آپ کو کیا راستے میں چھوڑ آئے ہیں

۸-۱ نذیر احمد روڈ، مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ۔

پیرزادہ قاسم

دل تجھے راس آئیں گی حسرتیں سب سمیٹ لے
اور کوئی طلب نہ رکھ دستِ طلب سمیٹ لے

غم کدۂ حیات میں بس یہی شمعِ جاں تو ہے
کوئی بڑھائے لو کہ سب ظلمتِ شب سمیٹ لے

اب یہ متاعِ رائیگاں کون کرے طلب یہاں
ہاں یہ دکانِ نکہت و فن خیر سے اب سمیٹ لے

خاک ہوں خاک پیرہن دستِ ہنر کا اختیار
چاہے وہ جب بکھیر دے چاہے وہ جب سمیٹ لے

منظرِ ہست و بود سے کیا ترا جی نہیں بھرا
اب یہ بساطِ کن فکاں اے مرے رب سمیٹ لے

۱۴ اے، اسٹاف ٹاؤن، کراچی یونیورسٹی، کراچی

عابد جعفری

زباں رکھتے ہوئے بھی بے نوا ہوں
میں اپنے آپ میں ساکت پڑا ہوں

وہ دریا تھا سمندر لے گیا ہے
میں تنکا تھا کنارے آ لگا ہوں

ہیں ماتھے کی لکیریں زخم خوردہ
میں لکھنے سے زیادہ سوچتا ہوں

وہ آغازِ محبت چاہتا ہے
میں انجامِ محبت جانتا ہوں

ہمیشہ شور میں رہتا ہوں میں گم
جو یوں دیکھو تو بے صوت و صدا ہوں

قرینِ درد ہوں بہ اندازِ دریا
ہمہ تن گوش بر آوازِ پا ہوں

مرے پیروں سے لپٹے خاک [illegible]
سو اب میں ناروے میں بس گیا ہوں

12 56 [illegible] ST
[illegible]
[illegible]

رشدا بوشوار

ترجمہ : جاوید دانش
333-DONEDALE DR. WHITBY
ONTARIO. L1N 1Z6 CANADA.

فلسطینی ڈائری

رشدا بوشوار - ١٩٣٢ میں ذکرن کے علاقے حبران میں پیدا ہوئے ! ان کے کئی ناول ، افسانوں کے مجموعے پچوس کی کتابیں اور ایک ڈائری منظر عام پر آکر مقبول ہو چکے ہیں !

ان کی معروف تخلیقات میں ناول (١) محبت اور موت کے ایام ١٩٧٣ء (٢) عاشق ١٩٧٧ء افسانے (١) ماضی کی یادیں ١٩٧٠ء (٢) درخت کتابوں پر نہیں اگتے ١٩٧٥ء (٣) لوگوں اور پتھروں کی کہانی ١٩٩٢ء ان کی مشہور ڈائری او بیروت ١٩٨٣ء میں شائع ہوئی جو ١٩٨٢ء کے اسرائیلی حملے کے بعد فلسطینیوں اور لبنانیوں کی کسمپرسی کی داستان سناتی ہے - !

١٩٤٨ء میں مجبوراً رفیوجی بننے کے بعد وہ کئی شہروں اور رفیوجی کیمپوں میں قیام کرتے ہوئے شام میں مستقل طور پر سکونت اختیار کر چکے ہیں ۔ آجکل ڈائرکٹر آف پبلشنگ (فلسطینی تحریروں) کے طور پر مصروف ہیں ۔

او۔ بیروت

٥ جون ـــــ ١٩٨٢ء !

مجھے دمشق پہنچے ابھی چند گھنٹے ہی گزرے تھے کہ ایک منحوس خبر ملی ۔ دشمن نے بیروت پر بمباری کر دی ہے ، اسٹیڈیم کی دیواریں تباہ کر دی گئی ہیں ۔ درجنوں مارے گئے اور بے شمار زخمی ہوئے ہیں ۔ لبنانی اخبار "السفیر" میں تفصیلی خبریں اور روح فرسا تصویریں شائع ہوئی تھیں ۔ !

میں اپنے شاعر دوست ناظم ابو افاش کے گھر اپنی بیوی کیساتھ لنچ پر مدعو تھا ، کچھ دیر میں نے افاش کی نظموں سے خود کو بہلانے کی کوشش کی مگر شاعر محمد وادوان کے آتے ہی اور اس کے اترے چہرے کو دیکھتے ہی میں دوبارہ مضمحل ہو گیا " تم نے کچھ سنا ؟ " آتے ہی اس نے مجھ سے سوال کیا " ان لوگوں نے جنوب کی طرف بھی چڑھائی کر دی ہے " ! اس نے دوسری خبر سنائی ماحول پر خاموشی مسلط تھی اور جنگ پورے شباب پر چھڑ گئی ہوئی تھی ! جون کی پانچ تاریخ تھی ۔ مجھے حیرت ہوئی کہ یہ سب جون کے مہینے میں کیوں ؟ مجھے فکر لاحق تھی کہ مقابلہ ہم کتنی دیر کر پائیں گے ؟ مجھے یہ بھی تشویش تھی کہ تازہ حملہ کس قدر سنگین ہوا ہے ؟ ایک بار پھر ١٩٦٧ء کی شکست کی تلخ یادیں مجھے بے چین کرنے لگیں ۔

مجھ سے بیٹھا نہ گیا ـــــ افاش اور اس کی بیوی سے اجازت لے کر ہم لوگ رخصت ہوئے چلتے چلتے اس نے پوچھا اس قدر بے چین کیوں ؟ ـــــ نہیں تو اس کا عادی ہو جانا چاہیے میں نے اپنے آپ سے کہا جو کیسا اعتماد اور پھر اطمینان کیوں کر ہو ۔ ساتھ ہی دیوانگی بھی کیسے ہوں ہم لوگ !

سڑک پر ہر ایک پریشان دکھائی دے رہا تھا ۔ جب کیمپ پہنچے لاؤڈ اسپیکر پر اعلان ہو رہا تھا کہ فوری طور پر خون کا عطیہ دیا جائے ۔ اعلان کے بعد رونے کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں ہم لوگ " یارموک کیمپ " میں تھے ۔ کیمپ کوئی بھی ہو ان میں باقی عرب دنیا سے علیحدہ ایک دنیا آباد تھی ! یہاں ہر طرف آنسو خون ، خوف ، بدبو اور مایوسی تھی ۔ میں نے دیکھا بے شمار نوجوان مرد اور عورتیں ، خون کا عطیہ دینے " ڈپیر یارموک کلینک " کی طرف جا رہے ہیں اور بہت سے واپس آ رہے ہیں ، یہ ان کی حالت کا ثبوت تھا !

اب کیا ہونا چاہیے ؟ اب جب کہ صیہونیوں نے یکے بعد دیگرے چڑھائی شروع کر دی ہے ، ہمیں اپنے انقلاب ، اپنی عزت ، اپنا

مستقبل اپنے خوابوں کو پہچاننا ان کی پرورش کرنا ہے، انہیں آگے بڑھانا ہے!

مہینوں سے ہمیں اس جنگ کا خدشہ تھا، اس بار پچھلی تمام جنگوں سے بڑھ کر خونریزی کا اندازہ تھا، ہم لوگوں نے اب تک دشمن سے فیصلہ کن جنگ کی تیاری بھی نہیں کی تھی جب کہ ہمارے دشمن جدید امریکی اسلحوں سے لیس ہو کر پڑتے تھے ان کا فیصلہ قطعی تھا، ہم لوگ مستقل مزاجی کے خوگر تھے مگر وہ امریکہ کے شہ پر۔ مغرور اور عرب دنیا کی خاموش طلاسے پر امید اور مطمئن تھے! وہ عرب جو اپنے گروہ سے سختی برتتے ہیں مگر اپنی سرحدوں کو دشمنوں کے لئے کھلا چھوڑ دیتے ہیں!

میرا دوست عبدالہادی اور میں کیمپ میں ساتھ ہی رہتے تھے۔ ہم لوگوں نے فیصلہ کیا کہ فوراً روانہ ہونا چاہئے!

اس نے اپنی بیوی اور بچوں کو الوداع کہا اور میں اپنے خاندان سے ہمکلام ہوا۔ اس بار حملہ بہت سنگین ہے۔ تمہیں یاد ہے میں کیوں اپنی سڑک کو بیروت کی اہم سڑک کہتا آیا ہوں۔ مجھے معلوم ہے وہ لوگ ہماری سڑک تک ضرور پہنچ جائیں گے۔ میں نے اکثر اس کے بارے میں لکھا بھی ہے،

اگر تم میری موت کی خبر پانا، اس وقت خود پر قابو اور اعتماد رکھنا۔ غم کرنا مگر اسے خود پر یا بچوں پر حاوی نہ ہونے دینا، ان جگر گوشوں کی پرورش اچھی طرح کرنا اور ان کی تعلیم میں کوتاہی نہ کرنا مجھے یاد ہے میں پچھلی جنگوں میں بہادر رہا ہوں دعا کرو اس بار بھی میرے قدم ثابت رہیں میں اپنی طرف سے پوری کوشش کروں گا میں وعدہ کرتا ہوں۔"

"تمہیں معلوم ہے" میری بیوی نے پوچھا آج فہد خون عطیہ دینے کلینک گیا تھا، وہاں اسے یہ کہہ کر واپس کر دیا گیا کہ وہ ابھی صرف بارہ سال کا ہے۔ اس نے رو رو کر برا حال کر لیا، وہ بڑا مایوس تھا۔" تب تو میں جیت چکا ہوں!

میرا بیٹا فہد، اس عمر میں فلسطین کی اہمیت جانتا ہے اور اس سے بے پناہ محبت کرتا ہے! آج وہ اپنا خون دینے کو تیار ہے، بلا جھجک اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا ہے یہ وہ ننھے پتلے گندمی فلسطینی بازو ہیں جو کل ہماری بوجھ اٹھائیں گے!

خدا حافظ، الوداع، میرے بچے الوداع!

یہودی تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں اور ہم ان کا سامنا کرنے جا رہے ہیں! میرے باپ نے ایک بار کہا تھا۔" دیکھو رشد! ہم لوگوں نے جب فلسطین کو الوداع کہا تھا، ہمارا کنبہ، بس ہم اور تم تھے۔ تمہاری ماں زینب اور تمہاری ہمشیرہ مانعذہ فلسطین پر قربان ہو گئیں۔ آج تمہارے خاندان میں چھ لوگ ہیں میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ہم لوگ اس طرح پھلے پھولیں گے! ہاں! ہماری نسل کی افزائش ہوئی ہے۔ یہ اچھا اور ضروری بھی ہے۔ میں خود کو قربان کر سکتا ہوں" مگر میرے پیچھے یہاں فہد موجود ہو گا اور اس کی جگہ چھوٹا طیب اور پھر اہلام، میری لخت جگر جس نے میری ماں اور بہن کی کمی کو پورا کیا ہے۔ ساتھ ہی وہ تیز طرار "غسان" ہم سب کی جگہ کھڑا ہو گا۔ اپنے سب سے چھوٹے بچے کا نام ہم لوگوں نے معروف ادیب "غسان کنفانی" شہید، کے نام پر رکھا تھا۔ ظالموں نے غریب کے ٹکڑے ٹکڑے اڑا دیئے تھے۔ مگر اس کی تحریریں، اس کے ناول اس کی کہانیوں کو برباد نہ کر سکے، اس کی تاثیر اور مقبولیت کو بھی ختم نہ کر سکے۔ وہ اب بھی ہمارے درمیان موجود ہے! اور رہے گا

رات گئے ہم لوگ بیروت پہنچے۔ السلام اے بیروت!

السلام اے فاکھانی کوارٹر شہید اسٹیڈیم السلام!۔

اپنوں نے ہماری پیٹھ پر وار کیا ہے

جنگ جنوبی لبنان سے فاکھانی کوارٹر تک پھیل ہوئی تھی۔

فاکھانی ہماری آخری شاہراہ تھی اس کی حفاظت کون کرے گا؟ کیسے کوئی فصیل کھڑی ہو گی؟ کون ہتھیلی پر جان رکھ کر حملہ آوروں کا سامنا کرے گا؟ اس جنگ کو شروع ہوئے ہفتہ ہو گیا۔ پچھلے سات شبانہ روز جیٹ بم برسا رہے ہیں، ٹینک آگ اگل رہے ہیں۔ ایسے مہلک ہتھیاروں کا استعمال ہو رہا ہے۔ جو اس سے پہلے کہیں نہ ہوئے تھے! ہر شئے جل کر خاک ہوئی جا رہی ہے!

"خدا نے دنیا کو چھ روز میں مکمل کیا اور ساتویں روز اس نے آرام کیا!" توراۃ یہی کہتی ہے۔ یہی "یوم سبت" کہلاتا ہے! مگر اس بار یوم سبت کے موقعہ پر جنگ کے دیوتاؤں نے آرام نہ کیا۔ وہ اس دن بھی اپنے راکٹ اور میزائل کا شمار اور حساب کرتے رہے! سارے کے سارے نئے ہتھیار [illegible] امریکی خاص طور پر فلسطینی اور لبنانیوں کا

سے بچھے گئے تھے۔ بارھویں جون کی شب آ گئی اور جنگ کا دیوتا ابھی سے یوم سبت پہ آرام نہیں کیا تھا۔ اب تک تازہ دم تھا۔

ہمارے بھائی ہماری مدد کو نہ آ سکے۔

عربوں کی سرزمین خاموش ہی رہی پڑوسی عربوں کی دولت اور چھوٹی انا آنکھ مچولی ہی کھیلتی رہی! ہم پر ظلم ہوتا رہا اور سب دیکھتے رہے میں معبود کی قسم کھاتا ہوں کہ ان میں کچھ دشمن کی پشت پناہی بھی کر رہے ہیں۔ اور مالی امداد بھی اور کچھ دیکھتے ہوئے چشم پوشی بھی کر رہے ہیں اس طرح نہ صرف وہ ہمارے جذبات مجروح کر رہے ہیں۔ بلکہ نفسیاتی طور پر ہمارے عزم کو کھوکھلا کر رہے ہیں میرے خدا! کیا جو کچھ ہو رہا ہے ایسا ہی ہونا چاہئے تھا۔ یہ کیسی مصلحت ہے؟۔

ہمارا غم لفظوں میں بیان نہیں ہو سکتا! یہ سچ ہے کہ ہم اپنی مٹی اپنی مادر وطن کی خاطر لڑ رہے ہیں۔ مگر یہ جنگ عربوں کی عزت و ناموس کی جنگ کیوں نہیں بن جاتی؟

اخبار "النہار" میں اسرائیلی فوج اور ان کے شاہی استقبال کی تصویریں ہم نے دیکھی ہیں۔ ہم نے فاشسٹ لبنانی "خوشگوار" لڑکی کو بڑی دل آویز مسکراہٹ کے ساتھ ایک اسرائیلی فوجی کو گلاب پیش کرتے بھی دیکھا ہے۔! یہ بھی ایک عجیب گروہ ہے انہیں مادر وطن سے کوئی تعلق نہیں، ان کا قومیت پر کوئی اعتقاد نہیں ان سب کی قیمت فلسطینی ادا کرتے ہیں۔ جب تک وہ اپنی قوم کے لئے لڑ رہے ہیں۔

وہ ایسے فرقہ پرستوں کی وجہ سے اپنی شناخت کی قیمت اپنے خون سے ادا کرتے رہیں گے!

لبنانی فوٹوگرافر احمد، عینی شاہد کے طور پر اپنے کیمرے کا استعمال کرنے والا تھا کہ ایک فاشسٹ نے کہا، تم مغربی بیروت کے لبنانی ہو، منہ سے ایک لفظ نکالے بغیر واپس چلے جاؤ ورنہ۔ دوسرے نے کچھ سوچے بغیر رائفل کا دستہ اس کے چہرے پر دے مارا، بیچارہ لہولہان واپس آیا۔

ان بے ضمیر "فاشسٹ" سے تم کیا توقع کر سکتے ہو احمد؟ یہ فرقہ جو اسرائیلیوں سے اپنے معاہدے اور نسبت پر فخر کرتا ہے سمجھ کر بھی کیا سکتے ہو احمد، تم ایک لبنانی ایک فلسطینی اور ایک عرب ہو۔

غم کی قندیلیں

ہاں! بیروت سوگوار ہے آج!۔

عرب ریڈیو کی نشریات سے جو کچھ سنا، اس پر پہلے وہ شرمسار پھر حیران ہوا۔ بڑا پریشان کن منظر تھا۔ اس نے دیکھا۔ اسرائیلی بڑے ترنگ میں پہاڑی پہ سے گزر رہے ہیں۔ وہ بغیر جنگ کے فاتح تھے۔

اس کا دل غم سے چور چور ہو گیا۔

بیروت نے والی عرب عہدہ داروں کے بیانات بھی سنے جو فلسطینیوں اور لبنانیوں کے خون سے اپنے مفادات استوار رہے تھے اور موقع کا فائدہ اٹھا رہے تھے، ہم ایسے دوست، ایسے پڑوسی اور ایسے عربوں سے کیا توقع کر سکتے ہیں!

بجلی کا فقدان ہے اور پانی کی بڑی قلت ہے! موم بتیاں، گیس کے لالٹین اور قلم کے سائز کی فلیش لائٹ کی بڑی مانگ ہے۔ ان حالات میں بھی کچھ لوگوں کا کاروبار چمکا ہوا ہے۔!

تاندیں جلتی لکڑیاں اور اس کے دھوئیں سے رات مزید کالی ہو رہی ہے، فضا بوجھل ہے! مجاہد سڑکوں پر ننگے پاؤں پہرہ دے رہے ہیں۔ یا جیپ میں انقلابی گیت گاتے گھوم رہے ہیں

اس غمگین اور دل برداشتہ لمحوں میں مجھے جبیر بچوں کی ایک لڑکی یاد آئی۔ جسے میں کبھی چاہتا تھا۔ مجھے خود پر حیرت ہوئی کہ اس وقت یہ یاد کیسی؟ شاید موت کے لمحات میں ہم لوگ محبت اور خوابوں میں پناہ ڈھونڈتے ہیں، میری نیم خوابیدہ حالت میں وہ بڑی متانت سے آئی۔ اس کی آنکھوں میں غم اور ایک سوال تھا! تمہیں ماحول سے وحشت اور مایوسی ہو رہی ہے اور تم محبت اور خوابوں میں پناہ چاہتے ہو مگر فلسطین کے دامن میں محبت اور خوابوں کے علاوہ ہے کیا؟! اس نے بہت پیار سے مجھ سے پوچھا!

جب میں نے آنکھیں کھولیں۔ میں نے اپنے دریچے پر غم کی قندیلیں ٹمٹماتی دیکھی۔ میں نے بیروت کے ہر دریچے پر غم کی قندیلیں ٹمٹماتی دیکھیں۔ مجھے لگا بیروت خود ایک قندیل ہے جو ہوا کے زور پر پھڑپھڑا رہی ہے۔ مگر اپنے گرد و پیش کے تمام اندھیروں کے باوجود روشن ہے!!!

آخری التماس

میں اپنی بالکنی میں کھڑا اپنی بیوی اور بچوں کے بارے میں سوچ رہا تھا تصور میں ان کی شبیہ بنا رہا تھا۔ میں اپنے ان بھائیوں کی شکل بھی یاد

[باقی صفحہ ۲۷ پر دیکھیے]

انیس انصاری

ندی کی زرخیز لہر آئی
تو خشک بنجر زمیں میں جان پڑ گئی تھی
وہ دھار واپس گذر گئی ہے
تو سچے اور آبدار موتی کی فصل تیار ہو گئی ہے
زمیں نے نرم و گرم بوندوں کو
منتظر کوکھ کے مساموں میں بھر لیا تھا
وہ لہر واپس گذر گئی ہے
مگر جڑوں اور سطح پر
موتیوں کی ڈالیں پھیلی ہوئی ہیں
ندی کی آمد بھی اتنی ہی ساعتِ مبارک تھی
جس قدر ساعت جدائی
میں کس قیامت کے نرم لمحوں میں جی رہا ہوں
تمہاری ہجرت کے بعد
جیسے مدینہ پھر امان سایہ نگن ہوا ہے
بہت بہت شکریہ!
کہ تم نے میری ہتھیلیاں نہال کر دیں
تمہاری آنکھوں کی آرزوئیں
گرچہ مجھ سے کچھ دور جا چکی ہیں
مگر انھوں نے زمینیں سب مالامال کر دیں
حسین میڈاس[1]
زندگی
تم نے کیسے مجھ کو چھوا
کہ سونے کے پھول سو ہتھیلی کی مانند کھل گئے ہیں
اسیر اک دم سے ہو گیا ہوں
چراغ اک ساتھ جل گئے ہیں ـــ!

---

[1] میڈاس بادشاہ جس شے کو چھوتا تھا سونا بن جاتی تھی

● فلیٹ نمبر ۲ شاپ VI، گولا باغ کالونی، لکھنؤ-۱

جمیل الرحمٰن

ابھی ستارے کو آسماں پر ٹھہرنا ہوگا

برونِ شہرِ وفا۔ قدم اس کے ڈگمگائے تو اس نے سوچا
ابھی ہوا کو سمندروں پر اترنا ہوگا
ابھی ستارے کو آسماں پر ٹھہرنا ہوگا

ابھی تو موسم بدل رہے ہیں
ابھی تو سب لوگ چل رہے ہیں
مری تھکن کا جواز کیا ہے ؟
لرزتے ہونٹوں پہ تھرتھراتی ہوئی دعاؤں کا راز کیا ہے ؟

ابھی تو جنگل میں خامشی ہے
الاؤ کی روشنی۔ ستم خیز تیرگی کے،
نشان آنکھوں سے چن رہی ہے
ابھی تو شاخِ شجر کی شہوت،
حریص شاموں، نشیلی صبحوں کے دلنشیں خواب بُن رہی ہے!

ابھی تو رستے کسی کے پہلے قدم کو چھونے کی کیفیت کے حجاب میں ہیں
ابھی تو دیدہ و دل دوائی عذاب میں ہیں
ابھی ستارے کو آسماں پر ٹھہرنا ہوگا
ابھی مجھے ساری منزلوں سے گزرنا ہوگا

سحر سے پہلے مری تھکن کا جواز کیا ہے ؟
لرزتے ہونٹوں پہ تھرتھراتی ہوئی دعاؤں کا راز کیا ہے ؟

KORMELINK WEG-44,
1104 NS AMSTERDAM, HOLLAND ●

اقبال مسعود

مسعود منزل، گراؤنڈ فلور، ریت گھاٹ، بھوپال - ۴۶۲۰۰۱

یادِ یارِ مہرباں

● دن ۲۵ مئی ۱۹۹۰ء۔ مقام: سانتا کروز ریلوے اسٹیشن۔ شہر بمبئی۔

ہم لوگ ابھی ابھی لوکل ٹرین سے ایک ہجوم کے ساتھ بہتے بہتے سے نکلے ہیں۔ اور اب سارے پلیٹ فارم پر تیزگامی سے بڑھتے لوگوں کی بھیڑ ہے جو ایک ریلے کی صورت خارجی دروازے کی سمت بڑھ رہی ہے۔ لوکل ٹرین برق رفتاری سے پلیٹ فارم کو چھوڑ دیتی ہے۔ لمحوں کے لئے سناٹا سا چھا جاتا ہے اور اب میں اور تاجدار احتشام لمبے طویل پلیٹ فارم پر بے مصرف سے کھڑے ہیں۔ دور دور تک کوئی شناسا نہیں چند آوارہ کتے، کچھ خوانچے والے اور ریل کی چمکتی پٹریاں، خاموشی سے اکتا کر میں کہتا ہوں "جانے ظفر کہاں رہ گیا!" تاجدار سگریٹ کا کش لے کر بڑے متفکرانہ انداز سے چاروں اور دیکھتے ہیں اور بہت آہستگی اور نرمی سے کچھ کہنا چاہتے ہیں کہ ہر دو سمت سے تیز رفتار برقی ٹرینیں پلیٹ فارم پر آ کر رک جاتی ہیں۔ اور پھر ایک تازہ مگر پژمردہ لوگوں کی بھیڑ پلیٹ فارم پر پھیل جاتی ہے۔ آوازوں کا، قدموں کا، اور ریل کے انجنوں کا ہر طرف شور ہے۔ شور ہی شور اور ایسے شور میں تاجدار کی آواز شور کا ایک جزو بن جاتی ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ میں برقی گھڑی کی طرف دیکھتا ہوں جو شام ہونے کا اعلان کر رہی ہے۔ آج ساڑھے چار بجے کیفی اعظمی کے گھر پر ترقی پسند مصنفین کی ماہانہ نشست ہے اور اس میں ظفر اور ہم دونوں مدعو ہیں۔ اور ظفر کا دور دور تک اس بھیڑ میں پتہ نہیں۔ میں آسمان کی سمت دیکھتا ہوں دو پرندے دوستانہ انداز میں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے بادل کے ساتھ شہزادہ خاور مغرب کی طرف سرگرم سفر ہے۔ تب ہی ظفر کی آواز سنائی دیتی ہے: "ارے، تم لوگ یہاں کھڑے ہو؟" وہ غالباً کسی لوکل ٹرین سے اتر کر ہم لوگوں کی طرف آ گیا ہے۔ تاجدار اسی انہماک سے سگریٹ نوشی میں مشغول ہیں۔ تاجدار بہت ہی پیارا اور مخلص دوست ہے۔ ایک صاحب طرز نثر نگار اور ایسی نثر جس کو پڑھ کر [illegible]۔ دوستی اور دوستی پر واقعی یقین کرنا پڑتا ہے۔ وہ ایک ایسے علمی خانوادے سے تعلق رکھتا ہے کہ جس کی شعری و ادبی کائنات ایک صدی پر محیط ہے۔ پھر برصغیر ہند و پاک کے ایک مقبول اور معتبر ادبی رسالے کا ایڈیٹر بھی ہے۔ مگر کیا مجال جو فخر اور غرور کا شائبہ بھی اس میں ہو، ورنہ بے جا فخر میں مبتلا تو بہت سے لوگ دیکھے ہیں۔

میں بڑی محبت کے ساتھ تاجدار کی طرف دیکھتا ہوں وہ ظفر صہبائی سے مصروف گفتگو ہے۔ مجھے واقعی خوشی ہے کہ تاجدار میرا دوست ہے ہم لوگ دھیرے دھیرے چلتے ہوئے اسٹیشن سے باہر آ جاتے ہیں۔ باہر نکل کر تاجدار ایک ٹیکسی کو روک رہے ہیں۔ اور ٹیکسی کسی فرمانبردار پالتو جانور کی طرح ان کے حکم پر قریب آ جاتی ہے۔ ٹیکسی میں بیٹھ کر تاجدار ڈرائیور سے "جوہو" "جانکی کٹیر" کہتے ہیں اور گاڑی کسی خراب اڑنے والے پرندے کی طرح تڑپ لیتی ہے۔

سامنے سرمئی سڑکیں کسی ریت کی طرح پھیلی ہوئی ہیں۔ آس پاس سیمنٹ فولاد اور کنکریٹ کی عمارتوں کا بڑھتا اور پھیلتا ہوا جنگل ہے۔ پھر دور سے سمندر کے گرجنے کی آواز آنے لگی ہے۔ ہوا میں خنکی اور نمی کا احساس ہوتا ہے۔ سڑک کے کنارے کنارے دو رویہ خوبصورت بنگلے قطار در قطار بچھے ہوئے ہیں۔ اور ان میں لگے درخت جیسے خوشی اور سرشاری سے جھوم رہے ہیں۔ کاش ایسے گھر ہم سب کا بھی مقدر ہوں۔ دل میں ایک خواہش سر اٹھاتی ہے مگر خواہش کا کیا وہ تو ہمیشہ رہتی ہے ٹیکسی ایک جھٹکے کے ساتھ رک جاتی ہے میں باہر دیکھتا ہوں پرانی اینٹوں کی ایک قد آدم طویل دیوار دور تک چلی گئی ہے۔ اور اس کے داخلی راستے پر "جانکی کٹیر" کا پرانا سا بورڈ آویزاں ہے۔ ہم ٹیکسی سے اتر کر اندر راستے پر چل پڑتے ہیں اسی راہ پر آج سے دس سال قبل بھی آیا ہوں۔ مگر نئی نئی تعمیرات بنگلوں اور راستوں نے اجنبیت پیدا کر دی ہے۔ تاجدار قافلہ سالار کی طرح چل رہے ہیں۔ وہ اس علاقے کی راستوں کی اور مکانوں کی تاریخ اور ان کے مکینوں کی حیثیت سے باخبر کر رہے ہیں۔ اور اس طرح بتا رہے ہیں جیسے وہ گائیڈ کے فرائض انجام دینے لگے ہوں۔ بیچ بیچ میں اپنے شعر اور ادبی ذکر بھی چلتا رہتا ہے۔

میں تاجدار کو چھیڑنے کے لئے کہتا ہوں "بھائی شاعری ٹریول گائیڈ نہیں۔ یہ انسانوں کا معاملہ ہے۔" مگر تاجدار میرے زیر لب ہنسی دیکھ لیتے ہیں۔ وہ [illegible] صاحب [illegible] تعمیر آگیا [illegible] دیکھا جو لیا ہے یہ تعمیر کے پاس بہت سے نئے زاویاں چلنے لگے ہیں آپس

ں بحث و مباحثہ کر رہے ہیں۔ شاید کسی سمت پر ڈسکس ہو رہا ہے۔ تاجدار صدی کی بائیں سمت ایک دروازہ کھولتے ہیں۔ اور ہم لوگ اندر داخل ہو جاتے ہیں۔ سامنے ایک طویل سرسبز لان ہے جس میں صوفے اور کرسیاں لگی ہیں۔ اور ایک طرف کیفی اعظمی سفید کرتا پاجامہ پہنے بیٹھے ہیں۔ میری متجسس نظریں ان پر پڑتی ہیں۔ تیز روشن آنکھیں، گھونگھریالے بال جن کی سیاہی میں چاندی کے تار چمک رہے ہیں۔ گول چہرہ اور دراز قامت، سب کچھ پہلے جیسا ہی۔ بزرگی کے ساتھ جو استقلال کا روایتی تصور ہے۔ وہ ان میں دور تک منعکس ہے۔ چہرہ چمک رہا ہے۔ مجھے یاد آیا کہ کیفی اعظمی سے سب سے پہلے میرا ذہنی تعارف میرے بڑے بھائی رفیق عزام نے کرایا تھا۔ وہ ان کے کلام ہی کے نہیں صورت کے بھی عاشق تھے۔ پھر بعد میں پروفیسر عبدالقوی دسنوی بھی ہمہ وقت ان کی شخصیت، کلام، شکل اور باتوں کا ذکر کرتے رہتے تھے۔ اور جب کیفی صاحب کو میں نے پہلی بار دیکھا تو خود مجھ پر منکشف ہوا کہ ایتھنز میں بنے کسی یونانی دیوتا کے مجسمے میں جان پڑ گئی ہو۔ فرق بس یہ ہے کہ ایتھنز کا مجسمہ سنگ مرمر کا ہوتا ہے۔ اور یہ مجسمہ صندل کا ہے۔ ہونٹوں پر زیر لب تبسم آنکھوں میں محبت و مروت کی جوت بظاہر کچھ بھی نہیں بدلا۔

تاجدار احتشام میرا اور ظفر کا تعارف کراتے ہیں۔ ہم لوگ ٹھیک سے بات کرنے بھی نہ پائے تھے شاعر کو زیر لب خود بعد میں سوچا جائے کیسے ان سے تکلم کیا جائے۔ یکایک کیفی اعظمی مجھ سے مخاطب ہو کر پوچھ بیٹھتے ہیں: دسنوی صاحب کہاں ہیں۔ اور میں دروغ گوئی سے کام لیتا ہوں۔ ان کی طبیعت ناساز ہے اب بھلا یہ کیسے کہتا کہ آپ کے جیسے ہی ان کو باقاعدہ مدعو تو کیا نہیں وہاں تو دسنوی صاحب کے بہت سے دوست بھی ان کا انتظار کر رہے ہیں۔ ان سے کیا کہوں!

کیفی اعظمی کی کٹیا کے عظیم الشان لان میں وہ دروازہ کس سمت ہے جہاں ہرے سمندروں کی طرح گھنٹیوں کی قطار لٹک رہی ہے۔ پہلے جب آیا تھا تو ان گھنٹیوں کو بجاتے ہوئے جانے کیوں احترام اور خوشی کا بیک وقت احساس ہوا تھا۔

لان کے چاروں طرف اشوک کے درخت سبز بانات پہنے سپاہیوں کی طرح ایستادہ ہیں۔ اور کچھ ناریل کے درخت اپنی لمبی لمبی چھتریاں تانے مزے سے ہوا کے دوش پر لہرا رہے ہیں۔ قدموں میں بچھا ہوا سبزے کا قالین سمندر کی لہروں کی آواز اور دور آسمان کی نیلاہٹوں میں اڑتے آزاد پرندوں اور ماحول نے سخت گرمی کو بھی خنکی عطا کر دی ہے۔

آہستہ آہستہ لان بھر گیا۔ اور اب ساری کرسیاں، صوفے، بمبئی کے صحافی ادبی اور علمی دانشوروں سے بھر چکے ہیں۔ آخر انجمن ترقی پسند مصنفین کے سکریٹری محمد ایوب واقف اٹھ کر جلسہ کی کارروائی کا آغاز کرتے ہیں۔ وہ سب سے پہلے صدارت کے لئے بھوپال سے تشریف لانے والے مہمان شاعر ظفر صہبائی کا نام پیش کرتے ہیں کیفی اعظمی تائید کرتے ہیں۔ اور کارروائی شروع ہو جاتی ہے۔ ایوب واقف گذشتہ نشست کی رپورٹ پڑھ کر سناتے ہیں۔ اس رپورٹ کو سن کر لگتا ہے کہ انجمن ترقی پسند مصنفین ابھی تک فعال ہے حالانکہ میرا خیال ہے کہ ۱۹۳۶ء میں جو انجمن بنی تھی اور جس مقصد کے تحت وہ پورے ملک میں عوامی تحریک کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ وہ ۱۹۴۷ء میں دوسری جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد اور ہندوستان کی آزادی کے ساتھ ہی کمزور پڑ گئی۔ کیونکہ اس وقت ہر چھوٹی بڑی جماعت نے کم و بیش، سوشلزم، انقلاب، جمہوریت اور طبقاتی برابری کا وہی نعرہ لگانا شروع کر دیا ہے۔ جو ترقی پسند مصنفین کا تھا۔ انجمن کے کچھ فعال کارکن کانگریس اور پارلیمنٹ میں پہنچ گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ گرمی، جوش، سرمستی اور وہ دھن باقی نہ رہی۔ جو ہواؤں کا رخ بدل سکے۔ اور طوفانوں پر بند باندھ سکے اور آج ۱۹۹۰ء میں یہ راگ! شاید اب ہم لوگ اس دھن پر نہیں گا سکتے۔ نیا راگ نئی دھن نیا نغمہ گانا ہو گا خود سویت یونین میں لینن کے بعد زمانے نے کتنی کروٹیں بدلی ہیں۔ خروشچیف کے زمانے میں پہلی مرتبہ یہ آواز بلند ہوئی کہ PEACEFUL CO EXISTENCE ہو یعنی سرمایہ دار ممالک سے جہاں تک ہو سکے اپنی سالمیت کو برقرار رکھنے کے لئے تصادم آرائی سے گریز کیا جائے اپنا پروپگنڈہ جاری رکھو۔ وہ خود راہ کا انتخاب کریں گے بہرحال ان سے جھگڑا الجھنا بہتر نہ ہوگا لینن و استالن کے زمانے میں۔ PEACEFUL CO EXISTENCE کا تصور بھی محال تھا۔ البتہ ہاں مارکس نے یہ تنظیم دی انہوں نے تو واضح الفاظ میں کہا کہ کا نرمل پالیسی۔ امپیریلزم اور فائنانس کیپٹل سے ہمارا جھگڑا ہے۔ اس سے اتحاد کرنے کا سوال ہی نہیں چنانچہ لینن اور استالن نے کسی سرمایہ دار ملک سے مفاہمت نہیں کی۔ روس میں استالن کی موت کے بعد یہ ضرورت محسوس ہوئی اور خروشچیف نے مفاہمت پر زور دیا۔ بعد میں چین میں بھی مارکسزم میں فکری تبدیلیاں کی گئیں۔ اور نتیجے میں اب ہر دو ممالک کا امریکہ سے کتنا ہی نظریاتی اختلاف ہو مگر دونوں متصادم نہیں ہوتے تو اب جبکہ اشتراکی ممالک کا یہ حال ہے ان کی وہ پالیسی نہیں رہی جو بنیادی تھی تو ایسے وقت اور ایسے میں انجمن ترقی پسند مصنفین کو کیوں نئے زمانے اور بدلتے ہوئے حالات کے تحت اپنے رویہ میں تبدیلی لانا تھی۔ ناقص شاخوں کی قطع و برید اور نئی کونپلوں کی پیوند کاری ناگزیر تھی تب یہ انجمن فعال بنتی اور نئے CONTRIBUTION کے لئے زمین تیار کرتی۔ میں اپنے خیالات کے آئینہ خانے سے باہر نکلتا ہوں جب میرا نام افسانہ پڑھنے کے لئے پکارا جاتا ہے۔ اپنا افسانہ "سیاہ چٹان" جو کہ

سنانا شروع کرتا ہوں۔ اس افسانے کی بنیادی تعلیم نسل پرستی اور کالے گورے کی تقسیم کے خلاف ہے۔ بہرحال افسانہ سنانے کے بعد جب میں بیٹھا تو تاجدار احتشام نے کہانی پر بڑی محبت اور خلوص سے مبارکباد دی۔ اس کے بعد سکریٹری صاحب نے بحث کے لئے کہا۔ گو میں چاہتا تھا کہ یہ دانشور اپنے خیالات کا اظہار کریں تاکہ میں اپنی خامیوں سے آگاہ ہو سکوں۔ مگر وہاں ایک خموشی سب کے جواب میں والا معاملہ تھا۔ تب ہی کیفی اعظمی نے سکوت توڑا۔ اور یوں گویا ہوئے "اقبال مسعود کا افسانہ سن کر احساس ہوا کہ ہم شاعری سن رہے ہیں۔ اس میں نثر اور نظم کی حدیں ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئی ہیں۔ افسانے میں انہوں نے جو درخت کی علامت استعمال کی ہے وہ بہت طاقتور اور بامعنی ہے۔ تاہم میرا خیال ہے کہ افسانہ وضاحت کا فن ہے اور اس کو کچھ اور نمایاں اور واضح ہونا چاہئے۔ بہرحال مجموعی طور پر افسانہ خوبصورت اور بے حد سجیلا ہے۔

کیفی اعظمی کے اس تبصرہ کے بعد محمد ایوب واقف نے مشاعرہ شروع کیا۔ اور سب سے پہلے امین تابش سے درخواست کی کہ وہ اپنا کلام سنائیں۔ جب تابش اپنی غزل سنا رہے تھے تو میرا ذہن کیفی اعظمی سے پہلی ملاقات کی طرف چلا گیا۔ اس زمانے میں میرا ایک مضمون "پیام آزادی" مجلہ سیفیہ میں چھپا تھا۔ اس میں "پیام آزادی" نام کے ایک اخبار کا ذکر تھا جو بیک وقت تین زبانوں میں شائع ہوتا تھا اور ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی میں اس نے ایک اہم رول ادا کیا تھا۔ اس کے ایڈیٹر عظیم اللہ خاں تھے۔ کیفی اعظمی جب بھوپال تشریف لائے تو انہوں نے پرنسپل سیفیہ کالج اشفاق صاحب، پروفیسر عبدالقوی دسنوی اور ڈاکٹر آفاق حسین صدیقی سے اس مضمون کی تعریف کی اور مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ چنانچہ دسنوی صاحب اور آفاق حسین صدیقی کے ساتھ میں [illegible] پہنچا۔ جہاں کیفی صاحب کا قیام تھا۔ وہ بڑے تپاک سے پیش آئے اور میرے مضمون کی تعریف ایسے الفاظ میں کی جو بڑے لوگوں کا ہی خاصہ ہے اور جو اپنے چھوٹوں کو بھی عزت دیتے ہیں۔ پھر انہوں نے ازراہ محبت نوازی یہ بھی فرمایا کہ میں آجکل تانتیا ٹوپے پر کام کر رہا ہوں۔ مجھے بڑی مسرت ہوگی اگر تم میرے ساتھ مل کر کام کرو اور اس عہد کے تاریخی پس منظر کی تلاش میں تعاون کرو۔

بعد میں آفاق اور میں نے ایک انٹرویو بھی لیا تھا مگر ہم لوگوں کی لاپرواہی سے وہ تلف ہو گیا۔ مگر اتنا ضرور یاد ہے کہ اس میں ایک سوال ہم نے فرقہ وارانہ صورتحال پر بھی کیا تھا اور کیفی اعظمی نے اس کا سبب معاشی قرار دیتے ہوئے کہا تھا کہ اگر سب کو مواقع فراہم ہوں اور ملازمت بنیادی حقوق میں شامل ہو تو فسادات اپنے آپ ہی کم ہو جائیں گے۔ پھر فرصت کہاں رہے گی۔ ظاہر ہے کہ بے روزگاری جو ذہنی تناؤ پیدا کرتی ہے وہ اکثر و بیشتر فسادات یا کسی قسم کے دہشت پسند رویوں کے ذریعے ظاہر ہوتی ہے۔" تاجدار احتشام کی آواز مجھے پھر واپس ماحول میں لے آتی ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں۔ کیفی صاحب اقبال مسعود شعر بھی اچھے کہتے ہیں۔ ان سے شعر بھی سنے جائیں۔ اور کیفی اعظمی مجھ سے شعر سنانے کے لئے کہتے ہیں۔ میں ایک غزل کے چند شعر سناتا ہوں ؎

موسم گل میں اگر شاخ سے ٹوٹے ہوتے   کچھ شگوفے بھی اسی شاخ سے پھوٹے ہوتے

حاضرین نے ہمت افزائی کی اور شعروں کو بار بار پڑھوایا۔ آخر میں جناب صدر یعنی ہمارے عزیز دوست ظفر صہبائی نے [illegible] کا شکریہ ادا کیا اور یہ بھی کہا کہ کیفی اعظمی صاحب نے جو اقبال مسعود کے افسانے کے بارے میں مشورہ دیا ہے تو میرا خیال ہے کہ فنکار کو گائیڈ لائن کی ضرورت نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کو خود اپنی راہ متعین کرنے اور سیکھنے اور دنیا سے سبق لینے کے لئے آزاد چھوڑنا چاہیئے۔ پھر غزل شروع کی:

سامنے ہے آسمان   پر نہیں سکتے اڑان
اف یہ ہوا کا دباؤ   پھٹنے لگے بادبان
آئیے آخری نوحہ پڑھیں   منہ میں ہے زبان

داد و تحسین کا ایک شور اٹھا۔ پھر دوسری غزل سنانے کی فرمائش کی گئی۔ پھر تیسری غزل ظفر صہبائی اپنے مخصوص انداز میں سنا رہے تھے۔ میرا دل ظفر کی تعریف سے خوش ہوا۔ وہ واقعی اچھے شعر کہتا ہے۔ ظفر کو شعر پڑھتے دیکھ کر مجھے داغستان کے مشہور شاعر رسول حمزہ کی یہ بات یاد آئی کہ "شاعری اپنی مٹی اپنی قوم اور اپنی مادری زبان سے پھوٹتی ہے" اتنے میں واقف صاحب کیفی اعظمی سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ بھی کچھ اشعار سنائیں۔ اعظمی انکار کرتے ہیں کچھ نیا لکھا ہی نہیں۔ تو سنائیں کیا! ظفر صہبائی کہتے ہیں کہ "آپ ہم لوگوں کو کچھ بھی سنائیں ہم تو درحقیقت آپ ہی کے شعر سننے آئے تھے۔ کیفی صاحب ایک مسکراہٹ کے ساتھ غزل چھیڑتے ہیں۔

میں ڈھونڈتا ہوں جسے وہ جہاں نہیں ملتا   نئی زمین نیا آسماں نہیں ملتا

سہیل فاروقی

گرفتہ دل جو ترے درد کی امان میں تھے
سروں پہ دھوپ تھی پر جیسے سائبان میں تھے

کھلی تھی آنکھ مگر کچھ نہ آنکھ بھر دیکھا
شبیہ کس کی نظر میں تھی کس کے دھیان میں تھے

ہمارے سر پہ رہا کچھ نہ آسماں کے سوا
ہمارے ساتھ جو کھیلے تھے آسمان میں تھے

ملال سب کو تھا دریا کے خشک ہونے کا
چمک تھی آنکھ میں اور ذائقے زبان میں تھے

ستم کی زد سے جو نکلے تو یہ نہ ہوش رہا
کہ تیر کتنے ابھی وقت کی کمان میں تھے

سہیل ہم سے نہ سلجھے غزال کے گیسو
کہ خام فکر میں تھے مبتدی زباں میں تھے

● ۱۰۴/۱۲ ذاکر نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

ضیاء الحق قاسمی

میں نے تو کبھی تم سے ستارے نہیں مانگے
کشتی نے سمندر سے کنارے نہیں مانگے

فرصت کے وہ لمحات کا خواہاں رہا مجھ سے
بیٹے نے کبھی مجھ سے غبارے نہیں مانگے

بچپن سے ہے پاؤں پہ کھڑے ہونے کی عادت
میں نے تو کسی سے بھی سہارے نہیں مانگے

اک بار پرکھ تو کبھی میرے جوش و جنوں کو
اے ارضِ وطن تونے دلارے نہیں مانگے

پہنچا ہوں خلاؤں میں فضاؤں میں اکیلا
رستے میں ملائک سے اشارے نہیں مانگے

آنکھوں کے لئے میں نے تو مانگی تھی بصارت
نظروں کے لئے میں نے نظارے نہیں مانگے

ہوتا ہے تا ورد مرے حجرۂ جاں میں
میں نے کبھی پڑھنے کو سپارے نہیں مانگے

● ۱۰۰/۸ اسحاق آباد سرشاہ محمد سلیمان روڈ۔ کراچی ۷۵۹۰۰

ملکہ نسیم

سفر کو نکلے ہیں گردِ سفر کی قید میں ہیں
ہیں سنگِ میل مگر رہ گزر کی قید میں ہیں

جو آشنا تھے وہ لمحے کسی کے ہو بھی چکے
ہم اجنبی کی طرح اپنے گھر کی قید میں ہیں

تمام آئینے دانشوری کے ٹوٹ چکے
جو باخبر تھے وہی بے خبر کی قید میں ہیں

کڑی رتوں میں بھی ترسا کئے ہیں چھاؤں کو ہم
شجر کے سائے تو اب بھی شجر کی قید میں ہیں

وہی اتاریں گی پردے تمہارے ذہنوں کے
جو انگلیاں ابھی دیوار و در کی قید میں ہیں

● پوسٹ بکس نمبر ۳۴۰، جی پی او۔

عبدالعزیز خان

امین بلڈنگ، چوتھا منزلہ، فلیٹ نمبر ۱۶، ابراہیم رحمت اللہ روڈ، بمبئی ۳

لکڑ بھگا

راجیش سگریٹ کا کش لیتے ہوئے سبربن کورٹ باندرہ کے لنکنگ روڈ سے گزر رہا تھا کہ 'سایونارہ' کے پاس 'نیلم' ہوٹل سے رچنا نکلی۔ راجیش اپنی جگہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ اسے ایک ذہنی جھٹکا سا لگا۔ رچنا تو امریکہ میں ہے۔ وہیں ڈاکٹری کرتی ہے۔ تو کیا رچنا واپس آگئی؟ مگر کب آئی۔ کہیں یہ کوئی اور تو نہیں۔ نہیں یہ تو رچنا ہی تھی وہ اس کو ہزاروں میں سے پہچانتا تھا۔ وہ جھکی ہوئی ہو یا بیٹھی یا منہ پھیرے کھڑی ہو۔ سر گھمائے کہیں جا رہی ہو، وہ پہچان لیتا۔ رچنا کا ایک ایک انگ اس کا جانا پرکھا تھا۔ کیوں کہ اس کے ہاتھ اسی کے ہاتھ تھے اس کے پیر اسی کے پیر تھے اس کا چہرہ اسی کا چہرہ تھا۔ اس کی کمر اسی کی کمر تھی۔ وہ کسی اور کی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ کیونکہ راجیش نے نہ صرف اس سے پیار کیا تھا بلکہ اس سے پیار کرتے ہوئے خود اپنے سے بھی پیار کیا تھا۔ نہ صرف پیار کیا تھا بلکہ اسے جیا تھا۔

راجیش نے کسی فلمی ہیرو کی طرح سگریٹ کے جلتے ٹکڑے کو اپنے داہنے ہاتھ کی پشت پر چھو کر دیکھا کہیں یہ خواب تو نہیں۔ مگر یہ حقیقت تھی وہ [illegible] دھانی رنگ کی ساڑی اور پرپل بلاؤز پہن کر ایک مستانی ادا سے چلتی ہوئی۔ وہ ایک تھی جس کے لئے راجیش ناچ ناچ کر پاگل ہو جاتا مگر رچنا تو امریکہ میں تھی!

وہ لمبے تیز قدموں سے اس کی بغل میں چلنے لگا۔ رچنا اپنے بغل میں کسی شخص کو دیکھ کر چونکی اور ترچھی نظر سے دیکھا اچانک رک گئی۔

"ارے راجیش تم!"

مگر راجیش اس کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔

"مگر تم راجیش ہی ہو نا! مگر تم نے یہ کیا صورت بنا لی ہے؟"

"وقت نے مجھے کہیں کا نہ رکھا رچنا۔ وقت کا لکڑ بھگا میرے جسم سے گوشت کے لوتھڑے نوچ نوچ کر لے گیا۔ زندگی پل پل میرے ساتھ ریپ کر رہی ہے۔ اور میں کبھی یہ نہ بھول پایا کہ شروعات تم نے کی تھی ......!"

رچنا کانپ گئی۔ اتنے دنوں بعد راجیش کے درشن ہونے اور یہ تیکھا لہجہ۔ مگر وہ تو اس کی مجرم تھی۔ بولی

"آؤ تو سامنے اوپن ہاؤس میں بیٹھتے ہیں۔"

اوپن ہاؤس میں جونیئر آرٹسٹ اور فلم کی بی کلاس ہیروئنیں کافی کے کپ پر اور کولڈ ڈرنک کے گلاس پر خوش گپیاں کر رہی تھیں۔

وہ دونوں ایک کونے کی میز پر بیٹھ گئے۔ "ہاں اب سناؤ"

"میں تمہیں باتیں سنانے کے موڈ میں نہیں ہوں۔"

"امریکہ سے آنے کے بعد تم سے ملنے کے لئے میں کتنی بے تاب تھی۔ میں تمہارے گھر بھی گئی تھی مگر پتہ چلا کہ تم گھر چھوڑ چکے ہو۔ تمہارے نئے گھر کا پتہ بھی وہاں کسی کو معلوم نہیں تھا۔ پھر میں نے یونیورسٹی کے باہر ریسٹورنٹ کے کاؤنٹر والے کو تمہارے نام ایک خط دیا تھا۔ اس سے پتہ چلا کہ تم ہر ہفتے وہاں ضرور جاتے ہو۔"

"مگر دو مہینے سے میں تو وہاں گیا ہی نہیں۔"

"امریکہ سے آئے ہوئے مجھے بھی دو ہی ماہ ہوئے ہیں۔" وہ بولی

ویٹر نے مینو کارڈ دیا۔

"کچھ کھاؤ گے؟"

راجیش نے نفی میں گردن ہلائی اور اپنے گرد و پیش نظر دوڑائی۔ ایلورا اجنتا کی مورتیوں کے فوٹوگرافس۔ پکاسو کا ایک شاہکار جیسن کے دو میورل، ہلکا ہلکا سنگیت۔

"ایک کافی ایک چائے اور تھوڑے سینڈوچز اور تھوڑی چکن فرینکیز۔"

"کیا اپنے لئے منگایا ہے؟ میں اتنا نہیں کھاؤں گا!"
"اچھا تو ایسا کرو۔ سنو۔ سینڈوچز نہیں لانا۔ صرف فرینکیز،
چکن فرینکیز۔ چائے اور کافی" ویٹر نے پوچھا۔
"یس یس"
ویٹر چلا گیا۔
"راجیش تم اپنا سناؤ میں پہلے تمہیں سننا چاہتی ہوں"
"میں ایک ٹریولنگ ایجنسی میں مینیجر ہوں"
راجیش اور رچنا ایک ہی کالج میں انٹر سائنس تک پڑھے تھے۔ پھر رچنا نے میڈیکل کالج جوائن کر لیا تھا۔ اور راجیش نے ایم۔ ایس۔ سی۔ میں داخلہ لیا تھا۔ راجیش کو سب یاد آنے لگا جیسے کوئی فلم چل رہی ہو یونیورسٹی کے لان پر دونوں کا پیار جسے رچنا نے ہمیشہ دوستی کہا۔ وہ سمجھتا رہا۔ دوستی اور پیار کا فرق۔ مگر رچنا کہتی۔

"ہندوستانی لڑکوں کا بس یہی رونا ہے۔ دوستی کا ہاتھ بڑھاؤ تو وہ اسے پیار میں بدل دینا چاہتے ہیں!"

رچنا کا بچپن لندن میں گزرا تھا۔ اس کے والدین اپنے وطن لوٹ آئے تھے۔ مگر رچنا کا رہن سہن سب مغربی طرز کا تھا یہ الگ بات تھی کہ اس نے "قدیم ہندوستانی تہذیب و ادب" کا بجدی سے مطالعہ کیا تھا۔ اور ہندوستانیت اس کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ اس کا انداز والہانہ تھا۔ کھلا ذہن، کھلا سوچ، کوئی لاگ لپیٹ نہیں۔ سلجھے ہوئے خیالات اور یہی باتیں راجیش کو پسند تھیں ورنہ ایسی کتنی لڑکیاں یونیورسٹی میں تھیں جن سے بات کرو تو لگتا جیسے چار ہی ملاقاتوں میں عشق کرنے لگیں گی۔ اور کہیں گی "شادی کر لو"۔ رچنا کہتی:

"میرے کتنے دوست تھے فارن میں اور یہاں تم اکیلے ہو۔ مگر تم عشق کرنے لگے ہو!"

وہ ہنستی تو راجیش محسوس کرتا کہ وہ اس سے پیار کرنے لگی ہے شادی کے نام پر راجیش کو رچنا نے سمجھایا تھا۔

"راجیش ہم ذہنی سطح پر ایک دوسرے کو انکار کرنے کی لگاتار کوششیں کرتے ہیں۔ تم محسوس کرتے ہو یا نہیں لیکن میں صاف محسوس کرتی ہوں۔ ہمارے اندر وہ کون سی بات ہے، نہیں مکمل طور پر اپنے آپ کھلنے سے باز رکھتی ہے۔ پتہ نہیں کیوں۔ میں اپنے آئیڈیل فریم میں تم کو سمانے کی کوشش کرتی ہوں۔ تو تم یا تو فریم کے باہر چلے جاتے ہو۔ یا فریم کے اندر دب کر رہ جاتے ہو۔ تم فریم میں فٹ نہیں بیٹھتے۔ راجیش ہمیں سمجھنا چاہیئے کہ ہم اس ٹوٹتے ہوئے سرمایہ دار سماج کی دو مخالف سمتیں ہیں۔ ہم دو کناروں کی طرح ہیں۔ جو آپس میں مل نہیں سکتے۔ اس لئے پیار نہیں دوستی ہی ٹھیک ہے!"

ویٹر چائے کافی فرینکیز لے آیا۔
"لو یہ کھاؤ........ اور کیا حال ہے"
"حال سن کر کیا کرو گی؟" وہ ہنسا۔ تب رچنا بولی۔
"مذاق نہیں۔ سنجیدگی سے کہو!"
"مذاق کرنے کی مجھ میں سکت نہیں رہی۔ رچنا میں سوچتا ہوں اس جوکر کے بارے میں جس کی ماں اسپتال کے بیڈ پر زندگی کی آخری سانس لے رہی ہے اور جوکر سرکس میں اپنا آئٹم پیش کر رہا ہے۔ ہنس رہا ہے۔ مگر رو رہا ہے کتنا بڑا مذاق ہے یہ کسی کی زندگی کے ساتھ؟ کتنا بڑا جگر چاہیئے۔ دنیا کو ہنسانے کے لئے؟ اپنے دکھوں کو چھپانے کے لئے؟ مجھ سے یہ سب نہیں ہوا! اس لئے میں نے وملا سے سب کچھ کہہ دیا۔" "وملا کون؟"
"وملا یونین لیڈر کی لڑکی"
"یونین لیڈر کون"
"وہ جس کی سفارش سے میں مل میں نوکری کرنے لگا تھا۔"
"مل میں نوکری! تمہیں تو اچھا خاصہ جاب مل رہا تھا بمبئی میں"
"وہ جاب میری قسمت میں نہیں تھا۔ اور پھر میں نے سوچا تھرڈ گریڈ آدمی کو تھرڈ گریڈ لوگوں کی سطح پر ہی رہنا چاہیئے!"
"طنز کرنے کی تمہاری عادت نہیں گئی"، رچنا نے کہا۔ اور نیپکن سے ہاتھ پونچھے۔
"تب میں نے وملا کو سب بتا دیا تھا"
"تم نے میری برائی کی ہوگی، اور میں ہوں بھی بری، ہے نا؟"
"ہاں! تم بری ہو۔ ورنہ میں کیوں اتنا ٹوٹتا!"
"راجیش تم تو کبھی کبھی بچوں کی سی حرکت کرتے ہو؟"
"ہاں تم سچ کہتی ہو۔ میں نے بال ہٹ کی تھی اور تم نے تھالی میں چاند دکھایا تھا۔ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ چاند تو آسمان پہ ہے اور میں چاند کے لائق نہیں ہوں!" راجیش نے چائے کی چسکی لیتے

ہوئے کہا؛

ونلا سے مل کر مجھے لگا کہ میں نے اپنے زخموں کے لئے مرہم پا لیا ہے۔ ونلا میری بڑی خدمت کرتی تھی وہ ایک خدمت گذار لڑکی تھی۔ مجھ سے خوب باتیں کرتی تھی۔ میرے زخم بھرنے لگے تب ایک دن میں نے سنا کہ ونلا کے اور دو ایک لوگوں سے تعلقات ہیں۔ میں نے ونلا سے جاننا چاہا۔ سچ اور جھوٹ؟ تب اس نے کیا کہا تھا پتہ ہے؟"

رچنا کانی سہمنے لگی۔

اس نے کہا تھا، ہاں ہاں!......... میرے ناجائز تعلقات ہیں فی الحال ایک انیپی سیٹھ کے گھر نوکری کرتی ہوں اور کان کھول کر سنو! شادی کے بعد میں تمہاری جائداد نہیں میں تمہاری بیوی ہوں وہ وقت کا کھانا دے کر تم مجھ سے جو لیتے ہو وہی میں کیوں دوسروں کو نہیں دے سکتی؟ اگر مجھے اپنے آپ کو بیچنا ہی ہے تو میں ایک کے لئے کیوں بکوں۔ اتنا کہہ کر ونلا چلی گئی۔ اپنے انیپی یار کے پاس اور میں دیکھتا رہ گیا۔

کانی ختم کرتے ہوئے رچنا بولی'

غلط نہیں کہا ونلا نے۔ تم مرد سماج کو اپنی اجارہ داری سمجھتے ہو اور عورتوں کو ان کے حقوق نہیں دیتے؟"

"کیا وومن لب جوائن کیا ہے؟" راجیش نے مسکرا کر پوچھا

"ہاں! امریکہ جانے سے پہلے میلا جاگرتی منڈل کی میں ممبر ہوں اور چاہتی ہوں کہ ہر عورت اس منڈل کو جوائن کرے۔ خیر میں یہاں ممبر نہیں ہوں۔ تمہاری دوست ہوں۔ آگے بتاؤ۔ یہ کوئی کہانی نہیں! جو تم مجھے لے بیٹھے ہو سنتی رہوں" وہ چڑھ کر بولا۔

"خیر مائی ڈیئر۔ میں کب کہتی ہوں کہانی ہے؟ میں نے دونوں دفعہ غلط عورتیں چنیں۔ مجھے اس کا اعتراف ہے۔ ایک تم جو اپر کلاس کی تھیں اور ونلا جو لوور کلاس کی تھی اور میں......؟" راجیش نے کہا۔

"اور تم" رچنا نے پوچھا؟

"میں نہ اوپر تھا نہ نیچے۔ بیچ میں لٹک رہا تھا نہ پیر زمین پر تھے نہ سر آسمان سے لگا تھا۔

"یوں کہو کہ تم بھاؤ ناکی کشتی میں سوار تھے اور تمہارا کوئی پلیٹ فارم نہیں تھا۔

"میں بھاؤ ناکی کشتی میں سوار نہیں تھا —— میرا پلیٹ فارم مزدور تھا۔ میں مل کی یونین کی سرگرمیوں میں رات دن مصروف رہنے لگا تھا۔ یونین لیڈر سے کسی بات پر غلط فہمی پیدا ہو گئی تھی۔ پھر غلط فہمیاں بڑھتی گئیں۔ مجھے مل سے نکالا گیا تھا۔ اور یونین سے بھی جھگڑا چھا ہوا کہ گھر تھا میرے پاس اور ونلا بھی کسی حد تک میری تھی۔ لیکن اب کے قسمت نے ساتھ نہیں دیا تھا۔ ونلا ایک لڑکے کو جنم دے کر ہمیشہ کے لئے اپنی کہانی ختم کر کے چلی گئی تھی لڑکا دماغی طور پر مفلوج MENTALLY RETARDED تھا۔

آپ کے کہنے کے مطابق کہ اس لڑکے کی ماں کے ناجائز تعلقات کسی انیپی سے تھے۔ ہو نہ ہو یہ لڑکا اسی انیپی سیٹھ کا ہے۔ شاید اس کا علاج ناممکن ہے۔ کیس ہسٹری سناتے ہوئے ڈاکٹر بولا تھا۔

"میں ٹوٹ گیا تھا۔ کئی دنوں تک میں سمجھ نہ پایا تھا کہ اس بچے کا کیا ہو گا۔ اب تم اپنی سناؤ۔

"میں نے امریکہ میں ایک امریکن سے شادی بھی کی لیکن شادی زیادہ دن نہ چل سکی گھر کے لوگوں سے بھی میرا رشتہ ٹوٹ چکا تھا۔ مگر ایک دن یہی ہوا۔ طلاق۔ دہیئر ڈیئر نرس وانٹ نتھنگ بٹ سیکس۔ —— ایک خاندان بنانے کی خواہش ان میں کبھی نہیں ہوتی۔ میں تمہارے بچے کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ چلو میرے ساتھ؛"

اور پھر وہ بل ادا کر کے ہوٹل سے باہر نکلے۔

امریکہ سے لوٹنے کے بعد رچنا نے ایک فلیٹ لے لیا تھا۔ اس کے امریکہ میں رہتے ہوئے ہی یہاں ایک رشتے دار نے لیڈیز ڈپنسری کا انتظام کیا تھا۔ اور رچنا نے آتے ہی چارج لے لیا تھا۔

رچنا نے راجیش کے دماغی طور پر مفلوج بچے کو چیک کیا تھا۔ کسی بڑے سائیکیاٹرسٹ PSYCHIATRIST کا مشورہ بھی لیا تھا۔ اور بڑی خود اعتمادی سے کہا تھا کہ یہ کوئی غیر معمولی کیس نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

اسے تو رچنا نے جیسے ایک زمین دے دی تھی۔ جہاں کی وہ بحال چہل قدمی کرتی تھی جس کا بدلہ راجیش اس کا خیال دے کر چکا تا تھا۔

دو دن بعد رچنا نے راجیش کے سامنے شادی کی تجویز رکھی

راجیش کو یقین ہی نہ آیا۔ کہیں رچنا شادی کے بہانے اس سے مذاق تو نہیں کر رہی ہے!۔

اس نے سوچا۔ رچنا سے شادی کرکے شاید اس کے دل پر لگے زخم اور داغ مٹ جائیں گے! مگر زندگی میں اتنا بھٹکنے کے بعد وہ اب کہیں ٹک بھی پائے گا!

"کیا سوچ رہے ہو؟"

"کچھ نہیں۔ یوں ہی۔"

اگر بچے کے بارے سوچ رہے ہو تو بالکل فکر مت کرو میں جو ہوں تمہارے ساتھ۔ اس کا حل میرے پاس ہے میں بچے کو علاج کے لئے فارین لے جاؤں گی۔ مجھے یقین ہے بچہ اچھا ہو جائے گا۔

راجیش کو یوں لگا جیسے وقت کا لکڑ بگا ایک بار پھر اس کے بدن سے گوشت نوچنے کے لئے اپنے نوکیلے پنجے تیز کر رہا ہو۔ اس نے بڑے ہی دھیرج کے ساتھ کہا۔

"تمہاری ہمدردی کا بہت بہت شکریہ!"

"اس میں شکریہ کی کیا بات ہے؟ یہ تو میرا فرض ہے اور اب ہم دو تھوڑے ہی ہیں!"

راجیش کو رچنا کی وہ پرانی بات یاد آگئی۔

"۔۔۔۔۔۔۔ پتہ نہیں کیوں میں اپنے آئیڈیل فریم میں تم کو سجانے کی کوشش کرتی ہوں تو تم یا تو فریم کے باہر چلے جاتے ہو یا فریم کے اندر دب کر رہ جاتے ہو۔ تم فریم میں فٹ نہیں بیٹھتے۔۔۔۔۔۔۔"

اسے خاموش دیکھ کر رچنا نے کہا:

"تم پھر سوچ میں پڑ گئے؟"

"نہیں بس یوں ہی۔۔۔۔۔۔"

"تو پھر میری بات کا جواب دو۔"

"جواب! رچنا تمہارا دل سچ مچ بہت بڑا ہے۔ پھر بھی شاید میرا جواب تمہیں برا لگے۔ ایک بار تم نے کہا تھا کہ۔۔۔۔ ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ ہم اس ٹوٹتے ہوئے سرمایہ دار سماج کی دو مخالف سمتیں ہیں۔ ہم دو کناروں کی طرح ہیں جو آپس میں مل نہیں سکتے۔ اس لئے پیار (شادی) نہیں دوستی ہی ٹھیک ہے۔"

اور رچنا کھوئی کھوئی سی راجیش کی طرف دیکھتی رہی۔

اتر پردیش اردو اکادمی کی مطبوعات

سلسلۂ ابوالکلام آزاد صدی تقریبات

کتاب		مرتب	قیمت	کتاب		مرتب	قیمت
الہلال (اخبار)		ابوالکلام آزاد دستی حصہ تین کل سیٹ	۶-/	خطبات حسرت موہانی	مرتبہ	مفتی محمد رضا انصاری	۱۰-/
انتخاب ہفتہ وار پیغام	مرتبہ	محمود الٰہی	۸-/	یادگار آزاد (شاریہ)	"	عبدالقوی دسنوی	۱۲-/
الہلال کے تبصرے	"	محمود الٰہی	۱۸-/	انتخاب زمیندار	"	عتیق احمد صدیقی	۱۳-/
انتخاب تذکرہ	"	محمود الٰہی	۱۲-/	انتخاب مدینہ بجنور	"	سید محمد عقیل رضوی	۱۲-/
الہلال کے افسانے	"	ایم کوٹھیاوی راہی	۱۰-/	انتخاب ہمدرد	"	صباح الدین عمر	۱۵-/
خطبات خلافت	"	محمود الٰہی	۱۵-/	مولانا آزاد کا نظریۂ صحافت	"	قطب اللہ	۱۲-/
خطبات جمعیۃ العلماء	"	شجاعت علی سندیلوی	۱۳-/	کمال ابوالکلام		علی جواد زیدی	۱۱-/

ملنے کا پتہ

اتر پردیش اردو اکادمی، قیصر باغ لکھنؤ۔۔۔

فون
۲۴۳۱۴۲
۲۳۶۰۳۲

بہ خط شاعر

ایک ادی باسی لوک گیت

چھور کے حسین سپنے
دیکھتا ہوں میں کب سے
میرے گاؤں باہر کا
یہ گھنا سا اندھیرا
ختم ہونے والا ہے
اُسے زرد جگنوؤں میں
روشنی کے گیت ہوں گے
دور سے جو روشنی میں
وہ بکاش کو لرزیں
ایک ایک کھولی میں
سحر کے آئیں گے
چھور کے حسین سپنے
دیکھتا ہوں میں کب سے

اچھوت

تم مجھے چھوتے ہو جانم!
تن پہ گنگا جل چھڑک کر
خود پوتر ہو گئی
لیکن نہیں دنیا میں ایسی چیز کوئی
جو پوتر کر سکے مجھکو!
میں تو پیدا ہی ہوا ہوں اپوتر
عمر بھر میں اپوتر ہی رہوں گا
اور مر جاؤں گا آخر اپوتر!!

جینت پرمار

شجرہ

میں نے کتابوں میں ہی پڑھا ہے
کئی وطنوں کا شجرہ
مجھکو اپنے پردادا سے پہلے کے
پرکھوں کے نام نہیں معلوم
کون تھے وہ
کیا کرتے تھے
مجھکو نہیں معلوم مگر
میں نے سنا ہے —
تیرتھ یاترا کے پنڈوں کی بستی میں
رہتا ہے یہ شجرہ
لیکن کیا میرے پرکھے
ایسے تیرتھ دھام گئے ہوں گے!

ان پڑھ باپ

پڑھانے کی خواہش میں
ان پڑھ باپ نے
میرے دائیں گال پہ
کتنے طمانچے مارے تھے!
نوٹ بک میں جب
میں نے پہلی بار لکھا تھا
گنتی بنا ڈالی تھی میری
یہی سمجھ کر
شاید میں نے
ٹیڑھی میڑھی ریکھاؤں سے
نوٹ بک گندی کر دی تھی!

۲۵ دسمبر ۱۹۲۷

منوسمرتی کا ورق ورق
تو نے جلایا —
کس میں ہمت تھی
کہ تجھے تو روک سکے
میں نے سیاہی کے بدلے
اسی آگ کو
اپنی دوات میں بھری ہے
جس میں ڈبو کر اپنا قلم
گیت تمہارے لکھتا ہوں

* ۲۵ دسمبر ۱۹۲۷ کو ڈاکٹر امبیڈکر
منوسمرتی کا کاپیاں جلائی تھی -

● اے/۳۰۰ وجل پیالا، سرکٹ ہاؤس، شاہ پور، احمد آباد -۱

کمال احمد

ڈی ۱/۴۴۰، سرسید احمد روڈ کلکتہ ۱۴۰۰۰۷

قضیہ

ہوا کچھ بھی نہیں تھا۔
ایک مفلس عورت کی موت ایسی نہیں تھی کہ اخبار کی سرخی بنتی
لیکن گوپال کی سیاست نے ویدی کی موت کو اہم بنا دیا
اشرف نے جب دیکھا صبح سویرے اٹھ جانے والی ویدی کے کمرے کا دروازہ دس بجے تک نہیں کھلا تو اسے تشویش ہوئی۔ وہ جانتا تھا کہ ویدی کبھی نائٹ ڈیوٹی نہیں کرتی تھی۔ اس نے دستک دی، کنڈی ہلائی۔ زور زور سے دھکا دیا۔ لیکن دروازہ پھر بھی نہ کھلا۔ کچھ ہی دیر میں ایک بڑا مجمع جمع ہو گیا۔ بات بستی کمیٹی کے دفتر تک پہنچائی گئی۔ کئی ممبر دوڑے آئے۔ سبھوں کی تجویز یہ ہوئی کہ دروازہ توڑ دیا جائے اور دروازہ توڑتے وقت گوپال بھی نہ جانے کہاں سے آ گیا۔
کمرے کے بیچوں بیچ ویدی مردہ پڑی تھی۔ ویسا ہی پرسکون چہرہ لگ رہا تھا سو رہی ہے ابھی جاگ پڑے گی۔ لیکن نہیں جاگی وہ
اشرف آبدیدہ ہو گیا۔ اسے ڈھیر ساری باتیں یاد آ گئیں۔ یاد آئے وہ دن جب وہ سخت بیمار تھا۔ ٹی بی ہو گئی تھی اسے اور ویدی نے پورے دو سال ہسپتال میں اس کا علاج کروایا تھا۔ روزانہ انجکشن لگواتی تھی اور روز دوائی دلواتی تھی۔ سب کچھ مفت۔ دو سال بعد کیسا ہٹا کٹا ہو گیا تھا وہ
اشرف کو دکھ اس بات کا تھا کہ وہ ویدی کے کام نہ آ سکا۔ وہ تو ویدی کے بارے میں زیادہ پہچان بھی نہ سکا تھا۔ وہ کون تھی؟ کہاں سے آئی تھی۔؟ بس اتنا جانتا تھا کہ وہ ہسپتال میں آیا ہے۔ اور گزشتہ دس سال سے اس بستی کے ایک اندھیرے کمرے میں رہتی تھی۔ اشرف نے چاہا تھا کہ بجلی کی ایک لائن وہ بھی لگا لے۔ آخر سبھی تو کارپوریشن کی بجلی چرا کر اپنا گھر روشن کر رہے تھے۔ وہ کیوں اندھیرے میں رہے۔ لیکن شاید ویدی کو چوری کا اجالا پسند نہ تھا۔ اشرف نے ایک بار ویدی کا نام پوچھ کر مذہب جاننا چاہا تھا۔ —— "مجھے صرف ویدی کہو۔!"
"صرف ویدی کیوں؟" اشرف نے حیرت ظاہر کی۔
"کیونکہ میں تمہاری بہن جیسی ہوں"
"تو پھر آپا کیوں نہیں۔؟" اشرف نے یہ نا چاہا۔ اور ویدی مسکرا کر رہ گئی
اشرف نے دھیرے سے کمیٹی کے صدر کے کان میں یہ بات ڈال دی کہ ویدی مسلمان تھی اور اسے دفنایا جانا چاہیئے بات دھیرے دھیرے بستی کے لوگوں میں پھیل گئی کہ ویدی کی تجہیز و تکفین کا انتظام کمیٹی کر رہی ہے
بس پھر کیا تھا۔ گوپال کو تاؤ آ گیا اس نے اپنے لوگوں کو جمع کر کے کمیٹی کے دفتر میں دھاوا بول دیا کہ ویدی ہندو تھی اور اسے ہندو دھرم کے انوسار جلایا جانا چاہیئے۔
لوگ دو گروپ میں بٹ گئے۔
بات تھانے تک پہونچی۔ پولس نے لاش پر قبضہ کرنا چاہا لیکن گوپال اور اس کے لوگ آڑے آ گئے۔ ایم ایل اے اور مقامی کاؤنسلر بھی اس دوران پہنچ چکے تھے۔ ویدی کے کمرے کی تلاشی لی گئی۔ لیکن کوئی بھی چیز ایسی نہ ملی جس سے مذہب کا پتہ چلتا، کمرے کے ریٹ بل میں بھی صرف ویدی لکھا تھا۔ ایم۔ ایل۔ اے نے دونوں فرقوں کے نمائندوں کو دلیل پیش کرنے کی دعوت دی کہ وہ ثابت کریں۔ ویدی کا مذہب کیا تھا؟
بستی کمیٹی کے دفتر میں میٹنگ بلائی گئی دونوں فرقوں کے چار چار نمائندے، ایم ایل اے، کاؤنسلر، تھانے کا او۔ سی اور کمیٹی کے عہدے داروں کی بند دروازے میں میٹنگ شروع ہوئی
"میں نے اکثر ویدی کو مولا علی درگاہ میں سجدہ کرتے دیکھا ہے

اشرف نے دلیل پیش کی

"یہ کوئی بات نہ ہوئی۔ درگاہ میں سبھی فرقے کے لوگ سجدہ کرتے ہیں۔ اس میں مذہب کی قید نہیں" ایم ایل اے نے اشرف کی دلیل رد کر دی۔

"میں پوجا کا پرشاد جب بھی دیدی کو دیتا۔ وہ عقیدت سے اسے آنکھوں سے بوسہ دے کر کھایا کرتی تھی" گوپال نے کہا

"یہ بھی ثابت نہیں کرتا کہ دیدی ہندو تھی" ایم ایل اے صاحب نے گوپال کی دلیل کو بھی مسترد کر دیا۔

اچانک خلیل صاحب کو ایک واقعہ یاد آیا۔ انہوں نے اجازت مانگی کہ انہیں واقعہ بیان کرنے دیا جائے۔

ایم ایل اے صاحب نے اجازت دے دی۔

میرے گھر ولادت ہونے والی تھی۔ رات کے تقریباً دو بجے درد اٹھا۔ بارش بہت تیز ہو رہی تھی۔ تمام راستے پانی سے جل تھل تھے۔ کوئی سواری بھی نہیں تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کریں تو کیا کریں۔ اچانک دیدی کا خیال آیا کہ وہ اسپتال میں کام کرتی ہیں شاید کچھ مدد کر سکیں۔ جب ان کے پاس گیا تو وہ فوراً راضی ہو گئیں اور مجھے کہا کہ گھر پر ہی بچے کی ولادت کی تیاری کروں۔ بڑی مدد کی انہوں نے اور ٹھیک اس وقت جب فجر کی اذان ہو رہی تھی بچے کی ولادت ہوئی۔ انہوں نے مجھے مبارکباد دیتے ہوئے کہا لڑکا ہوا ہے بڑی مبارک گھڑی میں اس کے کان میں پہلی آواز اذان کی گئی ہے اس کا نام بلال رکھنا۔" اتنا کہہ کر خلیل صاحب رکے اور سبھوں پر نظر دوڑاتے ہوئے کہا "بتایئے اگر وہ مسلمان نہیں تھیں تو انہیں اذان کی واقفیت کس طرح ہوئی اور وہ یہ کیوں کہتیں کہ اس کا نام بلال رکھنا"

اس سے پہلے کہ ایم ایل اے کچھ کہتے گوپال بول اٹھا

"اسے چھوڑیئے! اس طرح کا من گھڑت واقعہ میں بھی بہت سنا سکتا ہوں۔"

"جھوٹ کہہ رہے ہے" اس کے ساتھیوں نے اس کا ساتھ دیا۔

گوپال بپھر کر کھڑا ہو گیا۔ "دیکھئے ایم ایل اے جی! آپ تو میں کیسے چھوڑ آپ کو دھرم کا کیا پتا۔ لیکن ہم ایسا ہونے نہیں دیں گے۔ نہیں ہونے دیں گے۔ جے سیا رام" سبھوں نے نعرہ بلند کیا۔ گوپال جو تین بار اجودھیا ہو کر آیا تھا اور ۶ دسمبر کو مسجد شہید ہونے کے بعد جلسے کی ایک اینٹ بھی ساتھ لایا تھا۔ آج اسے اس جلسے پر اپنے لیڈر شپ کی عمارت کھڑی نظر آ رہی تھی۔

معاملہ بگڑتا دیکھ کر ایم ایل اے صاحب نے اشرف، محسن اور خلیل کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ دیدی کا انتم سنسکار گوپال کو کرنے دیں۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ اجودھیا نہیں، بنگال ہے ہم ان کے بہکاوے میں نہیں آئیں گے۔" تینوں نے ایک زبان ہو کر کہا۔

"آپ ایک عورت کو جلانے سے روک رہے ہیں جبکہ آپ کے لوگوں نے بھی جلانے کو صحیح مان لیا ہے۔ چاہے کچھ ہو دیدی کا انتم سنسکار ہندو دھرم کے انوسار ہوگا۔" گوپال کچھ زیادہ ہی بدتمیز ہو رہا تھا۔ حاجی صاحب سمجھ گئے۔ گوپال کا اشارہ صغریٰ، عصمت اور ہدایت اللہ کی طرف ہے۔ او سی نے مداخلت کرتے ہوئے کہا "آپ لوگ جلد کوئی فیصلہ کریں ورنہ مجبوراً لا اینڈ آرڈر برقرار رکھنے کے لیے پولس کو کاروائی کرنی ہوگی۔"

"لاش کا پوسٹ مارٹم ہوگا" پوسٹ مارٹم کی بات سن کر اشرف چونک گیا اسے دیدی کی لاش کی بے حرمتی منظور نہ تھی۔

او سی نے گوپال سے شانت ہو جانے کو کہا، ایم ایل اے اور کاؤنسلر نے دوبارہ حاجی کریم اللہ، اشرف، خلیل اور محسن کو سمجھایا۔ وہ مان جائیں اور لاش گوپال کے حوالے کر دیں۔ ورنہ فرقہ وارانہ فساد کا ڈر ہے سب خاموش ہو گئے۔ ایم ایل اے نے گوپال کو اجازت دے دی کہ لاش ہندو دھرم کے مطابق جلائی جا سکتی ہے۔ یہ سنتے ہی گوپال اور اس کے ساتھیوں نے "جے سیا رام" کا نعرہ بلند کر کے اپنی جیت کا اعلان کیا۔ خوشی سے سبھوں کے چہرے دمک رہے تھے۔ اشرف کو نہ جانے کیوں اپنی شکست کا احساس ہو رہا تھا۔ سبھی سر جھکائے کلب کے دفتر سے نکل آئے۔ او سی نے اطمینان کا سانس لیا۔

دوسرے دن دیدی کی ارتھی ترشول دھاریوں نے شان و شوکت سے اٹھائی۔ چندہ میں کافی رقم اکٹھا کی گئی۔ اخباروں کو سرخی ملی۔ گوپال کی بڑی بڑی تصویریں چھپیں۔ دور دراز سے لوگ دیدی کی ارتھی کو کندھا دینے آئے ایک میلہ سا لگ گیا۔

گوپال اب بہت بڑا لیڈر بن چکا تھا۔ اس نے چندہ کی رقم سے ایک آشرم بھی کر لیا تھا۔ جہاں بڑے بڑے نیتا آنے لگے تھے۔ یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ اس جگہ سے اب گوپال الیکشن لڑے گا۔ تمام ہندو دوٹ جو اسے کے تھے دیدی کی موت کے ٹھیک دو مہینے بعد درمیانی عمر کا ایک کوئی ایک تصویر ہاتھ میں لئے، بستی کے لوگوں سے پوچھتا پھر رہا تھا کہ کیا کوئی انجیں

پہچانتا ہے۔ تصویر بڑے غور سے دیکھنے کے بعد اشرف نے پہچان لیا۔
یہ تو دیدی کی تصویر ہے۔" تم پہچانتے ہو"؟ اجنبی نے بے چینی سے پوچھا۔
" ہاں۔ یہ ہمدی دیدی کی تصویر ہے، جوانی کی ہے تاس لئے پہچاننے میں دیر ہو گئی۔" اشرف بولا" لیکن تم کون ہو"؟ "میں بنگلا دیش سے آیا ہوں۔ یہ میری ماں ہے۔" اس نے جواب دیا۔
دیدی کا بیٹا۔ اشرف نے حیرت سے پوچھا" آپ کا نام؟
"منیرالدین۔!
منیرالدین اشرف نے دہرایا۔ تو آپ...؟.... آیئے میرے ساتھ"
اشرف اسے لے کر کمپنی کے دفتر میں پہنچا۔ کوئی ضروری میٹنگ چل رہی تھی ایم ایل اے، کاؤنسلر سبھی موجود تھے۔ اشرف اجنبی کو لئے تیزی سے داخل ہوا۔" دیکھئے ملئے ان سے" اشرف نے منیر کو آگے کرتے ہوئے کہا۔
"کون ہیں یہ؟ ایم ایل نے پوچھا۔ دیدی کا لڑکا۔ بنگلا دیش سے آیا ہے۔ ڈھونڈتا ہوا اپنی ماں کو
۔ نام ہے اس کا منیرالدین۔ سنا آپ نے منیرالدین اور آپ سبھوں نے اسے جلا دیا
"جلا دیا؟ کیسے؟ میری ماں کو فساد میں" منیر نے بے چین ہو کر پوچھا
"نہیں فساد کے ڈر سے" اشرف بولا۔
ایم ایل اے نے منیرالدین سے بیٹھنے کو کہہ" دیدی آپ کی ماں تھیں۔؟"
منیرالدین نے تصویر دکھاتے ہوئے کہا۔" یہ میری ماں تھیں۔"
" اتنے دنوں بعد آپ کو ماں کی یاد آئی۔" کاؤنسلر نے طنز کیا
" ماں برسوں پہلے ابا سے ناراض ہو کر کہیں چلی گئیں تھیں"
" ناراضگی کی وجہ"
" ابا نے دوسری شادی کر لی تھی"
" اتنے دنوں آپ نے اپنی ماں کو تلاش کیوں نہیں کیا"
" میں بنگلا دیش میں نہیں رہتا تھا۔ سعودی میں نوکری کرتا تھا۔ ابا نے کبھی خط میں ماں کے گھر چھوڑنے کا ذکر نہیں کیا۔ کیسے جانتا۔"
منیرالدین بری طرح رونے لگا۔
اشرف سوچ رہا تھا کہ قبر بھی تو نہیں جہاں وہ رو کر جی کو ہلکا کر سکے۔ جہاں یہ محسوس کر سکے کوئی اس کا اپنا ابدی نیند سو رہا ہے۔ قبر پر اس کے رو لینے سے دیدی کی روح کو سکون ملتا اور اس کا جی بھی ہلکا ہو جاتا۔

مگر اب کیا ہو سکتا ہے سب کچھ تو جل کر راکھ ہو گیا۔ اشرف کو جاتا دیکھ کر ایم ایل اے صاحب نے پیچھے سے آواز دی۔
"اشرف کہاں جا رہے ہو؟"
"گوپال کے پاس" اشرف نے پلٹ کر جواب دیا
"کیوں"؟
" اس سے جلنے کی اینٹ واپس لینے۔ اس کا حق دار وہ نہیں
" ارے روکو"! اشرف کو روکو۔" ایم ایل اے صاحب سبھوں سے کہہ رہے تھے
لیکن تب تک اشرف جا چکا تھا۔

بقیہ صفحہ ۲۳ — فلسطینی ڈائری

کرنے کی کوشش کر رہا تھا، جن سے ملاقات کئے کئی برس بیت چکے تھے وہ لوگ اماں میں مقیم ہیں، جہاں میرا داخلہ ممنوع ہے۔ کئی بار میرا ویزا رد کیا جا چکا ہے۔ میرے باپ اور بھائی اماں میں رہتے ہیں، میری بیوی اور بچے دمشق میں رہتے ہیں اور میں تنہا بیروت میں ہوں!
ایسا ہوتا ہے صحیح معنوں میں ایک فلسطینی خاندان۔
عبدالعزیز ایک مجاہد ہے، اس کا اپنا خاندان گیلیلی میں ہے، اس کا ایک بھائی لندن میں ہے، دوسرا جرمنی میں اور دو بہنیں دبئی میں وہ سب عرب ملک میں یکجا نہیں ہو سکتے سالوں سے [illegible] کرتے ہیں! ان کا خاندان خوش قسمت ہے کہ وہ لندن میں مل بیٹھنے کی صورت اور سبیل کرنے میں کامیاب ہوئے ۱۹۴۸ کی ہجرت کے بعد وہ پہلی بار یکجا ہوئے تھے۔
یہودی ہر دور میں اپنی مصیبتوں کو خوب بڑھا چڑھا کر بتاتے رہتے ہیں۔ ان میں اور ہم میں فرق یہ ہے کہ وہ جتنا روتے ہیں اتنا ہی دنیا سے مطالبہ بھی کرتے ہیں، امریکہ اور یورپ بھی ان کی خوب طرفداری کرتا ہے اور ان کو برباد کی شہ پر ہی بیروت کو تباہ کیا جا رہا ہے۔
ہم دنیا سے رحم کی بھیک نہیں مانگ رہے ہیں، ہم تاریخ اور زندگی سے اپنا حق طلب کر رہے ہیں، دشمن ہمیں نیست و نابود کر دینا چاہتا ہے۔ دراصل وہ اپنی بقا کے لئے ہمیں صفحۂ ہستی اور تاریخ کے صفحات سے مٹا دینا چاہتے ہیں۔ ہماری ہستی خواہ کتنی کمزور ہو ہم زندہ رہیں گے۔!

حمید اختر سکروڈھنوی

سیم آب و گل تیرا نفس کا ساز بھی تیرا
بانِ نطق کو بخشا ہوا اعجاز بھی تیرا
ہا تک حق ہے علی کب کر سکا حمد و ثنا تیری
مرا سجدہ بھی تیرا سجدہ گاہِ ناز بھی تیرا
را میں تھر رہا ہوں میں بلندی کی طرف لیکن
گوں میں گرم خوں تیرا پرِ پرواز بھی تیرا
میں نے تجھکو پہچانا تو اس میں کیا ہنر میرا
ے توفیق بھی تیری ہے انداز بھی تیرا
قدرت کب ہے اختر کو کہ اپنے لب ہلا پائے
یا یہ گنگ بھی تیرا سخن پرداز بھی تیرا

● ۵۲۵۔ دلکشا روڈ اسلام آباد میرٹھ۔ یوپی

فصیح اللہ خاں نقیب

ہے فرشتہ تو کسی حال میں رہ
دمی ہے تو اپنی کھال میں رہ
قصلہ ہے تو اپنی راہ نکال
گر نہیں ہے تو پھر چال میں رہ
ب یہ دنیا کسی کو راس آئی
ونہ ملنے تو اختلال میں رہ
دھوپ میں چھاؤں میں خنک میں ترمیں
رہ کہیں پر بھی، پر شال میں رہ
پل ندی کی طرف نہ دیکھ نقیب
ست بس روزیِ حلال میں رہ

● اصغر حسین جونیئر کالج۔ اکولہ (مہاراشٹر)

ساز اندمانی

کینوس خالی ہے اک تصویر دے
میرے بنجر خواب کو تعبیر دے
درد کا احساس لے لے، یا مجھے
دستِ عیسیٰ میں تھی جو تاثیر دے
کیوں ہے قسطوں میں عذابوں کا نزول
جو سزا دے تو بلا تاخیر دے
منتشر ہوں جسم کے ملبے تلے
شخصیت کو پھر مری تعمیر دے
بے کرانی دے غزل کو سازؔ تو
شاعری کو اک نئی تنویر دے

● ا۔ مثل پراشنٹ پیٹ بلیٹر ۴۲۰۱۰۱

نعیم الدین فضا

ہوئی ہے تیز کچھ ایسے نفس نفس کی آگ
محال ہے کہ بجھے منبر و کلس کی آگ
ہوا سنائے ابھی خیر حسنِ گلشن کی
کہ شاخ شاخ ہے پھیلی ہوئی نگس کی آگ
نظامِ دہر کو پیہم دکھا رہی ہے آنکھ
مزاجِ وقت میں ٹھہری ہوئی اُمس کی آگ
خرد کے دور میں معدوم ہو گئی افسوس
دل و نگاہ سے احساس کے جرس کی آگ
ہے فکر صید کی پا تیلیوں کا غم ہے فضاؔ
بجھانے بیٹھا ہے صیاد کیوں قفس کی آگ

● ۱۴۔ بی بی بگان لین کلکتہ۔ ۷۰۰۰۱۵

انور ایرج

میں چھلک گیا کہیں آنکھ سے تو کہیں پلک پہ ٹھہر گیا
وہ زمیں سے اپنی گزر سکے میں کہاں کہاں نہ گزر گیا
وہی ابر بن کے مری روشنی وہی شہر دھوپ سے جھلو نکی
یہی دکھ کہ میں سنگ اٹھا کے درد مینے میں ابھر گیا
ہر ایک رہگذر تری رہگذر ہر ایک راستہ ترا راستہ
مجھے تو ملا ترا نقش پا میں جہاں گیا جدھر گیا
مجھے بندگی تو نہ آ سکی یہ تری طلب کے کمال تھا
کبھی دست بستہ کھڑا رہا کبھی سجدے میں میرا سر گیا
میری حیثیت میرا نام کیا، میری ذات وصف و صفات
کہیں قطرہ قطرہ سمٹ گیا کہیں ذرہ ذرہ بکھر گیا

● مدینہ منزل، ہندپیڑھی۔ رانچی ۸۳۴۰۰۱

محمد قاسم دہلوی

دلی سا کوئی شہر بھی دنیا میں کہیں ہے
اجڑا ہے کئی بار مگر اب بھی حسیں ہے
طوفان و حوادث میں کمی کوئی نہیں ہے
لیکن مرے پیروں کے تلے اب بھی زمیں ہے
ہونا ہے مجھے خاکِ وطن تیرا ہی پیوند
ہجرت کا تو اب میرا ارادہ ہی نہیں ہے
کس طرح مٹاؤ گے نشاں میرا یہاں سے
اس خون سے لکھی ہوئی تاریخ یہیں ہے
بت کس کا سجایا ہے نہاں خانۂ دل میں
ہے کس کا مکاں اور یہاں کون مکیں ہے

● ۴۱۷۰۔ اردو بازار۔ دہلی ۱۱۰۰۰۶

سلیم انصاری

وہ بھی خلا میں گم اگر ہو جائے گا
ن میرا چاندنی کا ہمسفر ہو جائے گا
ی پیالی میں سب پی کر گھول کے بعد
ارا جھوٹ حرف معتبر ہو جائے گا
نے کی گواہی بھی نہ دے پائے گا وہ
بچھڑے گا تو کتنا مختصر ہو جائے گا
ں اتنی بڑھیں گی دو دلوں کے درمیاں
میں ملنا بھی ممنوعہ شہر ہو جائے گا
ں بیٹھی ہوئی ہستیں پکاریں گی سلیم
صحرا یہاں جب بے شجر ہو جائے گا

نکو دوم یونٹ، ٹنڈوا ہیگی سائٹ، بینا کیٹ

راحت حسن

دنیا گھمار ہا ہوں میں اپنے سوار کو
آسیب ڈھونڈتا ہے کسی رہگزار کو
باہر کو جھانکتا ہوں مٹانے کو بس ابھی
الزام دے رہا ہوں ترے انتظار کو
پہلے سے کم ہے دشت میں دیوانگی کا نشہ
پت جھڑ میں بھی تول رہا ہوں بہار کو
اب کھول کر کتاب کوئی دیکھتا نہیں
پڑھتے ہیں لوگ غور سے ہر اشتہار کو
راحت ہوا کی گونج سے مینار ہل گیا
طائر ترس رہا ہے اب اپنے وقار کو

● پریم نشان، دودھ پور۔ علیگڑھ

فاروق شکیل

جب سے ہوئے جدت کی فرہنگ سے واقف
ہم لوگ ہیں ہر چہرے کے ہر رنگ سے واقف
پھر کی نہ بحث ہم نے کبھی پھول کے ان سے
جب ہو گئے ذہنوں پہ لگے زنگ سے واقف
یہ بات الگ ہے کہ کم آمیز ہیں ہم لوگ
ورنہ ہیں ملاقات کے آہنگ سے واقف
سینے سے پہاڑوں کے نکل سکتی ہیں نہریں
ہو جائے گر انسان رگِ سنگ سے واقف
رہتی ہے شکیل اس کے ہی قابو میں یہ دنیا
ہوتا ہے جو دنیا کے ہر اک رنگ سے واقف

● ۱۹۰-۲-۲۳ مغل پورہ حیدرآباد۔ ۲۔۔۔۵

جمیل فاطمی

ر کھوں کے تقدس کا نشاں ہوتا ہوا
رہا ہوں میں زمیں پر آسماں ہوتا ہوا
ٹوٹی ہوئی تخریب کی بلند گری
ے آدمیت کا زیاں ہوتا ہوا
دل پہ ہر تسم خوابِ شکستہ کے نشاں
دوستاں پل پل دھواں ہوتا ہوا
قطرہ خونِ دل پیتی ہوئی شمعِ حیات
زندگی کا رائیگاں ہوتا ہوا
برستے شبنم منظر پس منظر جمیل
صبر و سکون نذرِ خزاں ہوتا ہوا

مقام و ڈاکخانہ لکھنیا ضلع بیگو سرائے ۸۵۱۱۲۰

ساحر افغانی

تفریح کے مقصد سے ملاقات نہ کرنا
بے ربط کبھی ہم سے کوئی بات نہ کرنا
خوددار ہے مغرور نہیں نسل ہماری
اس لہجے میں پھر ہم سے مخاطبات نہ کرنا
شمشیرِ ضرورت سے لگیں زخم اگر
لغزش کبھی ایسی پسِ حالات نہ کرنا
یہ دورِ ترقی مجھے تسلیم ہے لیکن
پامال بزرگوں کی روایات نہ کرنا
وہ راہ تو میری نہیں جس راہ پہ تم ہو
سمجھوتے کی ساحر سے کوئی بات نہ کرنا

● ۴۹-چھیپا پورہ، جالندھر ۶۴۴۲۲۶

اشرف عادل

میں رواں آب پہ رکا تنہا
تم سے بچھڑا بھی اور جیا تنہا
شمس بھی روز شام ہی جلتا ہے
میں تری یاد میں جلا تنہا
اب ہواؤں کا منتظر ہوں میں
ریت پہ میرا گھر سجا تنہا
میری ناکامیوں پہ سنتے ہو
سوچتا ہوگا کچھ خدا تنہا
سب کی بگڑی تو بن گئی عادل
لوٹ آئی تیری دعا تنہا

● ڈو باغ، کھنیلا۔ سری نگر

طلعت عرفانی

مِلا کے برف کے ٹکڑے شراب میں ہم نے
حیات دیکھی ہے رقصاں حباب میں ہم نے
اب ان دنوں کا دھواں تک نہیں یہاں موجود
لہو چراغ کیا جب شباب میں ہم نے
اٹے ہیں ساتھ ہم ان کے ورق ورق ہو کر
کئے تھے حرف جو لکھے کتاب میں ہم نے
ہمارا حال کسی نے اگر کبھی پوچھا
کہا ہے شکر خدا کا جواب میں ہم نے
برس کے صحنِ گلستاں پہ رات بھر طلعت
گئے ہیں دھوپ کے تیور گلاب میں ہم نے

● ۱۳۔ اے سبا بزی مہد سرائے ریتوں کا لانی۔ دہلی

حنیف نجمی

انا پہ اپنی کرشمے وار کرتا رہتا ہوں
میں اپنے عجز کا اقرار کرتا رہتا ہوں
نگاہ رکھتا ہوں ہر لمحہ سنگ میلوں پہ
میں اپنی راہ کو دشوار کرتا رہتا ہوں
میں اپنے جسم سے سورج اگلنے کی دھن میں
کرن کرن کو گرفتار کرتا رہتا ہوں
کسی کا ذکر ابھی کیا ابھی تو دنیا سے
خود اپنے بارے میں تکرار کرتا رہتا ہوں
ذرا سا درد ملا ہے سو اس میں بھی اکثر
تمام شہر کو حقدار کرتا رہتا ہوں

● معرفت محلہ آپکس پوسٹ راگول ۲۱۰۵۰۷

سجاد سیّد

ستم تو کرتا ہے لیکن دعا بھی دیتا ہے
مرا حریف مجھے حوصلہ بھی دیتا ہے
ہے جس کا ایک تبسم قرارِ جاں اپنا
اسی کا طرزِ تغافل رُلا بھی دیتا ہے
بجا کہ ہجر کا عالم عذاب ہے لیکن
مگر یہ عرصۂ فرقت مزا بھی دیتا ہے
کبھی ہے موت میں پنہاں نجات کی صورت
کبھی وہ زیست کی صورت سزا بھی دیتا ہے
گئی رُتوں کا ترنم ہے اس کے شعروں میں
روایتوں کو وہ لہجہ نیا بھی دیتا ہے

● سی۔۲ گل مہر اوینیو، جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی

گوہر شیخ پوری

ایسے وابستہ ہوئے دفتر سے ہم، غافل سے ہم
دور ہو کر رہ گئے احباب کی محفل سے ہم
فکر و فن کی سب کتابیں دیمکوں نے چاٹ لیں
اکتسابِ علم جب کرنے لگے ناول سے ہم
موت کے ہاتھوں کبھی جب سخت ہے دشمن کا ہاتھ
تندگی کتنی ہے اپنی پوچھ لیں قاتل سے ہم
سانس لینا بھی گراں ہے سانپ کی بستی میں جب
کیا گذرتی ہے یہ پوچھیں فاختہ کے دل سے ہم
ہر قدم پہ خود کو ملتے ہیں کھیل کر
دریچے دکھ درد سے لا لائے مشکل سے ہم

● ۳۸/۲۶ تیلیا باغ، بنارس ۲۲۱۰۰۲

شریف اجمل

مصیبت بھی ٹھکانہ ڈھونڈتی ہے
شریفوں کا گھرانہ ڈھونڈتی ہے
بہاروں کی پلی ہے زندگی کیا؟
سدا موسم سہانا ڈھونڈتی ہے
ملی چنگاریوں کو مست گنبد
ہوا خالی بہانہ ڈھونڈتی ہے
ہماری خشک آنکھوں میں بھی دنیا
گئی رُت کا فسانہ ڈھونڈتی ہے
عجب غربت کی خوش فہمی ہے اجمل
مقدر میں خزانہ ڈھونڈتی ہے

● کوارٹر نمبر ۷۲ مسلم بستی گولمری ۳ جمشید پور

جاوید اختر آزاد

عمل کی راہ میں دشواریاں بھی ہوتی ہیں
کبھی یقین کبھی خوش فہمیاں بھی ہوتی ہیں
بیاضِ دل پہ کبھی دستخط نہیں کرنا
کہ خاکساری میں رسوائیاں بھی ہوتی ہیں
مذاکروں ہی سے ہوتے ہیں حل مسائل کے
تمام اس میں خوش فہمیاں بھی ہوتی ہیں
پلٹ کے پھر نہیں دیکھا کسی مسافر کو
شکستہ راہ میں پرچھائیاں بھی ہوتی ہیں
لیل بعد فتح نہیں رہنا خوابِ غفلت میں
محاذِ جنگ میں پسپائیاں بھی ہوتی ہیں

● دلاور پور۔ مونگیر۔ بہار

انیس احمد خاں

اچھے ہیں وہی لوگ جو انجان بہت ہیں
ہم جان گئے کچھ تو پریشان بہت ہیں
خط چھانٹے انھوں نے مرے پہچان کے کر
ہاتھوں میں لہو دیکھ کے حیران بہت ہیں
بے پردہ اندھیرے میں بھی رہنے نہیں پاتے
وہ تن کے اجالے سے پریشان بہت ہیں
یہ گورِ غریباں ہے کہ آباد بہت ہے
ابلیسیاں انسان کی دیران بہت ہیں
دل سے کے انیسؔ آپ پریشان رہیں گے
یہ وہ ہے سمندر جہاں طوفان بہت ہیں

● بی-۲، نظام الدین ویسٹ نئی دہلی - ۱۳

احمد نثار

افق پہ سورج کمال بھر تھا
نشہ خودی کا زوال بھر تھا
ہر اک اذیت ہمیں پہ نازل
کہ دکھ ہمارا مثال بھر تھا
وہ بدگمانی بھی آن بھر تھی
لہو رگوں میں اُبال بھر تھا
مری خموشی جواب بھر تھی
کہ چپ کا موسم سوال بھر تھا
تھی شست کتنی وہ ایک ساعت
میں جیسے گزرے میں سال بھر تھا

● نیشا شیونگ مشین، اپر گلی، جبرا - ۸۲۸۱۱۴

سہیل شفق

ہر ایک آن وہ ہم سے جدا سا کچھ تو ہے
ہماری ذات کے اندر خدا سا کچھ تو ہے
وہ کیا ہے کچھ بھی نہیں اک خلا سا کچھ تو ہے
کبھی دعا تو کبھی بد دعا سا کچھ تو ہے
ہر ایک پل جو گھٹتا ہوا سا مجھ میں ہے
قدم قدم وہی مجھ سے خفا سا کچھ تو ہے
سمجھ سکا نہ کوئی اب تلک کہ وہ کیا ہے
وہ آئینہ نہ سہی، آئینا سا کچھ تو ہے
تمام رنگ وہ، موسم اڑا گیا لیکن
کہیں تو شاخ پہ اٹکا ہرا سا کچھ تو ہے

● ایم - ۱۳۳، سری کرشنا پوری، پٹنہ - ۱

وحید صدیقی

اینٹوں کی بستی میں تنہا، میرا چھپر ایک
شعلوں کے محلات بہت ہیں شبنم کا در ایک
بھیڑ تھی میرے پیچھے پیچھے، خالی تھے جب ہاتھ
راہ ہوئی سنسان جو میں نے، چھینکا پتھر ایک
ہنستے ہنستے رو دیں آنکھیں، فاش ہوا اک راز
پوشیدہ ہے زیرِ تبسم، درد کا پیکر ایک
بپھری موجوں سے سیکھو ٹکرانے کی ریت
پیدا کر لو ساحل جیسا صبر کا جوہر ایک
خالی خالی آنکھیں دیکھیں، ٹوٹے ٹوٹے جسم
چہرے چہرے پر ٹھہرا ہے غم کا لشکر ایک

● ۲۶ سیکٹر ۹، آر کے پورم - نئی دہلی - ۲۲

عبرت مچھلی شہری

جب عدالت کو فرنیچر سمجھتے ہوں گے لوگ
اپنی ناسمجھی پہ ساری عمر روتے ہوں گے لوگ
حادثے کی رات کس ہمسائے کے گھر جاؤ گے
جاگتے بھی ہوں گے تو ظاہر میں سوتے ہوں گے لوگ
دوستی اس کی تو سگریٹ کا دھواں تھی اڑ گئی
عمر بھر عدم بھروسہ وہ اور ہوتے ہوں گے لوگ
کون جانے حسن کے رنگ محلاتے شہر میں
روح کو نیلام کر کے جسم دھوتے ہوں گے لوگ
بیچ پھر ابھری ہے عبرت بیچ دریا ہے کہیں
پھر کسی کو غالباً زندہ ڈبوتے ہوں گے لوگ

● محلہ خانزادہ پوسٹ مچھلی شہر ضلع جونپور

طارق متین

یہ بات جھوٹ نہیں ہے اگر عجب ہے تو کیا
سکوں کا قحط ہمیشہ رہا ہے اب ہے تو کیا
ہجومِ غم میں بھی ہنس کر جیئو تو ہم جانیں
جہانِ خواب میں جینے کا تم کو ڈھب ہے تو کیا
لباسِ فقر ہے آئینہ اپنی غربت کا
یہ خالی ہاتھ ہمارا جو بے طلب ہے تو کیا
اتارتا ہوں میں دل کے ورق پہ عکسِ نشاط
کتابِ غم جو مرے نام منتسب ہے تو کیا
چمن میں آگ لگے گی تو کس کو بخشے گی
سرائی آشیاں طارق جو منتخب ہے تو کیا

● پوسٹ آفس کھنیا دیگو سرائے بہار۔

زرّیں فاطمہ زیدی

روشن دنیا اندھے لوگ
بھوگو بھوگو کرم کا بھوگ
دوڑیں گے پانی کو دیکھ
پائیں گے مرگ ترشنا لوگ
مایا سے مت پریم بڑھا
اب بھی سمے ہے لے جوگ
پریم پریم سب کہتے ہیں
یہ نہ جانے اندھا روگ
بولی بولیں لاکھوں کی
سستی دنیا سستے لوگ

● پوسٹ بکس ۳۸۴۵، رووی ـ ۱۱۲ مسقط (عمان)

نعیم حیدر

پال کے ساتھ امیدوں کا شجر رہنے دے
پھونک مت سایۂ گزران بسر رہنے دے
زندگی منزلِ مقصود تک پہنچے کہ نہیں
دھوپ چھاؤں کا یہ موہوم سفر رہنے دے
دست و بازو مرا دل اور جگر سب لے لے
مرے ہونٹوں پہ یہ گفتار مگر رہنے دے
کون جانے کہ پھر آباد کبھی ہو کہ نہیں
میرے ویرانے میں مقتول کا سر رہنے دے
لوگ محسوس کریں کوئی یہاں رہتا تھا
ڈھانے والے یہ مکاں زیر و زبر رہنے دے

● نیا محلہ، آسنسول ـ ۲

اکمل امام

میز در میز کرکے سفر دستخط
خود بخود ہو گئے معتبر دستخط
ٹوٹ سکتی ہے ورثے کی ہر اک انا
کورے کاغذ پہ کیجے اگر دستخط
تیزی بڑھتی ہے عہدے سے پروازیں
بخش دیتے ہیں کاغذ کو پر دستخط
منتخب ہو کے پہچان بن جائے گی
شخصیت بے اثر با اثر دستخط
مستند اب نہیں ہے زباں کا کہا
ہو گئے آج کل معتبر دستخط

● گلی امام علی محلہ مالیان، بہار شریف ـ ۸۰۳۱۰۱ / سہارنپور ـ ۲۴۷۰۰۱

منظر منوملی

وجود میرا ہدف رہا ہے
گناہ خنجر بکف رہا ہے
سمندروں کی تہیں کھنگالو
کہیں کہیں پر صدف رہا ہے؟
اڑی چلی ہیں ہماری سوچیں
تمہارا رخ جس طرف رہا ہے
جو چھپ رہا ہے سوال بن کر
وہ نکتۂ من عرف رہا ہے
خدا کا یہ نامسعود بندہ
ازل سے کچھ ناخلف رہا ہے

● ۲-۲-۱۰۲۴، بنگل گوشہ، عادل آباد ـ ۵۰۴۰۰۱

سخن خواب

رضی احمد تنہا

آدمی کو بھیڑ میں ننگا کریں
آج مل کے ہم سبھی دنگا کریں
پریم کے جتنے سنہرے حرف ہیں
نفرتوں کے خون سے رنگا کریں
اس مہا بھارت کے سارے سارتھی
بھیشمی تیور کو بجرنگا کریں
دشمنوں سے چھین کر سنجیونی
راونوں کو رام جی چنگا کریں
ایک تنہا رنگ سے اب کام لیں
پرچموں کو اب نہ ترنگا کریں

● آرریا ـــ (بہار) ۸۵۴۳۱۱

سلمیٰ شاہین

وقت ہم پہ جو مہرباں ہوتا
کوئی اپنا مزاج داں ہوتا
عمرِ رفتہ سے مانگ کر لاتے
ایک لمحہ جو بے کراں ہوتا
ضبط نے غم کی آبرو رکھ لی
لب پہ آتا تو داستاں ہوتا
صاف گو راز داں نہیں رکھتے
ورنہ میرا بھی راز داں ہوتا
اجنبی کا گلہ نہ کر شاہین
دوست ہوتا تو جانِ جاں ہوتا

● شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی ـ دہلی

منظر سلطان

منظر بدل گیا ہے کھلے آسمان کا
شاید زمانہ بیت گیا امتحان کا
سب لوگ کرسیوں کی سیاست میں جٹ گئے
پرسانِ حال کون ہے آشفتگان کا
برسوں رفاقتوں کے جنازے اٹھائے ہیں
اک باب لکھ رہا ہوں اسی داستان کا
تنہا بھری دعائیں سدا کام آئیں گی
احساس تو رہے گا کسی سائبان کا
ہر چیز اس جہاں میں تغیر پذیر ہے
منظر مزاج سمجھو غزل کی زبان کا

● منشا ٹولہ - بتیا ۸۴۵۴۳۸ - بہار

شریف قریشی

جو سفر کیا تھا میں نے وہ سفر گیا اکارت
نہ کسی نے راہ دیکھی نہ ملی کوئی بشارت
یہ ہے بے حسوں کی دنیا جسے کوئی دکھ نہ صدمہ
مجھے راس ہی نہ آئی یہاں درد کی تجارت
اُسے قربِ شاہِ خوباں سے قرار کیوں نہ آئے
جسے منتخب وہ کر لے جسے سونپ دے وزارت
یہ مذاق باہمی ہے کہ دل و نگہ کی رنجش
کوئی مر گیا حیا سے کوئی کر گیا شرارت
جو نشان آخری تھا وہ نشاں بھی مٹ گیا اب
جہاں دفن تھی تمنا وہاں بن گئی عمارت

● بلے بھور سہ منڈی - فتح گڑھ - یوپی ۲۸۹۶۰۱

شمس رمزی

جڑ ایں کس میں ہیں ایسی، ایسے منظر دیکھنا
دیکھنا اپنا تماشا اور جسم کر دیکھنا
کون سا پتھر تمہارے سر کا اچھا دوست ہے
استھانوں سے باہر نکل کر دیکھنا
پھیکے پڑ جاتے ہیں پھر بھی نقشِ دیدہ
بھول کر بھی تتلیوں کے پر نہ چھو کر دیکھنا
کیسے آہٹ پر سمٹ آتی ہیں ساری مچھلیاں
تم بھی اک دن پھینک کر دریا میں پتھر دیکھنا
چودہ گھنٹے کی مشقت کر کے اک مزدور کا
ناد یا کو بھول جانا اور بستر دیکھنا

● سی - ۱۴۷، ویلکم، دہلی ۵۳

حبیب احمد ساجد

رات بھر خوب رو گئیں سڑکیں
دامنِ صبح دھو گئیں سڑکیں
بے زباں اژدہام میں رہ کر
اپنی پہچان کھو گئیں سڑکیں
میری گمنام سی ہتھیلی میں
اپنی تشہیر کھو گئیں سڑکیں
ہر مسافر کی چشمِ حیرت میں
سبز منظر چبھو گئیں سڑکیں
شاہراہوں سے اوب کر ساجد
ایک قریہ میں سو گئیں سڑکیں

● روم ۱۰، بی ایس ملے کالونی، ویلور ۶۳۲۰۰۴

طارق قمر

میں کبھی تجھ سے بے خبر نہ ہوا
کوئی آنسو اِدھر اُدھر نہ ہوا
ہم سفر راستے کی دھوپ رہے
کوئی بھی راہ کا شجر نہ ہوا
میرا ہر شعر میرا کرب تمام
صرف آنسو رہا ہنر نہ ہوا
میرا ہر حوصلہ مرا ہر خواب
صرف جادہ رہا سفر نہ ہوا
میں تجھے بھول تو گیا ہوتا
خود سے غافل کبھی مگر نہ ہوا

● محلہ جگت، سنبھل ۲۴۴۳۰۲ (یوپی)

حنا انجم

ہماری آنکھوں سے رِستا ہے اب لہو کم کم
جگر کے چاک کو ہے حاجتِ رفو کم کم
اُسے یہ فکر نہیں کیسے کاٹتی ہوں میں وقت
مجھے بھی رہتی ہے اب اس کی جستجو کم کم
ذرا سی ڈھیل ملے دل کو، خوب کھل کھیلے
اسی لئے تو ہے دنیا کی آرزو کم کم
کشیدگی کا کسی کو سبب نہیں معلوم
بس اپنے بیچ لگی ہونے گفتگو کم کم
زمینِ دل کی وہ زرخیزیاں کہاں گم ہیں
یہاں اترتا ہے اب موسمِ نمو کم کم

● ۸۱ - بلوہٹا - جراسپید ۲۷۱۲۰۱

دست برگ کے بعد ستیہ پال آنند

کا

نیا شعری مجموعہ

ستر اردو نظمیں جنھیں عالمی سطح پر عصری یورپی اور امریکن شاعری
کے مدِ مقابل رکھنے میں کوئی پیش و پس نہیں ہوتا

دیدہ زیب طباعت اور گیٹ اپ

قیمت ● ۱۲۰ روپے

سیمانت پرکاشن ۔ ۹۲۲ کوچہ روہیلہ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

جب شاعری کا شوق ہو تو پہلے اچھے اور مشہور شاعروں کا کلام خوب دیکھو اور سوچو کہ شعر کہنے کے لئے کن کن باتوں کی اور کن کن سامانوں کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد چھوٹی چھوٹی بحروں میں تھوڑے تھوڑے شعر کہو۔

شاعری کا گر مشق ہے۔ شعر کہنے کی مشق جتنی زیادہ کی جائے گی اتنی ہی شاعری چمکتی جائے گی ابتدا میں روزانہ ۳۰۔۴۰ شعر کہنے چاہئیں اور ہر وقت شعر کہنے کی عادت ڈالنی چاہیے تاکہ طبیعت کسی خاص وقت دیکھوئی کی عادی اور محتاج نہ ہو جائے۔

ہمیشہ دوسرا مصرع پہلے کہنا چاہیے اور پہلا مصرع اس کے بعد دونوں مصرعوں میں ربط و وابستگی ضروری بات ہے۔ غزل کہنے کے لئے، قافیوں کے ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں۔ جو قافیہ آسانی اور خوبصورتی سے نظم ہو سکے، اس کو نظم کر لیا جائے۔

[دستور الاصلاح — [illegible] — کراچی]

سیماب اکبرآبادی

مدیر

افتخار امام صدیقی

●

معاونت

ناظر نعمان صدیقی

قیمت ۶ روپے

*

زرِ سالانہ ۶۰ روپے ◆ لائبریری سے ۷۵ روپے

ناظر خصوصی ۱۰۰۰ روپے ◆ معاونین سے ۱۰۰ روپے

ممالک غیر سے

[illegible] ڈالر — ۱۵ پونڈ

دست برگ کے بعد ستیہ پال آنند

کا

نیا شعری مجموعہ

ستر اردو نظمیں جنہیں عالمی سطح پر عصری یورپی اور امریکن شاعری
کے مدمقابل رکھنے میں کوئی پیش و پس نہیں ہوتا

دیدہ زیب طباعت اور گیٹ اپ

قیمت ● ۱۲۰ روپے

تو کیا ہمارے پاس لفظ نہیں؟

ستارہ شمار قلم کاروں کی طرف سے ایک تحریر!!

شعر و ادب کے بقراطی صاحبان تو چاروں طرف موجود ہیں۔ لیکن ان میں سچ بولنے والے کتنے ہیں! بقراطی تنقیدی تحریروں میں بصیرت کتنی ہے؛ نئی نسل کو اس سے کتنی آگہی حاصل ہو رہی ہے۔ تخلیق کار حیران و پریشان ہیں کہ دوسری صف کے لوگ شور مچانے اور ڈرانے دھمکانے کے علاوہ کچھ نہ کرتے ہوئے بھی پہلی صف کو منتشر کرنے میں مصروف کیوں رہتے ہیں! ان کے پاس اپنی بات کہنے کے لئے کچھ نہیں صرف بگاڑ کا عمل اور بس۔ اپنے سرمایۂ ادب کی تفہیم و تشکیل اور ان میں موجود کلاسیکی یا جدید دور کے دانشور جنہوں نے واقعتاً اپنی بات کہنے کی سعی کی، ان کی تلاش کیوں نہیں؛ بات تو ساری نقد و معنی کی بنا ہوتی ہے۔ رد و قبول بھی انہیں سے ہوتا ہے۔ متن کے اندر اور باہر ہزار تاویلات کے لئے مروجہ لفظوں ہی کا سہارا لینا پڑے گا تو کیا ہمارے پاس لفظ نہیں؛ لفظ ہیں تو کیا معنی نہیں؛ ایک عالم سمٹ رہا ہے سرحدیں شور کر رہی ہیں انسان کی جغرافیائی تبدیلیوں کی اپنی ایک تاریخ بھی ہے جو مسلسل رقم ہو رہی ہے۔ مختلف تہذیبیں بنتی، بگڑتی رہتی ہیں۔ زبانوں کا تغیر و تبدل فطری ہے۔ مذاہب عالم کا نفوذ بھی ہر طرح کے فلسفے کو متاثر کرتا ہے۔ مگر کیا ہماری اپنی کوئی تہذیب نہیں! ہمارے اجتماعی لاشعور کے سلسلے کیا ہیں کیا اس کے اثرات مرتب نہیں ہو رہے ہیں؛ کیا یہ مکمل کائنات ان معنوں میں نامکمل ہے کہ سب سے پہلے آدمی سے آخری آدمی تک ظاہر ہوتا ہے! اس تناظر میں نئی نسل کیا ہے؛ اکیسویں صدی میں قدم رکھنے والی نئی نسل کے لئے کیا ہے! ان کی تربیت مغربی نظریات اور فلسفہ سے کی جائے گی یا پھر مشرقی شعریات سے بھی آگاہ کیا جائے گا! ان کی اپنی عصری جمالیات کیا ہے۔ اور کیا ہو گی!۔ بیسویں صدی کے نصف آخر تک آتے آتے اردو شعر و ادب میں قابل اور نمایاں نام بھی آتے ہیں کلاسیکی شاعری کے کئی بڑے ناموں نے اپنے عہد کی حیثیت کو اپنی شاعری میں سمو دیا۔ وہ کسی ترقی پسندی اور کسی جدیدیت کو نہیں جانتے تھے۔ مگر اعلیٰ درجے کی شاعری بھی ہوئی ہے بلکہ بیشتر ہمارے ترقی پسندوں اور جدیدیوں سے بڑی شاعری تخلیق ہوئی ہے۔ اچھا اور سچا شعر ہر عہد میں نیا اسی لئے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں لفظوں کی تخلیقی ترتیب اتنی آبدار ہوتی ہے کہ ہر عہد اس کو چھونے کی آرزو میں نئے خیال کی پھلجھڑیاں چھوٹتی پڑیں گی۔ متن اور متن فن پارہ اپنی سانسوں میں زندہ رہتا ہے۔ اگر وہ واقعی ایک عمدہ تخلیقی پارہ ہے۔

آج جو خلا تیزی سے ابھر رہا ہے اور فاصلے اس میں بھرتے جا رہے ہیں۔ اس کا شاید ہم ادراک نہیں کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے نہ تو دانشور ہیں اور نہ ہی علما۔ بس شعبۂ اردو اور اردو اکادمیاں باقی رہ گئی ہیں۔ اور ان سے وابستہ افراد۔۔۔۔۔ ؛؛ دیمک کتابوں سے کتابوں تک کا عمل جاری ہے۔ یا پھر مغربی نقادوں اور فلسفیوں کے مترجم رہ گئے ہیں۔ علاقائی صوبائی اور اشخاص کے زیر اثر تخلیق کیا جانے والا ادب آج کتنی اہمیت رکھتا ہے؛ نہ تو غیر جانبدار نقاد ہیں اور نہ ہی ان کے ستارہ شمار۔ بات کہاں سے اور کن ناموں سے کی جائے؛ اصطلاحوں میں بند ذہنوں سے نئی نسل کو کیا مل سکتا ہے؛ اور کیا مل رہا ہے! لمحۂ فکریہ تو یہ ہے کہ نئی نسل جو ذہین تو ہے، شعور بھی رکھتی ہے۔ لیکن بہت ساری توجہ سے بھی محروم ہے۔ وہ کیا کرے؟ ہمارے بزرگوں کے پاس ہر سوال کا جواب موجود ہے۔ وہ مطمئن کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ بالخصوص ان نئے لوگوں کو ان بزرگوں کا آلۂ کار بننے پر مجبور ہیں۔ بدلتے ہوئے حالات میں کچھ بھی صاف اور واضح تو نہیں تاہم یہ مزید ہوا کہ بہت سارے لوگ اپنا کو جیتیں گے بہت کچھ بیتے گا پتہ نہیں چلتا۔ سحر ٹوٹ رہا ہے چند برسوں میں وقت کئی اہم فیصلے صادر کرنے والا ہے۔ معنویت کی تلاش ختم ہونے والی ہے۔ غیر مزدوری لوگ بچنے والے ہیں۔ لفظ و معنی کے نئے رشتے ابھر رہے ہیں۔ مغربی لوگوں کے لئے نہیں صرف کتابیں پڑھنے والا کتابیں لکھنے والوں کی یا لفظوں کو کتابوں سے نکال کر کتابوں میں رکھنے والے مزدوروں یا نام نہاد بقراطیوں کو لفظ و معنی کے نئے رشتوں کا کوئی ادراک نہیں ہوگا کیونکہ ان کے ذہن کے بند خانے سانچوں میں ڈھل گئے ہیں جانے والا ———

منجانب ستارہ قلم کاروں کی طرف سے یہ ایک تحریر آپ سے مکالمہ چاہتی ہے!

وہاب اشرفی

(صدر شعبۂ اردو رانچی یونیورسٹی، رانچی)

جدید مغربی ادبی نظریات اور ہمارے نقاد

شاید اب اس بحث کی گنجائش نہیں کہ اردو تنقید مغربی افکار سے مسلسل متاثر ہوتی رہی ہے۔ یہ کوئی الجھن کی بات نہیں ہے۔ زیادہ ترقی یافتہ زبانوں کا ادب لازمی طور پر پسماندہ زبان کے ادب سے زیادہ ترقی یافتہ ہوتا ہے۔ بیرونی مغربی ہمارے احساس کمتری کی دلیل نہیں۔ ہماری مجبوری اور ضرورت ہے۔ تخلیقی ادب پیدا کرنے کے باب میں ایسی مجبوری اور ضرورت یقیناً کم ہو جاتی ہے۔ لیکن تنقیدی امور کی انجام دہی میں دو طرح کا رد۔ اصول اور ضابطے یہاں تک کہ فکری پہلو ایسے اہم ہو جاتے ہیں جن کی عالمی سطح پر شناخت ہو چکی ہوتی ہے۔ ان سے گریز کرنا، لاتعلق رہنا، دامن کش گذر جانا یا سرے سے واقف نہیں ہونا گمراہ کن بات ہوگی اور ایک طرح سے اپنی پسماندگی پر خوش ہونے اور نازاں ہونے کے مترادف۔ لیکن یہاں ایک بڑا اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مغرب کے نت نئے تجربوں کو بلا رد و انتخاب قبول کرنا سود مند ہو سکتا ہے؟ اور کیا اردو تنقید کی زبوں حالی کا اس عمل سے علاج ممکن ہے؟ کیا اس سے تنقیدی انارکی پیدا نہ ہوگی؟ میرے خیال میں جو حضرات مغربی تنقید کے کسی نئے اصول کے اطلاق سے ناخوش ہوتے ہیں۔ ان کے سامنے کئی دوسری وجہوں کے علاوہ ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ بہت سے نظریات کے دام میں پھنستے نظر آتے ہیں اور انہیں فوراً احساس ہوتا ہے کہ ان کی جانی بوجھی سرحد پر باہر کے انجانے ہتھیاروں سے حملہ کیا جا رہا ہے۔ گویا ان کی نگاہ میں ایک قسم کا تنقیدی تشدد ہوا جس کے خلاف آواز اٹھانی ہی چاہیے۔ میرے خیال میں تنقیدی تشدد کا یہ احساس بے بنیاد نہیں ہے۔ ایک کلیم الدین احمد کی مثال بالکل سامنے کی ہے۔ ہم سبھی واقف ہیں کہ وہ کیمبرج میں F. R. LEAVIS کے شاگرد رہ چکے تھے خود لیوس نے کلیم الدین نمبر مرتبہ پروفیسر ناگندر پرشاد، گیا میں ایک خط کے ذریعہ اس کا اظہار کیا ہے۔ چنانچہ ان کا حق ہوا ہے کہ وہ لیوس کے کسی قول کو نقل کریں لکھتے ہیں:

" ادبی تنقید کو ادب کے علاوہ اور کسی چیز سے واسطہ ہے۔ ادب سے سنجیدہ دلچسپی محض ادبی نہیں رہ سکتی۔ یہ دلچسپی سماجی انصاف اور تنظیم اور دیگر کی صحت کے احساس اور ان میں انہماک سے وابستہ ہوتی ہے۔ " [تنقید اور دماغی صحت۔ سخن ہائے گفتنی۔ دوسرا ایڈیشن صفحہ ۲۸۱]

کلیم الدین احمد نے یہ نہیں کہا کہ لیوس کا یہ قول انہوں نے کہاں سے نقل کیا ہے۔ لیکن اگر میں اس قول کو مارکس سے منسوب کر دوں تو کسی ناواقف شخص کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ اگر یہ قول درست ہے تو کلیم الدین احمد کو مارکسی ادب و تنقید پر برسنے کی کیا ضرورت تھی۔ انہوں نے اقبال کے کلام کا ایک بڑا حصہ کیوں رد کر دیا؟ غزل، قصیدہ اور مرثیوں کو اس کے کچھ پس منظر میں کیوں نہیں دیکھا؟ انہیں کو رد کرنے کی کیوں کوشش کی؟ کلیم الدین احمد کی عملی تنقید کی جو صورت ہے اس میں یہ قول کہیں منطبق نہیں ہوتا۔ اس قول کی بنیاد پر ماہ مارچ ۱۹۸۱ء اثر معنفہ کا شف الحقائق کی اشاعت پر اردو تنقید پر ایک نظر میں ایک جگہ بھی لکھا گیا کیوں گوارا نہیں کیا۔ ان تمام سوالات کے جواب اس لئے مشکل ہیں کہ موصوف تو لیوس کے رسالے SCRUTINY کی پالیسی کے نقاد معلوم ہوتے ہیں۔ اس اقتباس کے جسے میں انجیلوں سے نقل کیا ہے۔ پالیسی کیا تھی سنئے:

IT MIGHT BE CLOSER TO THE FACT TO HOLD THAT THE ADOPTION OF A TIME [illegible] ARGUMENT AT ONCE AGGRESSIVE AND ABRASIVE AT LENGTH INTIMIDATED MANY WHO AT FIRST DISAPPROVED SCRUTINY'S POLICY OF SUBJECTING LITRA[illegible] TO PROCESSES OF MINUTE TEXTUAL EXAMINATION WHICH DEMANDED [illegible] AND EXHAUSTING CONCENTRATION ON THE 'WORDS ON THE [illegible] - FUTURE TEACHERS AND PROFESSORS WHO WENT INTO THE [illegible] WORLD AND SPREAD THE NOTHING-BUT-THE WORDS-

محشر بدایونی

کیا ہم کو ثمر اپنی ریاضت کے ملے ہیں
ارزانی سے اسبابِ جراحت کے ملے ہیں
کس قوم میں ہواؤں سے لڑے تھے سو یہی ہے
کام اپنے چراغوں کی حفاظت کے ملے ہیں
دنیا ہے کہ کیا۔ کیسے ہیں یہ لوگ خدایا
یاں مہر میں بھی زہرِ کدورت کے ملے ہیں
کیا سوچیں کہ آئے گی قیامت بھی کسی دن
یہ عمر کے دن بھی تو قیامت کے ملے ہیں
اس گردشِ زر میں کسے آزاد کہا جائے
سب لوگ غلام اپنی ضرورت کے ملے ہیں
اک حرفِ قناعت ہے جو سرمایہ ہے اپنا
اس حرف سے ہی رنگ طبیعت کے ملے ہیں
ناطے دیاروں ہی نہیں ہے یہ رہ و رسم
رستے ابھی کچھ لوگ محبت کے ملے ہیں
کیا اور وفا کے ہیں کچھ اعزاز کہ ہم کو
کچھ کم تو نہیں زخمِ ملامت کے ملے ہیں
کچھ بھی ہو یہ طوفان ہوا ہم کو تو بس میں
انساں کو پہلو کی وسعت کے ملے ہیں

سی۔ ۵۵ بلاک ’ایل‘ نارتھ ناظم آباد کراچی

اظہر سعید خان

اب اتنا نقشِ حیرت بھی نہ تھا میں
تمہیں دیکھا تو ایسا ہو گیا میں
مرے ہی نقشِ پا تھے میرے پیچھے
یہاں کیا تھا جو مڑ کر دیکھتا میں
مری دنیا الگ تھی تجھ سے لیکن
تری دنیا سے باہر تو نہ تھا میں
ذرا کچھ اور میرے پاس آؤ
میں دیکھوں تو سہی یہ تم ہو یا میں
جو پیچھے رہ گئے ان کو نہ دیکھو
مجھے دیکھو کہاں تک آ گیا میں
بس اک جستِ جنوں کا فاصلہ ہے
پھر اس کے بعد تو کیا اور کیا میں
یہاں تک تنگ آیا بندگی سے
کہ آخر چیخ اٹھا میں خدا میں
بتوں سے بھی نبھا لیتے ہیں اچھے
چلو مانا سب اچھے اک برا میں

ایچ۔ ۲ علی شاہ اسکوائر خیابانِ جامی کلفٹن کراچی

پر کھڑی ہوں۔ کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کدھر جاؤں۔ ایک دم خیال آیا کہ دونوں بچے گھر پر اکیلے ہیں۔ اس رات بچوں کو بانہوں میں لے کر میں اندر آگئی تھی کہ باہر ہونے والی بارش کا خیال بھی نہیں آیا۔

صبح بچوں کو اسکول بھیج کر، میں بالکل ہی خالی سی رہ گئی تھی۔

تب انل چادر لپیٹے آیا۔ اس کا بخار اتر گیا تھا۔ کافی دیر تک وہ خاموش سر جھکائے بیٹھا رہا۔ میں بھی چپ چاپ بیٹھی تھی آخر اس نے میری طرف دیکھا۔ کرسی سے اٹھ کر پلنگ پر میرے ساتھ آ بیٹھا۔ میرا ہاتھ تھاما اور دیوانوں کی طرح مجھے چوم لیا۔

"کچھ نہیں ہوا۔ پلیز، فارگیٹ اٹ۔"

میں اسے کیسے سمجھاتی کہ مرد کے لئے کچھ نہیں، عورت کے لئے سب کچھ ہوتا ہے۔ میرے لئے تو ہر بات، ہر رشتے کے معنی ہی بدل گئے تھے۔

میں اپنے اندر سوئی ہوئی اس خواہش سے چھٹکارا پانا چاہتی تھی۔

تب اس دن میں چلتے ہوئے میں نے دیکھا تھا کہ دھرتی کا سینہ چیر کر ایک ہرا سا پودا نکل آیا ہے۔ پھر وہ پودا بڑھتے بڑھتے پیڑ بن گیا۔

میرا اپنا پاپ ہی [illegible] چہرہ کو ہرا دے کر لے آیا ہے۔

میں اس کے قریب جاتے عجیب سی جھجک اور ڈر سا محسوس کرتی ہوں، جیسے وہ کوئی غیر ہو۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ مجھے ڈانٹے، پھٹکارے، چاہے اور کچھ کہے، مجھے گھر سے نکال دے۔ لیکن وہ کچھ نہیں کہتا۔

ایک شام اسپتال سے لوٹتے ہوئے انل نے کار کا رخ موڑ دیا اور ہم شہر سے دور ندی کے کنارے پہنچ گئے تھے۔ ایک بڑا سا کچھوا ریت پر دھوپ کا مزہ لے رہا تھا۔ ندی کے اس پار سرکنڈوں کا جنگل تھا۔ انل نے گمبھیرتا سے کہا۔

"تمہارے پتی۔۔" بس

"زندگی بھر معذور رہیں گے۔ میں جانتی ہوں"

"جو کچھ ہمارے بیچ ہوا۔" اس کی نگاہیں سرکنڈوں کے جنگل میں تھیں۔ "میں نے نہ ایسا چاہا تھا۔ نہ کبھی سوچا تھا۔ جانے کیوں کیسے۔"

وہ کچھوا اپنی چھوٹی سی گردن نکالے کسی خطرے کے احساس سے ندی کی طرف جا رہا تھا۔۔

"۔۔ سلمیٰ جی غلط مت سمجھئے گا" انل نے میرا ہاتھ تھام کر کہا تھا۔

"تب اچانک ان چاہے میں ہو گیا۔"

میں سوچ رہی تھی اس کا دوش انل اکیلے کا تو نہیں۔ مگر وہ اپنے اس احساس میں مجھے کیا شامل کرنا چاہتا ہے۔ کیا وہ یہ تو نہیں کہنا چاہتا کہ تم ذمہ دار ہو اس کی۔ وہ کچھوا اچانک خطرے سے پانی میں اتر گیا۔

دوسرے کنارے پر سرکنڈوں میں چھوٹی چھوٹی چڑیاں شور کر رہی تھیں۔

"تم چاہو۔ تو میں تم سے شادی کر سکتا ہوں۔ تمہارے پتی سے طلاق لی جا سکتی ہے۔ دونوں بچے ہمارے ساتھ رہیں گے۔"

میں اس خیال سے ہی کانپ گئی تھی۔ میں نے کبھی اس طرح سوچا ہی نہیں تھا۔

میرا پتی سدا کے لئے اپاہج ہو گیا تھا۔ اس کا یہ مطلب تو ہرگز نہیں تھا کہ میں اسے منجدھار میں بے سہارا چھوڑ دوں۔ خود کنارے جا لگوں۔ وہ تو شاید اس کے لئے مجھے معاف کر دے میں خود کو کبھی معاف نہیں کر سکوں گی۔ اور وہ دونوں بچے جو صرف میرے ہی نہیں ہیں ان سے ان کے باپ کی شفقتیں، محبتیں کیسے چھین لوں۔!

"مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔" انل نے جیسے جرم کے احساس سے کہا

میں اس کچھوے کو دیکھ رہی تھی جو اب کچھ فاصلے پر دوبارہ ندی سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن بار بار پھسل کر پانی میں گر جاتا تھا۔

"میں تمہیں زندگی میں بے سہارا نہیں دیکھنا چاہتا۔ گڈی اور پنٹو کا فیوچر سیکیورڈ دیکھنا چاہتا ہوں۔ پلیز"

اسپتال میں میرے پتی نے پوچھا تھا کہ تمام اخراجات کون برداشت کر رہا ہے تب کوئی سہارا نہ دیکھ کر، میں نے اسے بتایا تھا کہ ہم انل کی پائی پائی ادا کر دیں گے۔ اس کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ جیسے جم کر رہ گئی تھی۔

سرکنڈوں میں چڑیاں شور مچا رہی تھیں وہ کچھوا ندی سے نکلنے کی کوشش میں تھا۔ میں خود سے باہر نکل کر خود کو دیکھ رہی تھی۔ اور مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

میں نے مٹھی میں ریت بھر لی کہ وہ [illegible]
اس ندی میں کود جاؤں۔ انل کو دھکا دے [illegible]

مسئلہ حل ہو جائے گا۔

"ہمارے تعلقات۔ کیسا رشتہ ہو سکتا ہے۔؟

"جیسا تم چاہو۔" انہوں نے پیار سے کہا۔ "ہم شادی۔"

"نہیں ہماری شادی نہیں ہو سکتی۔ میں اپنے پتی کو نہیں چھوڑ … اس لیے نہیں کہ وہ اپاہج ہے۔ اس لیے" اور میں … نے سوچا۔ کس لیے۔؟ محبت کے لیے، ہمدردی کے … ان سے جسمانی رشتہ قائم ہو جانے کے بعد یہ محبت والا … ہی مجھے مضحکہ خیز معلوم ہوا۔ شاید محبت ہی ہو۔ وہ تھی … بھی کی۔ میں خود سے مجبور ہی تھی اور ان خود سے … بے چہرے کے لگاتار چڑھاؤ کو جیسے پڑھنے کی کوشش … رہا تھا۔ میں شبدوں کی تلاش میں جیسے گم ہو گئی تھی۔ وہ … ا پھر پانی میں پھنس گیا تھا۔ عجیب جال ہے … رہتا پانی میں … اندر سے ریت پر دیتا ہے" "نہیں، ہم شادی نہیں کر سکتے۔" … نے مکمل اعتماد اور وثوق سے کہا۔ "تم مجھ سے دس بارہ … چھوٹے ہو اور کچھ سال بعد مجھ سے اکتا جاؤ گے، پھر شاید … برداشت بھی نہ کر سکو۔ سوچو ایسی حالت میں کیا ہوگا۔ ہم روتے … لڑتے جھگڑتے ایک دوسرے کو دوشی ٹھہراتے اور پچھتاتے … زندگی ہوگی۔ میں یہ نہیں بھول پاؤں گی کہ میں نے اپنے بے … اپاہج پتی کو دھوکا دیا ہے۔ تم یہ بات دل سے نہیں نکال … سکو گے کہ میرے دو بچے ہیں، میں عمر میں تم سے بڑی ہوں۔ … جس راستے پر ہم چل نکلے ہیں، اس کی کوئی منزل بھی نہیں۔"

وہ سر جھکائے بیٹھا سنتا رہا۔ ہمارے سامنے … تھا … میں چھپی چڑیاں خاموش ہو چکی تھیں۔ وہ کچھ اندر میں … لگا چکا تھا۔ اور اب چاروں طرف سناٹا تھا۔ ندی آہستہ … آواز کیے بہہ رہی تھی۔

"میرے پتا شاید ہمارے تعلقات کو سمجھتے ہیں۔"
… نے ریت پر … سے … کہا۔ "… میں ان رشتوں کی پاس … تک جاتی ہے۔"

"میں انہیں کبھی دھوکا نہیں دوں گا۔"

"اس رشتے میں دھوکے کی گنجائش ہے ہی نہیں۔ ہم دونوں … ہو جاتے ہیں۔ شاید دونوں ہی دلکشی ہیں۔ … تمام … میری ہوں گی۔

"یہ کب تک۔" مجھے خود کے ذلیل ہونے کا چبھتا ہوا احساس ہوا۔ "ایک دن تھک جاؤ گے، لوگ پوچھیں گے۔ تم شاید کوئی جواب دے سکو۔ ہمدردی، دوستی۔ انسانیت۔ میں کیا کہوں گی۔؟

"مجھے کسی کی پروا نہیں ہے۔"

"مجھے تو ہے۔ میں عورت ہوں۔"

"پھر تم ہی کوئی حل بتاؤ۔"

"شاید اس کا کوئی حل ہے ہی نہیں۔ تم ہمیں اپنے آدرش یادوں سے نکال دو۔"

"کیا۔" وہ جیسے اچھل پڑا۔ "جانتی ہو تم کیا کہہ رہی ہو۔ تم مجھے گالی دے رہی ہو۔ کیا میں اتنا ذلیل اور کمینہ ہوں۔"

"بھابی۔!؟" میں نے پھر مٹھی میں ریت بھر لی تھی۔

"وہ اور طرح کی عورت ہیں۔ نیک، نرم دل، لیکن ضد کی پکی۔"

"تمہاری شادی ہوگی۔"

"میں زندگی بھر شادی نہیں کروں گا۔"

"نہیں۔ نہیں۔ تم ایسا نہیں کرو گے۔ میں چلی جاؤں گی یہاں سے۔"

کار جب گھر کی طرف آتے ہوئے، میں گھر کا راستہ جانتے پہچانتے ہوئے بھی بھول گئی تھی۔ ہر چیز نئی اور عجیب لگ رہی تھی۔ لگتا تھا اب کبھی گھر نہیں پہنچوں گی۔ میں ایک دم پھپھک کر رو دی۔

"کیا ہو گیا۔ کیا ہوا اب؟"

"میں ہوں نا۔ یقین کرو مجھ پر۔" انہوں نے کہا۔ "میں سب انتظام کر دوں گا۔ مکان، بچوں کی تعلیم، تمہارے پتی کا علاج ڈاکٹری۔"

"نہیں۔ نہیں چاہیے مجھے کچھ بھی۔" میں چیخ پڑی تھی

اگلے دن شام، میرے پتی کو گھر لے آئے۔ … بھی آگئے اور انہوں نے برآمدے کی … ڈھلوان بنوا دی۔ … سب اچھا نہیں لگا تھا۔

… جاتے میں اپنے پتی کے پاس آگئی ہوں … وہیل چیئر کو …

شکیل الرحمٰن
مرحوم، ۲۹۲، ساؤتھ سٹی، گڑگاؤں۔ ۱۲۲۰۰۱ (ہریانہ)

ایک نفسیاتی اصطلاح
آرکی ٹائپ / آرچ ٹائپ

آرکی ٹائپ (آرچ ٹائپ) ARCHETYPE ایک نفسیاتی اصطلاح ہے کہ جس کی بنیاد یونانی لفظ آرچ ARCHE ہے، آرچ کے لغوی معنی ہیں خاص، بنیادی، قدیم ترین، قدیمی، ٹائپ ٹائپوس TYPOS ہے یعنی صورت، فارم۔ اصطلاحی معنی ہیں بنیادی صورت، قدیم ترین یا خالص فارم!

علم نفسیات کے معروف عالم سی۔ جی۔ ینگ C. G. JUNG نے آرکی ٹائپ یا آرچ ٹائپ کی اصطلاح نسلی اور اجتماعی لاشعور COLLECTIVE UNCONSCIOUSNESS کے مواد، مضمون یا مادے کے لئے استعمال کیا اور اس کے بعد یہ اصطلاح ادبی و فنی تنقید میں استعمال ہونے لگی۔ رفتہ رفتہ یہ ایسی جمالیاتی اصطلاح بن گئی جو تخلیقی فنکار کے اجتماعی یا نسلی لاشعور کے اولین قدیم اور بنیادی جمالیاتی علامتوں اور استعاروں اور نسلی تجربوں کو سمجھنے لگی۔

ینگ سے قبل بھی آرکی ٹائپ / آرچ ٹائپ کی اصطلاح کے استعمال کی خبر ملتی ہے۔ فیلو جوڈایوز PHILO JUDAEUS نے انسان کے ذہن میں خدا کے پیکر GOD IMAGE کو سمجھانے کے لئے اس اصطلاح کا استعمال کیا تھا۔ اس طرح آئرینیوز نے اس اصطلاح کو استعمال کرتے ہوئے کہا تھا کہ خالق نے ساری چیزیں، تمام اشیاء و مظاہر براہ راست اپنی ذات یا اپنے وجود کے اندر سے خلق نہیں کئے بلکہ اس کے وجود کے باہر جو آرکی ٹائپس تھے انہی سے کی۔ قدیم یونانی مفکروں نے خالق کائنات کے نور اور روشنی کو "آرکی ٹائپ" کہا تھا اور خیال، تصور یا آئیڈیا میں کوئی خصوصیات کو محسوس کیا تھا۔

آرکی ٹائپ / آرچ ٹائپ اولین بنیادی قدیم یا خالص صورت کا سرچشمہ ہے تخلیقی فنکاروں کی حسی اور نفسی کیفیتوں کی شدت سے آرکی ٹائپس میں تحرک پیدا ہوتا ہے اور بنیادی اور قدیمی علامات اپنی تہہ داری اور معنی خیز جہتوں کے ساتھ نمایاں ہونے لگتی ہیں۔ خود فنکار ان کے مستقل عمل اور اظہار کو پہچان نہیں سکتا یا پہچان نہیں پاتا۔ نسلی یا اجتماعی شعور سے بعض ایسی بنیادی صورتیں اور تصویریں سامنے آجاتی ہیں۔ جو اپنی معنویت کے لحاظ سے فنکار کے تجربوں کی معنویت میں وسعت، گہرائی اور تہہ داری پیدا کر دیتی ہے۔ تخلیقی فنکار کے اپنے تجربے اور فکر "آرکی ٹائپس" کی شدت سے زیادہ روشن اور معنی خیز بن جاتے ہیں۔ تخلیق کا پراسرار عمل ہی "آرکی ٹائپس" کے سرچشمے سے باطنی رشتہ قائم کرکے انہیں متحرک کرتا ہے۔ بنیادی معاملہ اعلیٰ ترین سطح پر فنکار کے تخلیقی عمل کا ہے۔ پہلی جہت یا سطح کی شاعری اور دوسری سطح یا جہت کی تخلیق کا تحرک "آرکی ٹائپس" کو متحرک نہیں کر سکتا، یہی وجہ ہے کہ صرف بڑے فنکاروں کی تخلیقات میں "آرکی ٹائپس" کا مطالعہ ادبی تنقید میں اہمیت رکھتا ہے اس لئے کہ بڑی تخلیق ایک انتہائی پراسرار تخلیقی عمل کا نتیجہ ہوتی ہے نیز دوسری جہت سے اور آگے بڑھ کر تیسری اور چوتھی جہت تک پہنچ جاتی ہے۔ پہلی اور دوسری جہت تک پہنچنے والے ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات میں بعض پیکروں یا بعض علامتوں یا استعاروں کے بار بار استعمال سے اکثر یہ غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے کہ یہ "آرکی ٹائپس" ہیں یا "آرکی ٹائپس" کے تحرک کا نتیجہ ہیں۔

ادبی تنقید میں تخلیقی فنکار کی شخصیت اور اس کے ذہن کی حیثیت غیر معمولی ہے۔ شخصیت اور ذہن کا بہتر مطالعہ کیا جائے تو سائیکی کو سمجھے بغیر ممکن نہیں۔ آرکی ٹائپس سائیکی ہی میں موجود ہوتی ہیں۔ نفسیات کے علماء اسے اہمیت دیتے ہوئے اسے سائیکی ([illegible])

MOTHER LEGEND ہے۔ پچھلی نسلوں قوموں اور قبیلوں کے بنیادی تجربوں کا تسلسل جاری رہتا ہے۔ اور انسان کے نسلی لاشعور میں یہ تجربے موجود ہیں۔ تخلیقی فنکار کی "سائیکی" میں جب شدت پیدا ہوتی ہے تو ان تجربوں سے ایک انتہائی پراسرار معنوی رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ آرکی ٹائپس کا اظہار عموماً استعاروں اور علامتوں میں ہوتا ہے۔ دیومالا اور قدیم ترین کہانیوں کے کردار اور حسی تصورات نئے تجربوں کی معنویت میں ابھرتے ہیں۔ صرف ایک امیج یا پیکر جانے کتنی سچائیوں کا مظہر اور علامیہ بن جاتا ہے۔ انسان کی پچھلی نسلوں قوموں اور قبیلوں میں آگ روشنی سانپ عورت مرد آسمان رات پانی چاند وغیرہ جو اہمیت رکھتے ہیں ہمیں اس کا علم ہے۔ یہ سب اور ان کے علاوہ جانے اور کتنے اشارے اور استعارے اپنی معنی خیزی کے ساتھ سائیکی میں موجود رہتے ہیں۔ نئے فنی تجربوں کا رشتہ ان سے قائم ہوتا ہے۔ اور ان کی معنی خیزی نئے تجربوں میں جہتیں پیدا کرتے ہوئے جانے کتنے جلووں کو کھینچ لیتی ہے۔ ان کے تعلق سے جانے کتنے جلوے سامنے آجاتے ہیں۔ جمالیاتی آرکی ٹائپس یا آرکی ٹائپس کی پہچان اسی منزل پر ہوتی ہے کہ جہاں کوئی بڑا تخلیقی فنکار سائیکی سے گہرا معنی خیز باطنی رشتہ قائم کر کے (جو عموماً لاشعوری ہوتا ہے) اپنی انفرادی اسطور کی تخلیق کر دیتا ہے۔ اردو کی بوطیقا میں مرزا غالب اس کی واحد عمدہ مثال ہیں کہ جنھوں نے آتش، نور، خدا، محبوب، لہو، پرچھائیں وغیرہ سے ایک انفرادی اسطور کی جمالیات سامنے رکھ دی ہے۔

دنیا کے کسی بھی ادب کی تاریخ سامنے رکھ لیجیے اور کسی بھی ادب کی اعلیٰ ترین تخلیقات کا مطالعہ کیجیے، ایک سچائی بار بار ابھرے گی کہ کسی بھی بڑے تخلیقی فنکار کے فن میں تجربہ اور متھ کا رشتہ حد درجہ گہرا ہے اور متھ کے گہرے رشتے کی وجہ سے فن میں تابناکی اور معنی خیزی پیدا ہوئی ہے اور کبھی کبھی اس حد تک کہ خود فنکار کی شخصیت ایک اعلیٰ متھ کا جمالیاتی نمونہ بن کر LEGEND بن گئی ہے۔ شیکسپیئر، غالب، گوئٹے، حافظ، رومی اور اقبال سب متھ سے ایک پراسرار ذہنی رشتہ رکھتے ہیں۔ آرکی ٹائپس میں متھ کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔ اردو ادبی تنقید میں ابھی تک متھ کے تعلق سے آرکی ٹائپس یا آرکی ٹائپس کا مطالعہ نہیں ہوا۔ انسان کی خواہشوں کا سب سے بلند سطح پر متھ کا عمل ہے۔ متھ سے ذہنی اور جذباتی رشتہ اور اس رشتے کی جمالیاتی صورت میں آرکی ٹائپس کی قدر و قیمت اور اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ اس نے بھی حقیقت نگاری اور فطرت نگاری ایک نئی جہت تک بن جاتی ہے۔ بڑے تخلیقی فنکاروں کے تجربوں کے بعض سانچے MYTHICAL بن گئے ہیں اور اس طرح آرکی ٹائپس / آرکی ٹائپس کے تحرک سے ایک نئی فنی ڈیزائن توجہ طلب بن گئی ہے۔ دیو، پری، جن، دیوی، دیوتا، ان کے چہرے، طاقت، درخت، پیڑ پودے، لہو، خون، ذات، ماں، درویش، سب استعاراتی معنویت کو لیے آرکی ٹائپس کے تحرک کا گہرا احساس عطا کرتے ہیں۔

ادبی تنقید جب آرکی ٹائپ / آرکی ٹائپ کی اصطلاح استعمال کرتی ہے۔ اور کسی فنکار کی جمالیاتی آرکی ٹائپس کا تجزیہ کرتی ہے تو دراصل تلوار کی دھار سے گزرتی ہے۔ آرکی ٹائپس کا تجزیہ آسان نہیں۔ اس لیے بھی کہ بعض لکھنے والے شعوری طور پر اپنے "لاشعور" کی نمائش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آرکی ٹائپس کی علامتوں اور متھ وغیرہ کی تحلیل ضروری ہے۔ اور ساتھ ہی بڑے فنکاروں کے ذہن تک رسائی بھی ضروری ہے جو تہذیب جیسے فنکاروں کے ذہن کی تشکیل کرتی ہے اس پر بھی نظر چاہیے۔ اور ساتھ ہی جس کی تمام تخلیقات کے مطالعے کے بعد نتائج اخذ کرنا بھی ضروری ہے۔ جنت اور جہنم کا ذکر کون نہیں کرتا لیکن یہ دونوں کس حد تک آرکی ٹائپس سے رشتہ رکھتے ہیں یہ دیکھنا ضروری ہے۔ قدیم یونانی قصوں کہانیوں کا رس کوئی بھی لے سکتا ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ انسانی تجربوں کی گہرائیوں تک جو رسائی ہوئی ہے۔ کیا اس سے آرکی ٹائپس کے رنگ حاصل ہوئے ہیں۔ علامتوں اور استعاروں کے ظاہری رنگ و آہنگ سے ہٹ کر قدیم ترین تصورات کی معنویت اور ان تصورات کے فطری رنگ اور آہنگ تک پہنچنے کا معاملہ ہے۔

جو یقیناً دشوار ہے۔ جدید شاعری میں صحرا، بستی، صلیب، وغیرہ کا ذکر بار بار ہوتا ہے اسی طرح سمندر، پتھر، سمندر، آگ وغیرہ کا ذکر عام ہے۔ ذہنی اور جذباتی تجربوں میں یک جہتی معنی کے ساتھ کچھ آ جاتی ہے۔ لیکن یہ استعارے اور یہ علامتیں زیادہ دور تک نہیں لے جاتے بے قرار اور متحرک "سائیکی" کا احساس عطا نہیں کرتیں۔ ظاہر ہے اس کے باوجود کہ یہ سب آرکی ٹائپس ہیں، آرکی ٹائپس بھی ہیں ان کا استعمال تجربوں کے پیش نظر آرکی ٹائپل نہیں ہے۔ یہی حال تاریکی، اندھیرا، سمندر اور جنگل وغیرہ کا ہے۔ یہ سب پہلی جہت یا زیادہ سے زیادہ دوسری جہت تک لے جاتے ہیں۔ یہ علامتیں ہیں تاکہ تجربے حسی سطح پر صرف جب بہتر ہو کر سائیکی کی جانب بڑھیں اور سائیکی میں ایسا تحرک پیدا ہو کہ آرکی ٹائپس پیدا ہونے لگی ہوں۔

• آرکی ٹائپس / آرکی ٹائپس کی بنیادی پہچان تو اسی وقت ہوتی ہے جب سائیکی کے تجربوں سے نئے تجربوں کا گہرا معنی خیز رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ [illegible]

فضل تابش

بارا امتحاں لیتا رہا ہے
ک استاد، رہبر، آشنا ہے

ستاروں سے دیکھا ہم نے ہنستا
مسرت کو یہ جگنو کیا بنا ہے

یقیں کر منگ لیں گے تو دیگا
مگر ہم کو خدا نے سب دیا ہے

زمیں خالی نہیں تھی بچھڑ کر فن سے
جدا ہونا لے راس آ گیا ہے

ہمارے ملک موتی ہیں یہ شبنم
یہ سب کچھ مت چھپ ... کھلو

۱۵ر۹ شیش محل — بھوپال

اختر ہوشیارپوری

زخمِ انا کو پھر سے ہرا کر رہا ہوں میں
یہ قرضِ زندگی ہے ادا کر رہا ہوں میں

پہلے تو روشنی کا سفر شب کو طے کیا
اور اب دیوں کو نذرِ ہوا کر رہا ہوں میں

اُس سے بچھڑ کے سوچتا ہوں شہرِ دوست میں
کیوں ناخنوں سے گوشت جدا کر رہا ہوں میں

کاغذ پہ انگلیوں کا لہو بولنے لگا
آ تو بھی سن کہ عرضِ وفا کر رہا ہوں میں

اپنے بدن کی گونج کو لفظوں میں ڈھال کر
راتوں کی خامشی کو صدا کر رہا ہوں میں

دنیا ہی کیا حیات بھی حائل ہے راہ میں
شاید کہ آرزوئے بقا کر رہا ہوں میں

اختر یہ دن بھی آتے ہیں عمرِ رواں کے ساتھ
جب کچھ نہ کر سکا تو دعا کر رہا ہوں میں

اے ۔ ۸۴۷۵ کرتار پورہ محلہ راولپنڈی (پاکستان)

کرامت علی کرامت

شہد کی مکھی نظر آتی ہے کیوں اتنی اداس
چھین لی ہے کس نے آخر سارے پھولوں کی مٹھاس

توڑ کر الفاظ کی مٹی بنایا اک گھڑا
بھر لیا احساس کا پانی، بنا معنی شناس

ایک ہی آکاش کا سب آبگینوں میں ہے عکس
توڑ کر تم ایک کر دو تو وہی ہے انعکاس

کیسے سمجھاؤں تمہیں پوری عبادت زیست کی
میں تو خود بھی ہوں کتابِ وقت کا اک اقتباس

وہم کی دلدل سے جب بھی ہو گیا آزاد میں
میرے دامن سے چپک کر رہ گیا خوف و ہراس

یوں کرامت ایک طوفانی ہوا کی زد میں ہوں
اڑ رہی ہے ہر طرف میرے خیالوں کی کپاس

رحمت علی بلڈنگ، دیوان بازار کٹک ۷۵۳۰۰۱

[illegible] لیکن تیرے کی اس دن بچوں کی دبی دبی ہنسی سے شرمندہ ہو کر اس
دستر خوان چھوڑ دیا۔ پھر دونوں باپ بیٹی کے لئے میز، کرسیاں اور
چھری کانٹے کا انتظام ہوا۔
ایسا بھی نہیں تھا کہ گھر والوں نے کبھی انگریزی رہن سہن دیکھا ہی [illegible]
یا مغربی تہذیب کے بارے میں کچھ بھی نہ جانتے ہوں لیکن مغرب کی
پیروی کے ضروری نہیں سمجھتے تھے اور چند دن بعد مہمان کے لئے
خود طریقے کو اپنانا مشکل ہو گیا چنانچہ باپ بیٹی نے اختیار کر رکھے تھے
دن چڑھے بیدار ہوتی پھر دن رات بھر گھر کے بڑے [illegible] کی یہ
[illegible] لڑکوں کے ساتھ بیٹھ [illegible] کے [illegible] اور شام ڈھلے ڈانس۔
اماں نے نیچے ہو کر کہہ دیا۔ مجھ سے یہ سب برداشت نہیں ہوتا
بیرسٹر صاحب علیحدہ انتظام کر لیں تو بہتر ہے کیونکہ گھر میں بچے اور نوجوان
[illegible] حالت میں ہیں اور کھلا سینہ دیکھ دیکھ کر نہ جانے کیا کر بیٹھیں
اس کا خدشہ صحیح تھا۔ محلے کے لڑکے بھی جو اب تک گھر کی چوکھٹ
پھلانگ سکے تھے اب شاہدہ سے دوستی کے بہانے ڈھونڈنے لگے
اور ہر وقت اچھل کود دھما چوکڑی مچانے لگے تھے۔ بلند بانگ قہقہوں
[illegible] سہارے گری ہوئی فقرے بازیوں سے گھر مچھلی بازار بن کر رہ
گیا تھا۔ اپنے گھر کے بچوں کو تو اماں نے ڈرا دھمکا کر سر شام ہی گھر کے اندر
[illegible] کمرے میں بند کرنا شروع کر دیا تھا مگر چچا کے لحاظ سے ان نوجوان
[illegible] کو نہ روک سکیں۔ اپنے پرائے، عزیز رشتہ دار، دوست
اور ہمسائے سبھی شاہدہ کی خوشبو لے کر کتوں سے
[illegible] طرح بھنبھنانے لگے۔ کوشش کے باوجود اس مسئلے کا کوئی حل ممکن نہ ہوا۔
کیونکہ اس کا بھی یقینی طور پر کوئی اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ چچا مستقل
قیام کے لئے آئے ہیں یا پھر [illegible] مزید سیاحت اور قیام کے بعد
کی طرف جانے والے ہیں۔ لہٰذا میں نے اماں کو سمجھایا۔ کچھ دنوں [illegible]
[illegible] اس معاملے میں خاموشی اختیار کریں۔ معلوم تو ہو جائے کہ چچا کا ارادہ
کیا ہے۔ اگر اماں یہ کہہ دیتیں کہ چچا اپنے قیام کا علیحدہ سے انتظام کریں
تو زمانہ تو یہی کہتا کہ بھاوج نے اپنا نام پیدا کر دکھایا۔ دیور کو گھر
نکال دیا کیا پتہ مرحوم شوہر کی عزت کی بھی پرواہ نہ کی اس نے عافیت
اسی میں سمجھی کہ [illegible] جائے تھی کہ چچا کا منشا [illegible] معلوم
ہو جائے [illegible] اور کچھ چچا اور شاہدہ کو بھی
[illegible] حالت ہو گئی تھی
[illegible] ایک [illegible] دیرہ [illegible]

پھوپھی گئیں اماں کے پیچھے چلنے سے ان کا آنا جانا بالکل بند ہو گیا کیونکہ
آئی تو وہ میرے [illegible] بھائی کی ہوتی تھی۔ اور بھوک چاہے
پیٹ کی ہو یا دماغ کی دیر تک قابل برداشت نہیں ہوتی۔ طبیعت
میں ایک قسم کی چڑچڑاہٹ اور بدمزگی پیدا ہو گئی۔ جس سے بچنے کی خاطر
میں ایک دن [illegible] کر کے چچا سے کہا اب شاہدہ کی شادی کر دیجئے چچا۔ یہی تو
مناسب عمر ہوتی ہے شادی کی۔ تو [illegible] کے [illegible]
[illegible] نشتروں کے پیچھے سے چچا نے بغور مجھے دیکھا۔ یہ بات نہیں کہ انہوں
نے اس مشورے کو گستاخی پر محمول کیا ہو بلکہ شاید وہ یہ محسوس کرنا چاہتے
تھے کہ کس جذبے کے تحت یہ مشورہ دیا جا رہا ہے۔ اور جب ان کی جہاں
دیدہ آنکھوں اور تجربہ کار دماغ کو یقین ہو گیا کہ اس مشورے میں ذاتی
طلب کی مطلق کوئی جھلک نہیں ہے تب وہ بولے "یہ بیکار خیال ہے۔
بائیس سال کی عمر میں شادی کر کے میری اماں نے میری جو مٹی پلید کی ہے
اس سے حاصل شدہ سبق کچھ کم ہے جو اب میں اتنی کم عمری میں شاہدہ کی
مٹی خراب کر دوں"۔
گھر بسانا مٹی پلید کرنا تھا تو یقیناً چچا کی مٹی خراب ہوئی تھی لیکن گھر
بسانا ایک سماجی ضرورت اور فطری تقاضوں کی تکمیل کا نام تھا تو چچا نے
شادی کا جتنا سکھ اٹھایا شاید ہی بہت لوگ اٹھا سکے ہوں۔
چچی مجھے تھوڑا تھوڑا یاد تھیں۔ نازک سے ناک نقشے کی بھولی
شرمیلی خاتون تھیں۔ جب ہم اسکول سے لوٹتے تو عموماً چچی کی طرف چلے
جاتے تھے۔ کیونکہ ایک ہی حویلی کے دو الگ حصوں میں ہمارے
ابا اور چچا اپنے اپنے خاندانوں کے ساتھ مقیم تھے اور چچی بڑی مہربان اور
سگھڑ تھیں کہ ان کے پاس مرتبانوں میں ہمیشہ مختلف چیزیں بھری رہا کرتی تھیں
نمکین بھی اور میٹھی بھی۔ اچار چٹنیاں۔ [illegible] تازہ بھی اور خشک
بھی اور نہ جانے کیا کیا۔
پیسے کی ہمارے گھر میں بھی کوئی کمی نہیں تھی لیکن چچی کی طرح اماں
ہمارا حد سے زیادہ خیال نہیں رکھا کرتی تھیں۔ جو کچھ کھانا ہوتا سوائے
مقررہ اوقات کے درمیان میں کبھی نہ ملتا اس کے برعکس چچی کے پاس جب
بھی چلے جاؤ وہ اصرار کر کے کچھ نہ کچھ ضرور کھلاتیں۔ اور کھلا کر [illegible]
چھوڑتیں۔ ہمیشہ خود کو مصروف رکھتیں۔ جب ہم پوچھتے نوکروں کے ہوتے
ہوئے بھی آپ خود کام کیوں کیا کرتی ہیں چچی تو وہ مسکرا کر مدھم لہجے میں
جواب دیتیں کیونکہ کاہل عورتوں کو مرد پسند نہیں کرتے "ان [illegible]
اور میری سمجھ کی گرہ میں نہیں آتی تھی مگر پھر بڑھتی ہوئی [illegible]

انور شیخ

LIBERTY, P.O. BOX [illegible], CARDIFF
GREAT BRITAIN CF2 4YP

اردو کا مستقبل کیا ہوگا؟

مدیر شاعر کے نام موصول ہونے والی ڈاک کے ذخیرے میں طویل خطوں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے ایسے کئی طویل اور اہم خط شاعر میں شائع بھی کئے گئے ہیں۔ ذیل میں ایک اور اہم خط درج کیا جارہا ہے اس کے بعض نکات سے اتفاق نہ کرتے ہوئے بھی کئی اہم باتوں کی کسی بازگشت اور اردو کے کچھ بنیادی مسائل غور طلب ہیں رسم الخط کی تبدیلی کا آج کل سوال ہی نہیں لیکن یہ بھی ہو رہا ہے کہ اب اردو والے اپنی کتابیں ہندی میں بھی شائع کرنے لگے ہیں اور یہ رجحان بڑھ رہا ہے۔ نئی نسل کے درمیان سے اردو کا رسم الخط نکلتا جارہا ہے سچ تو یہ ہے کہ اردو کے بنیادی مسائل پر از سر نو غور کرنے اور متحد ہو کر اس پر عمل کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا جارہا ہے کیونکہ ہندوستانی سیاست کے تناظر تیزی سے بدل رہے ہیں۔

انور شیخ اپنے سہ ماہی اردو انگریزی جریدے لبرٹی (کارڈف، برطانیہ) میں اردو زبان و ادب کے بے حد سنجیدہ مسائل پر لکھتے رہتے ہیں۔ اردو زبان اور اس کے کلچر کا مستقبل کیا ہوگا۔ ان کے موضوعات میں ایسے ہی سنجیدہ اور بحث طلب ہوتے ہیں۔ انور شیخ اپنے ہفت روزہ اخبار ماڈی (برطانیہ) میں بھی شائع کر رہے ہیں۔ اردو کی نئی بستیوں سے شائع ہونے والے اخبارات و رسائل میں۔ اردو کے مسائل پر لکھے ہوئے نئی نسل سے اردو رسم الخط کی عدم دلچسپی کا ذکر بطور خاص کیا گیا ہے۔ اردو زبان ہندوپاک میں یا پھر نئی بستیوں میں اپنے مسائل کے ساتھ موجود رہے اور آج بھی دنیا کی بڑی زبانوں میں سے ایک ہے لیکن اس کا مستقبل کیا ہوگا؟؟ (ادارہ)

بعض اتفاقات ناقابل یقین ہوتے ہیں میں نے شاعر کے مشترکہ شمارہ نمبر (۱۹۹۳) صفحہ ۱ پر نظم دیکھی تو اعتبار نہ آیا۔ اور علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم نے دعا نصف صدی قبل کہدی جو میرے ذہن میں ابھی تک انگڑائیاں لے رہی ہے۔ علامہ مرحوم نے خوب فرمایا ہے میں چاہتا ہوں کہ اردو کا نام ہندوستانی رکھ کر اس لسانی نزاع کو قطعاً ختم کر دیا جائے چونکہ میں ان کا طبعاً ہم خیال ہوں۔ اس لئے اس موضوع کو مدلل طور پر اس طرح بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ کے سوالنامے کا بھی جزوی طور پر جواب دے سکوں۔

یہ روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ دنیا میں صرف وہی زبانیں علمی و ادبی عروج تک پہنچتی ہیں جو کسی ملک کے قومی وقار کا جزو ہوں۔ انگریزی، جرمن اور فرانسیسی زبانیں اس بات کا زندہ ثبوت ہیں۔ لسانی خلوت قومی حشمت کی ترجمان ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زندہ قومیں اپنی زبانوں کو سرکاری زبان قرار دیتی ہیں اور اس کی ترویج و ترقی کے لئے ہر ممکن کوشش کرتی ہیں۔ ہندوستان میں انگریزی کی ترویج لارڈ میکالے کے اسی جذبے کی مرہون منت ہے جیسے زبان کو ملکی حکومت کی حمایت میسر نہ ہو اس کی بقا طویل نہیں ہوتی۔ اردو زبان کے ابتدائی فروغ کا بڑا سبب یہی تھا کہ بادشاہ ظفر اس کے شاعر اور مربی تھے۔ ان کے دربار میں شاعروں کا ہجوم اسی وجہ سے تھا۔

اردو کس کی زبان ہے؟ یہ کسی قوم کی زبان نہیں۔ ہندوستان کے مسلمان اپنے آپ کو اگر قوم کہیں تو وہ قومیت کے فطری اجزائے مقومہ سے محروم ہیں۔ قومیں مذہب سے نہیں بنتیں۔ یہ محض خوش فہمی ہے۔ اور مذہبی جنون کی پیداوار ہے۔ اگر یہ سچ ہو تو عرب اپنے خزانے صرف عربوں کی بہبود کے لئے ہی مخصوص کیوں کرتے ہیں اور انہیں غیر عرب مسلمانوں کی فلاح پر خرچ کیوں نہیں کیا جاتا۔ پاکستان اتنی جلدی دو حصوں میں کیوں ٹوٹ گیا

زبان کا تعلق مذہب سے نہیں قوم سے ہوتا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے اردو ہندوستان کے مسلمانوں کی زبان ہے جو کہ ایک اقلیت ہیں۔ اس لئے یہ ممکن نہیں کہ اردو کو ہندوستان کی قومی زبان کا اعزاز حاصل ہو جو کسی زبان کے ارتقا و بقا کے لئے لازم ہے۔ اردو کی بدقسمتی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں نے اسے اپنی قومی زبان قرار دے کر اسے ہندوستان کی تقسیم کا ذریعہ بنایا۔ میرا پنجاب کے ایک دیہات کے ساتھ تعلق ہے۔ جہاں ۱۹۴۷ء تک اردو بولنا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود بٹوارے کے الیکشن کے دوران ہر پنجابی مسلمان نے اپنی زبان اردو لکھی۔ اس کی دو وجوہ تھیں۔ ایک یہ کہ سکھوں نے پنجابی کو اپنی قومی زبان بنا لیا تھا۔ دوسرے یہ کہ اردو زبان کو اپنی مادری زبان قرار دے کر پنجابی مسلمان ہندوستان کے دوسرے مسلمانوں سے اپنی قومی یکجہتی کا اعلان کرنا چاہتے تھے۔

یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ہندوؤں نے ہندی کو اپنی قومی زبان قرار دیا ہے اور انہیں اس بات کا احساس ہے کہ اردو ان کے دیس کی تقسیم کا ایک سبب بنی۔ یہ ممکن نہیں کہ وہ اردو کی سرپرستی کریں۔ البتہ سیاسی مفادات کی خاطر زبانی جمع خرچ کرنا اور بات ہے۔ اردو مسلمانوں کی زبان نہیں اگر یہ حقیقت ہوتی تو دنیائے اسلام کے دیگر حصوں میں اس کی قدر دانی ہوتی جو تقریباً صفر کے برابر ہے۔ اردو ہندوستانی مسلمانوں کی زبان بن کر رہ گئی۔ اور ہندی قومیت کو اس سے سخت چوٹ پہنچی ہے۔ جب تک اردو زبان سے مسلمانیت کا عنصر دور نہ کیا جائے۔ اس کے پھلنے پھولنے کے امکانات محدود نظر آتے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بہت سے ہندوستانی مسلمانوں کو اپنے ہندی ہونے کا احساس لاحق ہے۔ اور وہ اپنے آپ کو بھارتی کہلانا چاہتے ہیں۔ جوں جوں یہ فرض پختہ تر ہوا۔ یہ لوگ ہندی کو اردو پر ترجیح دینے لگیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہندی اور اردو میں چپقلش قطعاً غیر ضروری ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندی اردو کی ماں ہے۔ اگر یقین نہ آئے تو مندرجہ ذیل فقرے پر نگاہ ڈالئے: آپ کہاں کے رہنے والے ہیں! تمہارا کیا حال ہے! تم کہاں کے رہنے والے ہو!! وہ لوگ کب آئیں گے! پیسے کب دو گے!
یہ فقرے اردو کے نہیں ہیں ہندی کے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ اردو کی گرامر بنیادی طور پر وہی ہے جو ہندی کی ہے۔ بعض بندشیں جو عربی اور فارسی سے منسلک ہیں۔ اس کا سبب اردو نویسوں کی متعصبانہ روش ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو اردو کے ہندی سے الگ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں عربی اور فارسی الفاظ کی بھرمار ہے جونہی بھارت کے لوگوں کا قومی جذبہ مضبوط تر ہوا وہ ہندی الفاظ کو غیر ہندی الفاظ پر ترجیح دینا شروع کر دیں گے۔

انیس سو سینتالیس سے پہلے ایک زبان سننے میں آیا کرتی تھی جو آل انڈیا ریڈیو کی نشر کی زبان تھی اور جسے ہندوستانی کہا جاتا تھا۔ یہ دراصل اردو زبان کی ایک سہل ہوئی قسم تھی جس میں ہندی اور سنسکرت الفاظ کا حسین امتزاج موجود تھا۔ اس سے ہندوؤں کو قطعاً کوئی عناد نہ تھا وہ بھی اسے اپنی زبان سمجھ کر بولتے تھے۔ یہ زبان ہندوستان کی LINGUA FRANCA تھی۔ علامہ کیفی مرحوم کی دوررس نگاہوں نے اس حقیقت کو خوب بھانپا تھا اس سلسلے میں میں ان کا ہم خیال ہوں۔ نہ صرف اردو کو ہندوستانی کہنے کے حق میں ہوں بلکہ اردو کی بقا کے لئے یہ بھی ضروری ہے اس کا رسم الخط دیوناگری میں بدل دیا جائے تاکہ ہندوستانیوں کو اس کے ہندی الاصل ہونے میں کوئی شبہ نہ رہے کہتے ہیں کہ صرف یوپی کی آبادی پورے پاکستان سے زیادہ ہے۔ یہ لوگ بالخصوص مذہب یقیناً اردو بولتے ہیں۔ اگر انہیں اردو کے مادری زبان ہونے کا احساس ہو سکے تو یہ اردو کی بقا کے ضامن ثابت ہو سکتے ہیں۔

صرف ہندی اور سنسکرت کے حسین امتزاج سے اردو ہندی کا نزاع ختم نہیں ہو سکتا اس کے لئے ضروری ہے کہ ہندی مزاج کی بھی بحالی ہو ہر زبان اپنے کلچر کی نمائندہ ہوتی ہے۔ لیکن اردو عربی اور ایرانی روایات کی حامل ہے۔ اس میں لفظ کی فراوانی ہے۔ مثلاً صحن کہتے ہیں؟
——— مثلاً مجنوں، اور شیریں فرہاد کے قصے اس زبان کی رگوں میں سمائے ہیں۔ بھلے ہی ہیر رانجھا اور سوہنی مہینوال کا ذکر ملتا ہے۔ دجلہ و فرات کی داستانیں حد سے متجاوز ہیں۔ لیکن گنگا اور جمنا اشتراکیت کی ایک خوبی یہ تھی کہ وہ مقامی ادیبوں کی ہو لی تھی۔ وطنیت اور مقامیت کو نظر انداز کر کے اردو زبان بھارت میں پنپ نہیں سکتی۔

میں نے اوپر جو کچھ لکھا ہے۔ یہ اردو اور ہندوستان کے سلسلے میں ہے مجھے اردو زبان صرف بھارت سے وابستہ نہیں بلکہ پاکستان کی سرکاری زبان میں سے ایک ہے۔ مقامی بھاشاؤں پنجابی، پشتو وغیرہ کی سربلندی اس کے قومی زبان تسلیم کئے جانے میں رکاوٹ بنی ہوئی ہے لیکن اس کے باوجود اس کی ترقی کے امکانات موجود ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ لاکھوں افراد ہندوستان کے ان حصوں سے ہجرت کر کے

سکتے ہیں جن کی مادری زبان اردو تھی، دوم یہ کہ اردو پاکستان کا ایک تاریخی جزو ہے اور تیسرے یہ کہ پاکستان کی تقریباً تحریر کا دفتری حصہ اسی زبان میں سر انجام پاتا ہے۔

رہیں اردو کی نئی بستیاں، جس سے مراد ایسے لوگ ہیں جو بیرونی ممالک یعنی یورپ امریکہ کینیڈا اور مشرق وسطیٰ میں آباد ہیں تو ان کی بہت بڑی تعداد ہے یہ دس فیصد کی مانند ہیں۔ جو دیکھنے میں تو بہت حسین ہے لیکن حقیقت میں تخت ناپائیدار ہے۔ یہ لوگ جو مغرب میں آباد ہیں اپنے بچوں کو اردو سے روشناس نہیں کرا سکے۔ ہماری نئی نسلیں اپنے کلچر اور زبان سے بے بہرہ ہو رہی ہیں۔ بد قسمتی سے چند دہائیوں تک یہاں اردو کے نام لیوا معدوم ہو جائیں گے۔

میں نے حقیقت کو دیانت داری سے بیان کیا ہے۔ آپ کے کلام اور تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ آپ سنجیدہ مزاج انسان ہیں۔ اردو کی بقا اور ارتقا کی ذمے داری آپ جیسے لوگوں پر عائد ہوتی ہے مجھ جیسے لوگ جو وطن عزیز کو بھی خیر باد کہہ چکے اردو زبان کے شیدائی ہونے کے باوجود اس کشتی کے کھیویا نہیں ہو سکتے۔ ہم لوگ تو صرف ثانوی معاون ہی ادا کر سکتے ہیں۔

اس سلسلے میں "شاعر" کو صف اول میں ہونا چاہیے۔ جو اشاعت کے چونسٹھویں سال میں ہے۔ یہ راز بقا کو جانے بغیر ممکن نہیں۔

میری رائے میں "شاعر" ایک اعلیٰ درجے کا ماہنامہ ہے۔ شعریت کا حامی ہونے کے باوجود نثری تقاضوں سے غافل نہیں ہے۔ معیاری لحاظ سے یہ بادِ صبا اور بادِ سموم دونوں کا نمائندہ ہے لیکن اس کا بہترین پہلو اس کی ہمہ گیری ہے جس میں بیرونی شعرا اور ادبا کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے ایسی ایک جزبی سادگی بھی ہے۔ جو جنبی کاوشوں سے پاکیزگی کے سبب وجود میں آتی ہے۔ چونسٹھ برس ایک ادبی رسالے کے لئے عمر خضر سے کم نہیں۔ یہ درازیٔ سنی۔ "شاعر" کی کامرانی اور افتخار امام صدیقی کی مہارت سارنا کا بین ثبوت ہے۔ ❁

بقیہ صفحہ ۱۸ ایک نفیاتی اصطلاح

ہے۔ اور صدیوں سے ماضی تک پھیلا ہوا سر اسرار ہوں پھر اچانک چراغ روشن ہو سکتے ہیں۔

آرکی ٹائپ / آرچ ٹائپ کی جابیانی اصطلاح دراصل MYTHOS کی ایک نئی کائنات کی جانب اشارہ کرتی ہے ہندوی شاعری میں شیو اور کرشن رومان اور بھگتی کے تجربوں تک ہی عام طور پر محدود ہے حالانکہ یہ دونوں ہندوستان کی سائیکی آتہاسی معنی خیز آرکی ٹائپس ہیں۔ ہندی شاعری میں یہ دونوں عظیم پیکر حسی سطح پر اتنے سحر انگیز نظر نہیں آتے کہ ہم ان کے اساطیری عمل و حرکت کو انتہائی گہرے تجربوں کے ساتھ حاصل کر لیں۔ ظاہر ہے بڑا شاعر ہی ان آرکی ٹائپس / آرچ ٹائپس سے باطنی رشتہ قائم کر سکتا ہے۔ ❁

بقیہ صفحہ ۳۵ یوسف کی چٹھی

خوشی اتنی زیادہ تھی کہ شدید درد بھی احساس پر غالب نہ آ سکا۔ وہ فون سننے بچے کے ساتھ بھاگتی ہوئی چلی گئی۔

"ہیلو! ــــ یہ یوسف ــ بیٹا" حلق میں اٹکا ہوا دل اس کی آواز اور یوسف کے بیچ حائل ہو گیا تھا۔

آپ یوسف کی والدہ ہیں؟ فون پر خود یوسف نہیں تھا۔ بہت دکھ کے ساتھ آپ کے لئے بری خبر ہے۔ کل کار کے حادثے میں یوسف .....

حاجراں پھر پیچ بات نہ سن سکی۔ ایک چیخ ابھری اور فضا میں منتشر ہو گئی۔

دوسرے دن کی طرح یوسف کا شاعر دوست ندیم بھی تعزیت کیلئے آیا

"بیٹا! کل یوسف کی ڈیڈ باڈی آ رہی ہے ائیرپورٹ جانا ہو گا تم ذرا جلدی آ جانا" یوسف کا باپ رندھی ہوئی آواز میں بولا۔

"انکل صبح مجھے ہائی کورٹ جانا ہے۔ شاید دیر ہو جائے میں سیدھا ائیرپورٹ ہی پہنچ جاؤں گا۔ حکومت نے میری ایک نظم پر بغاوت کا مقدمہ دائر کر دیا ہے۔ حاجراں نے اپنی دھواں دھواں آنکھوں سے جن میں انتظار کے تمام دیپ بجھ چکے تھے۔ ندیم کی طرف دیکھا

"تو کیا ـــــ تم بھی؟؟" ❁

خاندان سیماب اور شاعر سے رابطے کیلئے نیا تبدیل شدہ ٹیلیفون نمبر نوٹ کریجیے (۳۸۲۹۹۰۴)

شائق مظفرپوری

خواہش منزل بنی تلوار تو
راہ میں حائل ہوئی دیوار تو

اپنے چہرے کا تغیر دیکھئے
کھینچ ہو وقت کی رفتار تو

سرکشی ہے اندھیروں کے دوش پر
اوڑھ لی سر نے کہیں دستار تو

فکر کی قندیل میں جلتا ہے چراغ
جاگتا ہے جب کوئی فنکار تو

دیکھئے کیا پھول بننے کی دعا
ہو تبسم گر کلی پہ بار تو

خامشی کے لب کو بھی سی لیجئے
بار ہو لیکن بھی لب اظہار تو

وقت کا احساس ہی کچھ کم نہیں
نیند سے شائق ہوئے بیدار تو

● ۳۹- اولڈ پرولیا روڈ۔ ذاکر نگر۔ جمشید پور

شمس بدایونی

یہ دھوپ بھی یہ کرم کا سحاب بھی تیرا
زمیں بھی تیری، یہ خانہ خراب بھی تیرا
شبوں کے نور، اجالوں کی تیرگی کی قسم
بلائے جاں ہے یہ آفتاب بھی تیرا
ہیں تیری دین یہ تشکیک کے اندھیرے بھی
متاع علم و ہنر کا سحاب بھی تیرا
میرے خیال کے سرکش خیال بھی ترے
میری نگاہ کا مبہم سا خواب بھی تیرا
میں تیرا عکس ہوں گر تو ہے کل تو جزو ہوں میں
ہے میری ذات میں یہ انتساب بھی تیرا
یہ آگہی ترے علم و خبر کا صدقہ ہے
کہ شہر علم بھی اور اس کا باب بھی تیرا
تری بلا سے اگر ٹوٹ کر بکھر بھی گیا
ہوائے تیز بھی تیری، حباب بھی تیرا
قدم قدم پہ عناں گیر ضابطے ترے
نفس نفس میں مرتب نصاب بھی تیرا

● معرفت ڈاکٹر لطیف حسین- ۴۳، پھول والان بریلی (یوپی)

انجم عرفانی

◆

نہ کبھی چھپائی ہم نے جو ہے خوب و زشت اپنی
ہے انا جبیں پہ روشن یہی سرنوشت اپنی

نہ ہے موج اشک پگھلی سر دوش آہ بکھری
ہوئی ریزہ ریزہ ہم کہ ہے خام خشت اپنی

یہ بجود نغمہ پیکر سے زمین شعر پہ وہ
یہ بیان بار آور یہ غزل ہے کشت اپنی

نہ خیال ترک الفت نہ فرار ہے نہ ہجرت
اسی خاک سے ہے نسبت یہی ہے بہشت اپنی

کہیں دل دکھا کسی کا میں تڑپ اٹھا ہوں انجم
کہ روائے مصلحت میں نہ دبی سرشت اپنی

● شعبۂ اردو ایم۔ ایل۔ کے ڈگری کالج بلرامپور

سہیل وحید
۲۸۹/ا وکاس نگر، لکھنؤ۔۲

کمپٹ لال

نئے کلکٹر نے دو ایک دن قبل ہی اپنے عہدے کا چارج لیا تھا۔ شہر کے
بہت سے صنعت کار، لیڈر اور افسر ملاقات سے ملنے چلے آ جا رہے تھے۔ ایک
سفید کرتا پائجامہ پہنے سفید ٹوپی لگائے کلکٹر کے کمرے میں داخل ہو
کلکٹر نے مستعد ایڈمنسٹریٹر ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے آنے والے شخص
ہاتھ اٹھا کر اس کا خیر مقدم کیا۔ پھر پوچھا کہیے تکلیف کی کوئی کام؟ اس شخص
چہرے پر خفیف سی مسکراہٹ تیر گئی۔

اچھا اچھا بیٹھئے!

نہیں صاحب ایسے ہی ٹھیک ہے اب چلتے ہیں۔

ارے نہیں چائے تو پی لیجیے۔ کلکٹر گھنٹی بجاتے بجاتے رک گئے پھر
لے۔ بیٹھئے پانی تو پی لیجئے۔

نہیں صاحب، بس آپ کی مہربانی ہے۔ آنے والا شخص ہاتھ جوڑے اوپر سے
نیچے کی طرف جھکتا جا رہا تھا۔

ارے آپ کیسی باتیں کرتے ہیں، اب خدمت کا موقع ملا ہے۔ میری طرف
کوئی کسر نہیں باقی رہے گی۔ اب دیکھئے اس سے پہلے میں جہاں تھا وہاں دو تین سال
تک کوئی رکا نہیں، میں تھا جو تین سال رہا اور شان سے رہا۔ ہر کوئی خوش جب
اور ہوا تو وہاں کے لوگ آنے نہیں دے رہے تھے کچھ لوگوں نے تو آنسوؤں سے
وداع کیا۔ اب یہاں بھی آپ لوگوں کا تعاون رہا تو سب اچھا ہی رہے گا کہتے
کلکٹر کے چہرے پہ سرخی دوڑ گئی۔

ارے صاحب میری کیا اوقات ہے آپ جو حکم دیں گے کریں گے۔

اچھا ہم چلتے ہیں۔۔۔۔

نہیں صاحب۔۔۔۔

اچھا پھر آئیے گا۔۔۔۔ آتے رہئے گا۔۔۔۔

اچھا صاحب۔۔۔۔۔۔ نمسکار نمسکار

اس شخص کے جانے کے بعد بڑے سے کلکٹر نے چین کی سانس لی پھر گھنٹی
بجائی چپراسی آیا اس سے پانی مانگا۔ چائے مہمان کو نہ جانے کیا یاد آیا کہ پانی کا
گلاس منہ سے لگاتے ہی لگائے انہوں نے چپراسی کی طرف دیکھتے ہوئے
آنکھیں نچائیں اور ایک ہاتھ سے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے
ہاتھ کی انگلیاں نچا نچا کر پوچھا کہ جو صاحب ابھی آئے تھے وہ کون تھے؟
چپراسی نے کچھ سمجھنے اور کچھ نہ سمجھنے کے انداز میں ایک بار سر ہلایا۔
پھر خاموش رہ گیا۔

کلکٹر نے گلاس کا پانی گلے سے نیچے اتارتے ہوئے تقریباً چلا کر چپراسی
سے پوچھا۔

ارے میں پوچھ رہا ہوں۔ کہ جو صاحب ابھی آئے تھے کون تھے؟

اتنا سننا تھا کہ چپراسی کے چہرے پر کئی رنگ آئے اور گئے۔ اس نے
آنکھیں پھاڑ کر بڑا سا منہ کھولا۔ دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے اور بولا۔

ہے رام! آپ اس کو نہیں جانتے؟ ارے صاحب یہ تو اپنا کمپٹ لال
ہے۔ آپ کے بنگلے کا چوکیدار۔ یہ سنتے ہی کلکٹر کرسی سے کھڑے ہو گئے۔

کیا۔۔۔؟۔۔۔۔۔۔

کیا۔ انہوں نے اتنی زور سے کہا کہ برآمدے میں کھڑا چپراسی دو قدم
پیچھے ہٹ گیا۔ کلکٹر دھڑ سے کرسی پر گرے اور ایک ہنکار بھری۔

ہوں! چوکیدار۔ بلاؤ اس حرام زادے کو۔۔۔۔ چپراسی بھاگتا ہوا
گیا اور کمپٹ لال کو لے کر اندر آیا۔ وہ پہلے ہی کی طرح دونوں ہاتھ جوڑے
اوپر سے آگے کی طرف تھوڑا جھکا ہوا۔ اپنا جسم یوں دار چہرہ لیے کلکٹر کے سامنے
کھڑا ہو گیا۔ مسکرانے کی کوشش میں تھوڑا ہکلایا

صا۔۔۔۔۔۔۔ب۔۔۔۔۔۔ کوئی حکم؟

جھنجھلاتے ہوئے کلکٹر کی گرجتی ہوئی آواز نکلی۔ کیا نام ہے؟

صا۔۔۔۔۔۔۔ب۔۔۔۔۔۔۔ کمپٹ لال

تمہیں بالکل تمیز نہیں کپڑے ٹھیک ٹھاک پہنا کرو۔

پرتاپ سنگھ بیتاب

نہ اپنا کوئی حرف غلط رہ گیا
نہ پیروں تلے راستہ رہ گیا
کبھی ناخدا جب ہوا ہو گئے
ہر اک سمت باقی خلا رہ گیا
دعا آسماں میں کہیں کھو گئی
مرے پاس دستِ دعا رہ گیا
کہیں کھو گیا وہ مرے سامنے
مرا آئینہ اُس سے ملا رہ گیا
مکمل تو تھیں اپنی نزدیکیاں
مگر پھر بھی کچھ فاصلہ رہ گیا
گزرتے گزرتے گزر ہو گئی
بس اک یاد کے اور کیا رہ گیا
زمانہ مری قتل ہو ہی گئی
مرے ہاتھ میں خوں بہا رہ گیا
بظاہر بکھر تو گئے بیتاب ہم
بجا ہیں مگر حوصلہ رہ گیا

● ۱۰۸ اے سیکٹر۔ اچھی ہٹ ہاؤسنگ کالونی جموں توی (کشمیر)

طارق نعیم

◆

مدت سے اک شخص ہے ایسے میرے گماں سے نکلا ہوا
جیسے لفظ زباں سے ہو اور تیر کماں سے نکلا ہوا

رات گئے گھر لوٹا ہوں تو اپنا جسم بھی ساتھ نہیں
جانے کس کی تلاش میں تھا میں وقتِ اذاں سے نکلا ہوا

پھر بھی کتابِ زیست مکمل ہوتی نظر نہیں آتی
اک اک حرف سمیٹ چکا ہوں خامۂ جاں سے نکلا ہوا

دشمن زادے بول میں اس مخروہ سے کیسا سلوک کروں
میری اماں میں پہنچا ہے جو تیری اماں سے نکلا ہوا

اک بے سمت مسافت لے کر عالم عالم پھرتا ہے
ایک جہاں میں کب رہتا ہے ایک جہاں سے نکلا ہوا

● ہفت روزہ "مسلمان" ۲-۱۵، ندین چیمبرس۔ آبپارہ اسلام آباد

آر۔ پی۔ شوخ

وہ یوں بھی مرے سانس سے تعلیق کرے ہے
آئینہ ہے مگر آنے میں تعویق کرے ہے

اک میں جو اسے جمع کروں غمزہ بہ غمزہ
اک وہ جو مجھے مجھ سے بھی تفریق کرے ہے

اڑنے سے جو عشق کا رنگ تو سمجھا
یہ خاک پہ وہاں بھی تخلیق کرے ہے

انصاف کی امید نہ رکھیو کہ یہ دنیا
ناکردہ گناہوں کی بھی تصدیق کرے ہے

اب اس کی نگاہوں میں جچا ہوں تو ہوا یہ
بے ذوق زمانہ مری تحقیق کرے ہے

● ایم سائنس کالج، شاہ آباد مرکنڈا (ہریانہ)

آصف نقوی
ہیڈ آف جیول ہسٹری، ایف آئی سی سی آئی بلڈنگ، بارہ کھمبا روڈ، نئی دہلی۔

کچلا ہوا ماسک

اس نے دفتر کی عمارت میں گھستے ہی اپنا روز کا کرچاری ماسک
سے پر لگایا اور لفٹ کا بٹن دبا دیا۔ ابھی دس بجنے میں پانچ منٹ
تھے اس لئے اس نے اوپر جاتی ہوئی لفٹ میں خود کو اکیلا پایا۔
وہ اپنا ذاتی چہرہ بھول چکا تھا۔

اس نے لفٹ کے آئینے میں اپنے عکس کو HELLO,
GOOD MORNIN کیا اور جواب میں مسکرایا۔ پھر اس نے
کا ڈبہ کندھے پر ٹھیک کیا۔ لفٹ بیسویں منزل پر پہنچ کر ہلکے
جھٹکے کے ساتھ رک گئی وہ لفٹ سے باہر آیا اس کے قدم اب خود
ما مڑ رہے تھے۔ دائیں پھر بائیں CORIDOOR میں
گے بڑھ رہا تھا۔ کوری ڈور میں صفائی والا جھاڑو چلا رہا تھا اس نے
چے کا ڈنڈا بغل میں دبا کر دونوں ہاتھ جوڑ کر اس کو نمسکار کیا
ں نے گردن کے اشارے سے نمسکار کا جواب دیا اور پھر دائیں
ت کے کمرہ نمبر ۲۰۳۷ میں مڑ گیا۔ کمرے میں تیز PHENOL
ل بو نے اس کا استقبال کیا، وہ بو اس کو اب خوشبو لگنے لگی
تھی۔ کمرے میں پچیس میز کرسیوں کے PUZZLE سے وہ پھول
کی گیند کی طرح لڑھکتا ٹکراتا، بچتا، گھومتا، پھرتا اب بڑی
آسانی سے اپنی میز کرسی تک پہنچنے لگا تھا۔ ایک کرسی، ایک میز
ایک اسٹیل کی الماری اور ایک لکڑی کی فائل ریک اس کے نام سے
منسوب تھیں۔ اس نے کندھے سے کھانے کا تھیلا اتارا اور فائل
ریک کے بیچ کے خانے کے خالی کونے میں رکھ دیا۔ کرسی کھسکائی جو دھول
سے اٹی ہوئی تھی کیونکہ وہ صرف ایک کلرک تھا۔ کرسی میز سے
صفائی کرانے والی حیثیت سے بہت نیچے۔ اس لئے خود اس
نے روز کی طرح ایک پرانا فائل اٹھایا۔ پہلے پھونک مار کر فائل کی گرد
اڑائی اور پھر اس فائل سے اپنی کرسی میز کی دھول اڑائی جو اڑ

کر آس پاس کی چیزوں پر جم گئی ... وہ کرسی پر بیٹھ چکا تھا
اس کو قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ وہی روز والی آہٹ یعنی
سیکشن آفیسر آرہے تھے۔ وہ مشینی طور پر کھڑا ہوا اور پھر بیٹھ گیا
اب وہ اپنی ڈیوٹی شروع کر چکا تھا... اندر سے گھنٹی بجی
باہر نہ جانے کہاں سے چپراسی نمودار ہوا اور آفیسر کے لئے پانی
لے جاتا نظر آیا.... پھر اس کو کچھ یاد نہیں کیونکہ اور کسی طرح وہ
ہوا میں تحلیل ہو گیا۔ اس کی پہچان، "شخص" اپنا پن سارا
وجود DISOLVE ہو گیا اب وہ ایک فرد نہیں تھا ایک مشین تھا
یا شاید مشین کا پرزہ یا محض ایک فائل یا الماری یا صرف ایک
STAMP PAD اس نے خود کو پھر سے اس وقت پہچاننا
شروع کیا جب کہیں دور سے گھنٹے کی آواز سنائی دینی شروع
ہوئی اور وہ پورے پانچ مرتبہ ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن کی آواز
سن پایا... پانچویں ٹن پر وہ خود کو نئے سرے سے پہچان
سکا۔ اس نے کرسی پیچھے کھسکائی۔ میز پر بکھرے کاغذات
فائلوں میں رکھے اور فائلیں الماری میں قلم جیب میں لگایا۔
میز کی دراز اور الماری کے تالے لگائے اور پھر فائل ریک کے
بیچ کے خانے کے کونے سے کھانے کا ڈبہ اٹھایا جو اب خالی تھا
... کمرہ نمبر ۲۰۳۷ سے باہر آیا۔ پہلے بائیں پھر دائیں کوری ڈور
سے گزر کر اب وہ لفٹ کے سامنے لگی ہوئی قطار میں کھڑا تھا۔
لفٹ آئی قطار اندر بکھر گئی۔ اس بار اس کے چہرے کے ساتھ
بہت سے چہرے لفٹ کے شیشے میں نظر آئے۔ وہ کسی کو بھی
نہیں پہچانتا تھا کیونکہ سب چہرے ایک جیسے تھے۔ لفٹ
کے ہلکے سے جھٹکے سے رکنے کا احساس نے اطلاع دی کہ
وہ نیچے آچکا ہے۔ اس کے قدم خود بہ خود اٹھ رہے تھے۔

دفتر کے دروازے سے باہر آنے کے بعد سڑک پر ZEBRA CROSSING سے سڑک پار کرتے ہوئے کانپا اس نے اپنے چہرے سے ماسک کھسکا کر اوپر کیا... زور سے لمبی سانس لی PETROL اور CARBON MONOXIDE کی ملی جلی بو اس کی ناکوں۔ دھول اور PHENOL کی ملی جلی بو سے بہتر معلوم ہوئی۔ اس نے آنکھوں کے کناروں سے نکلی پانی کی بوندوں کو آستین سے صاف کیا اور سڑک پار کر کے بس کے لئے قطار میں کھڑا ہو گیا۔

پھر اچانک سب لوگ ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ کئی دھماکے ہوئے گولیاں چلیں۔ وردیاں، موٹریں، جوتے گھومنے لگے۔ چیخیں، سائرن، ہارن، سیٹیاں، گالیاں، نعرے گونجے

پھر خاموشی۔ سناٹا۔ تاریکی اور خلاء۔

اگلے روز شہر کے صفائی کرمچاریوں کو سڑک صاف کرتے وقت ایک کچلا ہوا ماسک ملا اور ایک انسانی جسم کی ادھ جلی لاش.....

اس سے اگلے روز ملک کے تمام اخباروں میں شہر میں بم دھماکوں اور فرقہ وارانہ فسادات کی سرخیاں تھیں۔ فساد میں ملوث دونوں فرقوں میں اپنے اپنے فرقے کے مرنے والوں کی تعداد کو بڑھا چڑھا کر بتایا جا رہا تھا۔

معلوم نہیں اس کچلے ہوئے ماسک کو کس نے اپنی فہرست میں شامل کیا؟!

شاعر کے پرستاروں سے التماس

ہندوستان اور بیرونی ممالک میں بسنے والے بے شمار پرستارو شاعر سے گزارش ہے کہ وہ اپنا سالانہ زر رفاقت بذریعہ چیک یا بینک ڈرافٹ صرف
THE SHAIR BOMBAY
ہی کے نام سے ارسال فرمائیں۔

شاعر کے مستقل خریداروں سے...

- اپنا سالانہ زر رفاقت وقت پر ارسال کیجئے
- منی آرڈر فارم پر اپنا مکمل نام - پتہ اور خریداری نمبر ضرور درج کیجئے۔
- اپنا منی آرڈر درج ذیل پتہ پر بھجوائیے۔

The "SHAIR" (Monthly)
MAKTABA QASRULADAB
BOMBAY CENTRAL POST OFFICE,
BOMBAY-400 008.

- شاعر کو اپنے حلقہ احباب میں متعارف کروائیے۔
- اپنے علاقے کی لائبریریوں، اسکولوں اور کالجوں کیلئے شاعر کو جاری کروائیے۔
- جواب طلب امور کے لئے مناسب ڈاک ٹکٹ یا لفافہ ارسال کرنا نہ بھولیے۔
- اپنا خریداری نمبر ضرور تحریر کیجئے۔
- شاعر کا نیا فون نمبر نوٹ کر لیجئے۔

ثمینہ راجہ

یتِ شوق، جدائی کا، کوئی ہمسفر سے گلہ نہ تھا
سفر کی تو حد نہ تھی وہ مگر اسیرِ زمانہ تھا
رِ ملال میں ذرا عشق ہو کے بھی دیکھیے
کوئی شہر یہاں کبھی پھولا اور پھلا نہ تھا
قدر سے میری انا بڑی تھی جو کرچیوں میں بکھر گئی
شیشہ گر کا ہنر تھا یہ کہ طلسم آئینہ خانہ تھا
قدم پہ طلب کیا ترا آسرا تو غلط ہے کیا
وہ تجھ سے جدا نہ تھی مرا حال تجھ سے چھپا نہ تھا
کارواں نے سمجھ لیا جو تھا رہنماؤں کا مسئلہ
منزلوں کی ہوس تو تھی انہیں راستوں کا پتہ نہ تھا
شہر میں تو ہے مگر کچھ عجب طرح سے عمر بھر
خواب دیکھنا جرم تھا کبھی نام لیا روا نہ تھا
وقتِ شب کا کمال تھا کہ تری نظر کا جمال تھا
ال تھا کہ وصال تھا، تو ملا کہ مجھ سے ملا نہ تھا
قرضِ حرف ادا کیا کبھی دل کو قبلہ نما کیا
بندگی کا قرینہ تھا یہی زندگی کا بہانہ تھا

۳/۲۴ ۱۱۱ [illegible] ۱۰/۳ اسلام آباد (پاکستان)

رفیق راز

ٹوٹتی شاخ، ہوا اور پتیاں دو چار
کچھ ایسے ٹھہرے ہی ہم بھی ہیں یہاں دو چار

سپردِ خاک ہوئے آج بھی کئی معصوم
سپردِ نار ہوئیں کل بھی بستیاں دو چار

نہ اس نے کوئی وصیت ہی کی نہ وہ بولا
سنی تھی ہم نے فقط اس کی ہچکیاں دو چار

بس ایک تیغ تھی اس کی جو رن میں ٹوٹ گئی
شہید چھوڑ گیا صرف بیٹیاں دو چار

وہ اپنے پاپ سویرے اسی میں دھوتے ہیں
میں اس میں ڈالتا ہوں روز نیکیاں دو چار

ہوا کے ہاتھ میں خوشبو بھیجنا اپنی
رکھوں گا کھول کے میں گھر کی کھڑکیاں دو چار

ہوئی ہے روح کی وادی میں نور کی بارش
گری ہے خار و خسِ دل پہ بجلیاں دو چار

● ریڈیو کشمیر، سری نگر (کشمیر)

نشیبِ جاں کے بھی رمز آشکار کروں
مگر فرازِ بدن کس طرح سے پار کروں
زمیں لپیٹ کے سو جاؤں اور پھر اٹھوں
کہ ایک عمر ترا یوں بھی انتظار کروں
[illegible] تو ذرا کہکشاں کے دانوں کا
میں تارہ تارہ مجھے رات بھر شمار کروں
لہو لہو کروں یہ دل کی نذر جاں کر دوں
مجھے پتہ ہے ابھی چپ ہوں، اسکو سنگسار کروں
تمام رات جنوں جال ایک سازش کا
سویرا ہوتے ہی گھر سے چلوں شکار کروں
کوئی دریچہ مرے نام کا کھلے گا کبھی
میں برگ نے کو بوٹے لگاؤں پیار کروں
نہیں جمیل بھروسہ خود اپنی سانسوں کا
میں بے ثبات بھلا کس کا اعتبار کروں

● نزد شیر خان اسکول، صوفی ٹولہ، بریلی

فیصل ایم فارانی

60-RUSHOLME RD, TORONTO
ONT, ONT, M6J 3H5 CANADA

یوسف کی چٹھی

روز کی طرح آج بھی انتظار کے روشن دیئے میں امید کا تیل ڈال کر اس نے کھڑکی سے باہر گلی میں اپنی دھندلی آنکھیں بچھا دیں۔ سڑک سے آتے ہوئے ہر سائیکل سوار پر اسے پوسٹ مین کا گمان ہوتا۔ اس کی ممتا کو جانے کیوں یقین سا ہو چلا تھا کہ آج اس کے یوسف کی چٹھی ضرور آئے گی۔

پچھلے کئی سالوں سے وہ انہیں چٹھیوں کے سہارے تو زندہ تھی۔ اسے ہر مہینے یوسف کی دو چٹھیاں ملتیں جن میں دنیا جہان کے مظلوموں کا درد سمیٹے ہوئے اس کی شاعری اور افسانے ہوتے۔ وہ پڑھی لکھی بہت کم تھی پھر بھی اس کی تحریریں پڑھ کر وہ خوشی سے نہال ہو جاتی۔ نظموں، غزلوں کے ہر مصرعے اور افسانے کے ایک ایک لفظ میں اسے اپنا یوسف نظر آتا۔ وہ یوسف جسے اس کے بچپن میں وہ کبھی پل بھر اپنی آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دیتی تھی۔

اولاد کی محبت میں دنیا بھر کی مائیں تقریباً ایک جیسی ہوتی ہیں لیکن ممتا کی شدت میں صاحبزاں شائد چند قدم آگے ہی تھی۔ شادی کے بعد دس سال تک اس کی گود کسی بنجر دھرتی کی مانند ویران رہی۔ کتنی ہی دعاؤں اور منتوں کے بعد اس کے خزاں رسیدہ گلشن حیات میں ننھا مہکتا ہوا خوش رنگ پھول کھلا تھا۔ اماوس کی دس سالہ طویل رات کے بعد خورشید کی کرنیں آنگن میں اتری تھیں۔

کم بخت ـــــ ڈاکیہ بھی جانے کہاں رہ گیا ہے۔ صاحبزاں کی بے چینی نے پہلو بدلتے ہوئے سوچوں کا روپ دھار لیا۔ اسے وہ وقت شدت کے ساتھ یاد آ گیا جب یوسف ایک شاعر اور ادیب نہیں۔ صرف اس کا بیٹا تھا جو اس کی آنکھوں کے سامنے رہتا اور دل کی ہر بات بتاتا۔

ثانیہ کو ماں سے ملا کر یوسف بہت خوش تھا۔ انہیں دنوں تو اس نے شاعری کا آغاز کیا تھا جب ثانیہ کے لئے اپنے دل میں امڈتے ہوئے پیار کو غزلوں کا روپ دینا شروع کیا۔

پھر جانے کیا ہوا!۔ یونیورسٹی میں پہنچنے کے بعد یوسف کا رومانی شاعری سارے رنگ اس کے سرہانے فیض، فراز، جالب اور منٹو کی کتابیں نظر آنے لگیں۔ فیض کی ایک نظم تو وہ صاحبزاں کو کئی بار سنا چکا تھا۔ "مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ"۔

یونیورسٹی سے فارغ ہوتے ہوتے اس کی غزلوں اور افسانوں نے بھی ایک نئے موڑ کے ساتھ پرخار راہوں پر قدم رکھ دیا۔ اس کے نام ریڈیو اور ٹیلی وژن پر مشاعروں کے دعوت نامے آنا بند ہو گئے تھے۔ وہ ایڈیٹر جو کبھی اس کی تحریروں کو خوشی خوشی شائع کیا کرتے تھے ان کے رویوں میں بھی تبدیلی پیدا ہو گئی۔ بس گنتی کے چند ایک ترقی پسند رسالوں میں اس کی تحریریں نظر آتیں اور ثانیہ جس کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے وہ بے تاب رہا کرتا تھا۔ اور پھر ملاقات پر پیار کے اظہار کے علاوہ اسے کوئی اور بات یاد ہی نہ آتی تھی۔ اسی ثانیہ کے ساتھ اس نے نا جانے کتنا عرصہ گزار دیا مہینے میں ایک دو بار ملاقات ہوتی بھی تو یوسف کی گفتگو اسی ایک نقطے کے گرد ہی گھومتی رہتی جو اس کی تحریروں کی جان تھا۔ طبقاتی کشمکش، سرمایہ دار، وڈیرے، جاگیردار اور غریبوں کا استحصال۔ یوسف کے پاس بات کرنے کو بس یہی موضوع تو رہ گئے تھے۔

میں تو خود اپنے آپ کو تلاش کر رہا ہوں ماں۔ اس سسٹم کی کھوج میں ہوں جس کا مجھے حصہ ہونا چاہیئے۔ میری پہچان تو وہی سسٹم ہے جس میں غریبوں کو انسان سمجھا جائے۔ ان کی عزت نفس مجروح نہ ہو۔ اپنی پہچان کے بغیر میں ادھورا ہوں۔ اور ادھورا یوسف تمہیں کیا خوشی دے سکتا ہے۔ ثانیہ کی سب سے پیاری آنکھوں میں پھیلتے ہوئے سوالوں کی نمی دیکھ کر یوسف نے جب اسے لوٹ جانے کا مشورہ دیا تو اس دن وہ صاحبزاں کے گلے لگ کر بے طرح روئی تھی۔

اری بھاگوان!— آج پھر چٹھی کے انتظار میں کھڑکی سے لگ گئی ہے۔ صاحبزاں کا انتظار رفیق کریم کی آواز سے ٹکڑے ٹکڑے ہو کے

رتے کرتے گا۔

"تمہیں تو بیٹے کی کوئی فکر نہیں ہے ماں جب باپ ہو تم دیکھ لینا آج تیری
...ت کی جنسی مریضائی کی۔" ماہروں کی نظریں ایک بار پھر گھر کی سے باہر
...سیں نشاکی دنیا اگی پر سرتا گیا۔ قتل کر کے اخبار تھا سے لیے کب میں چلا گیا۔

یوسف کا چھپنا ہوا ناستہ دو دن پہلے گم ہو گیا تھا۔ حکومت
نے اس کے افسانے "ہنا وطن" کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا تھا۔ کہ یوسف
نے اس افسانے کے ذریعہ عوام میں باغیانہ جذبات کو ہوا دینے کی کوشش
کی ہے۔ کتنی ہی پریشانیوں کے بعد وہ اس الزام سے بری ہوا تھا۔ اس
کے شاعر دوست ندیم نے اسے ان راستوں سے دور ہٹانے کی بہت کوشش کی۔

"تم پر ترقی پسند تحریک کا کچھ زیادہ ہی اثر ہو گیا ہے۔"

"ترقی پسند ہونا کوئی برائی ہے۔" یوسف نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

"میرا مطلب ہے ابھی بھی رومانوی شاعری کرتے کرتے یہ تم کس طرف
نکل گئے ہو۔ اس بار بچ گئے ہو۔ ضروری تو نہیں کہ ہر بار حکومت
کی گرفت سے نکل جاؤ۔" ندیم نے یوسف کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"تم چاہتے ہو کہ تمہاری طرح میرا قلم بھی صرف عورتوں اور مرد و زن
کے جنسی تعلقات میں پھنس کر رہ جائے۔" یوسف کچھ تلخ ہو گیا تھا مگر اس
نے فوراً ہی اپنا لہجہ دھیما کر لیا۔ "دیکھو ندیم! میں عورتوں اور مرد کے
تعلقات پر لکھنے کو برا نہیں سمجھتا۔ یہ ہمارے معاشرے کی ایک حقیقت ہے
اور اس پر لکھنا بھی چاہئے۔ مگر صرف اسی ایک موضوع کو حاصل زندگی مان
لینا بھی کہاں کی عقلمندی ہے؟ انسانیت کا دائرہ اتنا تنگ نہیں ہے کہ
قلم کار صرف جنسی مسائل میں پھنس کر رہ جائے۔ تم منٹو کی راہ پر چلنے کی
کوشش کر رہے ہو۔ مگر اس کے لئے پہلے منٹو کو اچھی طرح سمجھو۔ منٹو
معاشرے کی چھپی ہوئی برائیوں پر لکھتا تھا صرف انہیں بے نقاب کرنے کے
لئے، ان برائیوں کو ختم کرنے کے لئے، نہ کہ انہیں گلے سے لگانے کے لئے
اور پھر منٹو خود بھی تو کہتا ہے کہ وہ خرافات نہیں خرافات کے بارے
میں لکھتا ہے۔ میں یہ بھی مانتا ہوں کہ جب کبوتر کبوتریوں کو دیکھ کر گٹکتے
ہیں اور گھوڑے گھوڑیوں کو دیکھ کر ہنہناتے ہیں۔ تو اگر مرد عورتوں کو دیکھ
کر غزلیں یا افسانے لکھتے ہیں تو اس میں مضائقہ ہی کیا ہے؟ یقیناً کوئی
مضائقہ نہیں۔ مگر صرف اسی ایک موضوع کو انسانیت کا محور قرار دے
دینا بھی تو مناسب نہیں ہے۔ تم مردوں اور عورتوں کے رشتے
استوار کرنے کی خواہش مند ہو یعنی آزاد فضا کی تلاش میں ہو۔ جہاں شب
وصل حلال اور شب فراق حرام قرار دی جائے ایسی آزاد فضا کو تو ہم ہزاروں
سال پیچھے فاصلوں میں چھوڑ آئے ہیں۔ ان فاصلوں میں جہاں ہمارے
جد امجد بنا عورت سے مل کر خود کو پاتا تھا۔ اگر صرف یہی مسائل انسانیت
اور زندگی کا محور ٹھہرتے ہیں تو ہمیں ان فاصلوں سے باہر آکر نئی دنیا
تلاش کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اور پھر ہمارے مذہب اسلام میں اچھا
چھوڑو اپنے مذہب کو نہ سہی تم اگر دیگر مذاہب کی طرف دیکھو تو وہاں
بھی شب وصل کو کچھ شرائط کے بعد ہی حلال مانا گیا ہے۔ میرے دوست ہمیں
جنسی مسائل کے علاوہ انسانیت کو درپیش دیگر بہت سے مسائل کے حل تلاش
کرنے چاہئیں۔"

کچھ دیر کے لئے ماحول نے سناٹے کی چادر اوڑھ لی تھی۔ یوسف
نے ایک لمحے کے لئے ندیم کی آنکھوں میں جھانکا۔ پھر ماحول کو زعفران
کرتے ہوئے بولا "تم تو مرنے کے بعد بھی اپنی آنکھیں لاتعداد عورتوں
کو تحفتاً دے جاؤ گے۔"

یوسف گھر کے اندر اور باہر کی تمام مخالفتوں کے باوجود انسانیت
کی کھوج میں پر خار راہوں پر چلتا رہا۔ حتیٰ کہ اس کی تحریروں نے وطن کی
سر زمین اس کے لئے بہت تنگ کر دی۔ اتنی تنگ کہ اس کی زندگی ایک
پینڈولم بن کر رہ گئی۔ گھر سے زنداں، زنداں سے گھر آخر وہ دن بھی
آگیا جو حاجراں کے لئے قیامت سے کم نہیں تھا۔ حالات نے یوسف کو وطن
چھوڑنے پر مجبور کیا۔ سالوں گزر گئے۔ وہ واپس نہ آسکا۔ لیکن ہر مہینے ماں
کو دو چٹھیاں ضرور لکھتا۔ جن میں دنیا جہان کے مظلوموں کا درد سمیٹے
ہوئے اس کی شاعری اور افسانے ہوتے۔ پچھلے کئی سالوں سے ممتا کی ماری
حاجراں انہیں چٹھیوں کے سہارے تو زندہ تھی۔ یوسف کی تلاش جانے
مکمل ہوئی یا نہیں لیکن اس نے دنیا والوں کو ادب برائے زندگی کے
بہترین نمونے پیش کئے۔

دو ہفتے پہلے حاجراں کو یوسف کے خط میں اس کا افسانہ "درد کی
سانسیں" ملا جس کا آخری جملہ یہ تھا "مرنے کے بعد میری آنکھیں اور دل
ایک مرکب کی شکل میں ایسے ایک ادل الاحد میں بانٹ دیئے جائیں جو
دیکھتے تو سب کچھ ہیں مگر سمجھتے کچھ نہیں۔"

"ماسی ---- او ماسی! تمہارا امریکہ سے فون آیا ہے۔" پڑوسی
کی لڑکی نے بالآخر حاجراں کو انتظار کی سولی سے نیچے اتار ہی دیا۔

"بسم اللہ ---- بسم اللہ" حاجراں کا دل خوشی سے بے قابو ہو کر
جو دھڑکا تو حلق میں آگیا۔ وہ جلدی سے اٹھی عجلت میں اس کی میز کے
ساتھ ٹھوکر لگ گئی۔ درد کی ہزاروں سوئیاں گھٹنے میں چبھ گئیں مگر

[باقی صفحہ ۲۷ پر دیکھئے]

ہ رکرتی ہے۔ اردو میں ہمعصر جدید کلاسیکی نظموں کو پڑھتے ہوئے یہ احساس تنگ کرتا رہا کہ انگریزی ترجموں کے ساتھ کم انصاف ہو سکا ہے اور ان کے شعری مزاج
نہ جاننے کے لیے انگریزی کا سہارا مناسب نہیں۔ اپنی محدود معلومات کے باوجود میں نے اس انتخاب کی حد میں، جو کہ اس باب میں ہی ہے، چنانچہ اس
میں معاصر شاعری پر بیش تر توجہ مرکوز ہے۔

معاصر نیپالی شاعری میں نثری نظم کا دور دورہ ہے۔ اور اس کا یہ خاص رنگ بھی اردو شاعری کے حوالے سے معنی خیز معلوم ہوا۔ معنی خیز اس طرح نہیں
دو شاعری میں نیپالی کی نظم شامل کی جائے یا شعوری طور پر اس کے اتباع کی کوشش کی جائے بلکہ ان نظموں کی اپنی خصوصیات کے حوالے سے یہ بات بھی ظاہر ہے
ں شاعری جنوبی ایشیا کی بڑی شعری روایتوں مثلاً ہندی، بنگالی، مراٹھی اور خود اردو سے ملتا نہیں کھاتی اور ان کے مقابلے میں بعض مرتبہ ایک
رمانہ سادگی کی حامل نظر آتی ہے۔ مگر اس سادگی میں جابجا پہاڑی اور تہ داری ہے اپنی زمین سے جڑے چھوٹے پن کا احساس ہے۔ اور اس میں حرارت
ن تقدیر پر طنز ہے۔ بے قراری ہے۔ بعض نظموں میں ایسی غیر متوقع کیفیات ہیں۔ جو ہمیں ٹکرائے اور بالواسطہ ترجمے میں بھی اپنا احساس دلا دیں گی۔
ن پرشاد مل اور بھوپی شیرچن کی نظمیں خاص طور پر تمام جنوبی ایشیا کے شاعروں میں نمایاں کر کے دیکھی جانے کی مستحق ہیں۔ اور ہم سے بہت کچھ کہتی ہیں۔ اس ماحد کی
نئا آواز کو ہم ان سنی کیسے کر سکتے ہیں۔ یہ آواز تو بہت پاس سے اٹھی ہے! ❀

[illegible] شاعری کا انتخاب

دنیش ادھیکاری

قومیت

[illegible] اور لنگوٹی چھین کر/ انھوں نے کہا:
[illegible] دولت سے بھی پیاری ہے'
[illegible] سے بھی مہنگی ہے
[illegible] جانتے؟
[illegible] ٹوپی اور قومی لباس کہاں ہیں؟
[illegible] میت ہی تمہاری اصل شناخت ہو سکتی ہے
[illegible] نے اس طرح سے کہا
[illegible] ب میں نے قومی جھنڈا مانگا
مجھے ننگا چھوڑ گئے
بدن کی ننگی مٹی تھامے
اس کے سوا میرے پاس بچا ہی کیا تھا؟
ان کی باتیں دہرا کر / دل کو بہلا رہا ہوں
[illegible] پیاری ہے' سب سے مہنگی!

کشمتو پرتاپ ادھیکاری

بھگوان جانے دھان بہادر اب کیا بن جائے گا۔

مکئی کی بوائی کے دن سے
ایسی جھڑی بندھی تھی کہ بارش تھمی نہیں
ساری دھرتی جل تھل کوئی انکوا نہیں پھوٹا
بیج بونے کے دن سے ایسا سوکھا پڑا
ہر چیز مٹ کر خاک ہوئی
دھان کی فصل برباد ہوئی
فصل کاٹنے کا موسم فصل کے بغیر گذر گیا
کار تک اب دور نہیں
پھر دشین کا مہینہ اور تیہار
تو پھر کیا!
اس سے پہلے بھی کئی بار ایسا ہوا ہے
دھان بہادر نے یہ تہوار نہیں منائے
اس سال بھی وہ یہ تہوار نہیں منائے گا
مکئی اور دھان زندہ رہنے کے لیے ہوتے ہیں
اگر کوئی بھوکا زندہ رہ سکتا ہے
تو پھر کہنے کے لیے کیا رہ جاتا ہے
دشین اور تیہار جشن منانے کے لیے ہوتے ہیں
اگر کوئی خوشی کے بغیر جشن منا سکتا ہے
تو پھر کہنے کے لیے کیا رہ جاتا ہے
مگر یوں بھوکا رہ کر زندہ رہنا / یہ سچ نہیں ہے
خوشی کے بغیر مسکرانے کا یہ جبر / یہ سچ نہیں ہے
جو سچ ہے وہ دھان بہادر کا خواب ہے——
یہ خواب کہ اس کے کھیت میں
دھان کی سنہری فصل جگمگائے
یہ خواب کہ بوائی کے موسم میں
فصل بوئے اور پکنے کے موسم میں کاٹے
دھان بہادر وہ سچ ہے
جو لاکھوں دھان بہادروں کی علامت ہے
کدال دھان بہادر سے ہار گیا/ ہل بھی ہار گیا
دھان بہادر کی ٹھنڈی انگیٹھی میں
کچھ نہیں سوائے موت کے
دھان بہادر کے خالی پیٹ میں
کچھ نہیں سوائے موت کے
دھان بہادر کچھ نہیں

سوائے موت کی زندہ یادگار کے
اپنی زمین کی کھدائی سے تو
وھاں بہادر کو کچھ ملا نہیں
بھگوان جانے اب وہ کیا کھو دے گا!
ہل چلانے والا بننے سے تو
وھاں بہادر کو کچھ ملا نہیں
بھگوان جانے اب وہ کیا بنے گا!

وتود اشرومالی

خاندانی منصوبہ بندی کے معجزے

کتنے سارے نامور بیٹے تھے
جن کو اس دھرتی نے پہلے جنم دیا
جنھوں نے جان کی بازی لگائی
اس دھرتی کے لیے عزت، شہرت کمائی
کتنے سارے نامور بیٹے
جنم لینے کو باقی تھے
کہ خاندانی منصوبہ بندی کا رواج ہوا
اور کتنی کامیابی کے ساتھ!

کرشن بھوشن بالا

چیت کی ہوائیں

چیت کا مہینہ ترائی میں آگیا ہے
ہوا، پگل مست کی طرح پھر رہی ہے
درختوں کے پتے نوچتی ہوئی
ان کو بھی گراتی ہوئی جو صدیوں سے
سر اٹھائے کھڑے ہیں،
مٹی کی خاک اڑاتی ہوئی، پھولوں کی خوش بو
ان جانے کدھر لے جاتی ہیں ہوا
تاریخ کی بہت سی کتابیں جو ہم پڑھتے ہیں
ایسی ہی ہواؤں کی تحریر ہیں
تاریخ کی بہت سے کتابیں جو ہم لکھتے ہیں
ایسی ہی ہواؤں کی تخلیق ہیں
خود پر اعتبار کر کے میں نے ایک گھر بنایا ہے
چاہے یہ ہوا ان گھروں کو ڈھا دے
جو صدیوں سے کھڑے ہیں،
ان آوازوں کو دبا دے جو کم زور ہیں
یہ ہوا چاہے تو سمندر کا پانی
آسمان تک اچھال دے
یہ ہوا چاہے تو بارش کا پانی
آسمان سے صاف کر دے
میں یہ کہے بنا کیسے رہ سکتا ہوں
کہ شاید یہ ہوا ان بادلوں کو اڑا دے
جو اس دیس پر منڈلا رہے ہیں
میں یہ کہے بنا کیسے رہ سکتا ہوں
کہ شاید یہ ہوا ان صفحوں کو پھاڑ دے
جن پر اس ملک کی احمقانہ تاریخ رقم ہے
قرنے کی طرح جو لوگوں کو پکارتا ہے
یہ ہوا انقلاب کی بانگ دے رہی ہے
سوکھے پتے سارے چمن اڑا رہی ہے
ایسا لگتا ہے کہ خوب منافع کمانے کے لیے
ٹھیکے داروں کے بنوائے ہوئے مکان
اب ڈھے جائیں گے
ایسا لگتا ہے کہ اب کوئی گھٹا
سورج کی کرنوں کو نہیں روکے گی
کہ لوگوں کے تن بدن کو چھو کر
انھیں ہوشیار کر دے
میرے گھر کے پرچم پر
اوم بنے پرچم پر ہم لکھا ہے
آج پرچم پھڑ پھڑا رہا ہے
میرے گھر کے سامنے پیپل کے پیڑ کے
کتنی آزادی سے تالیاں بجا رہے ہیں
ایسا لگتا ہے کہ ہوا
شانتی اور سچ کے راستے پر چل رہی ہے
ہوا شاید بے چین ہے
بہار کی آمد کے استقبال کے لیے
مگر کون جانے/ ہوا کا راستہ رک بھی …
اس سے پہلے کہ وہ اپنی منزل پر پہنچ جا…
اس ہوا کو
اپنی سمت جانے سے روکا بھی جا سکتا …
کون جانے
یہ ہوا پیپل کے درخت کو اکھاڑ بھی …
جس نے کتنے مسافروں کو چھاؤں پہنچائی
چیت کا مہینہ ترائی میں آگیا ہے
ہوا پگل مست کی طرح پھر رہی ہے
ہوشیار رہو لوگو ہوشیار
تم جو چولہے میں آگ جلا رہے ہو
اور تم کتنے کے سرپرلو/ جو زبردستی
سارے خاندان پر دھونس جمانے کے عا…
آگ سے ہوشیار رہو/ ہوا سے ہوشیار
خبردار!

مین بہادر بستا

اس طرح ایک قوم

اپنی زندگی کا ڈھونگ رچاتی…

یہ لمحہ پر چھا رہا ہے سرکار والا جاہ…

ابھرتا
، آگے / ہولا گری کے کہسار
یں ننگی آنکھ سے دیکھ سکتے ہیں
یال میں دوربین کی ضرورت
ے گی، حضور!
، تین ستارہ ہوٹل کھولنا چاہتے ہیں،
لا تبار!
م کو کچھ قرض عنایت کر دیں گے؟
الا تبار
، ہے، اور وہ گندا گی،
والا، ہاں، وہ نیل رنگ دریا کرتالی ہے
نے اخباروں میں پڑھا ہوگا
ال کے دریا بکاؤ ہیں
درست نہیں ہے حضور
م نے تو اپنے علاقوں کے نام
ریاؤں کے نام پر رکھ دیے ہیں
منصوبہ ہے کہ ان سے بجلی حاصل
گے
ہم کو کچھ قرض عنایت کر دیں گے؟
نندو کی وادی ہے، سرکار والا تبار!
مطلب ہے، ہمارا دارالحکومت
میں تین شہر ہیں——
ندو، للت پور اور بھکتا پور
کا براست ملبے
ا ہے تو ناک پر رومال رکھ لیجیے
ی ہے کہ ہم ابھی تک گندی نالیاں
عوامی بیت الخلاء نہیں بنا پائے
اگلے پانچ سالہ منصوبے میں / ہم یقینی طور پر

شہر کو صاف رکھو پروگرام شروع کر دیں گے
آپ ہم کو کچھ قرض عنایت کر دیں گے
سرکار والا تبار؟

ونسرا گری

ناجائز رشتے

بے یقینی اور پریشاں حیالی کے درمیان دو لخت
میرا بیٹا ہملٹ بن جائے
کہ ہونے اور نہ ہونے کی الجھن میں
گرفتار رہے
وہ تلوار اٹھا کر بھی
جس پر غم نے دھار رکھی ہو
جس کی نوک زہر کے پیالے میں ڈبوئے
اور پھر میری گردن میں اتارے
مجھے تڑپتے، پھڑکتے موت کے گھاٹ اترتے
دیکھتا رہے
اس لیے کہ مجھے اعتراف ہے،
میں زن فاحشہ ہوں
اس عہد سے میرے ناجائز رشتے استوار تھے
اس عہد سے میرے ناجائز رشتے استوار تھے

رمیش طوفان

اعتراف

اگر میرے قدموں کی کوئی منزل نہیں
ان کا مقصد خالی سڑکوں کو ناپنا ہے
تو پھر مجھے ان دو ٹانگوں کی کیا ضرورت؟
اگر میری آنکھوں کا مقصد خالی یہ دیکھنا ہے
بھوک، درد، بیماری، افلاس
تو پھر مجھے ان دو آنکھوں کی کیا ضرورت؟

ونود ستیال

جمہوری بغاوت، ۱۹۹۰ء

یہ ہمارے لہو کا پہلا فشار ہے
ذہن کے گھور اندھیرے کے
خلاف ہماری پہلی نفرت
پہلی کوشش کہ پاش پاش کر دیں
ایک سڑی گلی بے ترتیبی کے منصوبے
ہمارے لیے پہلا موقع
کہ ستاروں کی جھلک دیکھ سکیں
جو چمک رہے ہیں / کہ ان سے بن جائے
ایک آسمان تازہ کی نئی تاریخ

چاندنی شاہ

ماں کی طرح جینے کی کوشش کر کے دیکھو

جینے کی کوشش کر کے دیکھو
دوسروں کے آنسوؤں اور
مسکراہٹوں میں شریک ہو کر
مشفق ماں کی طرح
جینے کی کوشش کر کے دیکھو
اپنی ذات سے بلند ہو کر
دوسروں کے دکھ درد کی فکر کرتے ہوئے
اپنی ماں کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھو

اس کے آنسوؤں کے پیچھے چھپے جذبے کو پہچانو
اپنی ماں کے دل کو محسوس کر کے دیکھو
اولاد کے لیے اس کے دل میں کیا ہے
جینے کی کوشش کر کے دیکھو
دوسروں کے لیے قربانی دیتے ہوئے
دھرتی کی طرح
جینے کی کوشش کر کے دیکھو
دوسروں کو گرمی پہنچاتے ہوئے
آگ کی طرح
محبت کی چادر پھیلا دو
سارے آسمان کو ڈھک دو
اور محسوس کر کے دیکھو کہ زندگی کیا ہے
محبت کی چادر پھیلا دو
ہوا کی ساری سلطنت کو ڈھک دو
اور محسوس کر کے دیکھو کہ زندگی کیا ہے

لشکر لوہانی

آگنا

ے ہوئے بیج میں زندگی نمو پا رہی ہے
ہوئی جڑوں نے گملے کو گھیر لیا ہے
جو گملے کے لیے زیادہ ہے' ایسا لگتا ہے
ابھار کو دیکھ کر۔ گملے میں پھولتے ہوئے
نفس سامنے کی بات کہتا ہے ——
ں کا کچا سطح تک پہنچنے کے لئے بے تاب ہے

شیلندر ساکار

شہر-۱

آسمان کے نیچے
جو کتابت کے ورق کی طرح گلا ہے
حروف الٹے سیدھے/ مسطر میلا'
میں آئینوں کے اس شہر میں
برہنہ تن گھوم رہا ہوں۔
کہ اپنا نام صاف طور پر پڑھ لوں
قلم کے پرانے گھاؤ کی طرح
چاند بار بار کوشش کر رہا ہے
کہ اپنی جھریوں بھری کھال چھپا لے
سڑک کی روشنی کے قریب
ردی اخباروں کی/ خالی جگہوں کے اندر
میں اپنا ٹکڑا سر/ اٹھا کر کے بتاتا ہوں
اور ساری رات/ اس شہر میں
گھومتا پھرتا ہوں

شہر-۲

پاگل ہاتھی شہر میں گھوم رہا ہے
شہری اپنی پسند کے پھول کا نام/ نہیں بتا سکتا
اپنی پسند کے گیت کی دھن/ نہیں گنگنا سکتا
سر نہیں اٹھا سکتا/ کہ آسمان کو دیکھ لے
وہ یوں ہی بڑبڑا رہا ہے
ڈر کے مارے کانپ رہا ہے
وہ بتا نہیں سکتا/ کہ اس نے شہر میں کیا دیکھا'
اس شہر میں کیا دیکھا
ورنہ اس پر امن میں رخنہ ڈالنے کا
الزام آجائے گا
پاگل ہاتھی شہر میں گھوم رہا ہے

سرکاری افسر

اس کی آواز بن گئی ہے
اطلاعی گھنٹیوں کی تعمیل
اس کی انگلیاں سیدھی ہیں
قلم کے بے جان دستے کی طرح
اس کی زبان پھیلتی ہے/ سیاہی چوس کی ط
سولی پر ٹنگے یسوع کی طرح
اس کا نام دفتر کی دیواروں پر
کیلوں سے ٹنگا ہوا ہے
اس طرح تھک ہار کر/ وہ ایک دن گھبرا گیا
اور اپنے بدن کی سرحدوں کے اندر
سکھ دربار کی چھتوں کی طرح
بے یار و مددگار
ایک آہ کیے بغیر پھٹ گیا

گوپال پرشاد رمل

ایسا دن آتا ہے

ایسا دن آتا ہے بس صدیوں میں ایک مرتبہ
انقلاب لے کر آتا ہے
ہر چیز تہہ و بالا ہو جاتی ہے
گونگے اور عاجز بولنے لگتے ہیں
دکھ سہنے والوں کے ہونٹ ہلنے لگتے ہیں
جن کے بارے میں سوچا تھا کہ
چپ چاپ سہتے رہیں گے
وہ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں
جن کے بارے میں سوچا تھا کہ بھاگ گئے ہیں
وہ لوٹ آتے ہیں
جن کے بارے میں سوچا تھا کہ سوتے رہیں گے
وہ چلنے لگتے ہیں
جن کے بارے میں سوچا تھا کہ [illegible] کی طرح

ان اٹھ کھڑے ہوتے ہیں
نا داکھ لو دینے لگے گی'
یدار ہو گا
ں بہادر بن جائیں گے
ں کی لہرا ٹھے گی
ر قیامت ہو گا
سامنے آنے لگیں گے
، آتا ہے بس صدیوں میں ایک مرتبہ

پورن بہادر ویدیہ

شمع کی نظم

ں ایک شمع/ خالی کمرے میں اکیلی
ھر جلتی رہی/ صبح ہونے تک پگھل کر
خاموش یاد بن گئی
دن سورج/ دروازہ اس کمرے میں آیا
ے لے بس موم کے چند قطرے
ں کے لیے یوں چھوڑ دیے گئے
قربان گاہ پر شہیدوں کا خون
خاموش سوگ میں
. کر وہ اپنے ہونٹ ثبت کر دیتا ہے
جگہ کل رات تک
ہی تھی ننھی سی ایک شمع

بدھ سایائی

میں

لون سے کوٹ سلور پر تھی
ا یہاں لٹکا دیا گیا ہے
ے میں/ اس بات کا اشارہ ہیں

کہ کسی کو یہاں لٹکا دیا گیا
پھر یہیں دفن کر دیا گیا

کندن شرما

آزادی

مجھے آزادی چاہیے.....
اس دیوار سے آزادی
اس گلی سے آزادی
اس گھر سے آزادی
سارے رشتے ناتوں سے آزادی
آزادی اپنے چاروں طرف کی ہر ایک چیز سے
آج یوں لگ رہا ہے
جیسے مجھے ہر چیز سے
آزادی چاہیے
اپنے آپ سے بھی آزادی

شاردا شرما

کیفیت

کل تک
آسمان کی کوئی حد نظر نہیں آتی تھی
اور اپنی حماقت میں
میں ایسا ہی سمجھتی تھی
آج اچانک ایسا لگا
آسمان دھیرے دھیرے سکڑ رہا ہے
تنگ سے تنگ ہوا جا رہا ہے
اے لو، وہ اب سمٹ کر
ایک نقطے کے برابر رہ گیا
خدا کا شکر ہے

کہ اب مجھے چیزوں کے قد و پیمائش پر
اعتبار نہیں رہا
اور آسمان پر تو ذرا بھی نہیں

نکل سلوال

کھیل جاری ہے

چڑیاں دانے چگ لیتی ہیں
جو آنگن میں سوکھنے کے لیے پھیلائے گئے تھے
بندر فصل کھا جاتے ہیں جو کٹنے کے لیے تیار تھی
گلہریوں کا نشانہ
درختوں پر لگے اخروٹ ہیں
اور کووں کا نشانہ
پھوٹتی ہوئی کونپل
اور جب آسمان پر چیل منڈلانے لگتی ہے
تو کسان کانپ اٹھتے ہیں، دعا مانگتے ہیں
ایسے واقعات دہرائے گئے ہیں
نہ جانے کتنی بار میرے گاؤں میں
پھر بھی کھیل جاری ہے

ٹویا گرنگ

نیا سال

نیا سال/ ہر سال چلا آتا ہے
آوارہ کتے کی طرح-----
نافرمان اور سوکھا مارا/ حالانکہ اس کی عادت ہے
کوڑے کے ہر ڈھیر پر سونگھتا، ٹہلتا رہتا ہے
اور دم دبائے، دانت نکالے
ایک ایک دروازے پر جاتا ہے
عدالت کا طلب نامہ اٹھائے ہوئے

بیم کمل

شہر اور گاؤں

اگر شہر پھلے پھولے گا
تو گاؤں بھی پھلے پھولے گا
یوں کہتے ہیں شہر کے لوگ
اگر اس سال بارش ہو گی
تو گاؤں بھی پھلے پھولے گا
یوں کہتے ہیں گاؤں کے لوگ
شہر کا ایک آدمی / سڑک پر گاڑی روک کر
گاؤں والے سے پوچھتا ہے
اس سال فصل کیسی ہے؟
گاؤں والا آگے آکر کہتا ہے
فصل تو اچھی ہے / مگر یہ بتاؤ
ہمارے پیٹ سے
تمہاری گاڑی کی ٹنکی بھر سکتی ہے؟

راجیو

تحریک

چاروں طرف آنکھیں
جو برداشت نہیں ہونے دیتیں
پھر بھی میں نے کلائی سے گھڑی اتار دی
اور وقت کو ننگا کر دیا
دس بجے ــــ بارہ بجے ــــ
سات بجے ــــ ایک بجے ــــ
بھاگو ــــ پولیس ــــ جیسا کہو ــــ جیسے ــــ
میرے سامنے برہنہ پڑے ہیں
گھڑی کی سوئیوں کے سارے تہوار
میں نے سب پر تھوک دیا ہے

جینجو شرما

روایت

برسوں سے
ایک تصویر میرے کمرے میں ٹنگی ہے
دیمک کی کھائی ہوئی
اپنے اصل سے
مشابہت بھی گم کر چکی ہے یہ تصویر
جسے فخر سے اسے دیوار پر لٹکایا تھا
میری ماں نے
اور نانی اماں اس کی پوجا کرتی رہی ہیں
آج میری آنکھیں اسے برداشت نہیں کر سکتی ہیں
برداشت ہی نہیں کر سکتی ہیں

ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے
چاہے وہ ایمان ہی کیوں نہ ہو
وقت آگیا ہے / کہ میں اس تصویر پر
آگ کا رنگ پھیر دوں / جلتی ہوئی تیلی لے کر
اور اسے راکھ ہو جانے دوں

وشواوی موہن سر-سمہا

فرار

ہر ایک شخص کو معلوم ہے / میدان جنگ میں
یا جیت ہوتی ہے / یا شکست
جب میں اپنے لیے بے انتہا آسائشیں ڈھونڈتا ہوں
قاسٹ حکمراں کی طرح
تو میرا ضمیر مجھے روک دیتا ہے / اور کہتا ہے
دیکھو / ناانصافی ہر طرف سر اٹھا رہی ہے
سازشیں پل رہی ہیں
انصاف کے جوا کے خلاف
ایسے وقت میں
شاعر کو فقط اپنے منصب اور شہرت کی فکر!
تم بھلا اس گھڑی کے تلخ تجربے سے
کیسے فرار پا سکتے ہو
جب لوگ چاروں طرف درد اور بھوک سے
کراہ رہے ہوں؟

شیامل

رنگ

سیاہ ہے رنگ / ظلم اور ناانصافی کا لوگ کہتے ہیں
اور نیلا ہے رنگ امن کا
سرخ رنگ، آگ کی طرح دہکتا ہوا
تبدیلی اور انقلاب کا
اور زرد ہے قربانی کا رنگ
میرے دیس کے مورکھ لوگو
تمہارے رنگوں کی زبان میری سمجھ میں نہیں آئی
بالکل نہیں آئی
اس شہر سیاہ کی زرد روشنیوں میں چلتے پھرتے
کتنے بہت سے لوگ
امن کے اس جنور کی طرف کھنچے آتے ہیں
مجھے کوئی بتاؤ / ان کی زیست کا رنگ کیا ہے؟
ان کی بھوک کا رنگ کیا ہے؟
یہاں کے انتشار اور لاقانونیت کا رنگ کیا ہے؟

شیلندر کمار سنگھ

بھوسا ساگر

اس قوم کی جنم پتری کہتی ہے

ل کچھ بھی ہو سکتا ہے ——
ی مثل کی تو تم ہر لوٹے بھی کر سکتے ہیں
ی ہو سکتا ہے کہ
وپ دولت ہے —
ں کی فصل غیر متوقع طور پر اچھی ہو سکتی ہے
تا ہے کہ سوکھا پڑے اور کال ہو
ل ہماری ہاکی ٹیم میں کامیاب ہو سکتے ہیں
ں سے کہیں زیادہ ووٹ لے کر
ن کی حفاظت ہی خطرہ ہو جائے
ل سماج دشمن عناصر سرگرم ہو سکتے ہیں
کتا ہے ان کا سر ہی کچل دیا جائے
ل کچھ بھی ہو سکتا ہے /
. طے ہے
جیسا کہ کال ہو یا فصل عمدہ
ہماری ہاکی ٹیم جیتیں یا ہار جائیں
طے ہے
سال بھر سا سار
چاپ نہیں بیٹھا رہے گا
یہ آپ کے سوچنے پر ہے
کیا کرے گا
کا اندازہ سو فی صد درست بھی ہو سکتا ہے
فی صد غلط
ایک بات طے ہے ——
سال بھر سا سار چپ چاپ
نہیں بیٹھا رہے گا!
سال بھر سا سار چپ چاپ
نہیں بیٹھا رہے گا!

استحصال کا شکار ہونے والے ایک طبقے کا نام ہے جو صرف ان لوگوں کی خدمت کرتے ہیں

جیون اچاریہ

قیمت

کل تک / مجھے اپنے پرکھوں پر فخر تھا
کہ اپنے لہو سے
میرے دیس کی سرحدوں کو نشان زد کیا
اس کی ثقافت کی حفاظت کی خاطر
آج / میں اپنا خون بیچنے پر مجبور ہوں
محض زندہ رہنے کے لیے!

ول کوٹرالا

کتے

کتے وفادار ہوتے ہیں' بہت وفادار
اپنے مالک کے حکم کے بغیر کاٹنے نہیں دوڑتے
ان دنوں اچانک ہی بڑھ گئی ہے
میرے دیس میں کتوں کی تعداد
ہر جگہ نظر آتے ہیں یہ کتے
گلیوں میں دفتروں میں
گھروں میں گاؤں میں
بھونکتے ہوئے یا دم ہلاتے ہوئے
یا جو بھی ان کے مالک کی مرضی ہو
مالک کا جو جی چاہے ان کے ساتھ سلوک کرے
وہ ان پر مہربان ہو سکتا ہے
جب تک وہ اس کی خدمت کریں
وہ ان پر قہر برسا سکتا ہے
جب اس کی خدمت سے منہ موڑیں

جو کتوں کو انسانوں پر ترجیح دیں
بے شرم ہیں یہ کتے
اور دشمنوں کی آگ میں لگے ہوئے ہیں
ان کے دانت زہریلے ہیں
اور ..جھنجھوڑ کھانے کو ہر وقت تیار

سیتا پانڈے

دفتری زندگی

احکام وصول کرو
کچھ ڈاک میں ڈالو
فائل آگے بڑھاؤ ——
یہ ہماری زندگی / یکسانیت کے بھنور میں گرفتار
حسن سے عاری!

گیانو واکر پوڈیل

یہاں زندہ رہنا مشکل ہے

زندگی فٹ بال کا میدان نہیں
نہ محبت فٹ بال کا کھیل ہے' جناب
یہ شہر تو بااختیار مجرموں کا مسکن بن گیا ہے
اب یہاں زندہ رہنا بہت مشکل ہے جناب

بشکریہ مستقبل
پہلی سہ ماہی ۱۹۹۴ء
اسلام آباد ۔ پاکستان

...ماہرِ نفسیات کے مطابق ترین اور سب سے زیادہ کتے ایسے بھی ہوتے ہیں

فلسفۂ زوال

نہ ہو افسردہ خاطر انقلابِ بزمِ امکاں سے
یہاں صحرا ہمیشہ بنتے آئے ہیں گلستاں سے
فنا ہے ایک عالم کی، نمودِ عالمِ دیگر
بنائے قصر ہے گویا جمی خاکِ بیاباں سے
چمن کی آبِ شو رنگت میں آنسو ستاروں کے
نمو لالہ و گل ہے سرشکِ ابرِ باراں سے
زوال اک باطنی تمہید ہے آئینِ رفعت کی
حدوثِ شام ہم آغوش ہے صبحِ درخشاں سے
غمِ واماندگی کو فرصتِ آرام ملتی ہے
فضا پھر گونجتی ہے کاروانِ خفتہ ساماں سے
خطِ ہستی پہ چلنا، نقطۂ آخر سے لوٹ آنا
یہ جادہ رات دن پُرشکوہ ہے رفتارِ انساں سے

زوال اک ساعتِ تدریج ہے معیارِ بلندی کی
نہ ہو پستی تو پھر تیشہ زنی کیوں کر بلندی کی

[نگارِ امروز، جولائی ۱۹۴۷]

سیماب اکبرآبادی

مدیر
افتخار امام صدیقی

معاون
ناظر نعمان صدیقی

قیمت ۶ روپے

زرِ سالانہ ۶۰ روپے
لائبریریوں سے ۷۵ روپے

ناظرِ خصوصی ۱۰۰۰ روپے
معاونین سے ۱۰۰ روپے
ممالکِ غیر سے
۲۵ ڈالر — ۱۵ پونڈ

دے کمال کا مزا

ہاں، قدرتی خوبیوں سے
بھرپور تھوڑا سا رُوح افزا
آپ کے کنبہ بھر کی پسندیدہ
تازگی غذاؤں کے مزے کو
کئی گنا بڑھا دیتا ہے۔

۲۵ قدرتی عناصر اور
جڑی بوٹیوں سے بنا ہوا
رُوح افزا نانا نانی،
دادا دادی اور پوتا پوتی
سب کا خاص پسند
شربت ہے۔

شربت رُوح افزا

ہمدرد

"میری پیاری نانی
جب پلائے پانی
ملائے اِس میں ــــــ کیا؟
تازگی بھرا رُوح افزا!

ہم پئیں اِسے ملک شیک میں،
نیبو پانی میں،
سوڈا میں،

اور لسی میں بھی!

"بات ہے بالکل سچی بابا
بات ہے بالکل سچی!"

دے کمال کا مزا

شربت رُوح افزا

ہاں، قدرتی خوبیوں سے
بھرپور تھوڑا سا رُوح افزا
آپ کے کنبے کی پسندیدہ
۲۵ قدرتی عناصر اور
جڑی بوٹیوں سے بنا

ہمدرد

... ہے۔ ان کا جواب ہمارے پاس یہی ہوگا کہ CONTROL سے عاری ہو کر رہ جاتا۔ اسی طرح نقد تاثراتی اساس تنقید کے علاوہ کوئی نیا تنقیدی نقطۂ نظر یا رجحان نہیں ہے۔ کیونکہ تاثراتی اساس تنقید پر تیسری نقطۂ نظر کا حصہ ہے۔ مگر اسے رد تعبیری تنقید سے علاحدہ کر لیا جائے تو رد تعبیر میں کچھ باقی نہیں رہتا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تنقیدی عمل ہے کیا؟ اسلوبیاتی تنقید ہے کہ مابعد ساختیاتی نقطۂ نظر کے مختلف رویوں کے ساتھ اردو تنقید میں تیزی اور شدت سے تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ انہوں نے ادب کے تفہیمی رویوں میں خیالات کا انتشار پیدا کر دیا ہے۔ اردو تنقید میں اس نے ایک شدت اختیار کی۔ کرسیاں بچھنے کے دعوے کا سلسلہ ہونے لگا۔ اور مختلف ناقدین اور ادیب کے قارئین الجھ کر رہ گئے۔ انہوں نے اس جانب نہیں دیکھا کہ یہ رویے ہمارے اپنے ادبی سیاق میں کتنے کارآمد ہیں۔ بنے بنائے نقطۂ نظر سے فائدہ اٹھانا بہت ضروری ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر چیز کو حرف آخر مان لیں۔ ہماری تنقید میں ہو رہا ہے کہ جب نفسیاتی تنقید آئی تو ایسا محسوس ہوا کہ اس کے آگے کچھ نہیں ہے۔ اسلوبیات، ساختیات، رد تعبیر، مابعد ساختیاتی رویوں کے ساتھ بھی یہی ہو رہا ہے۔

تنقید کا تعلق ادبی تخلیق سے ہے۔ اور ادبی تخلیق کا تعلق فکر، جذبے، مشاہدے، احساس، تجربے، اور جمالیاتی اظہار پر قدرت سے ہے۔ یہ تمام چیزیں تبدیل ہوتی رہتی ہیں، اور تبدیلیاں ہوتی رہیں گی۔ اس کے لئے نقاد کے ذہن کو سب سے زیادہ کھلا رہنا چاہئے۔ اور اس میں رد و قبول کی بے زیادہ صلاحیت ہونی چاہئے۔ اگر نقاد خشک پتے کی طرح ہوا کے رخ پر اڑنے لگے تو ادبی تفہیم بے سمتی کا شکار ہو کر رہ جائے گی اور تخلیق کثرت تعبیر سے پراگندہ۔ ❁

◆ بقیہ صفحہ ۱۵ کہت خوابی ◆

اس لئے سپنا پورا ہونے میں ذرہ بھر دیر نہیں لگتی۔

کسی فلمی رسالے کی کہانی کی طرح ایک دوسری شہزادی آن ٹپکتی ہے، اور وہ آناً فاناً پہلی محبت کو بھول جاتا ہے اور نئی شہزادی سے دل لگا لیتا ہے۔ کہانیوں میں شاید یہ بات ممکن نہ ہو، مگر خوابوں میں اکثر ایسا ہوتا ہے۔ اس نے بھی یہی سوچا تھا۔ کہ وہ محض ایک سہانا سپنا تھا۔ اس لئے آنکھیں موندے رہنے میں کوئی حرج نہ تھا۔ مگر پھر کسی سستے ناول کی طرح اسے شہزادی سے بے انتہا محبت ہو جاتی ہے، جتنی شاید پریوں کو کسی سے بھی نہ ہوئی ہوگی، اور اسے یقین آجاتا ہے کہ اس کی محبت کا انجام وہ ہوگا، جو کہانیوں میں نہیں ہوا کرتا۔

پھر کسی تھرڈ کلاس فلم کی طرح وہ اپنے باپ کو جسے وہ بالکل بھلا چکا تھا، ایک خط لکھتا ہے، اور شہزادی کے ساتھ اپنی محبت کا اقرار کرتا ہے۔ مگر نتیجہ وہ نہیں نکلتا، جو فلموں میں نکلا کرتا ہے، بلکہ صرف خوابوں میں نکل سکتا ہے۔ باپ اسے فوراً شہزادی کے ساتھ شادی کر لینے کو کہتا ہے، مگر جب تک وہ ایسا نہیں کرتا، باپ اپنی آنکھیں بند نہیں کر سکتا وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ اس کی بوڑھی ہڈیاں آرام کرنا چاہتی ہیں۔

کسی بچی کہانی کی طرح بیٹے کو یقین ہو جاتا ہے کہ باپ کی نصیحت پر اس کی زندگی میں عمل کرنے کی مہلت بہت تھوڑی رہ گئی ہے۔ شادی کی خبر ملتے ہی باپ آشیرباد بھیجتا ہے، مگر ساتھ ہی کسی سستی فلمی کہانی کی طرح رو دھو کر اس کے بارے میں پوچھتا ہے۔

کسی سہانے سپنے کی طرح بیٹے کو ملازمت مل جاتی ہے بیٹا باپ کو یہ خبر بھیجتا ہے اور اپنی شادی کی تصویریں لفافے میں ڈال دیتا ہے۔ باپ کو بیٹے کا خط پہنچنے کی خبر ملتی ہے اور وہ اگلے روز رجسٹری کو وصول کرنے کے لئے ڈاک خانے میں جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ مگر کسی تھرڈ کلاس فلم کی طرح وہ اسی رات دل کا دورہ پڑنے سے مر جاتا ہے۔ یہ اس سال کی آخری رات تھی۔ نئے سال کی پہلی تاریخ سے بیٹے کی ملازمت کا آغاز ہونا تھا۔

حقیقی زندگی میں اور کہانیوں میں اتفاقات اتنے تواتر سے نہیں ہوتے خوابوں کی بات دوسری ہے۔ ❁

ذہن کتاب اور شاعر سے رابطے کے لئے نیا تبدیل شدہ ٹیلی فون نمبر نوٹ کر لیجئے —— ۳۸۲۹۹۰۴

منیر الدین احمد
DEUTSCHES ORIENT INSTITUTE
MITTELWEG 150
2000 HAMBURG 13. GERMANY

کہانخوابی

اگر یہ عنوان آپ کو اوپرا لگتا ہے، تو کچھ عجب نہیں، کیونکہ اردو لغات میں ایسا لفظ سرے سے پایا ہی نہیں جاتا۔ دو منٹ پہلے تک میں بھی اسے نہیں جانتا تھا، کیونکہ اس وقت تک میں نے اُسے ایجاد نہیں کیا تھا۔ اس کی دراصل ضرورت اس وجہ سے پیش آئی، کہ یہ کہانی، جو میں آپ کو سنانے لگا ہوں، شاید کہانی نہیں ہے۔ بلکہ ایک خواب ہے۔

مگر مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے یہ خواب کب دیکھا تھا، دیکھا بھی تھا یا نہیں۔ شاید خواب کو کسی اور نے دیکھا تھا اور مجھے سنایا تھا۔ پھر میں سمجھنے لگا کہ میں نے خود دیکھا تھا۔ چونکہ بات بہت پرانی ہو چکی ہے، اس لئے تحقیق کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

یقیناً وہ شخص، جس نے مجھے یہ خواب سنایا تھا، اب زندہ نہیں ہے اور اگر وہ بقید حیات ہے۔ تو بے حد معمر ہو چکا ہو گا اور یہ بات اس کے حافظے سے نکل چکی ہو گی کہ اس نے کوئی خواب دیکھا تھا اور یہ کہ اس نے وہ خواب مجھے سنایا تھا۔ بلکہ وہ تو مجھے بھی بھول چکا ہو گا۔ اگر آج اتفاقاً میرا اس سے آمنا سامنا ہو جائے، تو وہ مجھے پہچان بھی نہیں پائے گا۔ میں بھی وثوق کے ساتھ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں اُسے شناخت کر سکوں گا۔ لوگوں کے چہروں کے نقوش اس طرح دنوں کے اندر اندر میرے حافظے کی لوح سے مٹ جاتے ہیں، جیسے کسی نے سلیٹ پر گیلا کپڑا پھیر دیا ہو۔ ڈرتا ہوں کہ چند روز تک آئینہ نہ دیکھوں، تو خود اپنی شکل و صورت کو بھلا بیٹھوں۔ اسی وجہ سے دن میں دو چار بار آئینہ دیکھنا میرے روزمرہ کے معمول میں شامل ہے۔ مگر اس سے یہ نتیجہ نہ نکال لیجئے گا کہ میرا حافظہ عام طور سے کمزور ہے، نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ میرے حافظے میں ایسی ایسی باتیں بھی محفوظ ہیں، جن کو میرے سنگی ساتھی کب کا فراموش کر چکے ہیں۔ بلکہ مجھے ایسی باتیں بھی یاد ہیں، جو [illegible] میں آنا شک و شبہ کی نظر سے دیکھا جا سکتا ہے۔

اب اس خواب کو ہی لیجئے جو شاید ایک کہانی ہے۔ کبھی آپ نے یہ بھی سنا ہے کہ جس روز باپ چالیس برس کی ملازمت سے ریٹائر ہوتا ہے، عین اسی روز بیٹے کو نوکری کا پروانہ ملتا ہے۔ باپ بے حد خوش ہے، اور ہر کسی کو بتاتا پھرتا ہے کہ ایسی خوش قسمتی اس کے حصے میں آئی تھی۔ زندگی میں اور کہانی میں تو یوں ہونا چاہیے کہ بیٹا شکر کرتے ہوئے نوکری قبول کر لے۔ دو چار برسوں میں اس کی شادی ہو جائے، اور باپ اپنے مرنے سے پہلے پوتوں اور پوتیوں کو کھلائے، ان کو گود میں لئے لئے پھرے۔ ان جیسی توتلی زبان بولے، اور پھر ایک روز لمبی تان کر سو جائے۔

مگر خوابوں کی طرح فلم اُلٹ جاتی ہے۔ بیٹا نوکری کی پیشکش پر لات مار کر ایک تعلیمی وظیفہ قبول کر لیتا ہے۔ اگرچہ کورس اس کی پسند کا نہیں ہے اور تعلیم کے خاتمے پر اسے ایک ایسا کیریئر اختیار کرنا پڑے گا، جس میں اُسے ذاتی طور پر کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ مگر نوکری کے مقابلے میں وہ ہر دوسری زندگی کو جس کا تعلق کسی نوع سے تعلیم کے ساتھ ہو، ترجیح دینے کا ارادہ رکھتا ہے۔

اب زندگی میں اور کہانی میں تو یوں ہونا چاہیے کہ باپ اپنی قسمت پہ روتا دھوتا پنشن لے کر ایک طرف ہو کر بیٹھ جائے۔ مگر خواب میں اس کو ملازمت کی توسیع مل جاتی ہے اور پورے پانچ برسوں تک اس کی نوکری قائم رہتی ہے۔ بیٹا اس عرصے میں تعلیمی مراحل کو طے کرتا ہے اور یونیورسٹی کی ڈگری لینے کے بعد ایک اسکول میں مدرسی کیلئے درخواست دیتا ہے۔ ادھر بیٹے کا تقرر ہوا اس طرح کہانی کی طرح اس کی تقرری کا پروانہ آتا ہے، [illegible] بیٹے کو عین اسی روز [illegible] بیٹے کو ہدایت کی جاتی ہے، اسی روز سے باپ کی

[illegible] طور پر شروع ہی ہو رہی ہوتی ہے۔ باپ کو پھر ایک بار اپنی خوش قسمتی والی بات یاد آجاتی ہے، اور وہ ہر کسی کو بتاتا پھرتا ہے کہ اس کے بیٹے کی نوکری اس روز سے لگ رہی تھی، جس روز اس کی ملازمت کی مدت ختم ہو رہی تھی۔

اب زندگی میں اور کہانی میں تو یوں ہونا چاہیے کہ بیٹے کو مدرسی راس آجائے اور وہ اپنی تعلیمی قابلیت بڑھانے کی خاطر تدریس کی ڈگری حاصل کرے، پھر دو چار دیہاتی مدرسوں میں دھکے کھانے کے بعد کسی چھوٹے موٹے اسکول میں ہیڈ ماسٹر لگ جائے اور اپنی عمر کو اس پیشے کی نذر کر دے۔

مگر کسی ٹوٹے ہوئے خواب کی طرح بیٹے کی مدرسی کا کیریئر شروع ہوتے ہی ختم ہو جاتا ہے، کسی آبلے کی مانند، جو بلا وجہ ٹوٹ جائے۔ خوابوں میں زندگی کی طرح ہر چیز ممکن ہے، صرف کہانیوں میں تسلسل کا ہونا اور منطقی نتیجے کا نکلنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ کہانی میں بیٹے کو شادی کرنی چاہیے' اس لڑکی کے ساتھ جسے ماں باپ نے ایک عرصے سے اس کے لئے چن رکھا ہے، مگر ایسا نہیں ہوتا، تو کیا اس کی شادی اس لڑکی کے ساتھ ہوتی ہے جو اچانک کہیں سے آن ٹپکتی ہے۔ اور وہ اُسے اپنی محبت کا یقین دلاتی ہے۔ کسی چھوٹے خواب کی طرح بیٹا پھر ایک بار تعلیمی ادارے میں پہنچ جاتا ہے، اور اپنی تعلیم کی تکمیل میں لگ جاتا ہے۔ باپ اس عرصے میں پنشن لے کر روکھی سوکھی کھا کر اپنی زندگی کے دن گزارتا ہے۔ اور جان لیتا ہے کہ اس کی خوش قسمتی کا ستارہ اب طلوع نہ ہوگا۔

پھر کسی دیومالائی کہانی کی مانند بیٹا اڑ کر جادو کی دنیا میں پہنچ جاتا ہے، جہاں پہ ہر طرف خوابوں کی مانند سونے اور چاندی کے ڈھیر لگے ہوتے ہیں، اس کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ وہ جس طرف نظر اٹھا کر دیکھتا ہے، ادھر ہیروں کی کانوں کی قطاریں اڑتی پھر رہی ہیں۔ اُسے لگتا ہے کہ وہ اپنی دنیا کو چھوڑ کر آسمانی جنت میں آ پہنچا تھا جہاں پہ ہر چیز مختلف تھی اور ہر قانون دوسرا تھا۔ اس کی دنیا میں پابندیاں تھیں، اجارہ داریاں تھیں اور قیود و حدود کا [illegible] تھا۔ اس آسمانی جنت میں آدم ہی نیا تھا۔ قانون شکنی وہاں پہ نہ پایا جاتا تھا۔ انسان اگر اڑنا چاہتا تھا تو پیڑ سے اڑاری مار کر

اٹھا لاتی۔

اب کسی دیومالائی کہانی کی طرح بیٹے کا سامنا کسی سحر زدہ شہزادی سے ہونا چاہیے تھا، جس کو جادو سے آزاد کروانے پر اس کی شادی دھوم دھام کے ساتھ شہزادی کے ساتھ ہوتی اور بادشاہ انعام میں اپنی سلطنت اس کے سپرد کر کے جنگل میں تپسیا کرنے کے لئے جا بیٹھتا۔ مگر ایسا نہیں ہوتا۔ بلکہ کسی ڈراؤنے خواب کی طرح قدم قدم پر اس کا سامنا چھپکلیوں کے ساتھ ہوتا ہے، جو اُسے جادو چلا کر اپنے زیر اثر لانے پر تلی ہوئی ہوتی ہیں۔

کسی فرانز کافکا کے ناول کی کہانی کی طرح اس عرصے میں اس کا باپ شہر چھوڑ کر ایک گاؤں میں جا بستا ہے۔ جہاں پر اس کو رہائش کے لئے ایک بوسیدہ جھونپڑا میسر آتا ہے، جس کی دیواروں میں دراڑیں پڑے ہوئے ہیں اور جس کی چھت چھلنی کی طرح ٹپکتی ہے۔ بارش میں باہر سے زیادہ پانی کمرے میں خود ٹپکتا ہے۔ کہانیوں اور زندگی میں اس کا کوئی مداوا نہیں کیا جاتا جب کہ خوابوں میں فلم کی طرح سین بدلنے میں ذرہ بھر دیر نہیں لگتی بیٹا باپ کو بھول کر اپنا وقت چھپکلیوں سے بچنے کی سعی میں بسر کرتا ہے۔

پھر کسی بھلا دی جانے والی دیومالائی کہانی کی طرح اس کی مڈبھیڑ ایک سحر زدہ شہزادی سے ہو جاتی ہے، جو اتنی خوبصورت ہوتی ہے، جتنا کوئی جی بھر کے جھوٹ بولے۔ وہ شہزادی کی معیت میں فضاؤں میں اُڑتا پھرتا ہے۔ اس کے پاؤں زمین پر ٹکتے ہی نہیں۔ اُسے یقین ہو جاتا ہے کہ اس سے بڑی نعمت اس کی زندگی میں کبھی نہ آئے گی۔ مگر شہزادی کا باپ کسی ہندوستانی فلم کی طرح اپنی بیٹی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دینے سے انکار کر دیتا ہے۔ کہانیوں میں شہزادیاں صرف شہزادوں کے ساتھ بیاہی جاتی ہیں، خوابوں کی بات اور ہے۔ اس نے سوچا کہ کاش یہ کہانی سچی نہ ہوتی، بلکہ محض ایک سپنا ہوتی، جس میں ہر چیز ممکن ہوتی، پھر ایک روز اس کی خوابوں کی شہزادی اس سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ جاتی ہے اور اپنی یاد کا نقش اس کے دل کی گہرائیوں میں چھوڑ جاتی ہے ——— اب اگر یہ کہانی ہوتی، تو وہ مجنوں کی طرح اپنے بندھے پھندے توڑ کر بیابانوں میں نکل جاتا اور لیلیٰ کا نام جپتا جپتا مر جاتا۔ مگر چونکہ یہ محض خواب تھا [illegible]

[باقی صفحہ [illegible] پر دیکھئے]

بشیر بدر

غزل کے دل میں رہے، نظم کی نظر میں رہے
دیارِ لوح و قلم میں سدا خبر میں رہے

ہمارے حال پہ چڑیوں نے مہربانی کی
کہ پیڑ نہیں جو پھل کہاں شجر میں رہے

تمام ملک اندھیرے میں ڈوب جائے تو کیا
وہ چاہتے ہیں کہ سورج انھیں کے گھر میں رہے

وطن میں پھرتے رہے ہم مہاجروں کی طرح
عجب نصیب ہے ہر دور میں سفر میں رہے

تھا شوقِ تجربہ جنھیں کھل کے رو نہیں پائے
کبھی زمیں کبھی [illegible] کے اثر میں رہے

کس احتیاط سے یہ زندگی گزار چلے
کسی کے دل میں رہے ہم کسی کے گھر میں رہے

غزل میں بے ادبی ہے بہت گستاخی
تمام ہوش کسی خنجر میں رہے

ہم اس گلی میں چلے جس گلی میں قاتل ہے
جسے عزیز تھا دل وہ سب اپنے گھر میں رہے

لے-۱، احمد شاہ اپارٹمنٹس، کوہ فضا، بھوپال

محمد علوی

زمیں لوگوں سے ڈر گئی ہے
سمندروں میں اُتر گئی ہے

خوشبوؤں میں صبا بکھر کر
خیال کے پر کتر گئی ہے

کھڑے ہیں بے برگ سر جھکائے
ہوا درختوں کو چھو گئی ہے

جلی بجھی شام کھڑکیوں میں
نئے شگوفے بکھر گئی ہے

اسی گلی میں، اسی مکاں میں
اک عمر اپنی گزر گئی ہے

یہی کہ تم ہم سے بدگماں ہو
جگہ جگہ یہ خبر گئی ہے

ہمیں تو نیند آئے گی نہ لیکن
یہ رات بھی تو ٹھہر گئی ہے

کہاں بھٹکتے پھرو گے علوی
سڑک سے پوچھو کدھر گئی ہے

۱۷- یونین پارک، سرکھیج روڈ، احمد آباد

شمیم انور

۱

ہر نگاہ خشمگیں لئے ہوئے
ملامتوں کے سنگریزوں کی بات
اور یہ۔ کھڑا ہوں بے حسی کے دامنوں کی قید میں،
غزل کا دھنک، تا قوس جل پہ بڑھ رہا ہے
مگر یہ شب ہوا نے اپنے جسمی رنگوں کو خشک کر دیا،

حرارتوں کی جستجو میں،
خواہشوں کی کشتی ہی جلائی تو،
صدیوں کی بھی ہوئی
بہت پور پور سے پگھل رہی ہے۔

۲

خنجروں کی نوکوں پہ
لکھے ہوئے۔ ہمارے نام ہی ملیں تو
ساحلوں پہ
اک سفینۂ فاختہ کے انتظار میں،
پھر یہ ہم لگائیں کیوں
کاغذی محل کے آس پاس،
آگ نہ جلائیں کیوں۔

۳

مرا چہرہ پڑھا کرو
کہا یہ پڑھ لیا، اچھا کیا، پر یاد رکھنا
رات کے پچھلے پہر
دروازے پہ پازیب کی ہلکی سی دستک ہو
تو کنڈی کھول دینا
ورنہ۔ میری طرح اک روز
گھر سے نکالے جاؤ گے تم بھی
بارشِ سنگِ ملامت سے مارے جاؤ گے تم بھی

۴

مجھے برگد کے نیچے
گاؤں کے کچھ شوخ بچے
بارش کے پتوں کے شگوفے چنتے چنتے
رکیک الفاظ کے پتھر چلائیں تو
بھلا حیرت کی اس میں بات کیا ہے
یہ فن تو ان کو ورثے میں ملا ہے۔

۵

مردہ جنگل کے سو راہوں کی گہرائی بڑھائی جا رہی ہے
گدھوں کی چونچ کی لمبائی بڑھائی جا رہی ہے
نئے حیلہ پرستی قتل کی نئی منطق
سراغ دست قاتل
اور بھی الجھا رہی ہے۔

آئی-۲۰۳، پادر پور روڈ، کلکتہ-۲۴

سبز دہ شاخوں پہ اوس کے قطرے
ہیں ابھی محوِ خواب ۔ اور سورج
رتھ پہ اپنے سوار آتا ہے (نیادن نیا عذاب)

اب تین سطروں میں عمودی طرز پر تحریر کئے گئے شعر یا نثر بعینہ اسی طرح چھوٹے چھوٹے جملے یا چند الفاظ کے مجموعے کا نام جاپانی صنف کی اندھی تقلید میں "ہائیکو" مشہور ہونے لگا۔ مثلاً آپ کے ذہن میں اچانک کوئی ایسا ہی بعینہ جملہ آیا اس کا کوئی حصہ گردش میں آیا۔ جیسے
اس کے رونے سے بے جان پتھر بھی نم ہو گیا

چنانچہ اس کا ہائیکو یوں تخلیق ہوا۔

اس کے رونے سے
بے جان پتھر بھی
نم ہو گیا۔

ایک اور ہائیکو ملاحظہ کیجئے۔

معصوم دل
محرومِ زندگی
مقتل میں

ان ہائیکو کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ طویل اور مختصر نظموں، غزل کے دو مصرعوں کی معنوی بلاغت اور بلوغت سے بنے شاعروں کے [illegible] ذہن کے سہارے سہل پسندی اور عہدِ طفولیت کی ابتدائی سطح پر واپس لوٹ رہا ہے جب بچوں کو دو حرفی اور سہ حرفی الفاظ کی مشق کرائی جاتی تھی۔ جیسے

گھر جا — کالا کتا
کھانا کھا — سرخ پھول
کتاب پڑھ — نیلا آسمان

کیا آپ ان دو لفظی سطروں کی عمودی تحریر کو "ہائیکو" ماننے سے انکار کر دیں گے۔ یہ بھی محض "ہائیکو" ہیں۔ اور ان الفاظ کو یکجا کرنے سے معنوی احساسات کے گوشے بھی ابھرتے ہیں جن میں آپ "شاعری" بھی پا سکتے ہیں۔

آخر میں "انشائیہ" کا ذکر بھی ضروری ہے۔ انشائیہ کا فن یہ ہے کہ آپ پہلے اپنے ذہن میں کوئی لفظ جملے کا ٹکڑا یا محاورہ لیجئے۔ مثال کے طور پر آپ کے دماغ میں ایک لفظ آیا۔ "کرسی"۔ اس کے بعد آپ شاروں، تشبیہوں، تلمیحوں اور اسی طرح کے تمام متعلقات کی مدد سے اس لفظ کو [illegible] سیاست عدالت [illegible] جہاں جہاں "کرسی" کے معنوی پہلو ملتے جائیں انہیں بے ترتیب، طنزیہ، مزاحیہ انداز میں لکھتے چلے جائیے۔ انشائیہ بن کر یکے بعد دیگرے ایسے محاورے اور انسانی نفسیات و حرکات کے ہزار ہا زاویے آپ کے ذہن میں ابھرتے چلے جائیں گے۔ آپ خود حیران ہوں گے کہ محض ایک لفظ "کرسی" سے معانی و مطالب کے اتنے گوشے کہاں سے پیدا ہو گئے۔ یہی انشائیہ نگاری ہے جس میں سگریٹ، تکیے، ملاقات، اونٹ، چھتری، زکام، صندوق، بخار، جیسے سینکڑوں عنوانات انشائیہ کی کامیاب تخلیق بننے کے لئے آپ کے روبرو صف بستہ نظر آئیں گے۔

آزاد غزل، نثری نظم، ہائیکو اور انشائیہ کا یہ مختصر سا محاسبہ شاید آپ کو کچھ غور کرنے پر آمادہ کرے۔ اور فن اور فن پارے کے ریاضت اور خونِ جگر صرف کرنے کی جو روش تھی اس سے نجات دلا کر آپ کو سہل المعروف کھو جا دے۔ اور آپ رات کو سوئیں اور صبح اٹھ کر ایک دم ترو تازہ ادب تخلیق کا شہود ہو جائیں گے۔ یہ ہاں ابھی شعر و ادب میر، سودا، ان کے ادوار کے عہد کا ادب، ترقی پسند تحریک کا ادب، آزادی کے بعد کا شستہ [illegible] ادب بہ حیثیت ہو کر رہ گیا ہے۔ ❁

شاعرِ اعظم

میں پہلی سطر لکھتا ہوں
اور ڈر جاتا ہوں۔
راجا کے سپاہیوں سے
سطر کو کاٹ دیتا ہوں!

میں دوسری سطر لکھتا ہوں
اور ڈر جاتا ہوں۔
گوریلے باغیوں سے
سطر کو کاٹ دیتا ہوں!

میں نے اپنی جان کی خاطر
اپنی ہزاروں سطروں کو
اس طرح قتل کیا ہے!

ان سطروں کی روحیں
اکثر میرے گرد بھٹکتی ہیں
اور مجھ سے کہتی ہیں
شاعرِ اعظم
شاعر ہیں یا آپ شاعری کے قاتل ہیں!

بہت سے منصف
بہت انصاف کے قاتل
خود مذہب کی مقدس روح کو
قتل کرنے والے تھے!

صرف یہی سننا باقی تھا
کہ ہمارے عہد میں
خوف کے مارے
شاعر بھی ہو گئے
شاعری کے قاتل!

● گہنادر، برہم پورہ، بھاگل پور

ترجمہ: مناظر عاشق ہرگانوی

[ہندی]

سلیم شہزاد

ضمیرِ مخاطب

دستک دے رہا ہوں اپنے ہی در پہ
لیکن معلوم ہوتا ہے
نیند بہت گہری ہے یا الجھا لیا ہے کسی خواب نے مجھے
کہ میں بیدار ہو کر
اپنے ہی لئے دروازہ نہیں کھولتا
میں بیدار ہوں لیکن اپنے ہی لئے
دروازہ نہیں کھولتا
کہ خوف ہے مجھے سرپھری ہوا کا
یا شاید دستک دینے والے کا
جو لیجانا چاہتا ہے مجھے کسی آئینہ خانے میں
جہاں میں اوروں کا تماشا تو دیکھ سکتا ہوں
لیکن آنکھیں نہیں ملا سکتا اپنے آپ سے
(نیند بہت گہری ہے یا الجھا لیا ہے کسی خواب نے مجھے

● ۳۲۳- منگو اور وارڈ، مالیگاؤں - ۴۲۳۲۰۳ (مہاراشٹر)

ں تھیلا بھی کتابوں سے بدبو دار ہوتے تھے فٹ پاتھ پر بکھری ہوئی ہیں
کے سر پر گرد جمی ہے۔ آنکھیں نیند میں پھنسی ہوئی ہیں وہ ان بالکل
کتابیں بچے بوجھ کی طرح رکھی ہوئی ہیں اور وہ خوف زدہ ہے کہ
میں آئے درخت کے نیچے گرنے بیر کی طرح کوئی اٹھا نہ لے اور کہیں
ل میں چلنے والی گولیوں کا نشانہ نہ بن جائے کہ وہ اسے یونیورسٹی
پس بلا سنا اور خوفزدہ ہے کہ جس بس پر وہ بیٹھ کر جانے والی ہے
س کی سب سے پچھلی نشست کے نیچے کینوس کے بیگ میں بم
نہ رکھا ہوا ہو۔

تاریخ کی تمام کتابیں اس پاندان کو نہیں جو پہلے نیچے دو جوگی کے
بین لگاتے کاغذ کی پڑیوں میں پان لپیٹ کر گاہکوں کو دیتا ہے
خبار یا عام کاغذ کی ردّی صفت بھی قبول نہیں کرتا وہ صرف چکنا اور چمکدار
ی ردّی میں خریدتا ہے شاید تاریخ کی کتابوں کے کاغذ سڑنے بجنے
کے باوجود جھگڑوں اور تاج والی تصویروں اور دوسری اور پھر تیسری
ی کی وجہ سے گاہکوں کو اپنے رومانس کی تسکین کے لیے پان بھر کر دیتے
ر وہ پان کھا کر انھیں کاغذوں سے انگلیاں صاف کرتے کرتے اس
پہ کو بھی ایک نظر دیکھ لیں اور تاریخ پڑھ لی جائے۔ کتابیں اب کوئی
پڑھتا لوگ صرف بحث کرتے ہیں۔

فلسفے کی کتابیں فٹ پاتھ پر بیٹھے اس ایک سیلز کو دے دو جہاں سے
سگادیب اپنی مطلوبہ کتاب کم قیمت پر حاصل کرنے میں کبھی کبھی کامیاب
ہو جاتا ہے۔

ایئرپورٹ پر ابھی سورج طلوع ہونے میں دیر تھی۔ رن وے سے
اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ امیگریشن کاؤنٹر اور کسٹمس چیک پوسٹ سے
ر باہر لاؤنج میں آگیا ہوں جہاں ایک خاکروب فرش صاف کر رہا ہے
اسٹ انکوائری کی کھڑکی کے سامنے بیٹھی ہوئی لڑکی میگزین کی تصویریں
ہ میں مصروف ہے تمام مسافر اب اِدھر اُدھر بکھر گئے اور بیئرر چھت
سے ایک جانب ایک عارضی کاؤنٹر پر اس عالمی کانفرنس کا بینر لگا ہوا
اس میں شرکت کے لیے مجھے یہاں بلایا گیا ہے۔ میں اپنے مختصر سامان کی
، چھوڑ کر کاؤنٹر پر جاتا ہوں اور اپنا نام بتاتا ہوں تو وہ لوگ کرسیوں
اٹھ کر مجھ سے بغل گیر ہوتے ہیں۔ خوش آمدید کہتے ہیں اور دیر تک مجھ
بڑی محبت سے بار بار مصافحہ کرتے ہیں ان میں سے ایک بھاگ کر میری
ل لے آتا ہے اور وہ دونوں میری بیوی اور بیٹی کو اپنی اپنی کرسیاں پیش
ہیں پھر فرسٹ کلاس ہال کے گلاسوں میں کافی پلاتے ہیں۔

میری بیوی اور بیٹی دونوں حیرانی سے کبھی میری طرف کبھی اُن دونوں کی طرف
دیکھتی ہیں ان کی آنکھوں میں مجھے ایک ہی سوال نظر آتا ہے۔ وہ دونوں
خاموش ہیں ان کے ہونٹ بھی نہیں ہلتے مگر میں ان کا سوال سن لیتا ہوں۔

۔ آپ تو کیا کرتے تھے ۔۔۔

میں ان دونوں کا نامکمل سوال سن کر جواب دیتا ہوں۔

۔ وہ طوفان اب گزر چکا ہے۔

۔ کون سا طوفان؟ یہ سائیکلون کا موسم نہیں ہے۔ [illegible]
میزبانوں میں سے ایک نے کہا۔

۔ جی۔ جی ۔۔۔ ۔ میں نے بات ختم کرنے کے لیے کہا۔ لیکن میری
بیوی اور بیٹی کو ان کے ادھورے سوال کا جواب مل گیا تھا اور
وہ مطمئن ہو گئی تھیں۔

کار جب ہمیں ایئرپورٹ سے لے کر روانہ ہوئی تو میں اس شہر کے لیے
جس سے بیس سال قبل رخصت ہوا تھا اور شہر میرے لیے جس نے مجھے خوف
زدہ اور پریشان حال رخصت کیا تھا، اجنبی ہو چکے تھے۔ کوئی راستہ شناسا
دکھتا تھا۔ ملک کا نام بدل جانے سے شہر بھی نگاہیں پھیر لیتے ہیں مجھے معلوم نہ
تھا۔ سڑک کے دونوں جانب الیکٹرک پولس میں مرکری بلب اُداسی سے روشن
تھے اور سڑک پر کوئی راہ گیر نظر نہ آتا تھا۔ اچانک صبح کی نم ہوا کے ساتھ
بیس سال پرانی وہ بو میری ناک سے دماغ میں سما گئی جس نے پہلی بار اس
شہر میں میرا استقبال کیا تھا۔

۔ یہاں مچھلیوں کی سڑاند محسوس ہو رہی ہے۔ میری بیوی نے کہا

۔ مچھلی کا کوئی ٹرک گزرا ہوگا۔ اس نے خیال ظاہر کیا

میں مسکرا دیا۔

۔ امی یہ بو تو ایئرپورٹ کے سپیریئر ہال کلاس کی کافی سے ہی ساتھ
ساتھ ہو لی تھی۔ میں خاموش رہا۔

سن اڑتالیس میں جب میں پہلی بار ٹرین سے اتر کر تیسرے درجے
کے مسافر خانے میں کئی روز اس انتظار میں پڑا رہا تھا کہ کہیں رہنے کا
انتظام ہو جائے تو یہی بو، مجھے شہر کی گلیوں گلیوں پھراتی ہوئی سرعبدالغنی
مسافر خانے تک لے گئی تھی اور پھر ہمیشہ کے لیے میری رفیق ہو گئی تھی۔

ہمیں شہر کے پوش علاقے کے ایک نئے فائیو اسٹار ہوٹل میں ٹھہرایا گیا تھا
جہاں انسانی حقوق پر ہونے والی کانفرنس کے دوسرے مندوبین بھی ٹھہرے
تھے ہم ناشتے سے فارغ ہوئے تھے کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ میری بیوی اور
بیٹی بالکونی سے آہستہ آہستہ بیدار ہونے والے شہر کا نظارہ کر رہی تھیں۔

میں نے ٹیلی فون اُٹھایا۔

"آپ کا فون ۔۔ سر۔" آپریٹر نے کہا

"میرا فون؟ ۔۔"

"جی آپ کا فون۔ یہ خاتون آپ کو کل سے کئی بار دریافت کر چکی ہیں۔"

"ہیلو!"

"میں نے اخبار میں پڑھا تھا کہ پاکستانی ڈیلی گیشن کے ساتھ تم بھی انسانی حقوق کی کانفرنس میں شرکت کر رہے ہو۔ پاکستانی ڈیلی گیشن تو کل ہی آ گیا تھا۔ تم دیر سے کیوں آئے؟"

یہ فاطمہ کی آواز تھی ۔۔ وہی لہجہ ۔۔۔ وہی اسٹیٹ فارورڈ۔ بغیر کسی تمہید کے گفتگو شروع کر دینے کا انداز وہی کانوں سے دل میں اُتر کر بیٹھ جانے والی آواز ۔۔۔ میری نگاہوں میں بیس سال بلکہ اس سے بھی پہلے کے وہ جگنو اُڑنے لگے جنھوں نے میری زندگی میں اُجالے بکھیر دیئے تھے۔

فاطمہ میری بیوی ۔۔۔ جسے میں مردہ سمجھ کر جلتے ہوئے گھر کے ملبے پر آخری بار نظر ڈال کر اور اس شہر کو چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ میں دفتر میں تھا کہ کسی نے اطلاع دی کہ میرا گھر بھی جلا دیا گیا اور میری بیوی کو قتل کر دیا گیا ہے۔ وہ ان دنوں حاملہ تھی اور میرے پہلے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ میں رات کی تاریکی میں چھپتا چھپاتا اپنے جلتے ہوئے گھر تک پہنچ بھی گیا تھا۔ مگر وہاں جلے ہوئے ملبے کے علاوہ اب کچھ نہ رہ گیا تھا۔ فاطمہ کا کہیں پتہ نہ تھا۔ کئی دنوں تک میں ہسپتالوں، تھانوں اور مردہ خانوں میں اسے تلاش کرتا رہا تھا مگر نہ فاطمہ ملی تھی نہ اُس کی لاش ۔ پھر میں خیرات کے سکوں کی طرح رشوت دیتا اور دعا کی طرح راستہ لیتا اپنی جان کے عوض اپنا سب کچھ لٹاتا ہوا ایک رات اُس جہاز میں بیٹھ گیا تھا جو مجھے رن وے سے زندگی کی طرف لے جا سکتا تھا۔ سارے مسافر میری ہی طرح اپنی بازی ہارے ہوئے تھے اور جہاز کے جلد سے جلد پرواز کے منتظر تھے۔ وہ بڑی بھیانک رات تھی۔

آج بیس سالوں کے بعد پھر میں فاطمہ کی آواز سن رہا تھا۔ وہ زندہ تھی اور دوسرے اینڈ پر تھی اور اسی شہر میں تھی۔

"فاطمہ!"

"اوہ ۔۔ تو تم مجھے بھولے نہیں۔"

"تم سچ مچ فاطمہ ہو نا ۔۔۔"

"ہم نے زندگی کے چند دن اور چند راتیں ساتھ گزاری ہیں ۔۔۔ وہ ساری کی ساری گواہ ہیں ۔۔۔ میں فاطمہ ہی ہوں ۔۔۔ میں نے تم سے کہا تو تھی کہ اگر تم کبھی مجھ سے جدا ہوئے تو میں مر کر بھی تمھیں چھین لینے زندہ رہوں گی۔ تمہارے خوابوں میں آیا کروں گی۔ بارش کروں گی۔" اس کی آواز بھرا گئی اور وہ رونے لگی، بیس سال کے شب و روز نے اس کے اس کی آنکھوں میں سوئیوں کی طرح چبھو دیئے۔

"فاطمہ تم زندہ ہو ۔۔۔ ؟!"

"عجیب سوال کیا ہے تم نے ۔۔۔ میں زندہ ہوں اس لئے کہ تم زندہ ہو۔"

"لیکن میں نے تو اپنی آنکھوں سے اپنا جلتا ہوا گھر دیکھا تھا۔"

"جلتا ہوا گھر تو دیکھ چکے ۔۔۔ اب اپنے بیٹے کو دیکھو گے تو حیران رہ جاؤ گے۔ بالکل تمہاری عادتیں۔ بالکل تمہاری طرح اشیاء کو پرکھتا ہے ۔۔ لوگوں کو دیکھتے ہی Respect کر دیتا ہے۔ چلتا ہے تو ایسا لگتا ہے تم چلے آ رہے ہو۔ میں حیران رہ جاتی ہوں کہ اس نے تمہیں دیکھا تک نہیں مگر ہو بہو تمہاری تصویر ہے۔ میں نے اپنی تنہائیاں اسے دیکھ دیکھ کر کاٹی ہیں ۔۔۔ وہ نہ ہوتا تو میں کب کی مر جاتی ۔۔۔"

"تم کہاں ہو؟"

اس نے مجھے ایک ہاسپٹل کا نام بتایا اور پتہ لکھا دیا۔ جہاں وہ ملازمت کر رہی تھی۔

"کس کا فون تھا ۔۔۔ پاپا" ۔۔۔ میری بیٹی نے سوال کیا

"ایک بہت پرانے دوست کا۔" میں نے بیٹی سے جھوٹ بولا اور فاطمہ سے ملنے چل دیا۔ ہاسپٹل میں فاطمہ میری منتظر تھی۔ اُس کے ساتھ بیٹا کھڑا مجھے اجنبیوں کی طرح تک رہا تھا۔ فاطمہ اب ہڈیوں کا ڈھانچہ ہو گئی تھی۔ جسم پر میلی سی ساڑی لپٹی ہوئی تھی۔ غربت نے اس کے خد و خال ہی نہ بدلے تھے بلکہ جلد بھی خشک چمڑے جیسی ہو گئی تھی اور ہاتھ پاؤں کام کی زیادتی کی وجہ سے تڑخ گئے تھے۔ آواز کے علاوہ اب فاطمہ کے پاس جوانی کے دنوں کی کوئی شے باقی نہ بچی تھی۔ مجھے فاطمہ سے مل کر شدید پچھتاوا ہوا۔

"تم بہت بدل گئے ہو" فاطمہ نے کہا اور اپنی میلی ساڑی کے پلو سے آنسو خشک کرنے لگی۔

سب کچھ ہی بدل گیا ہے۔ شاید وہ اچھا ہے میں پوچھنا چاہ رہا تھا لیکن میری آنکھیں ریت کے کھنڈر کی طرح خشک تھیں۔

"یہ شکیل ہے۔ تمہارا بیٹا ۔۔۔ تمہاری امانت۔"

میں نے آگے بڑھ کر شکیل کو سینے سے لگا لیا۔ وہ مجھ سے چمٹ

ابا جیسا جو آپ کو میں نے اندر کہیں ڈھونڈ لیا ہے۔

- بالکل تم پر گیا ہے نا - فاطمہ نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے ہنس کر جملہ پورا کیا۔

اچانک شکیل پھٹ پڑا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

- اب کیوں روتے ہو۔

- ابو مجھے کبھی یقین نہ آیا کہ میرا کوئی باپ ہے اور وہ سچ مچ میرے سامنے آئے گا۔

- فاطمہ نے تمھیں بتایا تو ہوگا۔

وہ کچھ دیر چپ رہا پھر گردن جھکا کر بولا

- ایسی کہانی پر یہاں کوئی یقین نہیں کرتا ۔۔۔ میں بھی ۔۔۔

- آپ لوگ جی بھر کے باتیں کیجئے ۔۔۔ میں چھٹی کے بعد شام کو ملوں گی۔ شکیل، ابو کو گھر لے جاؤ اور انھیں اپنا گھر اور تصویریں دکھاؤ۔

گھر جانے سے پہلے میں شکیل کو ڈیپارٹمنٹل سٹور لے گیا۔ ہم دونوں نے جی بھر کر شاپنگ کی۔ میں نے فاطمہ کے لئے اُن رنگوں کی ساڑیاں اور چپلیں خریدیں جو اسے کبھی بہت پسند تھیں۔ شکیل کے لئے قمیض، ٹائیاں اور سوٹ خریدے پھر ہم نے ایک عمدہ ہوٹل میں دوپہر کا کھانا کھایا۔ شکیل تھوڑی ہی دیر میں مجھ سے اس قدر بے تکلف ہو گیا کہ مجھے اس پر پیار آنے لگا۔

پھر وہ مجھے اپنے گھر لے گیا جو ایک مشہور کیمپ کے بیچوں بیچ تھا اور زندگی کی ہر نعمت سے محروم تھا۔ شکیل مجھے اپنے چھوٹے سے عارضی، پرانے والے کمرے میں لے گیا اور اس نے کمرے کی ایک دیوار پر ایسٹ ٹوائینڈ کی ہوئی مشہور سیاست دانوں کی تصویریں دکھائیں۔ اور مجھے بتایا کہ وہ پولیٹیکل سائنس پڑھ رہا ہے اور بی اے پارٹ ون کا طالب علم ہے اور یہ کہ وہ بڑا ہو کر سیاست داں بنے گا۔ اس نے دیوار کے بیچوں بیچ ایک بڑی تصویر کے لئے خالی جگہ دکھائی۔

- میں یہاں ایک بہت بڑے لیڈر کی تصویر لگانا چاہتا ہوں۔ اس نے کہا۔

- پھر کیوں نہیں لگائی۔

- اس کیمپ کی دیوار پہ نہیں لگائی جا سکتی۔

- کیوں۔

- یہاں ۔۔۔ پاپا۔ یہاں نہیں۔ میں اب آپ کے ساتھ پاکستان چلوں گا وہاں اپنے کمرے میں بہت بڑے لیڈر کی تصویر لگاؤں گا۔

ایسے لیڈر کی تصویر جو انسانیت کو آزادی دلا سکے جو [illegible] دے سکے۔ میں نے اسے سینے سے لگا لیا۔

- اب پھر آپ ہمیں چھوڑ کر تو نہیں چلے جائیں گے؟

شام چار بجے فاطمہ آگئی اور اپنے اور شکیل کے کپڑوں کے بنڈل بکھرے ہوئے دیکھ کر [illegible]۔

- امریکن ایمبیسی گیا؟

- دراصل ہم فلاکت اور ان کی توہین کے عادی ہو گئے ہیں۔ فاطمہ نے سنجیدگی سے بات مکمل کی۔

ہم نے ان کے پاکستان لے جانے کے پروگرام بنائے۔ پاسپورٹ کے مسائل پر غور کیا۔ ان دونوں نے پاکستان میں میرے گھر کے بارے میں کرید کرید کر سوال کئے ہیں۔ انھیں ان کے سوالوں کے جواب دیتا رہا اور سورج غروب ہوتے ہی دوسرے دن پھر آنے کا وعدہ کر کے ہوٹل لوٹ آیا۔

دوسرے دن میں اپنی بیٹی اور بیوی کے ساتھ سارا دن شاپنگ میں مصروف رہا اس لئے کہ اگلی صبح سویرے کی فلائٹ سے مجھے واپس پاکستان آنا تھا اور شام میں انسانی حقوق کی عالمی کانفرنس میں پیپر پڑھنا تھا۔ شاپنگ سے دیر سے لوٹا تو کانفرنس کا وقت ہو گیا جو رات بارہ بجے تک جاری رہی۔ میں نے اپنی بیوی اور بیٹی کو اب تک فاطمہ کے بارے میں کچھ نہ بتایا تھا۔ رات بھر میں کروٹیں بدلتا رہا لیکن فاطمہ اور شکیل سے ملنے [illegible]

ہوائی جہاز کی درمیانی نشستوں پر ہم تینوں بیٹھے ہوئے تھے

- سگریٹ بجھا دیجئے - اعلان ہوا

- حفاظتی بیلٹ باندھ لیجئے۔ دوسرا اعلان ہوا۔

- اب ہم ۔۔۔ فٹ کی بلندی پر پرواز کر رہے ہیں۔ اور گیارہ بج کر دس منٹ پر انشاء اللہ اسلام آباد ایئرپورٹ پر اتریں گے ۔۔۔

اعلان ختم ہوا۔

دوسری زبان میں اعلان جاری تھا اور جہاز کی مخصوص گونجتی آواز کی وجہ سے کان بند ہو رہے تھے۔ میری بیوی نے میرے کان کے قریب اپنا منہ لا کر اونچی آواز میں مجھ سے پوچھا ۔۔۔ - فاطمہ ملی تھی؟

جہاز کی آوازوں میں میری چیخ میرے گلے میں گھٹ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دم توڑ گئی۔ لیکن میری بیوی کا سوال جہاز بھر کے کمرے میں بند ہو جانے والی کسی ننھی سی چڑیا کی طرح سارے جہاز میں اڑتا رہا اور جہاز کی چند کھڑکیوں، دیواروں، نشستوں اور مسافروں کے بے تاثر چہروں سے ٹکراتا رہا

فاطمہ ملی تھی ۔۔۔؟ فاطمہ ملی تھی ۔۔۔؟ فاطمہ ملی تھی ۔۔۔؟

۳

سے وقت، اپنا وہ ماتم بستا،
جو تجھے ہر لمحہ نیا بتاتا ہے
اپنی ڈھلتی ہوئی عمر کے ساتھ ساتھ!
دن بدلے،
تیرا ماضی ہوتا ہے کم سے کم تر
اور تیرا مستقبل وسیع۔

——اور تیرا حال
ہمیشہ وہی ایک ساعت
جب بادام کا وہ درخت شگفتہ ہوتا ہے!

بے نشاں وقت،
سے مجھے وہ ماتم بستا،
کہ ہر روز
کیسے کھل جاتا ہے
تیری روح تیرے جسم میں!

۸

میرا کتبۂ زندہ

تمہیں میں، میں جو الف تھا۔
اُبھرا ابھرے سے حیات تک۔

۶

میں جلتا ہوں
میں جسم ہوں
عالم کے درخت کا
میں جانتا ہوں
کہ اپنے خون سے
میں پرورش کرتا ہوں ستاروں کی،
کہ پر درخشاں خواب
ایک پرندہ ہے
میرے دیار کا.....
میں جانتا ہوں،
جب موت کا تیشہ مجھے کاٹے گا
تب آسماں کا محراب
اپنا توازن کھو کر گر جائے گا۔

۷

کسی دن کوئی آ کر
تم پر جھپٹے گا
اور تمہارے گنام حرفِ ماتم کو
چھیننے کی سعی کرے گا۔

میرا حرف، آج کتنا برہنہ، کتنا شفاف
کوئی، جو تمہارا یقین کرے گا۔
سایہ الیاب سرگوشی کا پانی بنا ہوا،
تو، میری آواز، پاک
صاف روشنی کا ——!

۱

رات

نیند ایک پل،
آج کو کل سے جوڑتا۔
جس کے نیچے خواب کی صورت
بہتا ہے پانی، بہتی ہے روح!

۹

باہر سے مجھے کچھ بھی نہ چھوئے،
سُننے دو مجھے اپنے آپ کو،
کہیں اندر سے۔
میں اپنے دل کا خدا۔
(میں سب کچھ: شام، سحر
محبت، دوستی، وجود اور خواب۔
میں تنہا کائنات!)
گذر جاؤ، نہ سوچو میری زندگی کے بارے میں
چھوڑ دو مجھ کو۔ بس، گوشہ نشین۔
میں،
واحد اپنے محور میں۔

۴۷ - ڈاڈری گراس پول، کالوپور، احمد آباد - (گجرات)

بیسویں صدی کے اواخر کی ایک اہم دستاویز ▬ شعری جدید تہذیب کا تازہ اقرارنامہ

شاہد جمیل

کی

پہلی شعری کتاب

خوابوں کے ہم سائے

اسلوب کی انفرادیت * لہجے کا انوکھاپن * انہماک کی شدت * تجربات و کیفیات کے نئے تناظر

● آپ کی کتاب ، خوابوں کے ہم سائے ، بڑا خوشگوار استعجاب پیدا کر گئی ۔ آپ کا کلام عمدہ ہے۔ اس میں ایک وقار ، تفکر اور ٹھہراؤ ہے ۔ متوسط طوالت کی نظمیں آپ نے خوب کہی ہیں۔ [شمس الرحمٰن فاروقی]

● آپ کا مجموعہ ہر اعتبار سے پسند آیا ۔ بلکہ قابلِ رشک ہے خصوصاً نظم نگاری کا آپ کو خاص ملکہ ہے اور غزلوں کی بھیڑ میں آپ کی نظمیں آج کی اردو شاعری میں نمایاں ہیں ۔ [مظہر امام]

● آپ نے بغیر کلیشے کا سہارا لئے نئی حسیت کے اظہار کا بڑا EMOTIVE AND EXPRESSIVE پیرہن دیا ہے ۔ [دیویندر اسر]

● شاہد جمیل کی شاعری مشاہدے ، تجربے اور طریقِ اظہار کی دلآویز اور گوناگوں کیفیات کی شاعری ہے ۔ [بلراج کومل]

● شاہد جمیل کی شاعری میں باقی کے شعر جیسا انفرادی ذائقہ ہے اور شاہد جمیل جدید تر نسل کے نمائندہ شاعر ہیں ۔ ان کا مجموعہ خوابوں کے ہمسائے پڑھنے والوں کو چونکائے گا ۔ [محمود ہاشمی]

● اظہار و بیان پر جن چند جدید شعراء کو دسترس حاصل ہے ان میں شاہد جمیل کا نام سب سے نمایاں ہے ۔ [کمار پاشی]

جدید طباعتی پروسسنگ اور تکنیک کا استعمال ● نفاست ، عمدگی اور معیار کا انتہائی خوبصورت امتزاج

ضخامت : ۲۲۰ صفحات ▬ قیمت : پچاسی روپے

ناشر

مکتبہ [illegible] گیا – ۸۲۳۰۰۱ ، بہار ، بھارت

انجم سلیمی

◆

منافرت کا لبادہ بدل کے دیکھتا ہوں
اب آئینہ نہیں چہرہ بدل کے دیکھتا ہوں

کسی طرح سے میں ٹل جاؤں اپنی مرضی سے
سو بار بار ارادہ بدل کے دیکھتا ہوں

تمہیں بھی مجھ سے نہ شاید گلہ رہے کوئی
میں خود بھی اپنا رویہ بدل کے دیکھتا ہوں

اگرچہ کچھ بھی نہیں ہے یہاں پہ دیکھنے کو
میں پھر بھی چشم تماشہ بدل کے دیکھتا ہوں

کسی طرح سے نظر مطمئن نہیں ہوتی
ہر ایک شے کو دوبارہ بدل کے دیکھتا ہوں

میں گرد و پیش کو تبدیل کر نہیں سکتا
کچھ اور اس کے علاوہ بدل کے دیکھتا ہوں

کہیں بھی ٹھیک نہیں لگ رہا مرا انجم
تو کائنات کا نقشہ بدل کے دیکھتا ہوں

● دفتر تخلیق [illegible]

اختر یوسف

گل تاب ۔ ۱

اے گل تاب
رات بہت ہے
رات، اک چڑیا
دھیرے دھیرے چاند جگا
چاند چنبیلی، چاند گلاب
پور پور میں خواب اگا
دل کے دریچوں کو مہکا
اے گل تاب
دودھ سمان اجلی شاخیں
ٹھہر ٹھہر کے کھول
کبوتر کی [illegible] کو گھول
رسیلی پنکھڑیوں کو ہولے ہولے
دھیمے دھیمے شدھ شہد میں ڈھال
مہک پھر اور مہک ۔۔ گل تاب
یہ مانا، رات بہت ہے
رات اک چڑیا
پھر بھی پیاسی ہے
اے گل تاب

گل تاب ۔ ۲

اے گل تاب
آنکھیں کھول

رات پرندہ
گھلا جا آکاش سمٹ کر
تارہ تارہ شبنم شبنم
تجھ پہ برسنے کی چاہت میں
ٹھہرا ہوا ہے
اے گل تاب، رات پرندہ
اڑ جائے گی
آنکھیں کھول
ذرا سا کھول
ذرا سا بس
رسیلی پنکھڑیوں کی خوشبو
کا دروازہ کھول، آنکھیں کھول
رات پرندہ
ہے گل تاب

● [illegible] کراچی ۔ ۸۴۳۰۰۲

دستِ برگ کے بعد ستیہ پال آنند

کا

نیا شعری مجموعہ

وقت لا وقت

ستر اردو نظمیں جنھیں عالمی سطح پر عصری یورپی اور امریکن شاعری
کے بالمقابل رکھنے میں کوئی پیش و پس نہیں ہوتا

دیدہ زیب طباعت اور گیٹ اپ

قیمت • ۱۲۰ روپے

ادبیات کا منشاء و مقصد یہ ہے
کہ وہ تمام مظاہر لسانی میں ایک ندرت، ایک
مناسبت اور ایک ترتیب پیدا کر دے۔ ادبیات
کی حدود ایک طرف تو لسانیات سے ملتی ہیں،
دوسری طرف انسانی جذبات و احساسات سے۔ ایک
ادب نا آشنا صرف زبان کو ذریعۂ اظہار خیالات
تصور کر کے بحث کرتا ہے، مگر ایک ادیب کا
مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ زبان کی حیاتِ باطنی اور
جذبات کی عجز نا شکار گہرائی کا بھی پتہ لگائے۔
موضوع کے ماخذ کو الفاظ کے طلسم سے
ڈھونڈ نکالے۔ اس کا مدعا یہ ہوتا ہے کہ وہ
زبان کی ماہیت بحیثیت وصفِ انسانی سمجھ
سکے اور معلوم کر سکے کہ خیال سے اس کا کیا
تعلق ہے۔ اور ترقی و تربیت دماغ و علم پر اس
کا کیا اثر ہے۔

۱۶ اپریل ۱۹۳۳ء
مشاعرہ بزم ادب جہلم

سیماب اکبرآبادی

ممالکِ غیر سے
۲۵ ڈالر — ۱۵ پونڈ

آپ کو چاہیے صافی
کیونکہ خوبصورتی کے معنی خوبصورت جلد سے کہیں زیادہ ہیں۔

صافی کب استعمال کی جائے؟

- فساد خون
- جلدی خارش
- پھوڑے پھنسی
- کیل مہاسے
- گرمی دانے
- نکسیر

قمر جمیل ۷ تاریخ، آرٹ اور کروچے
ندا فاضلی ۱۵ داغ دہلوی۔ غزل کا ایک اسکول
رشید منظر ۲۵ اردو میں ہندسوں کا مسئلہ
مقصود الٰہی شیخ ۲۷ اردو میں ہندسوں کی تبدیلی

سرشار بلند شہری ۱۳ میں بادشاہت کا کیا کروں گا
کرامت بخاری ۱۴ میں صحرا ہوں
علیم اللہ حالی ۳۲ آرزو
یوسف تقی ۳۲ مناجات
عامر ریاض ۳۲ کامل آمادگی

اقبال مجید ۱۱ سب اکیلے ہیں
مرزا حامد بیگ ۲۱ گنڈو کا حساب ساز
انجم عثمانی ۳۰ برزخ
محمد مظفر الدین فاروقی ۳۳ تپ بچہ
ابرار مجیب ۳۷ جنگ بند
معز الدین ماجد ۴۱ گول میز

ابو محمد سحر۔ غالب عرفان۔ مشتاق شبنم ۱۰
رحمت امروہوی۔ احتشام اختر۔ بشیر سیفی ۱۹
شبیر رسول۔ جمیل احسن۔ قمر نقوی ۲۹
عاجز ہنگن گھاٹی۔ خالد عبادی۔ کبیر اجمل ۳۶

محفل شاعر
وزیر آغا ۶ تم جو آتے ہو
وزیر آغا ۶ جرس

آفتاب اقبال شمیم ۲۴ ۴۔ غزلیں

شگفتہ طلعت سیما۔ ممتاز صدیقی۔ اسنیٰ بدر زبیری ۔ ۴
انیسہ تنویر۔ سیما فریدی۔ فاطمہ تاج ۴۰

ط۔ انصاری ۵ [بنام] اعجاز صدیقی

افتخار امام صدیقی ۴۳ کتب و رسائل کا تعارف اور تبصرہ

افتخار امام صدیقی ۴ کائنات، آدمی۔ نظریہ اور زندگی

سرورق
سمندر منتھن
[کالی داس گپتا رضا کی نظم امرت منتھن کے پہلے شعر سے متاثر ہو کر]
عمل
علام الہندی
[بنارس]

جمیل الرحمٰن۔ الیاس شوقی۔ سرور ساجد محمود فرمان علی۔ انور معین کوثر۔ خالد ناز خان نکہت بریلوی۔ ایس ایم حسن کوچیچی۔ مالک صادق۔ ماجد الباقری۔ ش صفی ادیب۔ مختار شمیم۔ نافع شفیق۔ خورشید ملک خلیل تنویر۔ عدنان قوی۔ مجید اختر ابرار ترمذی۔ خان جمیل۔ شارق عدیل۔ عظیم راہی ۴۴ ارشد کمال

شمارہ ۔ ۶ [۱۹۹۴] جلد ۔ ۴۵
جون ۱۹۹۴ء

کائنات، آدمی، نظریے، اور زندگی!

سوال یہ ہے کہ کیا نظریے کے بغیر ادب تخلیق نہیں ہو سکتا؟ سوال یہ بھی ہے کہ نظریے کے بغیر زندگی بسر کی جا سکتی ہے کہ نہیں! عکری فکرمندوں
نے نسل کے بے جو ترقی پسند تھا یا جدیدیت کے الجھاؤں میں پڑے بغیر ادب تخلیق کرنا چاہتی ہے۔ یا ادب تخلیق کر رہی ہے۔ دراصل نظریاتی رجحان جو بھی کہہ
لیں اس نے قلم کاروں اور قاری دونوں ہی کا مزاج خراب کر دیا ہے۔ ترقی پسندوں نے اپنا ادب اور جدیدیوں نے اپنا ادب۔ دونوں ہی نے انتہا پسندی کی
بھی انتہا کر دی۔ نظریہ مذہبی ہو یا مادی، نظریہ ساز یہ بھول جاتے ہیں کہ ان کے اختیار میں کچھ بھی نہیں۔ نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم۔ سائنس کا شعور
اور اپنے ہونے کا تھوڑا بہت ادراک اور اپنے آس پاس کو ٹھیک ٹھاک رکھنے کی خواہش اور خواہش کی تعمیر۔ ارتقا پذیر دنیا میں کوئی بھی آئیڈیالوجی
بہت دور تک نہیں جاتی، اپنا اچھا یا برا کردار ادا کرتی ہے، یا تو ختم ہو جاتی ہے، یا پھر شکل بدل لیتی ہے۔ شب و روز کے تسلسل میں چلتے پھرتے آدمی کی بنیادی
جبلتیں مر تو نہیں گئیں۔ ایک دوسرے سے خوفزدہ آدمی سرحدوں سے باہر کب آیا ہے؟ ان اتنا شائستہ مزدور ہو گیا ہے کہ بہت سے چہروں سے اپنا دفاع
کرتا تھا بیسویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے اس نے جدید ترین مہلک ہتھیار بنا لئے ہیں۔ آدمی کے بنیادی مسائل اپنی جگہ ہیں اور اس کی ساری تگ و دو
اسی کے لئے ہے کوئی پل کوئی لمحہ ایسا نہیں جس نے آدمی کو اپنی بنیادی ضرورتوں سے بے نیاز کر دیا ہو۔ طاقت، اقتدار اور عقیدہ کسی بھی نظریے کا تصور
اور نفاذ ان کے بغیر ممکن نہیں۔ نظریوں کی تاریخ تو یہی بتاتی ہے۔ کسی بھی نظریے کے اچھے اثرات تو مرتب ہوتے ہی ہیں کسی عالمی سماج کی تشکیل و تعمیر
کا خواب دینے کی عملی صورتوں میں اختلافی شکلیں ہوتا رہتا ہے۔ یہ ایک فطری عمل ہے۔ اس کی نفسیاتی و جمالیاتی سطحیں بھی اپنا دفاع کرتی رہتی ہیں۔
ختم ہوتی ہوئی بیسویں صدی میں تمام نظریے یا تو دم توڑ رہے ہیں یا پھر کسی نئے نظام یا نئے کلچر کی تعمیر و تشکیل میں مصروف ہیں۔ تاہم پوری دنیا
جس انتشار کی زد میں ہے ——— اس نے فی الحال تمام چھوٹے بڑے نظریوں کو متزلزل کر دیا ہے۔ تمام اصطلاحیں آدمی اور کائنات کی
تفہیم کے لئے اب ناکافی معلوم ہو رہی ہیں۔ ان کے نئے معنی کی تلاش کا عمل بھی تیز تر ہے۔

اردو میں نقاد و دانشور یہ تو بتاتے ہیں کہ عالمی سطح پر جدید فکری صورت حال کیا ہے۔ سیاسی سماجی علمی و ادبی سطح پر نظریوں کو اب کس
طرح دیکھا جا رہا ہے۔ وہ باخبر تو ہیں اور بضد بھی کہ جو اطلاعات وہ فراہم کر رہے ہیں انہیں تسلیم کیا جائے۔ لیکن چونکہ ان کا اپنا کوئی فکری نظام نہیں ہے۔ لہٰذا
نئی نسل یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ اسے اب بھی ترقی پسند نظریے کے تحت اپنا ادب تخلیق کرنا ہے یا پھر جدیدیت یا مابعد جدیدیت کے رجحان کو اپناتے ہوئے
اپنا تخلیقی نظام قائم کرنا ہے۔ مگر ایک تیسری صورت حال بھی ابھر رہی ہے۔ (تیسری دنیا نہیں) اور وہ یہ کہ بغیر کسی نظریاتی وابستگی کے آزادانہ طور پر ادب
تخلیق کیا جائے۔ تمام نظریوں کی کسی مشترک فکری اساس کے بغیر۔

تخلیقی ذہن، نظریوں کا پابند نہیں ہوتا۔ اگر وہ بڑا اور سچا فنکار ہے تو اپنا نظریہ خود پیش کرتا ہے۔ وہ نظریوں سے سچ کو اخذ کرتا ہے۔ اور
سچ کا آزادانہ اظہار کرتا ہے۔ خاموشی کو لفظ دیتا ہے۔ لفظوں میں اپنی آواز رکھتا ہے۔ اور یہ آواز سفر کرتی ہے۔ اس آواز کی لہر جتنی توانا ہوگی،
اتنا باقی رہے گی وہ دشمن آواز کی صورت عہد بہ عہد سفر کرے گی اور ہر عہد کو منور کرے گی۔

فنکار چاہے جس آئیڈیالوجی سے وابستہ ہو اسے سچ بولنا ہے۔ سچ لکھنا ہے۔ وہ اپنے فکری سرمایوں سے نئی راہ کو جیتا ہے اور اجتماعی آئیڈیالوجی
کو سنوارتا ہے۔ نہ کہ نظریے کا مبلغ بن جاتا ہے۔ اردو میں مبلغ و مقلد بہت ہوئے ہیں مگر جینوئن یا جینئس فنکاروں کی کمی رہی ہے۔ سچا فنکار قطعی آزاد
مزاج ہوتا ہے۔ وہ کسی کی گرہ کو ناپسند نہیں کرتا۔ کھلی آنکھوں اور کشادہ ذہن سے دیکھتا اور سوچتا ہے۔ اپنے آپ میں جذب کرتا رہتا ہے۔ ہم عصر اردو ادب
میں فلسفہ، جمالیات اور تنقید کے دبستانوں کی اہمیت اپنی جگہ لیکن تخلیقی ذہن تو بہرحال ان دبستانوں میں قید نہیں ہوتا۔ وہ ان میں رچ بس
جاتا ہے اور پھر ان سے ابھر جاتا ہے۔ ساری کوششیں اسی کے لئے ہونی چاہئیں جو ہو نہیں پا رہی ہیں۔ کیونکہ نئے قلم کاروں کو گمراہ کرنے والی تنقیدی
تحریریں اپنا کام بھی کرتی رہتی ہیں اور آج بھی یہی ہو رہا ہے۔ مگر نئے قلم کاروں کو نہ صرف یہ کہ اپنے عہد کو پوری طرح محسوس کرنا ہے۔ بلکہ آنے والے
زمانوں کی دھمک کو بھی سننے کی سعی پیہم کرنا ہے۔ نظریہ چاہے سیاسی ہو سماجی ہو یا مذہبی انتہا پسندی سے بچتے ہوئے اس سے استفادہ کرنے اور اپنے
ذہنوں میں اس کے مناسب نفوذ کا شعور پیدا کرنا چاہئے۔ میں مذہب کو برا نہیں سمجھتا مگر ان کے خلاف ہوں جو مذہب کی گفتگو کرنے والوں کو بنیاد پرست
سمجھتے ہیں۔ نظریوں کی زندگی یا موت کی بحث میں مذہب زیر بحث آنا چاہئے مگر وہ مذہب نہیں جو سیاسی ہو۔

ظ۔ انصاری بنام اعجاز صدیقی

دوستِ والا،

یہ میری سادہ سی کتاب 'غالب شناسی'، حاضرِ خدمت ہے۔ آپ کے تبصرہ اور توجہ کی طلب گار ہے۔

اصغر علی خان صاحب انجینیر، جو فلسفے پر مضامین لکھتے ہیں اور شاعر بھی ہیں، مستقلاً مضامین لکھنے کے اہل ہیں، انہوں نے غالب شناسی پر تبصرہ لکھا ہے، منسلک ہے بھیج رہا ہوں اور اسی کو آپ 'شاعر' کے قریبی شمارے میں جگہ دے دیں۔

اگر ضروری سمجھیے تو کتاب کو بہ یک نظر دیکھ کر اپنے قلم سے ترمیم کر لیں۔ بہر حال جو مناسب سمجھیے، لیکن شکر گزار رہوں گا اگر یہ تبصرہ ذرا جلدی نکال سکیں تاکہ آپ کے حلقے تک کتاب پہنچ سکے۔

۱۷ اپریل، اتوار، شام کو ۵-۳۰ پر (5-30 pm) چرچ گیٹ B Road یونی ورسٹی کلب ہاؤس پر آپ خصوصی طور سے مدعو ہیں۔ اس شام فراق اور روحِ غالب پر بولیں گے، میں غالب پر سوالوں کے جواب دوں گا، چند غزلیں گائی جائیں گی اور اس طرح غالب شناسی کا افتتاح ہوگا۔ آپ نہ آئے تو شکایت رہے گی۔

[signature]
12.4.66.

قمر جمیل

بی ۵، قمر پلازا، گلشن اقبال، بلاک نمبر ۲، کراچی، پاکستان

تاریخ، آرٹ اور کروچے

فلسفۂ تاریخ کو یونیورسٹیوں میں باعزت مقام دیا جاتا ہے۔ ہماری یونیورسٹیوں میں نہیں یورپ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں میں لیکن کبھی اس کی حیثیت ہماری شاعری کی سی ہو جاتی ہے اور کبھی اسے یونیورسٹیوں سے نکال بھی دیا جاتا ہے لیکن فوراً کروچے پچھلے دروازے سے واپس آ جاتا ہے۔ تاریخ کے خلاف پہلا فیصلہ تو خود ارسطو نے دیا تھا۔ کہ اس کے خیال میں تاریخ سے زیادہ فلسفیانہ شاعری ہوتی ہے

آج کل تو ایسی شاعری بھی لکھی جا رہی ہے جس سے زیادہ شاعرانہ خود ... ہے کبھی شاعری نے ہر چیز کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا تھا۔ یہاں تک تاریخ کو بھی۔ تلمیح اسی کو کہتے ہیں۔ ع

وہ سلیماں سر بہ زانو اور سبا ویراں

یہ سلسلہ تاریخ سے نکل کر اساطیر تک پہنچ جاتا ہے۔ یوسف زلیخا کا قصہ، ایوب کا صبر، طوفانِ نوح، قصۂ آدم اور باغِ ارم ان سے زیادہ شاعرانہ اور کیا چیز ہو سکتی ہے کیونکہ ان سب چیزوں کو شاعری نے اپنے دامن میں سمیٹ رکھا ہے۔

یہی تاریخ، قبل تاریخ اور اساطیر کلاسیکی شاعری ہی کا نہیں جدید شاعری کا بھی ماخذ نہیں تو اور کیا ہیں۔ دیکھئے غالب کلیم اللہ اور حضرت خلیل اللہ سے تعلق قائم کرتا ہے۔

اگر کلیم شود ہم زباں سخن نہ کنیم   وگر خلیل شود میہماں جگر دانیم

نوجوان شاعر احمد نوید نے کل مرزا دبیر کا ایک مصرع سنایا جو دبیر نے انیس کے انتقال پر کہا تھا۔ ع

طورِ سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس

انیس کو اس سے بہتر اور خراجِ عقیدت کیا پیش کیا جا سکتا تھا۔ تاتر کے سے متاثر ہو کر اقبال نے بھی کہا تھا۔ ع

آں کلیمِ بے تجلی، آں مسیحِ بے صلیب

تاریخ کے مقابلے میں شاعری کو ارسطو اس لئے زیادہ فلسفیانہ قرار دیتا ہے کہ تاریخ خصوصیت یعنی PARTICULARITY سے اپنا تعلق قائم رکھتی ہے اور شاعری آفاقیت سے۔ تو ارسطو کی اس رائے کے بعد فلسفۂ تاریخ کا یہ فرض ہو گیا کہ ایسی عمومیت GENERALISATIONS یا نمونے PATTERNS تلاش کرے جو بار بار رونما ہوتے ہیں۔ صرف حادثاتی امور تک اپنے آپ کو محدود نہ کرے۔ ایمپی ڈوکلیس EMPEDOCLES اسپنگلر اور [illegible] کی اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ تاریخ دائروں میں گھومتی ہے۔ یہ دائرے ہمارے سامنے بار بار آ سکتے ہیں۔ لیکن کسی خاص سمت میں آگے نہیں بڑھتے لیکن جو لوگ تاریخ کی رفتار کو بامقصد سمجھتے ہیں جیسے کارل مارکس ان کا یہ خیال ہے کہ تاریخ ایک خاص سمت میں آگے بڑھ رہی ہے۔ سینٹ آگسٹائن یہ سمجھتا تھا کہ تاریخ ماورائیت رکھتی ہے۔ ایک مذہبی مفکر کا ایسا سمجھنا ضروری بھی تھا لیکن کارل مارکس سمجھتا تھا کہ تاریخ کوئی ماورائیت نہیں رکھتی ہے۔ نہ کسی ماورائی قوت کی بنیاد پر تاریخ حرکت کرتی ہے۔ بلکہ تاریخ انسانی افکار اور انسانی اعمال کی نشوونما میں ظہور کرتی ہے لیکن الیس، کانٹ اور کروچے کا خیال ہے کہ تاریخ آزادی کا ترقی پسندانہ REALIZATION ہے۔ ہرڈر نے کہا کہ تاریخ روح کا آشکار ہے۔ روح یعنی اسپرٹ کا۔ اس بات کو ہیگل نے آگے بڑھایا۔ ہیگل معاشرے میں روح GEIST کا عمل اور ارتقا تلاش کرتا ہے۔ جرمن زبان میں GEIST کے معنی ہوتے ہیں۔ SPECTRE, GHOST SPIRIT, WIT, INTELLECT MIND ملاحظہ کیجئے WEICHMANN کی جرمن انگلش ڈکشنری، ان لفظوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ جرمن زبان کے اس لفظ کا ترجمہ صرف "روح" کے لفظ سے نہیں کیا جا سکتا کیونکہ روح SOUL کا ترجمہ ہے۔ ہیگل کی GEIST کا مطلب ہے اسپرٹ یا انٹلکٹ یا خیال۔ تاریخ کی مادیت اجتماعیت اور سوشلزم ہیگل

کے اسی صورت پیدا ہوئے یعنی کروچے ہیگل کی فکری روایت کو مانتا ہے۔ اس کے ہاں آزادی ہی انسانیت کا اخلاقی آئیڈیل ہے۔ آزادی ہی ابدی خالق ہے۔ اور تاریخ کی وضاحت کرنے والا بنیادی اصول ہے۔ کروچے ہیگل کی محدود عقلیت پرستی سے بچ کر لاشعور، فطرت، آرٹ اور وجدان کی دنیا میں آجاتا ہے۔ کروچے تاریخی واقعات اور ان کے علم کو الگ الگ نہیں کرتا۔

کروچے ہیگل اور سینٹ تھامس اکیناس کی طرح یہ سمجھتا ہے کہ مطلق ABSOLUTE دنیا کے PROCESS میں حل ہو جاتا ہے۔ جو قلب اور عقل بھی اس پر غور و فکر بھی کرتا ہے۔

تاریخ پرستی کے ساتھ ساتھ کروچے کا نام جمالیات کے ساتھ وابستہ ہے۔ جمالیات کے سلسلے میں اس کی اہمیت یہ ہے کہ اس نے وجدان اور اظہار کا ایک نیا نظریہ پیش کیا۔ وہ مارکس سے اس قدر ضرور متاثر ہوا کہ وہ نیکی، خوبصورتی اور سچائی کے ساتھ افادیت کو بھی ایک قدر ماننے لگا۔ ویسے وہ GEIST یعنی اسپرٹ / اصل حقیقت مانتا تھا یعنی وہ INTELLECT اور MIND کی اہمیت کا قائل تھا۔ مادہ کا نہیں۔ وہ سمجھتا تھا کہ کائنات میں جو صورتیں رونما ہوئی ہیں وہ SPIRIT کے اظہار ذات سے پیدا ہوئی ہیں۔ انسان کی روح بھی ایک وحدت ہے چنانچہ جب ہم کوئی کام کرتے ہیں تو اس میں ہماری عقل، ہمارے جذبات، ہمارا لاشعور، ہمارے احساسات سب شامل ہوتے ہیں۔ ہم جو آرٹ تخلیق کرتے ہیں اس میں ہماری روح اپنی پوری وحدت میں ظاہر ہوتی ہے۔ تاریخ کے ہر لمحے میں روح بھرپور طور سے موجود ہوتی ہے۔ ہمارا آرٹ اور ہماری زندگی دونوں روح کا مظہر ہیں۔

آرٹ اسی وقت تخلیق ہوتا ہے جب فنکار کے وجدان میں روح اپنے آپ کو معرض وجود میں لاتی ہے۔ آرٹ فنکار کے وجدان میں تخلیق ہوتا ہے۔

آرٹ کیا ہے۔ یا ایک میٹریل ... میٹریل یعنی آرٹ میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ شاعری سے لے کر عمارت سازی تک ہر آرٹ کی جان تک میٹریل اسی طرح ہے جو نقاد اس حقیقت کو نہیں سمجھتے وہ آرٹ میں نکتہ نکتہ یعنی یا فنی اظہار پر زور دیتے گئے ہیں۔ مجسمہ سازی، شاعری، موسیقی، مصوری سب یکساں ہیں۔

کروچے کا خیال ہے کہ ایپک، ڈرامائی، اور میٹریل شاعری کی تقسیم اس لئے ہے کہ آرٹسٹ OBJECTIVITY حاصل کرنا چاہتا ہے۔ تو یہ تین منزلیں آتی ہیں۔ پہلی منزل غنائی شاعری ہے۔ غزل، گیت، دوہے وغیرہ۔ ان میں ذات یا انا اپنی تصویر کھینچتی ہے۔ اپنے آپ کو پیش کرتی ہے۔ میر کا یہ شعر دیکھئے۔

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا ‏ ‏ دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

غنائی شاعری شاعر کا عاشقانہ روپ اور اس کی تصویر پیش کرتی ہے۔ اس تصویر کا تعلق ایک طرف بصری حسن سے ہوتا ہے۔ اور دوسری طرف سامعی حس سے یعنی موسیقیت سے شعر دیکھ کو پرکھتا ہے۔

WHEN-AS IN SILK. MY JULIA GOES -
THEN, THEN, ME THINKS HOW SWEETLY FLOWS
THE LIQUIFACTION OF HER CLOTHES.

اب ایپک شاعری کی طرف آئیے۔ ایپک شاعری میں شاعر اپنے آپ کو چھپا کر دنیا کو پیش کرتا ہے۔ ڈرامائی شاعری میں شاعر کی فیلنگ اپنے اظہار کے لئے کردار تخلیق کرتی ہے اور ان کے تصادم میں اپنے جذبات کا اظہار کرتی ہے۔

شاعر کی ذات، معروضیت کے یہ تین طریقے ہیں۔ جو اختیار کر سکتی ہے۔ پہلا طریقہ تو یہ ہے کہ شاعر اپنی ذات کا ڈرامہ خود پیش کرے۔ دوسرا طریقہ یہ کہ خود چھپ جائے اور دنیا کو پیش کرے اور تیسرا طریقہ یہ ہے کہ اپنے جذبات کے اظہار کے لئے کردار تخلیق کرے۔ یہ تین طریقے غنائی، رزمیہ اور ڈرامائی شاعری کہلاتے ہیں۔ غنائی شاعری صرف گیت اور غزلوں تک محدود نہیں رہتی بلکہ رزمیہ اور ڈرامائی شاعری میں بھی ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً میکبتھ اور ANTONY AND CLEOPATRA میں معقول حد تک غنائی شاعری موجود ہے۔ ہیملٹ زندگی سے بیزاری اور مایوسی کے موڈ کا اظہار ہے۔ کردار، پلاٹ اور انجام سب اسی موڈ کا اظہار ہیں۔ ہیملٹ کے مختلف مناظر اور مختلف کرداروں میں اسی مایوسی کے مختلف SHADES اور پہلوؤں کا اظہار ہے۔ اس قسم کا کردار جو صرف تخیل نہیں ہے بلکہ سچائی کا فنکارانہ اظہار ہے۔

اس سے کروچے کا مطلب یہ ہے کہ سچائی کے حصول کا ذریعہ صرف عقل نہیں۔ وجدان بھی ہے۔ آرٹ کا تعلق وجدان سے ہوتا ہے جو عقل سے نہیں۔ آرٹ کا جوہر IDEALITY ہے جو اسے سائنس اور عقل سے الگ کر دیتا ہے۔ IDEALITY سے مراد وہ جوہر ہے جو صرف خیال یا تصور

موجودہ دور میں فنکار جب اپنے خیال یا تصور سے مکمل کر خود ذکر اور ان سے تعلق کر دیتا ہے تو آرٹ ختم ہو جاتا ہے۔ وجدان چیزوں کو ان کی کلیت میں دیکھنے کا نام ہے برگساں نے وجدان کا تصور بڑی شدومد سے پیش کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وجدان اشیاء کی اصل حقیقت تک پہنچنے کا ذریعہ ہے اور INTELLECT یعنی عقل صرف عمل کی دنیا میں ہماری رہنمائی کرتا ہے لیکن کروچے وجدان کو جمالیاتی تجربے کا ذریعہ بتاتا ہے۔ وجدان کو جو چیز ہم آہنگی عطا کرتی ہے وہ احساس کی شدت ہے اور احساس کی یہی شدت آرٹ کی علامتوں کو یکجا بھی کر دیتی ہے۔

کروچے کہتا ہے کہ فنکارانہ وجدان ہمیشہ غنائی ہوتا ہے۔ وجدان کے ساتھ غنائی کہنا ایک زائد لفظ کا استعمال ہے کیونکہ وجدان ہوتا ہی غنائی ہے۔

آرٹ کے نمونے وہ ہوتے ہیں جن میں ذہن کی مختلف قوتوں کی کشاکش رہتی ہے۔ جو حل نہیں ہونے پاتی۔ کروچے کہتا ہے کہ شاعر جب اپنے جذبات کا اظہار لفظوں میں اپنے ذہن میں کرتا ہے۔ تو نظم اسی وقت مکمل ہو جاتی ہے۔ پھر جب نظم سپرد قلم کرتا ہے یا دوسروں کو سنانا چاہتا ہے۔ یا اشاعت کی غرض سے بھیجتا ہے تو اس بات کا تعلق عمل کی دنیا سے ہوتا ہے۔ جمالیات کی دنیا سے نہیں۔ اگر مصور کے برش کا اسٹروک اس کے وجدان کے مطابق نہ ہو تو مصور اس اسٹروک کو منسوخ کر دیتا ہے۔ اور پھر درست کرتا ہے۔ تکنیک کا تعلق دماغ سے ہے۔ تکنیک آرٹ کا بنیادی عنصر نہیں ہے جو فنکار اپنے آرٹ میں کوئی محسوس کرتا ہے وہی تکنیک پر زندہ رہتا ہے۔ جتنا حساس قاری شعر کے ایک ایک مصرعے میں ان گنت کیفیتیں محسوس کرتا ہے۔ شاعر کے ایک مصرعے میں ایک حساس قاری کو ایک پینٹنگ مل سکتی ہے ایک مجسمے کی بھرپور کیفیت مل سکتی ہے۔ ایک عمارت کا پورا اسٹرکچر مل سکتا ہے۔

دیکھنے والے کی روح میں تصویر صرف رنگ کے طور پر نہیں بلکہ آواز کی حیثیت سے بھی زندہ ہوتی ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ ہم مصوری یا موسیقی کی کیفیات کو گرفت میں نہیں لے سکتے۔ یہ خصوصیات ہماری گرفت سے باہر ہو جاتی ہیں۔ ایک خصوصیت دوسری خصوصیت میں ڈھل جاتی ہے یا مختلف خصوصیتیں مل کر ایک ہو جاتی ہیں۔

آرٹ دراصل ایک ہوتا ہے۔ اسے مختلف فنون میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے باوجود آرٹ لامحدود طور پر متنوع ہوتا ہے۔ مختلف فنون کے تصورات کے طور پر نہیں بلکہ فنکارانہ شخصیتوں اور ان کی ذہنی کیفیتوں کے لامحدود تنوع کے طور پر۔

کروچے کی رائے میں شاعری کی بنیاد شخصیت پر ہوتی ہے اور شخصیت کی تکمیل اخلاقیات سے ہوتی ہے یعنی شاعری کی بنیاد اخلاقی شعور سے گہرا تعلق رکھتی ہے لیکن صرف اخلاقی شعور کسی کو شاعر بنانے کے لئے کافی نہیں ہے۔ شاعر کے لئے شاعرانہ جینیس ضروری ہے۔ یہ تو سب چیزیں ایندھن کا کام کرتی ہیں۔ کروچے کے خیالات کو خلاصے کے طور پر یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔

شاعری کا کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ کوئی پیغام نہیں ہوتا۔ شاعری اس چراغ کی طرح ہوتی ہے جو اپنی روشنی کا باعث خود ہوتی ہے اور تاریکی میں چھپی ہوئی چیزوں کو روشن کر دیتی ہے۔ ہر شخص کے دل میں خواہ وہ مفکر، سیاست داں یا نقاد، تخیل کا ایک پرائیوٹ ذخیرہ ضرور ہوتا ہے ● سیاسی شاعری، شاعری نہیں ہوتی۔ شاعری کا تعلق تخیل کی دنیا سے ہوتا ہے لیکن خالص شاعری کا تصور مضحکہ خیز ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے آپ پھول پر یقین رکھتے ہوں لیکن یہ سمجھتے ہوں کہ پھول زمین اور پودے کے بغیر اگ سکتا ہے۔ واقعات کی دنیا اور ہوتی ہے خواہشات کی دنیا اور۔ شاعر خواہشات کی دنیا کو پیش کرتا ہے آرٹ کا تعلق حقیقی شاعرانہ تخیل سے ہوتا ہے صرف FANCY یعنی خیال آفرینی یا خیالی اڑان سے نہیں ہوتا۔ آرٹ اپنے احاطے میں اس طرح رہتا ہے جیسے بادشاہ اپنی مملکت میں۔

شاعری غیر معقول نہیں ہوتی اور نہ منطق سے لاپروائی برت سکتی ہے اس کی اپنی ایک معقولیت اور اپنی ایک منطق ہوتی ہے۔ آرٹ کی بنیاد وجدان ہے اور فلسفہ کی بنیاد عقل۔ اچھا قاری آرٹ کی روح کے اندر اتر جاتا ہے۔ آرٹ کے دل کی دھڑکن سنتا ہے اور اگر یہ دھڑکن اسے سنائی نہ دے تو وہ اس شاعری کو رد کر دیتا ہے۔ انسانی روح صرف علم سے مطمئن نہیں ہوتی۔ بلکہ عمل کی دنیا میں بھی قدم رکھنا چاہتی ہے اسی لئے ہم تاریخ میں حصہ لیتے ہیں۔

خطابت شاعری کی آفاقیت کو ختم کر دیتی ہے۔ مقبول شاعری اور عظیم شاعری میں فرق ہوتا ہے۔ مقبول شاعری ان جذبات کا اظہار ہے جو عام فکر اور جذبات کی سطح کے مطابق ہوتی ہے۔ عظیم شاعری فلسفہ حیات کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ عظیم شاعری ہمارے اندر عظیم یادوں اور عظیم خیالات کو بیدار کرتی ہے۔

شاعری وہ سنہرا تیر ہے جو آسمان کی طرف چلایا جاتا ہے یعنی آرٹ کا کوئی مقصد نہیں ہوتا۔

لیکن کروچے یہ تسلیم کرتا ہے کہ آرٹ فنکار کی شخصیت کا اظہار ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آرٹ پورے معاشرے کی شخصیت کا اظہار بلکہ پوری انسانیت یا آفاقیت آرٹ کی معنویت ہے۔ *

ابو محمد سحر

طائرِ دل اتنی سعی بال و پر اچھی نہیں
آجکل اونچی اڑانوں کی خبر اچھی نہیں

زندگی میں کچھ خوشی کا بھی فسانہ چاہیے
اک کہانی دکھ بھری کی عمر بھر اچھی نہیں

روز و شب جھوٹی امیدوں پر بھی جینا ہے فضول
گرچہ نومیدی کی بھی شام و سحر اچھی نہیں

دل میں ہے کچھ تو اسے تفصیل کی زحمت بھی دے
یہ تبسم کی ادائے مختصر اچھی نہیں

دشمنِ امروز ہے بیتی ہوئی باتوں کا غم
یادِ عہدِ رفتہ اے آشفتہ سر اچھی نہیں

گھر ہے جو ہر وقت آثارِ قدیمہ کا گماں
خامشی اچھی ہے لیکن اس قدر اچھی نہیں

ہم نے مانا دور کے گا زمانہ اے سحر
پھر بھی خود کو بھول جانے کی ڈگر اچھی نہیں

۲۹ - مالویہ نگر - بھوپال - ۳

غالب عرفان

تم ساتھ ہو اور مجھ سے کچھ دور ہے تنہائی
لیکن اسی آنگن میں مستور ہے تنہائی
دہلیز پہ آہٹ سی، دروازے پہ دستک سی
اس کمرے میں وحشت سے بھرپور ہے تنہائی
انجان سی راہوں پر چل کر ہی جانا ہے
میری ہی اکائی کا دستور ہے تنہائی
تو نے مجھے بخشی کیوں ہر انجمن آرائی
جب تیری تجلی کا ہر نور ہے تنہائی
ماحول میں انساں کے اب تک وہ ادھورا ہے
جس فرض پہ مدت سے مامور ہے تنہائی
اس نام کی نسبت کی شہرت پہ نہ جانا تم
مجھ سے بھی سوا میری مشہور ہے تنہائی
مجھ کو بھی اکیلا پن ڈستا ہے کبھی تو کیا
وجدان کے لمحوں کو منظور ہے تنہائی
عرفان کی لہروں کو حاصل نہیں یکسوئی!
جس دن سے مرے گھر سے مفرور ہے تنہائی

ایل-۵۵، سیکٹر-سی، نارتھ کراچی، کراچی

مشتاق شبنم

کبھی تو ڈوب کے، کبھی ابھر کے دیکھتے ہیں
کرشمے ہم یوں ہی شام و سحر کے دیکھتے ہیں
کب اس دریچے سے، سورج طلوع ہوتا ہے
چلو! ہم اس کی گلی میں ٹھہر کے دیکھتے ہیں
وہاں بھی رنگِ وفا کچھ نہ کچھ ملے گا ضرور
ستم شعاروں کے دل میں اتر کے دیکھتے ہیں
یقیں ہے ہم کو رکے گا وہ تیز آندھی سے
عجیب حوصلے تنہا شجر کے دیکھتے ہیں
بچھڑنے والے کو اب جلد لوٹنا ہے
کہ راہ اس کی، دریچے بھی گھر کے دیکھتے ہیں
قیام کرنا پڑا ہے جو مقتلوں کے
اس امتحاں سے کبھی آؤ گزر کے دیکھتے ہیں
یہ سامنے ہے جو منظر، اسے بدلنا ہے
سمٹ کے دیکھ لیا، اب بکھر کے دیکھتے ہیں
تمہارے شہر میں شاید کہیں ملے عزت
خراب حال بہت تھے، سنور کے دیکھتے ہیں
کسی کے عیب سے ہم کو غرض نہیں
کہ ہم تو بس ہنر اہلِ ہنر کے دیکھتے ہیں

شونا تھ بھون — (دہلی)

اقبال مجید
شملہ بل بھوپال — (مدھیہ پردیش)

سب اکیلے ہیں

میں نے یہ درد بھی تمہارے لئے سہہ لیا ہے۔!

ادھر میری طرف نظریں اٹھا کر دیکھو۔!!

(لیکن اس نے نہیں دیکھا)

دیکھو نا میری آنکھوں میں کہ اگر جھوٹی ہوں گی تو ان میں وہ صاف شفاف روشنی تمہیں نہیں ملے گی کہ جس کا جلوہ کبھی کسی پہاڑ پر آگ کی تلاش میں بھٹکتے ہوئے آج سے ہزاروں سال پہلے کسی فرشتے نے دیکھا تھا۔

(لیکن اس نے میری آنکھوں میں نہیں دیکھا۔)

میری بات سنو کہ ہر لمحہ بہت قیمتی ہے۔ اور ہر گزرا ہوا پل ایک جان پر حساب کتاب ہے کہ اگر یادوں میں ٹھہر جائے رک جائے۔ بکھر جانے کا نام ہے تو دبی ہوئی چنگاری کے مانند اٹھتے ہوئے کانٹے کی طرح یکبارگی ایسا جلاتا ہے کہ ایسا کھٹکتا ہے کہ مرنے بھی نہیں دیتا اور جینے بھی نہیں دیتا۔

(لیکن تب بھی وہ یونہی گم سم رہی)

اور وہ شام بھی گذر گئی۔ اُداس خالی خالی اُجڑی اُجڑی بے معنی شام، نہ جانے کتنی شامیں سمیٹ کر لے جاتی ہیں! اور جس سے کچھ نہیں ہوتا مرد کے لئے اس سے دلچسپ کھیل اور کیا ہوگا اسے اتنا تو معلوم ہی ہوتا ہے کہ دوسری شام بھی آئے گی۔

(اور دوسری شام آئی)

وہی میز وہی میز پر لٹکتا ہوا روشنی کا مدھم سا دائرہ، وہی ہلکی ہلکی موسیقی اور پھر وہی سوچے ہوئے تراشے ہوئے گرم گرم الفاظ

یہ جو میں تم سے بیان کر رہا ہوں کیا تم پر کبھی گذری ہے!

میرا مطلب ہے کہ کیا کبھی ایسا ہوا ہے کہ تم نے اس بھاگتی دوڑتی زندگی میں کبھی کوئی میٹھا میٹھا درد سہا ہو۔ کوئی الزام اپنے سر لیا ہو۔ اپنی ایمانداری کو بیچ جانے کی کسی سے بھیک مانگی ہو۔ اپنی بات کسی کو سنانا چاہی ہو اور . اور

(اور وہ شام بھی گذر گئی)

مرد کو اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ دوسری شام بھی آئے گی۔

(اور دوسری شام آئی)

تب تک اس کے آنسو آنکھوں سے بہہ کر گالوں سے ہوتے ہوئے ہونٹوں کے کونوں تک آ کر چھلکے تھے۔ گہری لپ اسٹک والے ہونٹ بار بار پھڑک رہے تھے۔ گلاس میں بچا ہوا آدھا جوس یونہی ایک طرف رکھا تھا۔

پچھلی کچھ شاموں سے میں اس لڑکی کو دفتر سے اٹھا لاتا تھا۔

یہ بات مجھے بعد میں معلوم ہوئی کہ لڑکی کوئی ایسی شے نہیں ہوتی جس کو برساتی یا چھتری کے مانند ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ لے جایا جا سکے۔ بعض مرد لڑکیوں کے معاملے میں بیانات دیتے وقت ایسا محسوس کرتے ہیں کہ وہ دنیا کے واحد مرد ہیں جنہیں لڑکیوں کے بارے میں کچھ معلوم ہے۔ اور جو کچھ انہیں معلوم ہے بس وہی سچ ہے۔

لیکن وہ شام۔ رخساروں پر پھسلتے ہوئے گرم گرم آنسوؤں والی وہ شام جب وہ میرے سامنے تھی۔ دبلی پتلی سانولی سلونی سی لمبے قد کی یہ لڑکی ایک دن اچانک بس یونہی اتنی اچھی لگی تھی کہ جی میں آیا۔ تھا کہ اسے چھو کر اور محسوس کر کے دیکھوں کہ من کو بھا جانے والی ہر لڑکی ایک کائنات ہے اور ایک ان دیکھی، خوبصورت اور دلکش وادی ہے جس کی خوشبوئیں اور حرارتیں قریب آنے کی دعوت دیتی ہیں اور اسے EXPLORE کرنے کے لئے چیلنج کرتی ہیں۔

لیکن شامیں ایک جیسی ہوتی ہیں۔ سارے الفاظ دنیا کے سارے مرد دنیا کی ساری لڑکیوں کے لئے استعمال کر چکے ہیں۔ کچھ بھی تو نیا نہیں رہ گیا۔ لیکن وہ لڑکی جو سامنے بیٹھی تھی پچھلی کچھ شاموں سے میرے ساتھ تھی ایسی لڑکی دنیا میں کبھی پیدا نہ ہوئی تھی۔ اور ایسی شام دنیا میں کبھی نہ آئی تھی جو اس شام تھی میرے سارے لفظ بھی نئے تھے۔ ان چھوئے، اچھوتے، جو صرف اس لڑکی کے لئے پیدا ہوئے تھے اور اس لڑکی کے ساتھ ختم ہو جانے والے تھے۔

میں نے دیکھا وہ جیسے اپنے آپ سے لڑ رہی تھی۔ اتنی بہادری سے

میں بادشاہت کا کیا کروں گا

سرشار بلند شہری

...ا ہت کا کیا کروں گا
...میری عزیز تر ہے
...فری شجر تک
...شریں پہنچ رہی ہیں
...جنگلوں میں کوئی
...رگیت گا رہا ہے
...ساڑوں کے دامنوں میں
...ت لڑکی گذر رہی ہے
...ریوڑ سجے ہوئے ہیں
...کر گاؤں کی گلی میں
...ہ جبیں کے رُخ پہ
...رچم مہک رہا ہے
...کھیت کے کنارے
...شمہ مچل رہا ہے
...ایں حسین پرندہ
...ت پرواز کر رہا ہے
...رک پہ ہٹیلے گبھرو
...گا کے گذر رہے ہیں
...جھونپڑی میں گوالن
...ں گا کے بلو رہی ہے
...آنکھ میں تسلسل
...نم سورج مہک رہے ہیں
...ے کان میں کہیں سے
...کی آواز آرہی ہے
...شاہت کا کیا کروں گا
...دشاہت کا کیا کروں گا
...دشاہت کا کیا کروں گا
...ن زمینوں کا کیا کروں گا
...سمانوں کا کیا کروں گا
...دشاہت کا کیا کروں گا
...فقری عزیز تر ہے
...فقری عزیز تر ہے

کرامت بخاری

میں صحرا ہوں

میں صحرا ہوں
مری مٹی نہ جانے کب سے بارش کو ترستی ہے
مری جلتی ہوئی بے خواب آنکھوں نے
ہرا موسم، برستی رُت نہیں دیکھی
کوئی ندی
انوکھے منظروں کی جستجو میں
اس طرف کا رُخ اگر کر لے
تو رستے میں کہیں دم توڑ دیتی ہے۔
کہیں ریگِ رواں میں ڈوب جاتی ہے۔
کبھی بادل کوئی اُٹھے
مجھے سیراب کرنے کو
تو اس کے بادباں دیوار بن جاتے ہیں رستے میں
وہ لنگر ڈال دیتا ہے کسی شاداب بستی میں

جہاں ٹھنڈی ہواؤں میں دھنک انگڑائی لیتی ہے
جہاں خوشبو کا ڈیرہ ہے
جہاں شبنم کی افشاں سبزہ زاروں میں دمکتی ہے
میں صحرا ہوں
میرے آنگن میں وحشت ہے اندھیرا ہے
ہوائیں چیختی ہیں اور بگولے رقص کرتے ہیں
مری مٹی ترستی ہے۔
کسی پازیب چھنکاتی ندی کے لمس کی نم کو
کسی آوارہ بدلی کو
کسی رِم جھم کے موسم کو
مری مٹی ترستی ہے۔
خدا جانے کہاں شبنم اُترتی ہے
کہاں بارش برستی ہے
میں صحرا ہوں

● ۲۷۰ - اے فیصل ٹاؤن - جی او آر III - لاہور (پاکستان)
● ۲۸ جیوا پیر کی چال، دودھیشور روڈ، احمد آباد - ۴ (گجرات)

ندا فاضلی

۳۰۱، امرا پارٹمنٹ، ۳ نپاڑہ، اکھار بھی، ممبئی ۵۲

داغ دہلوی - غزل کا ایک اسکول

مغلیہ بادشاہ شاہ عالم کے آخری دنوں میں پٹھانوں کا ایک خاندان سمرقند سے اکھڑ کے روزی روٹی کی تلاش میں ہندوستان آتا ہے اور کچھ مہینے تک زمین آسمان کی کھوج میں اِدھر اُدھر بھٹکتا ہے۔ اور پھر دہلی کے ایک نئے ٹھکانے میں بس جاتا ہے۔ اس خاندان کی دوسری نسل میں ایک نوجوان احمد بخش خاں الور کے راجہ بختاور سنگھ کے اس فوجی دستے کی سرداری کا فرض نبھاتا ہے جو راجہ کی طرف سے بھرت پور کے خلاف انگریزوں کی حمایت میں بھیجا جاتا ہے۔ لڑائی کے میدان میں یہ نوجوان اپنی جان کو داؤں پر لگا کر ایک انگریز کپتان کی جان بچاتا ہے۔ اور اس وفاداری کے صلے میں دربار دہلی سے فیروزپور اور جھرکا نامی علاقوں کی جاگیر انعام میں پاتا ہے۔ الور کی ایک میواتی بیوی سے اسی جانباز سپاہی کا لڑکا شمس الدین خاں جاگیر کے تحفظ میں انگریزوں کی ناانصافی کے خلاف آواز اٹھاتا ہے۔ وہ برٹش ریذیڈنٹ کے قتل کا ملزم بنتا ہے۔ اور اس جرم میں بھری جوانی میں ۱۸۳۵ء میں پھانسی کی سزا پاتا ہے۔ وقت بھی کیا کیا کھیل دکھاتا ہے۔

دلی والے اس بہادر کی موت پر آنسو بہاتے ہیں۔ اور برسوں اس کی قبر پر پھول چڑھاتے ہیں۔

مرزا خاں انہیں شمس الدین کے پہلے اور آخری بیٹے ہیں جو بعد میں اردو غزل کی تاریخ میں نواب مرزا خاں داغ کے نام سے مشہور ہوتے ہیں۔ والد کی پھانسی کے وقت مرزا خاں چار سال چار مہینے کے تھے۔

یہ سانحہ ان کی ماں وزیر بیگم کو بھی کئی سال تک انگریزوں کے خوف سے روپوش زندگی گزارنے پر مجبور کرتا ہے۔ چار سال چار مہینے کے مرزا خاں کو بھی بچپن کی اس کچی عمر میں ماں کی ممتا سے دور کر دیتا ہے۔ ماں بیٹے کی یہ دوری اس وقت ختم ہوتی ہے جب کئی سالوں کے بھٹکاؤ کے بعد وزیر بیگم کی ملاقات آخری مغل سمراٹ بہادر شاہ ظفر کے جانشین مرزا فخر الدین سے ہوتی ہے۔ یہ ملاقات جلد ہی وزیر بیگم کو نواب شوکت محل کے خطاب سے نواز کر لال قلعہ کی ملکہ بنا دیتی ہے۔ شاہی محل کے سکون نے ملکہ بنی ہوئی ماں کے دل کو بے سکون کیا۔ تو مرزا خاں جو اب نو دس برس کے ہو چکے تھے، رام پور میں اپنی خالہ کے یہاں سے لال قلعہ میں بلا لئے گئے۔

خدا جب دوست ہے اے داغؔ کیا دشمن سے اندیشہ
ہمارا کچھ کسی کی دشمنی سے ہو نہیں سکتا

لال قلعہ میں مرزا خاں کی تعلیم و تربیت شاہزادوں جیسی ہوئی۔ اردو فارسی کے ساتھ نشانہ بازی، گھوڑ سواری، تلوار زنی وغیرہ بھی ان کی تعلیم کا حصہ تھے۔ یہیں کے شاعرانہ ماحول نے ان میں چھپے ہوئے شاعری کے ذوق کو گہرا کیا۔ وہ محل کے استاد شیخ ابراہیم ذوق کے سب سے کم عمر شاگرد تھے۔

بعد استاد ذوق کے کیا کیا
شہرت افزا کلام داغ ہوا

اس دور کا لال قلعہ بہادر شاہ کے بڑھاپے کی طرح ہندوستان میں مغلیہ تاریخ کی آخری سانسیں گن رہا تھا۔ لال پتھروں کی اس کشادہ عمارت میں اب بابر کی تلوار کی چمک تھی نہ اکبر کے کردار کی لچک تھی۔ اب اس کے پاس جہانگیر کے انصاف کی شان تھی، نہ شاہجہاں کے عشق کی آن بان تھی۔

بادشاہ صرف نام کا تھا۔ حکومت پر انگریز ریذیڈنٹ کا اختیار تھا۔ مغلوں کا یہ زوال اورنگ زیب کے بعد اٹھارویں صدی کے ابتدائی سالوں سے ہی شروع ہو چکا تھا۔ محمد شاہ کے دور میں نادر شاہ کے حملے اور دلی میں اس کی فوجوں کے کھلے عام لوٹ مار نے جس میں ایک دن میں تیس ہزار سے زیادہ دلی والے مارے گئے تھے، مغلوں کی ساکھ کو بری طرح نقصان پہنچایا تھا۔ چاروں طرف نئی طاقتیں سر اٹھانے لگی تھیں۔ اور بادشاہ آہستہ آہستہ اپنی ہی کمزوریوں کی وجہ سے اپنے ماتحتوں کی کٹھ پتلیاں بنتے جا رہے تھے۔ انگریزوں نے ان حالات سے فائدہ اٹھایا۔ اور ۱۸۰۳ میں شاہ عالم کی بادشاہت کو لال قلعہ کی آسائشوں

رحمت امروہوی

کانٹوں بھری یہ زیست بھی راس آگئی ہمیں
اب جو بھی ہے، جیسی بھی ہے، بھا گئی ہمیں

ہر تیرگی کے بعد اُجالا ضرور ہے
ہر رات جلتے جاتے یہ سمجھا گئی ہمیں

بیٹھے بٹھائے آنکھ سے آنسو چھلک پڑے
برسوں پرانی بات جو یاد آ گئی ہمیں

پینسٹھ برس گزار دیئے ہم نے جاگ کر
اب سو رہے ہیں جاگئیے نیند آ گئی ہمیں

کچھ تذکرہ تھا ہستیِ ناپائیدار کا
اپنی حماقتوں پہ ہنسی آ گئی ہیں

مرزا پور، مودی کا نرولو، احمد آباد - ۳۸۰۰۰۱ (گجرات)

احتشام اختر

ہزاروں سال سے میں جس کے انتظار میں تھا
وہ عکسِ خواب تو میرے ہی اختیار میں تھا

وہ میری ذات کے پرتو سے ماہتاب ہوا
وگرنہ کرۂ بے نور کس شمار میں تھا!

ہرے شجر سے مجھے اب کوئی لگاؤ نہ تھا
میں برگِ خشک تھا اڑتے ہوئے غبار میں تھا

سفر میں یوں ہی جھلستا رہا خبر نہ ہوئی
کہ ٹھنڈے پانی کا چشمہ بھی رہگذار میں تھا

لباس روح سے دھاگے الگ نہ کر پایا!
مرا وجود تو پنہاں ہر ایک تار میں تھا

میں بدگماں نہ کبھی اس سے ہو سکا اختر
عجب طرح کا مزہ اس کے جھوٹے پیار میں تھا

پرانا خزانہ ہاؤس۔ سول لائنز۔ کوٹہ ۳۲۴۰۰۱

بشیر سیفی

بھولا بسرا خواب ہوئے ہم
کچھ ایسے نایاب ہوئے ہم

دریا بن کر سوکھ گئے تھے
قطرے سے سیراب ہوئے ہم

جانے کس منظر سے گذرے
پل بھر میں پرآب ہوئے ہم

خود اپنی ہی گہرائی میں
آخر کو غرقاب ہوئے ہم

خوابوں کی تعبیر بھی دیکھیں
اتنے کب خوش خواب ہوئے ہم

بات زباں پر لا کر سیفی
بے وقعت بے آب ہوئے ہم

۱۱۹۸/۱-بی اسٹریٹ ۵- دلوا

اردو ڈرامہ نگار متوجہ ہوں

اردو اکادمی، دہلی کو نومبر 1994ء میں متوقع اپنے ڈرامہ فیسٹول کے لئے چار طبع زاد یا ایسے چار نئے اسکرپٹ درکار ہیں جو اردو کے کسی مقبول ناول یا افسانے پر مبنی ہوں۔ طبع زاد اسکرپٹ اوپیرا یا منظوم ہیئت میں بھی ہو سکتے ہیں۔ منتخب ہونے والے ہر طبع زاد اسکرپٹ پر دس ہزار روپے اور کسی ناول یا افسانے پر مبنی اسکرپٹ پر پانچ ہزار روپے دیئے جائیں گے۔

شرائط

- منتخب اسکرپٹ کے جملہ حقوق پانچ سال تک اردو اکادمی، دہلی کے پاس رہیں گے
- ایک نام سے ایک ہی اسکرپٹ قبول کیا جائے گا
- اسکرپٹ 75 سے 120 منٹ تک کا ہونا چاہیئے
- اسکرپٹ اکادمی کو بھیجنے سے پہلے کہیں بھی کسی صورت میں استعمال نہ ہوا ہو۔ اسکرپٹ کے ساتھ ڈرامہ نگار کی اس نوعیت کی یقین دہانی تحریری صورت میں آنی لازمی ہے
- ماخوذ ڈرامے کے ساتھ اصل مصنف / ورثا کی تحریری اجازت بھیجنا لازمی ہے
- اسکرپٹ اردو رسم الخط میں کاغذ کے ایک طرف صاف ستھرا لکھا ہونا چاہیئے
- اسکرپٹ پوری طرح اسٹیج ہونے کی ضرورتوں کو پورا کرتا ہو
- ڈرامے کے لئے موضوع کی قید نہیں
- اسکرپٹ کے انتخاب میں اکادمی کا فیصلہ قطعی سمجھا جائے گا
- کسی طرح کی قانونی چارہ جوئی دہلی کی عدالت میں ہی ہوگی
- ڈرامہ اسکرپٹ اکادمی میں موصول ہونے کی آخری اور قطعی تاریخ 12/ ستمبر 1994ء ہے۔

پتہ:- سکریٹری، اردو اکادمی، دہلی، گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی-110002

بے شک وہ ایک غیر معمولی ساز تھا۔ ان گنے چنے سازوں میں
...ت نمایاں۔ جو بہت انوکھے اور مختلف معلوم ہوتے ہیں۔ اور جن سے
...نہ تیس برس کے دوران اس بداخلاق لائن پر ملاقات ہوئی [illegible]
...، اور آخری ملاقات کے چند روز بعد کنڈے سے متعلق ایک [illegible] خبر
نے مجھے عجیب مخمصے میں ڈال دیا۔

خبر کیا تھی اخبار بیچنے کا بہانہ تھا یا خبر اور اشتہاریہ کا ملا جلا گٹ
...وقت میں ٹھیک طرح سمجھ نہیں پایا۔ اخبار میں ایک چھوٹا سا چوکھٹا بنا کر
...ن کنڈے کے شب و روز بیان کئے گئے تھے۔ وہیں ایک شادی شدہ
...رت کے قتل کی خبر بھی درج کر دی گئی تھی۔

میرے لئے اس خبر کا سب سے اہم پہلو یہ تھا کہ خصوصی نامہ نگار نے
...کے ایک مشہور محراب ساز مستری کو بدچلنی کے شبہ میں مبینہ طور پر اپنی
...ی کا قاتل قرار دیا تھا۔

جو ہوا سو ہوا۔ پر کیا وہ مشہور محراب ساز مستری وہی سرخ ٹوپی
...نوجوان تھا۔ ؟ کیا وہ قاتل بھی ہو سکتا ہے ؟ میں برابر سوچتا رہا لیکن اپنے
...غل منصبی کے سبب کنڈے جا کر حقیقت معلوم کرنا میرے لئے دشوار
...صرف یار دوستوں میں بات چلتی رہی۔ احباب نے اسے ایک اندھا
...ہی قرار دیا یا اسے میک ملی جگت۔ [illegible] اپنی جگہ قائم رہی۔

مسافروں کے ہاتھوں میں تھامے ہوئے اخبارات میری نظروں سے
...تے رہے پر عدالتی تفتیش کی رپورٹنگ کہیں دیکھنے کو نہ ملی۔

لوگ کہتے ہیں کہ مستری نے عدالت میں صرف ایک ہی استدعا کی :
"صرف تھوڑا سا کام رہ گیا ہے صاحب۔ مسجد کا کام ادھورا چھوڑ
...دھر کیا منہ دکھاؤں گا صاحب۔"

لیکن ایسی باتیں عدالتی کارروائیوں کو تھوڑی ہی متاثر کر سکتی ہیں۔
...معلوم ہوا کہ مستری پھانسی چڑھ گیا۔

بڈھا آدمی بھی کس کام کا۔ مسلسل تھکا دینے والے سفر میں اونگھ کے
سبب میں بیچ اردگرد کی فضا سے کٹ کر رہ گیا تھا۔ جب آنکھ کھلی تو میرے
...نے اور باہر کے اکثر مسافر تبدیل ہو چکے تھے۔ سوچا اگلے اسٹیشن سے
...ڈن کی پڑتال شروع کروں گا۔ اور اطمینان کے ساتھ سنبھل کر بیٹھ گیا۔

"بابو جی۔ اس بداخلاق لائن پر سفر کرتے ہوئے تین برس گذر گئے۔
...ن مجال ہے کبھی آنکھ لگی ہو۔ آپ پر خدا کی خاص مہربانی ہے صاحب
...نیک دل لوگوں کی خاص پہچان ہے۔"

سرخ ٹوپی اور ڈھیلی فرغل میں ستواں ناک، کرنجی آنکھوں اور چوڑے
شانوں والا میرا تنہا ہمسفر گویا مجھ سے مخاطب تھا اور میں حیران کہ بیٹھا
وہ پھانسی چڑھ جانے والا محراب ساز مستری دوبارہ کیسے جی اٹھا۔

وہ کہہ رہا تھا: "بہت دن اجنبی بلکہ وحشی مسافروں سے ملا ہوں صاحب۔
بہشت کے لئے بھی جانے کے لئے بیشک آنکھ [illegible] پر۔ پر پیٹ کے کام کو
بھی کچھ ایسا ہے صاحب کہ ہر طرف جانا پڑتا ہے۔"

پھر اس نے صدری کی بالائی جیب سے مڑا تڑا سگریٹ نکالا اور اسے
سلگاتے ہوئے گہرا کش لیا۔

"دل نہیں چاہے تب بھی جانا پڑتا ہے صاحب! اپنے پرکھوں کا کوئی
وعدہ نبھانے کی خاطر۔ پرانے حساب چکانے ہوتے ہیں۔ گذشتہ چار پشتوں
سے ہم یہی کچھ کرتے آئے ہیں۔ لوگ کہیں سے کہیں پہنچ گئے صاحب۔ لیکن ہم
وہیں کے وہیں ہیں۔ سنگ مرمر اور ٹائلوں کی کٹائی اور چنائی پر مجھے
کوئی گھمنڈ نہیں ہے۔ تو اوپر والے کی خاص عطا ہے صاحب اور اس
فقیر کی روزی کا سبب۔ ورنہ ایک لاوارث بچہ کس کام کا صاحب۔ اللہ کارساز ہے۔

والد صاحب قبلہ نے سوائے مسجد کی محرابوں کی تزئین کے دوسرے
کام کو کبھی ہاتھ نہیں لگایا۔ جوانی میں گذر گئے۔ مجھے تنہا چھوڑ گئے اپنے
ادھورے کاموں کے ساتھ۔"

"کیوں نہیں کرتے کوئی دوسرا کام۔ در بدر پھرتے ہو۔" میں نے کہا۔

"بابو جی۔ شوقین مزاج بہت مجبور کرتے ہیں کہ رہائشی بنگلوں کی آرائش
کروں۔ منہ مانگی اجرت دیتے ہیں لیکن۔ مجھ سے ایسا ہوتا نہیں صاحب۔ اللہ
کے گھر سنوارتا ہوں۔ اسی لئے اجنبی علاقوں کا ہو کر رہنا پڑتا ہے۔ گھر
بار چھوڑنا پڑتا ہے۔ مہینوں پلٹ کر خبر نہیں لیتا۔ لوگ کہتے ہیں ہم مٹی ہی
مٹی کے بنے ہیں۔ کیا کریں صاحب! کس کا جی نہیں چاہتا کہ اپنے گھر رہیں تو۔"

"شادی شدہ ہو؟"

"ہاں صاحب۔ ابھی دو ماہ پہلے شادی ہوئی ہے یقین کیا کروں صاحب
یہ کام بھی تو کرنے ہیں۔"

بے شک۔ میں بولا۔

"اب کدھر کا ارادہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اپنے آبائی علاقے میں جا رہا ہوں صاحب۔ کنڈے کا نام تو سن رکھا
ہوگا آپ نے۔ روز گذرتے ہیں ادھر سے پر دیکھا نہ ہوگا اتر کر۔"

"ہاں کنڈے کیا۔ عشرت کنڈے کہو نا۔ خاصا بدنام علاقہ ہے۔"

"دو کوڑی کا بدنام سا بدنام۔ محمودی سنگلاخ چٹانوں اور [illegible]
گرد شوروں میں آباد یہ ہنستا بستا قصبہ ہمیشہ سے ایسا نہیں تھا صاحب

"تاتاری میں نالش والے خوش حال گاڑی والے کے مستقل قیام کے سبب صدیوں سے آباد ہیں۔ نام شاد دیکھتے دیکھتے اسے جانے کس کی نظر لگ گئی ہے جانا زقیچے کے بڑے اُجڑ گئے۔ بلے بیٹھے، جب حویلیوں کے در و بیل در و اندروں کی چہچہاہٹ دم توڑ گئی۔ کیا یہ سب بدلی الٹی ہوا کے چلنے کی اس طرف آ کے ہوا لپٹا۔"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں میاں! بس نام ہی نکلا ہے تمہارے خانے کا۔"

"صاحب! چند شکستہ بوسیدہ ڈبوں کے ساتھ ریل کا سیٹیاں مارتا ہوا انجن پلک جھپکتے میں گزرتا ہے ملا دھرے۔ لو بھر ٹھہر کر چند شہری بابو آتا ہے اور اس بستی کو پہلے سے کہیں زیادہ ویران کر جاتا ہے۔ کیا جانیے صاحب بے روزگاری اور بھوک نے یہ دن دکھائے یا کوئی اور وجہ ہے۔ ہمارے نیک نام قصبے کا ایک بڑی عشرت سرا سے بدحال دیکھیا صاحب! جہاں شب بسری کے لئے تاتاری آنکھوں اور چوڑے شانوں والی مدلقامت لڑکیاں سو پچاس روپے میں مل جاتی ہیں۔ اس بستی کے وقت لوٹ گئے اور سونی جاگتی ہیں۔ ملاحق مسرتوں کی تلاش میں دور دور سے کئی رنگ رازی کا پکانے پڑے۔ معتمد اکابرین ملت، افسر جوان، اخبار نویس شاعر اور ادیب غرضیکہ ہر طرح کا فرد ادھر کھنچتے چلے آتے ہیں۔ چپکے دماغ نازنینوں کے عشوؤں سے تسکین پاتے ہیں۔"

"اچھا ـــــ یہ لوگ بھی !"

"ہاں صاحب، ہر طرح کے لوگ آتے ہیں ادھر ـــــ میں بہت چھوٹا سا تھا صاحب، جب اس بستی کو چھوڑ چلا گیا تھا ـــــ بس یہ سمجھو کوئی نہیں بہت کام کیا ادھر ادھر۔ اب سوچتا ہے اس گناہ ہوں کے گھر میں ایک مسجد سنوار دوں۔ اب سانس کا کیا اعتبار رہتا ہے۔ آن آتی ہے آئی ہے یہ سوچ کر چل پڑا صاحب۔"

نوجوان مستری مسجد کی محراب میں ٹائلوں کے جوڑ ملا رہا تھا۔ سنگ مرمر کر گرد کر رہا ہے جہاں کہاں رنگ دار مصالحہ بھر رہا تھا۔

موری شکستہ چٹانوں اور پتھریلی ڈھلانوں میں سے گزرتی ٹرین کے دھندلے شیشوں میں اب اکا دکا روشنی جھلملانے لگی تھی اور ٹرین کی رفتار کم ہو گئی تھی۔

"مستری تمہارا اسٹیشن آنے والا ہے۔"

"ہاں صاحب، یہ تاتاری روشنیاں عشرت کدوں کی ہی ہیں۔ یہیں اتروں گا صاحب، میرے لئے دعا کیجئے گا۔"

"اچھا ایک بات بتاؤ کیا تمہارے والد صاحب بھی اسی طرح کی سرخ ٹوپی پہنتے تھے؟"

"جی، جی ہاں صاحب۔ لیکن لوگ کہتے ہیں وہ میری طرح ٹھنڈی طبیعت کے نہیں تھے، بہت گرم مزاج تھے۔ خدا مغفرت کرے۔"

"بس صاحب! اب چلتا ہوں۔ میرے لئے دعا کی تو پھر بھی۔"

"انشاء اللہ۔"

سرخ ٹوپی والا نوجوان حرکت اپنے سامان کو سمیٹتا اور سلام کو ٹھہرتے ہوئے اتر گیا ـــــ "خدا حافظ۔"

وہ عشرت کدے کے نیم تاریک ٹیشن کی تاریکی میں اتر گیا۔

لمحہ بھر رک کر ٹرین ایک بار پھر چل پڑی تھی۔ میں نے کھڑکی میں سے پیچھے بیٹھے اس کے سر کو سرعت کے ساتھ ریلوے پھاٹک کے پاس تاکا۔ تاک لگا اشتیاق بوڑھی روشنیوں کی جانب اترتے ہوئے دیکھا۔

ایسے میں میرے جی میں جانے کیا آئی کہ اسے آواز دوں اور اسے تنبیہ کرتا کہ مستری! تمہارا باپ گرم مزاج ہرگز نہیں تھا۔ میں نے اسے بیری طرح گیا ہے۔ جان لو کہ وہ کسی گہری سازش کا شکار ہوا۔ تمہیں سنوارنے دینے کے لئے نہیں شاید کہ یہ عشرت کدے کی انتظامیہ یہ راز کبھی نہ کھلنے دے ـــ یہ سوچ کر میں لیکن میں ایسا نہ کر سکا۔

مجھے بہت آگے جانا تھا۔ ٹرین کے ساتھ اور رفتہ بڑھتی جا رہی تھی۔ ٹکڑوں کی پڑتال کے بجائے میں نے اپنے سفری تھیلے میں سے براؤن کوٹ نکال کر اپنے کندھوں پر ڈال لیا اور باہر دیکھنے والی کھڑکی کے ٹھنڈے شیشے کے ساتھ سر ٹیک دیا۔

ٹرین ایک بار پھر اپنے مخصوص رفتار کو پانے کی کوشش میں تھی اور عشرت کدہ کا نوجوان محراب ساز مستری پیچھے رہ گیا تھا۔ *

بقیہ صفحہ ۳۱ ۔ برزخ

نہ جانے کیا ان کا کیا ہو جائے گا۔

اس نے دروازے پر لگا بلب روشن کیا۔ دھیرے دھیرے دروازہ کھولا تو اس کا پڑوسی کھڑا تھا: "اگر آپ نے آج کا اخبار دیکھ لیا ہو تو ذرا..." ہاں ہاں کیوں نہیں۔ اس نے اخبار اٹھایا اور پڑوسی کے حوالے کر دیا۔ دروازے سے باہر جا نکلا۔ گھر کے قریب کونے پر کھڑی لال کار نہ جانے کب کی جا چکی تھی۔ اسٹریٹ لائٹ نے پورے راستے کو روشن کر دیا تھا۔ لوگ ڈر کے بعد نکلنے اور اپنے کھانے نکل آئے تھے۔ وہ کھانے کی میز کی طرف چلا اور ایسی رغبت سے کھانا کھانے لگا جیسے بہت دن سے بھوکا ہو۔ *

رشید منظر

LONDON

اُردو میں ہندسوں کا مسئلہ

اردو کی مقبولیت کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ برصغیر پاک و ہند میں یہ ہی وہ زبان ہے جو عوام اور خواص دونوں میں یکساں طور پر ہر دلعزیز ہے۔ ابتدا سے ہی اس میں مختلف زبانوں کے الفاظ کی آمیزش ہوتی رہی۔ گیت اور دوہے اردو زبان میں خاصے مقبول ہیں جن میں بیشتر الفاظ ہندی اور سنسکرت سے مستعار ہیں۔ اسی طرح عربی اور فارسی کے بے پناہ الفاظ اردو میں شامل ہو گئے۔ مختلف امتزاج سے اس پر اس کی گہری چھاپ ہے۔ بعد ازاں اردو پر انگریزی کا اثر ہوا اور رفتہ رفتہ عربی اور فارسی سے دور ہوتی ہوئی یہ زبان انگریزی کے قریب ہوتی گئی۔

خاص طور سے ہندوستان پر انگریزوں کے تسلط کے بعد انگریزی کا اثر نمایاں ہونے لگا۔ اردو برصغیر پاک و ہند میں جس طرح رابطہ کی زبان قرار پائی اسی طرح انگریزی کو اقوام عالم میں رابطہ کی زبان ہونے کا فخر حاصل ہے۔ ظاہر ہے جو زبان ساری دنیا کے طول و عرض میں بولی جاتی ہو اور جسے بے شمار ممالک کی سرکاری زبان ہونے کا شرف حاصل ہو اس کی روز افزوں ترقی سے دوسری زبانوں کا متاثر ہونا لازمی ہے۔ حیرت کی بات نہیں کہ انگریزی زبان اقوام عالم میں رابطہ کی زبان ہے بلکہ یہ زبان اس ترقی یافتہ زمانے میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی زبان بھی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق انگریزی اس وقت دنیا کے سب سے زیادہ ممالک کی سرکاری زبان بن چکی ہے اور چالیس کروڑ سے زیادہ لوگ سے دوسری اہم زبان کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ سوویت یونین کے خاتمے کے بعد اب تو ایسا لگتا ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں ہونے والی ساری ترقی اسی زبان کے زیر اثر ہو گی۔ خیال ہے کہ پوری دنیا میں شائع ہونے والے سائنسی جرائد کی مجموعی تعداد میں تقریباً دو تہائی جرائد انگریزی میں شائع ہوتے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ ہر زبان کا اپنا مزاج ہوتا ہے اور ایک زبان سے کوئی صنف یا خیال دوسری زبان میں منتقل ہونے کے بعد ایک نئے قالب میں ڈھل جاتا ہے۔ آج جب میں انگلستان میں بیٹھا ہمارا اردو کے بارے میں بات کرتا ہوں تو پوری طور پر میرے چاروں طرف پھیلا ہوا انگلستانی ماحول مجھے دانستہ یا نادانستہ طور پر متاثر کرتا ہے۔ اس سے انکار ناممکن ہے کہ ایک جگہ سے کوئی چیز دوسری جگہ منتقل ہونے کے بعد اس سے اثر قبول نہ کرے۔ بعینہ یہی صورت حال اردو کے ساتھ ہے کہ وقتاً فوقتاً عربی اور فارسی ہندی اور سنسکرت یا انگریزی سے منتقل ہونے والے الفاظ اور خیالات ایک نئے سانچے میں ڈھل گئے۔ اس سے اردو کی دلکشی میں اضافہ ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ زبان اور مقبول ہوتی گئی۔ آج اس زبان کے مراکز جانے دنیا کے کتنے ملکوں میں قائم ہو چکے ہیں۔ اب یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ اس زبان کے مراکز صرف پاکستان اور ہندوستان تک ہیں۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس کی یہ تمام تر ترقی صرف اہل اردو کی مرہون منت ہے جسے کہیں بھی حکومتی پشت پناہی حاصل نہیں ہے۔ پاکستان جہاں اسے حکومت کی زبان ہونے کا درجہ حاصل ہے وہاں بھی یہ استبداد زمانہ کا شکار ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو زبان کی ترقی کے تین اسباب بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

(۱) اہل زبان کی اس سے محبت اور ان کی تعداد۔ (۲) اسے کاروبار حکومت کی زبان ہونے کا درجہ حاصل ہونا۔ جس سے اہل زبان کو حصول معاش میں آسانی ہو۔ (۳) زبان کی شیرینی اور اس کا ذخیرہ ادب۔

جہاں تک اردو کا تعلق ہے۔ یہ اس کی خوش قسمتی ہے کہ اس کے شیدائیوں کی تعداد کثیر ہے۔ ان کے دلوں میں اب بھی اس زبان کے لئے بے پناہ محبت ہے یہی وجہ ہے کہ یونائیٹڈ نیشنز کے اندازے کے مطابق دنیا کی آبادی کے لحاظ سے سب سے زیادہ بولی جانے والی زبانوں میں اس کا نمبر انگریزی اور چینی کے بعد آتا ہے۔ اسی بات کو بنیاد بنا کر اردو والوں کی طرف سے یہ آواز بھی اٹھائی گئی ہے کہ یو این او کی کارروائی اردو میں بھی نشر ہونی چاہیئے۔

اردو بولنے والوں کی اتنی کثیر تعداد کے باوجود یہ انتہائی بدقسمتی ہے کہ اس زبان کو کہیں بھی بالطور سرکاری زبان پہچان کا شرف حاصل نہیں ہو سکا
۔ اس وقت سب سے اہم بات یہ ہے کہ جب تک اردو حکومت کے ملک کی زبان نہیں بن پاتی اور سائنس و ٹیکنالوجی میں ہونے والی ترقی کو
اپنے اندر آسانی سے ضم کرنے کی صلاحیت نہیں پیدا کرتی، اس کی بقا کا مسئلہ زیادہ سے زیادہ سنگین ہوتا جائے گا۔

اسی سلسلے کی ایک کڑی اس کے ہندسوں کا مسئلہ ہے۔ جس نے مجھے اس مضمون کو سپرد قلم کرنے پر مجبور کیا۔ اس سے پہلے کہ میں اس ضمن میں اپنے خیالات کا
اظہار کروں، اور اپنے معروضات پیش کروں مجھے اپنے دیرینہ دوست جناب منیر الدین صابری کا ذکر کرنا لازم ہے۔ صابری صاحب عرصے سے متحدہ عرب
امارات کے شہر دبئی میں مقیم ہیں۔ ٹیکس کے شعبے سے وابستہ ہیں۔ تجارت کی دنیا کی بوقلمونی کا بہترین ادراک رکھتے ہیں۔ ساتھ ہی شعر و ادب
سے گہری دلچسپی ہے۔ اردو کی خدمت میں ہمہ تن مصروف رہتے ہیں۔ متحدہ عرب امارات میں اردو کی بقا کے لئے ان کی خدمات سرفہرست ہیں۔ اپنے پیشے کے سلسلے میں
فار ایسٹ کے ملکوں خاص طور پر جاپان، کوریا وغیرہ کا برابر دورہ کرنا پڑتا ہے۔ ایکسپورٹ میں ان ملکوں کی ترقیوں سے کون واقف نہیں ہے۔ موصوف
نے ان ملکوں میں اپنے سفر کے دوران یہ اندازہ لگایا کہ فار ایسٹ کے بیشتر ممالک اپنی اپنی زبانوں کی بقا، اور ان کی ترقی پر تمام تر توجہ دینے کے ساتھ ساتھ
انگریزی ہندسوں کو اپنی زبان کا حصہ بنا لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ NUMERICAL BASED TECHNOLOGY کی ترقی اور اس کے حصول کے لئے ان کو
نہیں معاملات کرنے پڑتے ہیں اور نہ اس میں کسی قسم کی دقت پیش آتی ہے۔ کافی عرصے پہلے صابری صاحب سے اس موضوع پر میری تفصیلی گفتگو ہوئی تھی
اور مجھے بھی ان کا ہم خیال ہونا پڑا تھا کہ ہمیں اردو میں بھی عربی کے ہندسوں کو چھوڑ کر صرف انگریزی کے ہندسوں کا استعمال کرنا چاہیے تاکہ دو قسم کے ہندسوں
کے استعمال سے ہونے والی الجھن کا سدباب ہو سکے۔

اب اس پس منظر میں ہم اردو ہندسوں کے استعمال کا جائزہ لیں۔ اور دیکھیں کہ ان میں کیا مشکلات حائل ہیں اور اس سلسلے میں کیا کچھ کیا جا سکتا ہے۔ اردو
میں فی الوقت دو قسم کے ہندسوں کا استعمال ہو رہا ہے۔

(۱) ایک تو وہ جسے عربی سے حاصل کیا گیا ہے۔ یعنی ۱ ۲ ۳ ۴ ۵ ۶ ۷ ۸ ۹ ۱۰۔

(۲) دوسرا وہ جو انگریزی سے مستعار ہے۔ 1 2 3 4 5 6 7 8 9 10 انگریزی کے ہندسوں کا اردو میں جہاں جہاں استعمال ہوتا ہے
ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہے جبکہ اردو میں رائج ہندسے اپنے عربی ماخذ سے کہیں کہیں تبدیل ہو چکے ہیں۔ مثلاً اردو میں چار عربی کے چار سے مختلف ہے اسی طرح اردو
کے سات اور عربی کے سات سے مختلف ہے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ عربی کو کئی ممالک کی پشت پناہی حاصل ہے ان میں کئی ممالک تیل کی دولت سے مالا مال ہیں۔ اور دنیا کے امیر ترین ممالک میں شمار
ہوتے ہیں۔ مشرق وسطیٰ کے ان ممالک میں کمپیوٹر ٹیکنالوجی پر کافی کام ہوا ہے لیکن ہماری بدنصیبی یہ ہے کہ وہ COMPUTER CALCULATER جو عربی ہندسوں پر
مبنی ہوں اردو میں بغیر تبدیلی کے استعمال نہیں ہو سکتا۔

اردو کے ہندسے فی الوقت اردو کی کتابوں کے صفحات اور ہجری کیلنڈروں میں نظر آتے ہیں اس کے برخلاف انگریزی کے ہندسوں کا استعمال اردو
داں طبقہ عیسوی کیلنڈروں سے لے کر ریاضی کی تمام کتابوں میں کرتا ہے۔ اردو زبان کا طالب علم اپنی زندگی میں عام طور پر نہ صرف انگریزی کے ہندسوں کا استعمال
کرتا ہے بلکہ وہ اردو کے ہندسوں سے تقریباً ناواقف ہی رہتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کسی کو اپنی تاریخ پیدائش لکھنی ہے اور وہ بہ جبر اردو ہندسوں میں لکھ لے تو
بھی اس کی تاریخ پیدائش عیسوی کیلنڈر کی بنیاد پر ہو گی جس میں انگریزی ہندسوں کا آنا لازمی ہے۔

اس کے علاوہ شماریات کے نقطۂ نظر سے اردو یا عربی کا صفر ZERO بیشتر مشکلات کا حامل ہے۔ مثال کے طور پر اردو میں آپ ......۱ کو ایک لاکھ بھی
پڑھ سکتے ہیں اور دس لاکھ بھی جبکہ انگریزی میں ایسی کوئی مشکل نہیں۔ انگریزی کے 100000 کو ہم دس لاکھ نہیں پڑھ سکتے چونکہ وہاں صفر اور DECIMAL
کا فرق واضح ہے جبکہ اردو میں اس کی وضاحت نہیں۔ ان تمام باتوں سے ہمیں اس کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اردو کی بے بضاعتی اس بات کی متقاضی ہے کہ ہم
مندرجہ ذیل باتوں پر ٹھنڈے دل کے ساتھ غور کریں اور اس کی افادیت کو تسلیم کریں۔

(۱) اردو میں موجود دو قسم کے ہندسوں کا استعمال ترک کر دیں۔

(۲) صرف انگریزی کے ہندسوں کا استعمال کریں کیونکہ شعوری یا غیر شعوری طور پر ہمارا سارا کام انگریزی ہندسوں کے ذریعے ہی تو چل رہا ہے

کو دفتری زبان کے طور پر اپنانے پر پُر زور دیا تھا۔ سب لوگ اس کا یہ مطالبہ جائز ہے۔ اردو کو پاکستان کے دفتروں میں پوری طرح نافذ کرنے میں تاخیر
بڑی وجہ اصل اردو کو دفتروں میں رائج کرنے میں دیر ہو رہی ہے یا رکاوٹ ہے بلا یہ کا رسم الخط بدلنے کی بات ہے۔
• ہماری انگلش میڈیم میں تعلیم پانے والی نئی نسل شاید کی خیرک وجہ سے ہے۔ عوام تو اردو کے حامی ہیں۔
ہمیں برطانیہ میں اصل مسئلہ پر توجہ مرکوز رکھنی چاہیئے۔ ترقی یا وقت کے تقاضے کے مطابق تبدیلی حسب حال ہو تو منظور کرنی چاہیئے۔ یہاں تو اردو کی رفتار
شکر ہے دن بدن تیز جا رہی ہے یہاں۔ ہمیں رسم الخط کو برقرار رکھتے ہوئے اس کی ترقی و ترویج کی بات زیر بحث لانی چاہیئے۔ البتہ یہ لازمی ضروری ہے۔
ہمیں خوشی ہے کہ رشید منظر تجویز پیش کرتے ہوئے جھجکے نہیں۔ چند حروف کی تبدیلی یا بعض ہجوں کی اصلاح وقت کا تقاضہ ہے۔ لیکن ہجوں کی اصلاح دی قابل
ہو گی جیسا کہ قدرتی طور پر وقت کے ساتھ ساتھ ہوتی چلی جاتی ہے۔ مثلاً تیار (طیار)، سموسہ (سنبوسہ) تمباکو (تنباکو) طوطا (توتا)
ث (چبوترہ / چوترہ)، سورج (سوریہ)، کراچی (کراچی) اسپتال (ہسپتال) وغیرہ وغیرہ۔
صرف ہیئت کی وجہ سے صوتیات کو بنیاد بنا کر حروف تہجی پر تلوار چلانے سے گریز لازمی ہے
ہم برطانیہ میں اردو کو آسان بنانے اور اسے یہاں ترقی کے لئے یہاں اس کی اشاعت و ترویج کے لئے ناگزیر تبدیلی کے یقیناً حامی ہیں۔ اس کے لئے
علمیت کا معیار باہمی مشورے سے سوچ سمجھ کر ہی اختیار و مقرر کیا جا سکتا ہے۔ تبدیلی برائے تبدیلی بے معنی اور بے نتیجہ ہو گی وہی بات چلتی ہے جو وقت سے
ہم آہنگ اور عوام کے ہم مزاج ہو۔ ✻

بقیہ صفحہ ۱۵ داغ دہلوی ۔ غزل کا ایک اسکول

کبھی کسی کو کوئی حسب آرزو نہ ملا ۔ کسی کو ہم نہ ملے اور کسی کو تو نہ ملا (ظفر اقبال)

اللہ رے جامہ زیب تری جامہ زیبیاں ۔ پہنا جو رنگ تو نے وہی رنگ کھل گیا (داغ)

پڑتی ہے سات رنگوں کی ترے بدن کی چھوٹ ۔ جو رنگ تو پہنے وہ نکھر دکھائی دے (شاذ تمکنت)

داغ کا بڑھاپا اقتصادی بے فکری کے باوجود بے سکون گذرا۔ اپنی اہلیہ کی رحلت نے ان کی تنہائی کو زیادہ تنہا کر دیا تھا۔ جیسے بہلانے
کے لئے وہ ایک ساتھ کئی طوائفوں کو نوکر رکھے ہوئے تھے۔ ان میں صاحب جان، عمدہ جان، الٰہی جان، عمدن بائی، اور سورت کی اختر جان خاص ہیں
داغ کا ان سے رشتہ شام کی گائیکی کی محفلوں تک ہی تھا۔ داغ کو شاعری کے ساتھ سنگیت کا بھی شوق تھا اور یہ سب اپنے دور کی ماہر موسیقار رہیں
میں داغ کی غزلوں کی شہرت میں ان سریلی آوازوں کا بھی ہاتھ رہا ہے۔ داغ کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی دور پاس کے وہ سارے رشتہ دار جن کو داغ
پال رہے تھے داغ کے گھر کو آپسی اختلافات کی مہابھارت بنائے ہوئے تھے۔ سب کی نظریں ترکہ کی طرف بڑھتے ہوئے داغ کے بڑھاپے پر تھیں۔ داغ
۷۲۔ سالہ زندگی کی دھوپ چھاؤں جھیل کر ۱۹۰۵ء میں ہمیشہ کے لئے سکون کی نیند سو گئے۔
کیا ملا ہم کو زندگی کے سوا ۔ وہ بھی دشوار، ناتمام، خراب ✻

۸۰ کتابوں کے مصنف :

کشمیری لال ذاکر کے افسانوں کا نیا مجموعہ

اس صدی کا آخری گرہن

ضخامت ۲۴۸ صفحات

قیمت ۱۲۵ روپے

خوبصورت گٹ اپ ✿ مضبوط جلد ✿ روشن کتابت و طباعت

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس ۔ ۳۱۰۸، لال کنواں دہلی ۔ ۱۱۰۰۰۶

شہپر رسول

..باں کا زاویہ، لفظوں کی خو سمجھتا ہے
..یں اُس کو "آپ" پکاروں، وہ "تو" سمجھتا ہے

..خن کے حرف پہ رکھتا ہے، دھجیاں کا مدار
..یا کو، نکھر کی وردِ سبو سمجھتا ہے

..یں اس کی بزم میں بھی سرفراز رہتا ہوں
..ر انسب، مری عظمت عدو سمجھتا ہے

..نافقت سے عزیزوں کو نذر کرتا ہے
..ہ اس میں اپنی بڑی آبرو سمجھتا ہے

..وگراں مرے زخمِ انا سے عاجز ہیں
..ہ میرے خوں کی تیزی رفو سمجھتا ہے

شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ـ ۲۵

جمیل احسن

وطن سے دُور ادھورے ہمارے خواب نہیں
یہ ہجرتوں کا سفر پھر بھی کامیاب نہیں

حصولِ زر کا جنوں روح سے لپٹ جائے
یہ اور کیا ہے، جہاں میں اگر عذاب نہیں

جو سر جھکا کے چلا دیر تک سلامت تھا
جو سر اُٹھا کے چلا تھا، وہی حباب نہیں

ہزار پھول کھلے پھر بھی یہ شکایت ہے
چمن میں موسمِ گل ہے مگر گلاب نہیں

ہر اک شکست پہ دل کا لہو بہانا کیا
ہر ایک سر پہ تو چھاؤں نہیں، سحاب نہیں

جمیل لفظ ترے کیوں نہ انقلابی ہوں
قلم کی کاٹ ہے پیارے، کوئی رباب نہیں

HAGALUNDSGATAN 4 ... TTR
191 50 SOLNA, SWEDEN.

قمر نقوی

وسعتِ تخئیل کا امتحاں بھی ہوتا ہے
راہِ فکر کی رو کے آسماں بھی ہوتا ہے
بجلیوں کو گرنے سے کاش روک لے کوئی
آشیاں کے پہلو میں گلستاں بھی ہوتا ہے
سچ کا خون کرنے سے مسئلہ حل ہوگا
یہ چراغ بجھنے پر ضوفشاں بھی ہوتا ہے
منظروں کے پس منظر کا بھی جائزہ لینا
ہر یقیں کے پردے میں کچھ گماں بھی ہوتا ہے
چاند صرف راتوں کو روشنی نہیں دیتا
یہ تو خونِ ناحق کا رازداں بھی ہوتا ہے
وار کرنے والوں کو یہ بھی سوچنا ہوگا
زخم کے نتیجے میں اک نشاں بھی ہوتا ہے
ہجرتوں سے بھی اکثر فطرتیں نہیں بدلیں
پہلے جو بھی ہوتا تھا وہ یہاں بھی ہوتا ہے

ناؤ کیوں تلاطم سے آج تک نہیں نکلی
ہے قمرؔ ہوا موافق بادباں بھی ہوتا ہے

4104 S. LIONS AVE
BROKEN ARROW, OK 74011
U.S.A.

انجم عثمانی

دلی دوردرشن کیندر، پارلیمنٹ اسٹریٹ، نئی دہلی

برزخ

کھڑکی کے پردے کو ذرا سرکا کر اس نے ایک بار پھر گھر کے باہر دیکھا۔ لال رنگ کی ایک کار اب بھی اسی طرح اس کے گھر کے پاس سڑک کے کنارے کھڑی تھی۔ اسٹریٹ لائٹ غائب تھی۔

"کس کی ہو سکتی ہے یہ کار، کون آیا ہوگا۔ اتنی دیر سے اندھیرے میں کھڑی ہے۔ کہیں کوئی ۔ ۔ ۔ ۔" اس کی بے چینی اور تجسس بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ "اس میں اتنا بے چین اور پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ یہاں کالونی میں ہر وقت کاریں آتی جاتی رہتی ہیں۔" اس نے اپنے آپ کو تسلی دی۔ "لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کوئی مجھ سے ہی ملنے آیا ہو اور دروازے پر تالا لگا پاکر۔ ۔ ۔"

آج شام وہ آفس سے لوٹا تو اس کی بیوی نے بتایا کہ قریب کالونی میں بچے کے اسکول کے کسی ساتھی کا جنم دن ہے اور بچے وہاں جانا چاہتے ہیں۔ "یہ ٹھیک ہے تم لوگ ہو آؤ پاس ہی تو ہے۔ کھانا آکر پکا لینا۔" بیوی بچے تیار ہو کر جنم دن کی پارٹی میں چلے گئے اور وہ حسب عادت صبح کو ٹھیک سے نہ پڑھا جا سکنے والا اخبار لے کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اسے سگریٹ کی طلب ہوئی۔ سگریٹ کی ڈبیا خالی تھی۔ اس نے دروازے پر تالا لگا کر بازار سے سگریٹ لینے چلا گیا۔ سگریٹ لے کر لوٹ رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ اس کے گھر کے پاس ہی لال رنگ کی ایک کار کھڑی ہے۔ اسٹریٹ لائٹ غائب ہے۔ کار کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے اندر جھانکنے کی کوشش کی۔ کوئی نہیں تھا۔ گھر کا تالا کھولنے سے پہلے اس نے آس پاس نظر دوڑائی کہ شاید کوئی آیا ہو۔ اسٹریٹ لائٹ غائب ہونے کی وجہ سے دور تک نظر نہیں آرہا تھا۔ اس نے گھر کا تالا کھولا۔ دروازہ اندر سے بند کر کے کھڑکی کے قریب بچھی ہوئی کرسی پر بیٹھ کر ادھورے چھوٹے اخبار کی ورق گردانی کرنے لگا۔

اسے پھر خیال آیا کہ کہیں باہر کھڑی کار اس کے کسی ملنے والے کی تو نہ ہو۔ اس نے باہر جھانک کر دیکھا۔ کار اب بھی ویسے کھڑی تھی۔ گھروں کی کھڑکیوں سے چھن کر آتی ہوئی روشنی کار پر اس طرح پڑ رہی تھی کہ کھڑکی میں لگی سلاخوں کے سائے کار کو گھیرے ہوئے تھے۔ اس کا دل چاہا کہ اپنے مکان کے پیچھے رہنے والے دوست کے پاس جاکر معلوم کرے۔ کیونکہ اس کے بیشتر ملاقاتیوں کو معلوم تھا کہ اس کے گھر کے پیچھے اس کے ایک دوست کا گھر ہے اور جب بھی گھر بند ہونے کی وجہ سے کسی کو انتظار کرنا پڑتا یا کوئی بات کہنی ہوتی ہے تو وہ اس کے دوست کے یہاں چلے جاتے لیکن پھر وہ یہ سوچ کر نہیں گیا کہ اگر کوئی اس سے ملنے آیا ہوگا۔ تو خود ہی دیکھ لے گا۔ رات کا وقت ہے اسٹریٹ لائٹ بھی نہیں ہے۔ اسی دوران اگر اس کے بیوی بچے آگئے تو گھر بند پاکر خواہ مخواہ پریشان ہوں گے۔ پھر کیا ضروری ہے کوئی اس سے ہی ملنے آیا ہو۔ آیا ہوگا کوئی کسی کے گھر۔ اتنے بڑے بلاک میں کوئی اس کے ملنے والے کار والے تو نہیں ہیں۔ اس نے ان خیالوں کو جھٹک کر پڑھنا شروع کر دیئے۔ مگر اس کا دل پڑھنے میں لگ نہیں رہا تھا۔ اور بار بار اس کا ذہن باہر کھڑی کار کی طرف منتقل ہو رہا تھا۔

"ہو سکتا ہے کوئی جان بوجھ کر اسے یہاں چھوڑ گیا ہو۔ یہ کار چوری کی ہو اور اس کے گھر کے قریب کھڑی ہونے کی وجہ سے پولیس اس سے۔ ۔ ۔ یہ"

"بلا وجہ کی بات ہے بھلا کوئی چوری کر کے یہاں کیوں چھوڑے گا۔"

اس نے سر کو جھٹکا۔ ۔ ۔ ۔ "یہ ہو سکتا ہے ہو سکتا ہے اس میں کوئی دھماکہ خیز چیز ہو۔ آئے دن ایسے حادثات ہوتے رہتے ہیں۔ اور ان حادثات سے بچنے کے لئے ہوشیار رہنے کے اعلانات ہوتے رہتے ہیں۔"

بے چینی کے ساتھ اب اسے ڈر بھی لگنے لگا۔ اس کا دل چاہا وہ پولیس کو فون کر کے خبر کرے کہ اس کے گھر کے پاس ایک لاوارث کار مشتبہ حالت میں کھڑی ہے۔ ۔ اسے خود پر ہنسی آئی کہ یہ کیا بے وقوفی ہے بھلا یہاں کون سی اہم شخصیت رہتی ہے جس کے لئے کار بم کا اہتمام کیا گیا ہوگا۔ یہ بازار کی کار ہی ہے جا سے دفتری لوگ صبح خصوصی وقت پر بستی میں دو روٹیاں ڈالنے نکل جانے والے اور گھنٹے

راستے پر جھکا ہا سے مستقبل کے خوابوں سے عاری آنکھوں اور دلوں میں مہنگائی کا خوف لیے گھروں کو لوٹ کر بند ہو جانے والے لوگ۔ جنہیں ناموں سے نہیں مکان نمبروں سے پہچانا جاتا ہے جن کے نام اور شناخت دفتر کی بڑی بڑی میزوں اور کالونیوں کے چھوٹے چھوٹے مکانوں کے درمیان کہیں اس طرح گم ہو جاتے ہیں کہ انہیں پتہ بھی نہیں لگتا کہ وہ کب آدمی سے بڑے بابا اور چھوٹے بابو بن جاتے ہیں۔

ٹھیک ہے کوئی کار بم نہیں ہوگا لیکن یہ اتنی دیر سے میرے گھر کے پاس......"

اس کی الجھن بڑھتی جا رہی تھی! کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ مجھ سے ملنے آیا ہو یا اس نے مجھے جاننے کے لیے کسی کو بھیجا ہو۔ اسے یاد آیا۔ اس کے علاوہ اس ٹھیکیدار کے پاس لال رنگ کی کار ہے جس کی فائل اس کے میز پر ہے اور جسے آگے بڑھانے کے لیے ٹھیکیدار نے اسے تحفہ دینے کا اشارہ کیا تھا۔ اسے یاد آیا کہ وہ جب اس ٹھیکیدار کو دفتر سے باہر تک چھوڑنے آیا تھا۔ تو وہ اسی رنگ کی کار سے گیا تھا یا کاش اس نے نمبر بھی دیکھ لیا ہوتا۔ مگر اس کو میرے گھر کا پتہ معلوم نہیں ہے۔ پھر وہ کیسے آسکتا ہے؟" اس نے اپنے خیال کو خود ہی مسترد کر دیا۔ مگر یہ کار کسی نہ کسی کی تو ہے۔ اگر کوئی کسی پڑوسی کے گھر بھی آیا ہو تو اس کے گھر کے سامنے پارک کرنی چاہیے تھی یہاں میرے گھر کے کونے پر......"

"ہوگی کسی کی"...... اس نے خود کو اطمینان دلانا چاہا۔ مگر کار کی موجودگی اس کے ذہن سے چپک اٹھی تھی۔ "ارے کہیں وہ تو نہیں آگئی اس کی کار بھی تو......"

اسے یاد آیا کہ چند دن پہلے اچانک راستے میں اسے کالج کے زمانے کی ایک کلاس فیلو مل گئی تھی۔ اس دن وہ دفتر سے گھر لوٹنے کے لیے بس اسٹاپ پر کھڑا تھا کہ اچانک ایک کار اس کے پاس آکر رکی ایک خوبصورت سا چہرہ کار کی دروازے سے باہر آیا۔ اور اس نے اسے کالج کے زمانے کے نام سے پکارا۔ "ارے تم" اس کے چہرے پر کالج کے زمانے کی شوخی اور رونق لوٹ آئی۔ اتنے میں وہ کار سڑک کے کنارے پارک کر کے آ چکی تھی۔ وہ دونوں کافی دیر تک سڑک کے کنارے کھڑے پرانی باتوں میں الجھے رہے تھے۔ اس کی کلاس فیلو نے بتایا تھا کہ وہ اسی شہر میں رہتی ہے جب جب بھی وقت ہوگا وہ اس سے ملا کرے گی۔

اس نے اسے دفتر کے علاوہ گھر کا پتہ بھی دیا تھا۔ اس نے گھر کا دروازہ کھول دیا۔ دروازے پر لگے بلب کو روشن کیا تاکہ گھر کا نمبر آسانی سے نظر آسکے۔ کالج کے زمانے کی خوشگوار یادیں خوشبودار جھونکوں کی طرح اس کے ذہن کو گدگدانے لگیں۔ اس نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے آنکھیں موند لیں جیسے بیتے دنوں کی یادوں کو آنکھوں میں محفوظ کر لینا چاہتا ہو۔ اس کے ہونٹوں پہ ہلکی گدگدیاں تھیں۔ کچھ دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں کار اب بھی ویسی کھڑی تھی اس نے باہر جھانکا۔ اس کے بیوی بچے آ رہے تھے۔

"کیا بات ہے۔ دروازے کی لائٹ جلائے کواڑ کھولے کس کا انتظار ہو رہا ہے؟" اس کی بیوی گھر میں داخل ہوتے ہوئے خوش گفتاری کے لہجے میں بولی۔ "تمہارے علاوہ کس کی راہ دیکھ سکتا ہوں" اس نے صاف جھوٹ بولا۔

باہر کی لائٹ اور دروازہ اندر سے بند کیا اس کے بیوی بچے اپنے کمرے میں چلے گئے وہ پھر دروازے کی گرد کوشش کرنے لگا۔ مگر ابھی تک اس کے دماغ سے باہر کھڑی کار نہیں نکل سکی تھی۔ جو دراصل یہ کار ایک الجھن، خوف، بے کلی اور بے چینی اس کے چہرے سے ظاہر تھی۔

"پاپا انکل کے یہاں بڑے کیک اور بہت سی ٹافیاں...."

"اچھا اچھا" اس نے اپنی طرف آتی ہوئی بیٹی کو گود میں اٹھا لیا۔

"اجی سنیے اگر آپ اخبار چاٹ چکے ہوں تو ذرا بچوں کا ہوم ورک دیکھ لیجیے۔ میں کھانا تیار کرتی ہوں" وہ اٹھا اور بچوں کو اپنے کمرے میں لے آیا۔ اور بچوں کے ہوم ورک میں لگ گیا مگر رہ رہ کر باہر کھڑی کار کی موجودگی کا خیال اسے پریشان کر رہا تھا۔

"اف پاپا۔ آپ تو ٹھیک سے ہوم ورک بھی نہیں کرا سکتے" "کیا ہوا" کچن میں سے اس کی بیوی چلاتی ہوئی اس کی طرف آئی۔

اس کے چہرے کی طرف دیکھا جو زردی مائل ہوتا جا رہا تھا "کیا طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ بے چینی سے ہو کیا دفتر میں کوئی......"

"نہیں نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔" اس نے اپنی گھبراہٹ چھپانے کی ناکام کوشش کی "پتہ نہیں کیا کیا سوچتے رہتے ہو۔ اب سارے سارے وقت سگریٹ پھونکو گے تو یہی ہوگا۔ کھانا تیار ہے چلو کھا لو۔"

میز پر کھانا چنا جا چکا تھا۔ سب لوگ کھانا شروع کر چکے تھے۔ وہ بھی دھیرے دھیرے ایسے کھا رہا تھا جیسے کوئی بدمزہ کھانا زبردستی کھا رہا ہو حالانکہ یہ اس کی بھوک کا وقت تھا۔ اس کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ اس کا دل و دماغ کہیں اور ہے۔ خوف اور بے چینی کی پرچھائیاں اس کی آنکھوں میں دیکھی جا سکتی تھیں کہ اچانک کال بیل بج اٹھی وہ دروازے کی طرف ایسے لپکا کہ اگر اس سے پہلے جا کر کسی نے دروازہ کھول دیا تو غضب ہو جائے

[باقی صفحہ ۲۳ پر دیکھیے]

علیم اللہ حالی

...رزو

...ں
...لیہ
...کی سرحد
...دھندلکے میں گم ہوئی ہے
...ں
...شے
...کھائے کی صورت
...آئے
...ی آئے
...ب لمحہ
...ی مانند ڈوبتے ابھرتے
...ثبات کے تصادم کا وہ ہیولا
...انکار سے گریزاں
...ہے احساس کے حصار میں
...لرزاں
...ت تن کی منزلوں میں
...کرشمہ کبھی ہو
...اظہار کا امیں ہو
...الفاظ میں کہیں ہو

...ٹ ہاؤس، گیا۔ ۸۲۳۰۰۱ (بہار)

یوسف تقی

مناجات

اے خدا
تو اگر خالقِ کون و مکاں ہے تو سن
تیرے بندے
جنھیں تو نے سونپا تھا
منصبِ کبریائی
آج مجبور و مہموم۔ بے دست و پا
آج ان کے لئے
تیرے بخشے ہوئے
یہ ارض و سما
اجنبی بن گئے ہیں
جبر کی تیغ بستر جاں میں اتر آئے
صبر کے ہاتھ بھی شل ہو گئے
اور وہ اپنے لبوں کو مقفل کئے
دم بخود دیکھتے ہیں
دیکھتے ہیں انہیں
جن کی سفاک ہاتھوں کی خون سلانیاں
انتہا کی بلندی کو چھونے چلی ہیں
کوئی بڑھتا نہیں۔ کوئی اٹھتا نہیں
ان کے گستاخ ہونٹوں سے نکلے شرربار نقروں کی پاداش میں
کوئی نکلا نہیں
(لب کشائی کی جرأت بھی جانے کہاں
مصلحت کی ردا اوڑھے
دبکی پڑی ہے)
کوئی عیسیٰ نفس بھی نہیں ہے جو
ان کے بیمار ذہنوں کو اک نئی زندگی بخش دے
اے خدا
تو اگر خالقِ کون و مکاں ہے تو پھر
اپنی مخلوق کو اپنی قدرت میں رکھ

● ٹی ۱۹ بی۔ مارکیوس لین، کلکتہ۔ ۱۹

عامر ریاض

کامل آمادگی

مصلحت اندیشیوں
اور ضمیر کے تمام مشوروں کو نظر انداز کر کے
میں تمہاری سمت چل پڑتا ہوں
لیکن، اذیتوں کا سمندر
اس وقت کچھ اور گہرا ہو جاتا ہے
جب میری موجودگی تمہیں
نامعلوم اضطراب میں مبتلا کر دیتی ہے
ہمیں ایک دوسرے سے مل کر
یا تو خوش ہونا چاہئے
یا ناراض!
دوہری کیفیتوں کے ساتھ جینا
منصوبہ بند زندگی کے لئے
مناسب ہو تو ہو
محبت کامل آمادگی چاہتی ہے

● عباشا ئیکش مسکن ہالیہ لکھنؤ۔ ۱

(ایک مکالمہ)

محمد مظفر الدین فاروقی
34 - ... DRIVE SOUTH, PROSPECT HEIGHTS
ILLINOIS 60070 (U.S.A)

تپانچہ

"مرا احترام کہ۔ کہ آدمیت کے گناہگار بکشتہ حالی ہست۔
مصنوعات وقت ہو! اے آدمی نے بڑی سخت ضیغم کیا؟ کیا ہم چپ
سے نکل جائیں گے؟ نہیں! کیوں کہ وعیدا ابھی ظلم طغیان کو
بزور بازو روک دو۔ روکنے کے وسائل نہیں رکھتے تو آواز
ہی بلند کرو، اتنا حوصلہ بھی نہیں ہے۔ تو کم از کم دل سے برا کہو۔
آؤ اے لوگو! ضمیر زندہ کا خاموشش فسانہ بھی تمھیں خلوت بسیط
میں گونج رہا ہے کیا تم سن سکتے ہو!؟"

جین کا خط ملتے ہی میں کوچین کی طرف چل پڑا۔ اس نے ساحلی علاقے میں ایک وسیع و عریض زمین پر اپنا گھر بنا رکھا تھا۔ پی ڈبلیو ڈی کے کنٹریکٹر کو ایسا ہی گھر بنانا چاہیے۔ شام کے ڈنر میں جین نے بہت ساری چیزیں بنوائی تھیں۔ کیرالا کا مخصوص سالن جس میں ناریل کا پانی پڑا ہوا تھا۔ حیدرآباد کی پکی گوشت والی بریانی۔ لکھنؤ کے کباب اور دہلی کے پراٹھے۔ یہ جین بھی بڑی خوب کا انسان ہے۔ اسے کیرالا کے سالن حیدرآباد کی بریانی۔ لکھنؤ کے کباب اور دہلی کے پراٹھے۔ مدراس کی کافی اور اردو زبان سے خاص شغف ہے چنانچہ ڈنر کے بعد مدراسی کافی کا دور چلنے لگا۔ تو جین کافی موڈ میں تھا۔ اسی جونک میں کہا

"دیکھئے انجینئر صاحب! پسند آیا میرا گھر آپ کو؟"

"جین! گھر تو لاجواب ہے مگر میں گھر والوں سے زیادہ متاثر ہوا ہوں

ہاں! افتخار صاحب! ہونا بھی چاہیے۔ شاید آپ کو معلوم نہیں ہوگا میں دلت ہوں۔ مہذب دلت میرے آبا و اجداد کسی زمانے میں ڈو بوٹ کی لنگوٹی لگائے سری رنگا پٹم میں جانوروں کی بکشی کیا کرتے تھے۔ ان میں کا ایک کسی طرح نواب حیدر علی کے دربار تک پہنچ گیا۔ اور پھر نواب کا خانساماں بن گیا۔ ہماری دادی کہا کرتی تھیں کہ پنڈت پدمنابا نواب کے گھر میں کبھی کبھی کھانا کھایا کرتے تھے مگر کبھی خانساماں کے ہاتھ کا کھانا انہوں نے کبھی نہیں کھایا۔ پتہ نہیں یہ روایت کہاں تک سچی ہے۔ ایک اور قصہ بھی ہمارے خاندان میں مشہور ہے۔ ٹیپو سلطان نے اس درخت کے نیچے آخری دسترخوان پروسا گیا۔ تو اسی وقت خانساماں نے سلطان کے سامنے کھانے کی پلیٹ رکھی تھی۔ پتہ نہیں اس بات میں کتنی سچائی ہے۔ لیکن جب ہمارے خاندان کا کوئی شخص سری رنگا پٹم جاتا ہے تو اس درخت کی جگہ تھوڑی دیر سر جھکا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ ہمارے گھر میں یہ علم اور تہذیب اسی زمانے کی دین ہے کیوں کہ نواب حیدر علی کا یہ اصول تھا کہ وہ اپنے قریب کے کسی آدمی کو جاہل نہیں رہنے دیتے تھے۔"

یہ کہتے ہوئے جین کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔

جین! تم ایک تاریخی انسان ہو۔ کتنا خوبصورت لیکن گداز ہے تمہارا!
کیا اس زمانے میں تم کو بھی دلت کہا جاتا تھا۔

یہ بھی ایک بڑی زیادتی ہے افتخار صاحب! جو فادر آف دی نیشن نے ہمارے ساتھ کی ہے!

وہ کیا؟

ہریجن! یعنی ہری کا جنا ہوا۔ ہم ہری کے بیٹے کیسے ہو سکتے ہیں کمشنر صاحب۔ ان کے شاستر کہتے ہیں کہ برہما نے ہمیں اپنے پاؤں سے پیدا کیا۔ اور ہم اپنے پاؤں باپ کا بھجن بھی سن نہیں سکتے۔ ہمارے ساتھ کتنی بڑی زیادتی ہوئی ہے۔

زیادتی کیسے ہوئی جین! فادر آف دی نیشن اچھوت کے ذلت آمیز لفظ کو ہی ڈکشنری سے نکال دینا چاہتے تھے۔ تو انہوں نے ہریجن کا لفظ استعمال کیا۔

شاید آپ ان کی میتھالوجی کو جانتے نہیں ہیں۔ پانچوں پانڈو بھائی ہریجن تھے یعنی اپنے باپ پانڈو کی اولاد نہیں تھے۔ ہری (بھگوان) نے ایک عورت کی گود میں ۳ بچے ڈال دیے۔ اور دوسری کی گود میں ۲ بچے ڈال دیے۔ دونوں عورتیں پانڈو کی بیویاں تھیں لیکن پانڈو ان سے عورت اور مرد کا تعلق نہیں رکھ سکتا تھا۔ پھر یہ بچے کہاں سے آئے بنے

عاجز ہنگن گھاٹی

شتہ رہا ہے ذہن کی اسکول سے
بچپن کا ملا تو کھیل گئے ہم ببول سے

ا دروازے پردے سب ہی کو شاں تھے مگر
وئی بھی گھر رہا نہ کی دھول سے

ہو گیا کم دائرہ احساس کا
یا م وسعتوں کا لدنے کے معمول سے

ں سے لگے سورج ہوس کا بکھر گیا
ل سا اٹھا شعلہ بدن کے ببول سے

طور پر ہی لوٹ کر گھر آ گئے
س کو ملی حق راستے میں بھول سے

نگھاٹ ضلع وردھا (مہاراشٹر)

خالد عابدی

ہم کو اس سے اور اسے ہم سے محبت نہ ہوئی
دوستی اپنی کبھی باعث زحمت نہ ہوئی

تیرا انداز بھی ویسا ہی تھا جیسا سب کا
صرف اتنا کہ ہمیں تجھ سے شکایت نہ ہوئی

ہم عجب لوگ ہیں ہر حال میں اس کا دامن
ورنہ یاں ٹھہر نہ جائے کہ قیامت نہ ہوئی

حسب معمول ہی ہوتا رہا سب کچھ لیکن
اس نے جو بات بتائی وہ حقیقت نہ ہوئی

اس کے ہمراہ تو کچھ روز سکوں سے گزرے
پھر ہوا یوں کہ عبادت کبھی راحت نہ ہوئی

● ۳۵ ۔ لے، ہارڈنگ روڈ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۱

کبیر اجمل

میں جسم و جاں کے کھیل میں بیباک ہو گیا
کس نے یہ چھو دیا ہے کہ میں چاک ہو گیا

کس نے کہا وجود مرا خاک ہو گیا
میرا لہو تو آپ کی پوشاک ہو گیا

بے سر کے پھر رہے ہیں زمانہ شناس لوگ
زندہ نفس کو عہد کا ادراک ہو گیا

زندہ کوئی کہاں تھا کہ صدقہ اتارتا
آخر تمام شہر ہی خاشاک ہو گیا

لہجے کی آنچ روپ کی شبنم نگل گئی
اجمل گلوں کی چھاؤں میں نمناک ہو گیا

● بی ۲۲/۳۳ سی ۲ [illegible]، بنارس

ابرار مجیب

۲۴۳، ایم ۱۲، این ۱۰ ارے کے سلوپ پوسٹ گما جمشید پور ـ ۵

جنگ بند

جمیل بھائی کی زندگی یوں ہی گذر رہی تھی۔ چند منٹ حاجاتِ صبح اور ضروریات سے فارغ ہونا گھوڑا ابر چلنے کے ساتھ ناشتہ چپٹی چپڑے ہوئے تین چار پراٹھے تیزی سے نگلنا۔ اور ڈیوٹی کے لئے گھر سے نکل پڑنا۔ منتظر ہی دکان سے پان لے کر وہ تیزی سے سائیکل کا پیڈل گھماتے ہوئے کارخانہ پہنچ جاتے۔ شام کو لوٹتے وقت کینٹین سے بچوں کے لئے کچھ آلو چاپ اور سموسے خریدتے اور گھر آجاتے۔ ان کی اس بے کیف زندگی میں ان کا پرانا مرفی ریڈیو اکثر رس گھول دیا کرتا تھا۔ یہ ریڈیو انہیں شادی میں ملا تھا اس طرح اس ریڈیو کی اپنی ایک تاریخی اہمیت بھی تھی۔ خیر ان دنوں بیٹری کی مجبوری بھی خاموش پڑا تھا۔

اُنکی یوں ہی گذرتی ہوئی زندگی کی روانی کا تسلسل دفعتاً از سبب سی چٹانوں کے نمودار ہو جانے کی وجہ سے منتشر ہو کر رہ گیا۔ جمیل بھائی ہی نہیں بلکہ پورا محلہ ہی جیسے اچانک صدیوں پرانی نیند سے بیدار ہو گیا۔

اس روز شام کے وقت جمیل بھائی کالونی کے پبلک نل میں نمبر لگائے کھڑے تھے۔ ـــــ اور دیکھ رہے تھے۔ دیکھ رہے تھے اور حیران ہو رہے تھے حیران ہو رہے تھے اور سوچ رہے تھے۔ وہ سوچ رہے تھے آخر معاملہ کیا ہے؟ معاملے کی اہمیت کا اندازہ فوری طور پر نہیں لگا سکے لیکن چونک پڑے۔ بدرالدین عرف باؤ کے خستہ حال چائے خانے پر، پان کی دکانوں کے آس پاس، خیاط جی کے گھر کے سامنے بچھی ہوئی بنچوں پر، یہاں وہاں اِدھر اُدھر عام دنوں سے کچھ زیادہ ہی بھیڑ نظر آرہی تھی۔ بات اتنی سی ہوتی تو بھی کوئی بات نہ تھی۔ جمیل بھائی کو محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ لوگ ایک خاص قسم کی بے چینی میں مبتلا ہیں۔ اور شاید کسی پیچیدہ مسئلے پر بحث و مباحثہ میں الجھے ہوئے ہیں۔ جمیل بھائی کے اندر تجسس کے جراثیم کلبلانے لگے اور اس سے قبل کہ وہ ان گتھیوں کو پرسکون کرنے کے لئے کوئی طریقہ ڈھونڈتے اور سے پیچھو ہاتھ میں کڑے چپول پر پائی کی

ماں تیز آواز میں بولی: ارے کھڑا کھڑا کا سوچتا ہے! پانی بھرو۔ پانی نمبر آگیا ہے۔

چونک کر انہوں نے بالٹی پانی کی دھار سے لگائی۔ جلدی سے پانی گھر پہنچایا اور تیزی سے چوک پر آگئے۔ باؤ کی ہوٹل میں دھواں دھار قسم کے مذاکرے چل رہے تھے۔

"امریکہ کا بولا ہے! اب شام والا نیوز سنا ہے کہ نہیں!"

"ہاں ابھی سن کے آرہا ہے۔ لگتا ہے تم ہی ایک نیوز سننے والا ہے!"

"ارے عالم! ای تو جوش سے بول رہا ہے نیوز میں کا خبر ہے ای بتاؤ۔"

"امریکہ اپنا جہاز اتارے گا۔ سمجھا!"

"سنا ہے ترکی بھی اپنا ہوائی اڈہ دے رہا ہے!"

"اب پورا سالا اسلام اور مسلمان کا دشمن ہے۔"

"حضور صلعم نے فرمایا: چودھویں صدی کے بعد کیا ہوگا میں نہیں بتا سکتا۔ ارے یہ سب قیامت کے آثار ہیں بھائی۔" یہ کھچڑی داڑھی والے مسجد کے موذن صاحب نے ایک لمبی اور انتہائی سرد آہ کھینچتے ہوئے کہا

"ارے او جمولا... ای سالا جو ہوا کہاں ہے سے...؟"

ہوٹل کے مالک باؤ کی کڑک کر ابھری آواز دفعتاً تمام آوازوں پر حاوی ہو گئی۔

"کا ہے!" جمولا کہیں سے نکل کر بولا

"کا ہے؟ آئیں... ماریں گے سالے چار جھاڑ دا ٹھیک ہو جائے گا۔ کہاں مرگیا تھا رے؟.... چل جا احمد سیٹھ کے یہاں جلدی..... چار اسپیشل اور دو گلاس پانی.... کام نہ دھندہ مارے رنڈا۔" پھر یہ خاموش ہو کر باؤ مودبانہ انداز میں موذن صاحب کی طرف دیکھنے لگا، لیکن شاید موذن صاحب آثار قیامت کے سلسلے کو مزید جاری رکھنے کے موڈ میں نہیں تھے۔

"ہاں تو صدام حسین ......" باتوں کا لامتناہی سلسلہ جاری تھا۔

اسی دوران اچانک ایک بے نام سا وجود سے جمیل بھائی کے اندر اُٹھا اور انہیں تنہائی کے بے کراں سمندر میں غرق کر گیا۔ تنہائی کا یہ احساس اس لئے نہیں تھا کہ وہ ان باتوں میں کسی قسم کی کوئی دلچسپی محسوس نہیں کر رہے تھے۔ بلکہ اس لئے تھا کہ وہ مسلسل جاری اس عاقلانہ مباحثے میں کوئی اہم کردار ادا نہیں کر پا رہے تھے۔ کہنے کو بہت کچھ تھا جو کچھ معلوم ہوا تھا وہ بہت ہوا تھا۔ انہوں نے کچھ ایسی خبریں سن رکھی تھیں کہ جنگ ہونے والی ہے لیکن اچانک شروع ہو جائے گی اس کا انہیں اندازہ نہ تھا۔ میزائیل اور اسرائیل بار بار ان دو بے صورت الفاظ کی تکرار نے بھائی جمیل کے پورے وجود میں سنسنی پیدا کر دی تھی۔

مجلس ختم ہوئی۔ بازو نے محفل بند کیا۔ اور لوگ ایک ایک دو دو کے گروپ میں اپنے اپنے گھر لوٹ گئے۔ بھائی جمیل رات بھر بستر پر کروٹیں بدلتے رہے......

دوسرے روز پہلی فرصت میں انہوں نے مرفی ریڈیو میکینک کے حوالے کیا۔ لیکن وہاں پہلے ہی سے مرمت کے لئے ریڈیو کی نامی تعداد موجود تھی اور دو چار دن کے اندر ریڈیو ملنے کی کوئی امید نہیں تھی جھنجھلا کر وہ جیب سے پانچ سو روپے نکالے اور بازار سے ایک بلیک اینڈ وائٹ پورٹیبل ٹیلیویژن خرید کر لائے۔ انٹینا وغیرہ سیٹ کرنے کے بعد انہوں نے راحت کی سانس لی۔ گھڑی دیکھی، ابھی سماچار کا وقت نہیں ہوا تھا۔ بچوں کو سختی سے ٹی وی نہ چھونے کی تاکید کرتے ہوئے وہ باہر نکل آئے۔ نیتا جی کے گھر کے سامنے لوگ جمع ہو رہے تھے۔ بھائی جمیل کے وجود میں دوڑتی سنسنی مزید تیز ہو گئی۔ نیتا جی فرما رہے تھے۔

"ورلڈ پالیٹکس آپ لوگوں کے برین سے اوپر کی چیز ہے امریکہ اور عراق جھوٹ موٹ کا لڑ رہے ہیں لیکن یہ بات آپ لوگ کب انڈر اسٹینڈ کریں گے؟"

خون کھول کر رہ گیا بھائی جمیل کا لیکن نیتا جی کے سامنے زبان کھولتے ہوئے ڈرتے تھے۔ پھر دبا کر بولے "کیا بول رہے ہیں نیتا جی اتنی بربادی، جھوٹ موٹ کی جنگ میں ہوتی ہے کیا؟"

نیتا جی بہت اطمینان سے مسکرا کر بولے "جیسے بربادی تو بیچاری کی ہے مر رہے ہیں، لیکن کوئی ہم کو یہ بتلائے کہ صدام حسین

اور جلتے ہوئے شہروں کا بھی نقصان کیا ہو رہا ہے کہ نہیں؟"

بھائی جمیل نے محسوس کیا کہ وہ اور زیادہ دیر تک اس طرح چپ چاپ نیتا جی کی باتیں برداشت نہ کر پائیں گے صدام کے خلاف بولنے والا۔ دین و ایمان سے کوئی مطلب ہو تب نا۔"

وہ بادو کے چائے خانے میں چلے آئے۔ یہاں تل ابیب پر اسکڈ میزائیل کے تابڑ توڑ حملوں کی منظر کشی جاری تھی۔

"دیکھئے گا اسرائیل نام کا ملک صفحۂ ہستی سے مٹ کر نیست و نابود ہو کر رہے گا" صوفی صاحب اپنی کھچڑی داڑھی سے ایک سفید بال کو نوچتے ہوئے بولے۔

"بجا فرما رہے ہیں آپ۔ اور یہ جو اسکڈ میزائیل گرائے جا رہے ہیں اس سے تباہی تو بہت زیادہ ہوئی ہوگی" کسی نے اپنے جذبۂ تجسس کی تسکین کے لئے پوچھا۔

"تباہی! ارے میاں وہاں لوگوں کو گیس ماسک تقسیم کئے جا رہے ہیں۔ ہزاروں لوگ مارے جا چکے ہیں۔ کروڑوں کی جائیداد تباہ ہو چکی ہے۔"

"اور چچا عراق ......" وضاحت کی چچا نے!

یہ چچا برکت علی تھے۔ ان کا نام چچا عراقی کیوں رکھ دیا گیا۔ جمیل بھائی کے ذہن میں ایک سوال پیدا ہوا ان کے اس سوال کا جواب چچا عراقی کے تئیں ہی مل گیا۔ ابھی ابھی وہ نیتا جی سے الجھ کر آ رہے تھے اور کافی جوش میں تھے۔

"وہ بات کرتا ہے۔ کیا جانتا ہے یہ! کھدر پہن لینے سے آدمی گاندھی نہیں بن جاتا ہے۔ بات کرتا ہے۔ ابے ہم سے پوچھو صدام حسین کیا ہے؟ صلاح الدین ایوبی ہے۔ صلاح الدین ایوبی.... بات کرتا ہے"

حاضرین مجلس میں بیشتر اسلامی تاریخ میں صلاح الدین ایوبی کے رول سے ناواقفیت کی بنا پر خاموش ہی رہے۔ کسی نے پوچھا "جنگ کا انجام؟" اس سے صرف ایک انتہائی پراسرار سوال نے جمیل بھائی کے اندر جیسے ٹھہرے ہوئے پانی میں ابال پیدا کر دیا۔

"ابے ابھی تو جنگ شروع ہوئی ہے۔ سنا نہیں صدام نے کیا کہا ہے۔ یہ جنگ تمام جنگوں کی ماں ہے۔ بات کرتا ہے... اس کے انجام میں بھی کوئی شک ہے کیا؟ اسے بندۂ مومن کے سر پر فتح کا سہرا بندھتا ہے۔"

دوردرشن کے سماچار کا وقت ہو رہا تھا۔ لوگ منتظر تھے۔ جمیل بھائی
بھی مگر آخری وقت سامنے جم گئے۔ پھر جنگ ہی کی خبریں تھیں۔ بتایا گیا
بغداد کے ایک بنکر کو متحدہ افواج کے بمبار طیاروں نے میزائیل سے تباہ
کر دیا۔ ہزاروں لوگ موت کے گھاٹ اتر گئے۔ جواب میں عراق نے سعودی عرب
پر اسکڈ میزائیل داغے جسے امریکی پیٹریاٹ میزائیلوں نے فضا ہی میں تباہ
کر دیا۔

سماچار سن کر جمیل بھائی کا چہرہ اتر گیا۔ پھر بھی مسرت کی کرن دوڑ
ہوٹل کی طرف تیز قدموں سے چل پڑے تاکہ لوگوں کو اس خبر کی بابت مکمل رپورٹ
اور سب باتوں سے آگاہ کریں لیکن انہیں مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ وہاں
پہلے سے ہی اس مسئلے پر تفصیلی گفتگو جاری تھی۔

وہ اسے سب مجبوری بتا رہے تھے۔ بی بی سی ریڈیو اور سی این این
اور امریکی ٹی وی کا توسط ہے دوردرشن کو ان ہی کے ذریعہ خبریں ملتی ہیں
کسی نے حالات کی وضاحت کی۔

جمیل بھائی نے محسوس کیا بات میں وزن ہے۔ انہیں تھوڑی دیر
پہلے جس دکھ نے آ گھیرا تھا اس کی شدت میں کمی آ گئی اور چہرے
پر رونق بحال ہونے لگی۔

اس سلسلہ روز و شب کے درمیان محلے میں کئی تبدیلیاں ظہور
پذیر ہوئیں۔ مثلاً یہاں لوگوں کو تاریخ اور اخباروں سے کوئی دلچسپی
نہیں تھی لیکن اب محلے میں اردو اخباروں کا سیلاب آ گیا تھا۔ بھانت
بھانت کے رنگ برنگے اخبار۔ سب سے زیادہ جنگ نمبر نکال رہے تھے
اخبار [illegible] روپے کا تھا لیکن اسے
بلیک میں چھ روپے کا فروخت کیا جا رہا تھا۔ اس میں صدام
حسین کی جانب نظر تصویر تھی جس میں وہ فوجی وردی میں ملبوس [illegible]
[illegible] جمیل بھائی نے بڑی مشکل سے یہ نمبر حاصل کیا
تھا اور صدام حسین کی تصویر کو فریم کروا کر اپنے کمرے میں ٹانگ دیا تھا۔

اس سلسلہ روز و شب کے درمیان کئی بچوں کی پیدائش ہوئی۔ ان
میں زیادہ تر لڑکوں کے نام صدام حسین رکھے گئے۔ جمیل بھائی کو اس بات
کا کافی افسوس تھا کہ ان کا سب سے چھوٹا بیٹا چھ برس کا ہو چکا ہے
اور اب اسکول بھی جانے لگا ہے اس لئے وہ خواہش کے باوجود اب
اس کا نام تبدیل نہیں کر سکتے۔

غرض یہ سلسلہ روز و شب کا سفر یوں ہی جاری تھا۔
ایک روز مسجد سے نماز عشاء ادا کر کے جب جمیل بھائی باہر نکلے

قدرتی طور پر ان میں کافی جوش و خروش ہے۔
• مجھے اس عراق کی فتح پر یقین ہے! ماسٹر حسن شفاق جذبات
کے ساتھ اعلان کر رہے تھے۔
• آپ کو پتہ ہے عراق کی پیدل فوج دنیا کی سب سے طاقتور
اور خوفناک فوج ہے! جمیل بھائی نے دوسروں سے بڑھ کر اپنی معلومات کا مظاہرہ
کرنا چاہا۔
• معلوم ہے، سب معلوم ہے۔ بات کرتا ہے۔ اب یہ تو
اخبار نوٹ عام سے پڑھ لوں والے ایڈیشن میں تفصیل سے لکھا
تھا! چچا عراقی اپنے مخصوص لہجے میں بولے۔
جمیل بھائی وہاں سے اٹھ کر اپنے گھر میں ہی اپنی عافیت سمجھی کیونکہ
کہ بہرحال چچا عراقی آج کل جس کے پیچھے پڑ جاتے تھے اس کے
ملنے والے ہی راستے روک لیتے تھے یا تو چچا عراقی کا گلا گھونٹ کر انہیں
ہمیشہ کے لئے خاموش کر دے یا پھر خود ہی خودکشی کر کے اس آسیب
سے ہمیشہ کے لئے نجات پائے۔
جنگ میں شدت آتی گئی ...... اور محلے کا ماحول گرم ہوتا
گیا۔ ساتھ ہی ساتھ ہمارے جمیل بھائی کا دوران خون بھی تیز ہوتا رہا....
اس سنسنی خیزی، اس تجربہ اور ہیجان نے جمیل بھائی کی رکی رکی سی زندگی کو
کافی دلچسپ اور پر جوش بنا دیا تھا۔
جمیل بھائی آج ڈیوٹی سے لوٹتے ہوئے کینٹین سے بچوں کے لئے
چاپ اور سموسے کے علاوہ کچھ مٹھائی بھی خرید لائے۔ کچھ دیر بعد ہوٹل
میں گپ شپ کی بات رہی تھی کہ اچانک شیخی سے خود صدام نے ہی عراقی فوج
کو واپس بلا لیا تھا۔ متحدہ افواج گراؤنڈ وار کے لئے تیار تھی۔ اور
بغداد پر بمباری کی شدت میں مزید اضافہ کر دیا گیا تھا۔ محلے کے لوگ
سانس روکے دم سادھے صدام حسین کی نئی حکمت عملی کا بڑی بے صبری سے
انتظار کر رہے تھے۔
مگر آج جمیل بھائی نے کچھ سوچے اور لڑکوں بچوں میں بات کیے۔
تھوڑا آرام کیا۔ ملکے وضو بنایا۔ مسجد گئے۔ نماز پڑھ کر لوٹ آئے۔ سماچار
کا وقت ہوا۔ ٹی وی کا بٹن دبایا۔ اسکرین چمک اٹھا...... تھوڑی دیر
بعد سماچار شروع ہوا۔
..... عراق نے کسی شرط کے بغیر کویت سے فوج واپس بلانے
کے معاہدے پر فوراً عمل درآمد شروع کر دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی
دونوں فریقوں نے جنگ بند..... جنگ بند

[باقی صفحہ ۳۵ پر دیکھئے]

معین الدین ماجد

... نگر ریلوے کالونی الہ آباد - ۲۱۱۰۰۱

گول میز

ایک طویل عرصہ کے بعد آدمی اور سانپ میں سمجھوتہ ہوگیا۔

دراصل جس مکان میں آدمی رہتا تھا اس میں ایک روز نہ جانے کہاں سے ایک سانپ آدھمکا تھا۔ وہ بھی ایک مکان ہی کی تلاش میں نکلا تھا۔ اسے کہیں کوئی مناسب ٹھکانہ نہیں ملا تو آخر میں اس نے اس گھر کا رخ کیا تھا۔ آدمی کا مکان ایک کمرہ اور ایک کوٹھری پر مشتمل تھا۔ گھر کے افراد بھی ضرورتِ حاضرہ کے لحاظ سے تھے۔ میاں بیوی اور دو بچے۔ بس! سانپ نے مکان کا مکمل جائزہ لیا۔ اس نے کوٹھری کو ہر اعتبار سے مناسب سمجھا اور کوٹھری میں رہنے کا مصمم ارادہ کرلیا۔ سانپ نے آدمی سے رسماً اجازت مانگی۔

آدمی ہچکچایا... اور اس نے سانپ کو اپنی کوٹھری دینے سے صاف انکار کر دیا۔ سانپ آدمی کی بدسلوکی پر تلملا گیا اور چوکھٹ پر اپنا پھن پٹخنے لگا۔ پھر ذرا ٹھنڈے دل سے سانپ نے سوچا کہ مواقع چھینے جاتے ہیں۔ چیز مانگنے سے نہ حاصل ہو تو زبردستی چھین لینا چاہیے دورِ حاضر کا تقاضہ یہی ہے...! چنانچہ سانپ نے آدمی کی کوٹھری پر جبراً قبضہ کرلیا اور اس روز سے وہ بڑے حق کے ساتھ رہنے لگا تھا۔

بظاہر سانپ اور آدمی ایک ہی چھت کے نیچے تھے۔ مگر بالکل لاتعلق سے۔ اندر ہی اندر دونوں ہی ایک دوسرے کے خلاف گھات لگائے بیٹھے تھے۔ آدمی روٹی کی خاطر اور سانپ شکار اور سیر سپاٹے کے چکر میں باہر نکل جاتے۔ آدمی کی واپسی کے بعد ہی سانپ گھر میں گھستا تھا۔ مصلحتاً چند دنوں تک سانپ نے کوئی ایسی حرکت نہیں کی جو آدمی کے لئے نقصان دہ ثابت ہوتی۔ مگر فطرت... اور سانپ!

ایک روز سانپ خاموش جذبے کے تحت دن دہاڑے گھر میں گھس آیا۔ عورت غالباً نہا کر نکلی تھی... اور بلاؤز پیٹی کوٹ میں ملبوس ڈریسنگ ٹیبل کے شیشے کے روبرو جھک جھک کر... لہرا لہرا کر اپنے بال خشک کر رہی تھی کہ یکبارگی اس کی نظر اپنے مقابل سانپ پر پڑی۔ عورت حواس باختہ ہوگئی۔ وہ سہم کر ایک کونے میں کھڑی ہو گئی۔ ایک چوکنے دربان کی طرح سانپ دروازہ کے پاس کھڑا مستی کے عالم میں جھوم رہا تھا۔ قبل اس کے کہ وہ عورت پر جھپٹتا... کہ اسے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی پڑی۔ سانپ ہچکچایا۔ خلافِ توقع اپنے رقیب کو گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر اسے حیرانی ہوئی۔ برق رفتاری سے وہ دم دبا کر اپنی کوٹھری کی جانب سرپٹ بھاگا۔

بس، اسی روز سے آدمی سانپ کو اپنے گھر سے نکالنے کے لئے طرح طرح کی تدبیریں سوچنے لگا۔ مگر تب تک پانی سر سے اونچا ہوگیا تھا۔ اس کی پھنکار رفتہ رفتہ اپنا اثر دکھانے لگی تھی۔ اندیشے اور وسوسے کلبلانے لگے تھے در و بام سے دہشت ٹپکنے لگی تھی۔

ایک روز —

گرمی کے دن تھے۔ نصف شب گزر چکی تھی۔ آدمی اپنے پریوار کے ساتھ خراٹے لے رہا تھا کہ موقع پاکر سانپ آدمی کی جوان لڑکی کو ڈسنے کے لئے دبے قدموں آہستہ آہستہ اس کی چارپائی کی طرف بڑھا۔ پھر ایک لمحے کے لئے سوچ کر چارپائی کا چکر لگا کر اس نے ہر سمت کا بھرپور جائزہ لیا۔ چاروں طرف سکوت طاری تھا۔ سانپ کو کامل یقین ہو گیا تو وہ لڑکی کے حسین مکھڑے کے قریب کھڑا اسے نہارنے لگا۔ یوں ہی دیر تک نہارتا رہا... اور آنکھوں ہی آنکھوں میں جتاتا رہا۔ اسی

پتہ نہ جانے کیسے کیا ہوا کہ روٹ لیتے وقت لڑکی کی نیند ٹوٹ گئی۔ وہ سانپ کو اپنے عین نزدیک پا کر ڈر کی آواز سے چیخ اٹھی۔ اب سانپ کے خلاف آدمی کا احتجاج اشد ضروری ہو گیا۔ غالباً سانپ آدمی کا ارادہ بھانپ گیا.... اب وہ آدمی پر حاوی ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ دونوں آپس میں لڑتے جھگڑتے... ایک دوسرے کو چیلنج کرتے اور دھمکیاں دیا کرتے۔

عاجز آ آدمی دوسرے مکان کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹکنے لگا... مگر اسے سر چھپانے کو کہیں کوئی جگہ نہیں مل سکی۔ بالآخر وہ تھک ہار کر بیٹھ گیا اور اس نے سانپ سے صلح کر لینے میں ہی اپنی عافیت سمجھی۔ چنانچہ آپس میں سمجھوتہ ہوا کہ اب آئندہ کبھی کوئی کسی کی طرف رخ نہیں کرے گا۔ دونوں مطمئن ہو گئے۔

مگر سانپ، سانپ ہی ہوتا ہے۔

آدمی کو کچھ شبہ ہوا۔ وہ اس سمجھوتے کا ردّ عمل جاننے کیلئے بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔

رات کا ایک بج رہا تھا۔ کائنات محوِ خواب تھی۔ آدمی دبے پاؤں اٹھا۔ اور اس نے اپنے کمرے کے دروازے کی دراز سے یوں ہی اندر جھانکا تو اسے بے ساختہ ہنسی آ گئی۔

سانپ بھی اپنی کوٹھری کی دوسری والی دیوار کے سوراخ سے سر نکالے جھانک رہا تھا۔..... *

پیش کرتا ہے

عربی، فارسی، روسی، ترکی، جاپانی، چینی، انگریزی، امریکی، جرمن، پولش، آئرش، اطالوی، سوئس وغیرہ عصری اور نثری ادب پاروں کے تراجم پر مشتمل

دستاویزی خصوصی شمارہ

جس کو آپ "خرام" کی سالانہ یا ششماہی خریداری قبول کر کے مفت حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ رعایتی شرح صرف ۔/۱۰ روپیہ کوپن کا رابطہ کے نام ۔/ منی آرڈر کے ساتھ بھیج کر حاصل کر سکتے ہیں۔ ... خریدار ... نئی آرڈر یا ڈاک ٹکٹ قابل قبول نہیں ہوں گے

• آفسیٹ کی طباعت • خوبصورت چہار رنگی ٹائٹل • صفحات تقریباً ۱۱۰

		فی شمارہ	سالانہ	ششماہی
بدل اشتراک	ہندوستان میں	20/- روپے	60/- روپے	30/- روپے
	پاکستان بنگلہ دیش و دیگر ممالک	4/- ڈالر	12/- ڈالر	6/- ڈالر

کوپن

براہ کرم "خرام" کا غیر ملکی ادب نمبر رعایتی شرح پر ارسال کریں ۱۰/ روپیہ کا ڈرافٹ / منی آرڈر منسلک ہے

نام ....

پتہ ....

ماہنامہ خرام ۸۸/۲۸۸ نسیم آباد، پوسٹ بکس ۲۸۲ کانپور ۲۰۸۰۰۱ (یو۔پی)

ہفت روزہ اخبار نو نئی دہلی

دستِ برگ کے بعد ستیہ پال آنند

کا

نیا شعری مجموعہ

ستّر اردو نظمیں جنھیں عالمی سطح پر عصری یورپی اور امریکن شاعری
کے مقابل رکھنے میں کوئی پیش و پس نہیں ہوتا

دیدہ زیب طباعت اور گیٹ اپ

قیمت ● ۱۲۰ روپے

مدیر

افتخار امام صدیقی

●

معاون

ناظر نعمان صدیقی

قیمت ۶ روپے

زرِ سالانہ ۶۰ روپے ◆ لائبریریوں سے ۷۵ روپے

تاحیات خریداری ۱۰۰۰ روپے ◆ معاونین سے ۱۰۰ روپے

ممالکِ غیر سے
۲۵ ڈالر ــ ۱۵ پونڈ

آج اُردو شاعری خرابِ افراط ہے۔
اس میں تفریط کی بہرحال ضرورت ہے۔ اہلِ کمال
اور کم علم لوگوں کی شاعری میں کوئی وجہ تفریق
ہونی چاہیئے۔ ردیف اور قافیہ اور بحر کی پابندی کے
ساتھ ایک خیال موزوں کر لینا کوئی معجزہ نہیں۔
ہر موزوں طبع بہرحال شعر کہہ سکتا ہے لیکن کاغذ
اور اذہان پر صدیوں باقی رہنے والے شعر دماغ کی
جودت اور روح کی قوت سے کہے جاتے ہیں۔
صرف بحر اور قافیہ و ردیف کے بوتے پر نہیں
کہے جاتے۔

[۱۲ دسمبر ۱۹۳۵ء، کانپور]

سیماب اکبرآبادی

مصنف	صفحہ	عنوان
شمیم حنفی	۷	نثری نظم کا مسئلہ
آغا سہیل	۲۰	افسانہ اور عصری آگہی
جاوید اقبال	۳۷	البیئر کامو
احمد رئیس	۱۹	نظم
حفیظ آتش	۱۹	جنگ
ندا نواز	۱۹	نیم سزا
ندا نواز	۱۹	بے بسی
ندا نواز	۱۹	حرف حرف لہو
کاشی ناتھ امبلگے	۳۶	محبت
کاشی ناتھ امبلگے	۳۶	تصویریں
کاشی ناتھ امبلگے	۳۶	کامیاب شاعر
کاشی ناتھ امبلگے	۳۶	آسمان
افتخار امام صدیقی	۴۲	خواب احساس
افتخار امام صدیقی	۴۲	دنیا کیسے حاصل ہو
افتخار امام صدیقی	۴۲	خدا اور میں
افتخار امام صدیقی	۴۲	کنواری آنکھیں
افتخار امام صدیقی	۴۲	خلا در کرب
ایوب جوہر	۱۱	روٹ لیس
شکیلہ رفیق	۱۵	بادضو دلہن
غضنفر	۲۸	بھیڑ چال
مظہر سلیم	۳۲	آدم ہاؤسنگ سوسائٹی
شاعلین نظمی	۴۰	ایک کمبخے کی آرزو

(نظمیں)

پریم کرت رنظر - اقبال متین - ظہیر غازی پوری ۱۴
غیاث متین - مختار شمیم - شاہد کلیم ۲۷
خورشید اکبر - شکیل جالی - عارف شفیق ۳۱
ہیرانند سوز - مجید اختر - جمال اویسی ۳۹

مصنف	صفحہ	عنوان
محسن زیدی	۶	غزل
حمید الماس	۶	ہم سفر [نظم]
شہزاد احمد	۱۰	تین غزلیں
مالک رام	۵	[بنام] دل شاہجہانپوری
ا د ا ر ہ	۴۴	کتب و رسائل کا تعارف اور تبصرہ
ا د ا ر ہ	۳	ہم عصر اردو ادب نمبر کے بارے میں

سرورق
’زوالِ رتبِ الشمس‘
شعر: اقبال [معمولی تحریف کے ساتھ]
عمل
غلام الہندی
[بنارس]

عتیق احمد - آفتاب عالم آفاقی - شاکر کھیوری
ریحان غنی - نشاط احمد شاد - شاہد اختر
جگر گلزاری - قمر نقوی - سلیم شہزاد
پروین کمار اشک - محمد اسلم - بشارت احمد
عزیز یوسفی - عبدالقوی دسنوی - حفیظ آتش
مرلعل خان ۴۴ حامدی کاشمیری

شمارہ - ۷ [۱۹۹۴] جلد - ۶۵

جولائی ★ ۱۹۹۴ء

ہم عصر اردو ادب نمبر کے بارے میں

قارئین کرام! شاعر کے "ہم عصر اردو ادب" نمبر کا پوری اردو دنیا کو شدید انتظار ہے۔ اس کا ہمیں احساس ہے۔ شاعر کی ۶۵ سالہ تاریخ میں کوئی بھی خاص نمبر اتنی غیر معمولی تاخیر سے دوچار نہیں ہوا تھا۔ محدود وسائل اور سخت ترین حالات کے باوجود ایک کے بعد ایک خصوصی نمبر شائع ہوتے رہے تھے۔ ہمارا ریکارڈ ہے کہ باوجود اقبال نمبر جیسا پیچیدہ اور بڑا تحقیقی کام بھی سال بھر میں شائع ہو گیا تھا۔ مگر! ہم عصر اردو ادب نمبر کی کہانی کچھ اور رہی ہے۔ اس کہانی کی داستان کو ہم خاص نمبر کے لئے اٹھا رکھتے ہیں۔ یہاں صرف چند معروضات آپ کے حضور پیش کرنے کی اجازت چاہتے ہیں۔

۱۹۹۲-۹۳ میں ملک کی بدترین سیاسی صورت حال اور بمبئی کے بھیانک فسادات نے وہ قیامت توڑی کہ ہم عصر اردو ادب نمبر کے تیزی سے مکمل ہوتے ہوئے کام درمیان ہی میں رک گئے ـــــ دو ہزار صفحات تک ایک بالکل ہی مختلف منفرد اور نئے تخلیقی منصوبے کی عدم تکمیل اور بمبئی کے ناگفتہ بہ حالات نے اس قدر توڑ دیا کہ کار و افکار کا جو تسلسل بنا ہوا تھا۔ اس میں جو شدت تھی وہ بکھر گئی۔ ایک عجیب سی تخلیقی کیفیت جیسے بانجھ ہو گئی۔

قارئین! اب ۱۹۹۴ء میں بروقت تمام ہم اپنے آپ کو سمیٹ پائے ہیں۔ ہم نے منصوبہ بنایا تھا کہ شاعر میں بہت ساری معنوی و صوری تبدیلیوں سے قبل ایک ایسا خاص نمبر شائع کیا جائے جس میں پوری اردو دنیا کے اہم قلم کاروں اور تازہ کار قلم کاروں کی ایک بالکل نئی کائنات سجا دی جائے۔ اردو شعر و ادب کا ایک "محل" شاعر کے صفحات پر تعمیر کر دیا جائے۔ عالمی اردو ادب کے تقریباً تمام اہم لوگوں کی تخلیقات کی یکجائی اور کسی ضخیم ترین خاص نمبر ہی میں سمائی۔ آج کے حالات میں اب ممکن نہیں۔ مگر ہم اسے ممکن کر گزرنے کا خواب سوچ چکے تھے۔

شاعر کے حالیہ شماروں میں آپ ہم عصر اردو ادب نمبر کے اعلانات دیکھ رہے ہوں گے۔ اور قیاس کر رہے ہوں گے کہ خاص نمبر کس معیار و مقدار کا حامل ہوگا۔ ابھی کچھ اور اعلانات آئیں گے۔ لیکن یقین کیجئے کہ آپ کے شاعر کا خاص نمبر آپ کے ان اعلانات سے بہت آگے کی چیز ہوگا۔ اس میں صرف شاعری، افسانے، مضامین، یا تبصرے نہیں ہوں گے۔ ادبی رسائل کی یہ روایتی ترتیب یکسر بدل چکی ہوگی۔ اس خاص نمبر کے لئے ایک نئی تعریف کی ہمیں جستجو ہے۔

قارئین! آپ نے بہت انتظار کیا ہے، صبر کیا ہے۔ کچھ اور انتظار کیجئے اور ہمارے لئے بطور خاص دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہم سے یہ کام مکمل کروا لے۔ خاص نمبر کو مکمل کرنے کی دھن میں ہر وقت کی بے طرح مصروفیت ہے ہمیں روز و شب کا ایک ایک ساعت کم معلوم ہو رہی ہے۔

خاص نمبر میں شامل ہونے والے قلم کاروں سے گزارش ہے کہ وہ اپنی نگارشات کو صرف اور صرف شاعر کے لئے مختص سمجھیں ہمیں مطلع کئے بغیر کوئی بھی تحریر کہیں اور ارسال نہ کی جائے۔ خاص نمبر کے تمام ابواب اپنی تخلیقی ترتیب میں شعر و ادب کے ایک نئے وجدان کو جنم دیں گے۔ شاعری کے باب میں اردو شاعری کا ایک عالمی منظرنامہ ابھر کر آئے گا اور پہلی بار نئے پرانے قلم کاروں کی ایک طویل کہکشاں بھی جگمگائے گی۔ ایک ایسا ضخیم اور وسیع انتخاب جو اس سے قبل کبھی بھی ممکن نہیں ہو سکا تھا۔ بے شمار شعراء سے رابطہ قائم کیا گیا ہے اور یہ سلسلہ آخری مراحل تک رہے گا۔ شعراء حضرات سے گزارش ہے کہ وہ ہمارے خط کا انتظار کریں ـــ اس کے بعد ہی اپنی تخلیقات کے بارے میں کوئی فیصلہ کریں۔ ہم آپ تک پہنچ رہے ہیں۔ شاعر کے ذریعے خطوں کے ذریعے۔ اردو کے تمام قلم کار و قارئین کے بھرپور تعاون کے بغیر یہ خاص نمبر شائع نہیں ہو سکے گا۔ یہ ایک اجتماعی نوعیت کا کام ہے۔ اور ہم اپنے اس کام سے ادبی رسائل اور قارئین سے متعلق بعض گمراہ کن اور مصنوعی مفروضوں کو توڑنا چاہتے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ آپ اپنے شاعر کو کس طرح نوازتے ہیں۔

[ادارہ]

غزل

پلٹتے جاؤ نہ سارے ہی باب ایک ہی ساتھ
تمام ہو نہ سکے گی کتاب ایک ہی ساتھ

نکل پڑے ہیں جب ایسی شکستہ کشتی میں
تو ہوں گے پھر تو سبھی غرقِ آب ایک ہی ساتھ

کبھی ملی نہ کسی خواب کی ہمیں تعبیر
ہمیشہ دیکھے ہیں خواب و سراب ایک ہی ساتھ

یہ کون سیرِ چمن کو نکل پڑا دمِ صبح
چمن میں کھل اٹھے سارے گلاب ایک ہی ساتھ

کسی سے اسکی نظر ایک سی نہ تھی، پھر بھی
ہوئے سب عشق میں خانہ خراب ایک ہی ساتھ

اٹھو کہ جشن منائیں ہم اپنی صحت کا
اٹھائیں ہاتھ میں جامِ شراب ایک ہی ساتھ

مری نگاہ نے محسن سبھی کو دیکھ لیا
رخوں سے اٹھ گئے سارے نقاب ایک ہی ساتھ

محسن زیدی
۵۳/۱۸،۱ اندرا نگر۔ لکھنؤ۔ ۲۲۶۰۱۶

ہم سفر

اس سے پہلے اس طرح کی تیز رفتاری نہ تھی
گھٹ رہے ہیں روز و شب کے فاصلے
آنے والے آخری لمحے نہ ہوں
ہیں نگاہوں میں افق کی وسعتیں
اجنبی دشتِ فضا ہے
کھو نہ جاؤں میں کہیں
اک طرف اڑتے ہوئے ہیں خار و خس
دوسری جانب ہے گرد
اتنی آلودہ نہ تھیں پچھلے سفر کی ساعتیں
مبتلا ہوں کس اذیت میں
مجھے
کوئی بتلاتا نہیں
سب ذرائع ہو گئے معدوم
رفتہ رفتہ آگہی بھی کھو گیا
میں ہوں
میری آخری خواہش ہے تنہا ہم سفر

۱۱۶۳-ب، اپ اسٹیر، ۲۶ اے، مین، نواں بلاک، جیا نگر، بنگلور-۶۹

شمیم حنفی

بی-۴۴، ذاکر باغ، اوکھلا روڈ - نئی دہلی - ۱۱۰۰۲۵

نثری نظم کا مسئلہ

ایک سوال جس پر غور کرنے کی ضرورت ہمیشہ باقی رہے گی۔ یہ ہے کہ ادب کی اصناف کے ڈھانچے یا ہیئت کے تعین میں بنیادی رول کون ادا کرتا ہے؟ یا یہ کہ کسی مخصوص صنف کی ترکیب کے عناصر میں سب سے زیادہ عمل دخل کہاں ہوتا ہے؟ شعری اور ادبی قدروں کا؟ افراد کا؟ کسی مخصوص فکری میلان کا؟ یا کسی خاص زمانے کا؟ ہمارے یہاں شاعری کی صنفیں یا تو اپنے موضوع سے پہچانی جاتی ہیں یا پھر ہیئت اور بناوٹ سے۔ کچھ صورتوں میں موضوع اور ہیئت ایک ساتھ دونوں کی بنیاد پر کسی صنف کی پہچان مقرر کی جاتی ہے۔

لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مختلف صنفیں کسی نہ کسی سطح پر ایک دوسرے سے اس طرح مربوط ہوتی ہیں کہ ان کے بہت سے عناصر ایک دوسرے سے مماثل ہوتے ہیں۔ ان میں تجربے، خیال اور موضوع کی حدیں قائم کرنا آسان نہیں ہوتا۔ کچھ امتیازات کے ساتھ ساتھ اشتراک کے کچھ پہلو بھی نکل آتے ہیں۔

اس معاملے میں شاعری کی جو صنف ہمارے لیے سب سے زیادہ مسئلے پیدا کرتی ہے نظم کی صنف ہے۔ قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، غزل، رباعی کے معاملات بڑی حد تک نظم سے مختلف ہیں کہ ان تمام صنفوں کی روایت بہت پرانی ہے اور مستحکم ہے۔ اسی لیے ان اصناف کی ہیئتوں میں کوئی بہت بڑی یا انقلابی تبدیلی ممکن نہیں۔ آزاد غزل، نثری غزل کے تماشے، شاعر کو اس آسانی نے شعر کو اس قسم کی دولت مندی نے غزل کی صنف سے اس کا سب سے بڑا امتیاز یعنی اس کے اشعار کی MEMORABILITY چھین لی۔ کسی شخص کو اگر آزاد اور نثری غزل کے شعر ازبر ہوں تو اسے اس شعر سے زیادہ اس شخص کا کمال سمجھنا چاہیے۔

یہ تمام صنفیں جن کا ذکر ابھی کیا گیا۔ ایک مستحکم تہذیبی اساس رکھتی ہیں۔ قصیدے، مثنوی، مرثیے، غزل، رباعی کا تصور ایک مربوط اور معین اجتماعی روایت کے تصور کا پابند ہوتا ہے۔ ان صنفوں پر گفتگو میں ہم ان کے روایتی پس منظر کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔

ایک واضح تہذیبی اساس تو نظم کی صنف بھی رکھتی ہے۔ بلکہ آگے بڑھنے سے پہلے یہ عرض کرتا چلوں کہ تہذیبی تقاضوں، اور ضرورتوں یا تہذیبی دباؤ کے ایک تصور کے بغیر میرے لیے کسی صنف کی شناخت اور تعبیر کا تصور کوئی معنی ہی نہیں رکھتا۔ لیکن شعر کی دوسری صنفوں کے مقابلے میں نظم کی صنف کے معاملات بعض اعتبارات سے مختلف بھی ہو جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں سامنے کی چند باتیں حسب ذیل ہیں۔

۱۔ نظم کی روایت اردو کی تاریخ میں اس طور پر متعین نہیں کی جا سکتی جس طرح مثال کے طور پر قصیدے، مرثیے اور غزل کی تاریخ

۲۔ ان اصناف کے مقابلے میں نظم کی صنف، کم سے کم انیسویں صدی کے اواخر تک بہت مایہ دار نہیں رہی۔ نظیر اکبرآبادی کی حیثیت محض استثنائی ہے

۳۔ مثنوی اور مرثیے کی ہیئت کے ساتھ قصیدے اور غزل کی جیسی ORTHODOXY تو وابستہ نہیں رہی۔ لیکن ان صنفوں میں جو تجربے یا ان کی وضع میں تھوڑی بہت جو تبدیلیاں دکھائی دیں ان کی حیثیت بھی ضمنی ہے۔

۴۔ اردو اصناف سخن میں نظم واحد صنف ہے۔ جو روایتی مشرقی پس منظر کے بجائے انیسویں صدی کی تہذیبی نشاۃ ثانیہ اور مغرب کے اثر سے ادبی فکر میں رونما ہونے والے تغیرات سے نسبت رکھتی ہے۔

۵۔ قصیدے، مرثیے، مثنوی [illegible] کی شعریات کا سلسلہ قدیم مشرقی روایات سے ملتا ہے جبکہ نظم کی شعریات کو مرتب کرنے کے لئے ہمیں جدید دور مغربی تمدن، مغرب اور مشرق کی آویزش [illegible] مغرب و مشرق کے مابین ایک معاشرتی، تہذیبی اور لسانی مکالمے پر توجہ دینی ہوگی۔

بے شک ہندوستان میں کتھا کہانی، داستان، حکایت اور قصص و ملفوظات کی ایک پوری تاریخ موجود ہے۔ پھر بھی ناول اور افسانہ صنعتی عہد اور ایک نئے ذہنی و جذباتی کلچر کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اسی طرح جا کا دیہ رمز ہے۔ مثنوی اور قصیدے کی شکل میں مربوط طور پر تخلیقی اظہار کی ایک روایت کے ہوتے ہوئے بھی نظم کو آزاد اور حالی کے دور میں ایک نئی بنیاد کی تلاش کرنی پڑی۔ صرف مسدس اور مثنوی کا فارم جدید نظم کے تخلیقی اور فکری تقاضوں اور نظم کو شعرا کی وجدانی ضرورتوں کو پورا نہیں کر سکتا تھا۔ تو کیا پابند، معرّا اور آزاد نظم کے ایک توانا سلسلے کا وجود کافی نہیں تھا کہ نظم کی کسی نئی ہیئت اور اظہار کے ایک نئے اسلوب کی تشکیل بھی ضروری سمجھی جائے!

اس سلسلے میں ایک ساتھ کئی نکات پر غور کرنا ہوگا۔

مگر ان نکات پر توجہ سے پہلے یہ معروضہ پیش کرتا چلوں کہ اس سوال کی بابت میرا جواب اثبات میں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی بھی ہیئت محض بے سبب وجود میں نہیں آتی۔ ورنہ تو یہ ہے کہ آزاد غزل اور نثری غزل کہنے والے بھی اپنے اقدام کا اچھا برا جواز رکھتے ہیں۔ مگر ایک تو یہ جواز کمزور ہے اور غزل کے بنیادی مطالبے کی نفی کرتا ہے۔ اور دوسرے یہ کہ آزاد یا نثری غزل باشقت ریاض کے ایک لمبے تجربے کے بعد بھی اعتبار نہیں قائم کر سکی۔ اس لئے نثری نظم کے مسئلے کو آزاد اور نثری غزل کے مسئلے میں الجھانا فضول ہے۔ نثری نظم کا مسئلہ ہمیں جن نکات پر فکر کی دعوت دیتا ہے، مختصراً وہ اس طرح بیان کئے جا سکتے ہیں۔

۱۔ اپنی روایت کو ایک زمین مہیا کرنے والے ایسے تمام شعرا جو تخلیقی ذمے داری کا کچھ شعور رکھتے ہیں۔ ان کی بنیادی کوشش ہوتی ہے کہ اس روایت کی تعمیر میں کام آنے والے بنیادی احساسات کا دائرہ وسیع کریں۔ تخلیقی لحاظ سے تھکے ماندے، صرف عادتاً شعر کہنے والے ابہام پسندی کے جوکھم سے ڈرنے والے شاعر پیش پا افتادہ احساسات پر قانع رہتے ہیں۔

۲۔ کسی بھی نئے اسلوب کی تلاش کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ لکھنے والا اپنی داخلی زندگی کو نئے سرے سے اور ایک نئی سطح پر سمجھنا چاہتا ہے۔ اس کے وجدان میں اتنی لچک ہے کہ بندھے ٹکے، بتلائے ہوئے آزمائے ہوئے راستوں سے ہٹ کر اس تلاش میں سرگرداں ہو سکے۔ اس کی تخلیقیت کا عمل خود سری کے ایک فطری جذبے کا ہمرکاب ہے اور وہ اظہار کے اجنبی یا نامانوس وسائل کو ہاتھ لگانے سے ڈرتا نہیں ہے۔

۳۔ اس ضمن میں عسکری صاحب کی بھی یوں ایک بات یاد آتی ہے کہ وسائل کے نئے اظہار سے دلچسپی کے بغیر لکھنے والوں کے یہاں ایسے تجربے رونما نہیں ہوتے جو کسی نئے اسلوب کے طالب ہوں۔ نئے وسائل کو استعمال کرنے کی خواہش ہی نئے تجربوں سے، نئے طرز احساس سے اپنے آپ کو بدلنے اور منکشف کرنے کی نئی کوششوں سے نسبت رکھتی ہے۔

۴۔ یہاں ایک ضمنی سوال بھی اٹھتا ہے۔ یہ کہ اظہار کے وسائل یا اسالیب میں تبدیلی کے عمل کی کیا نوعیت ہوتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ تبدیلی اندرونی اور داخلی بھی ہو سکتی ہے۔ اور اوپری یا سطح SURFACE پر دکھائی دینے والی بھی ہو سکتی ہے۔

۵۔ نثری نظم کی تاریخ میں جائے بغیر پچھلے دس پندرہ برسوں کی نثری شاعری پر ایک نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ کچھ شاعرانہ طرز احساس میں ایک نئے خاموش مگر ناگزیر تغیر صرف اردو ہی نہیں ہماری مختلف علاقائی زبانوں اور ہمارے زمانے کی بین الاقوامی شعری روایت کا حصہ بھی بن چکا ہے۔ اسے اس عہد کی ایک عالمگیر تخلیقی سرگرمی کا عمل سمجھنا چاہئے۔

۶۔ ہو سکتا ہے کہ یہ بات کچھ لوگوں کو بہت سرسری اور SWEEPING معلوم ہو، مگر واقعہ یہی ہے کہ نثری نظم سے پہلے شاعرانہ اسلوب میں اتنی بڑی انقلابی تبدیلی کا کوئی نشان ہمیں اپنی روایت میں نہیں ملتا ہے۔ قافیہ نظم اور آزاد نظم کو بے شک ایک حوصلہ مندانہ تخلیقی تجربے کی حیثیت حاصل ہے۔ پھر بھی اس حوصلے کے ہاتھوں ایسا کوئی واقعہ رونما نہیں ہوا۔ جسے ہم اپنی روایت کے محور میں تبدیلی سے تعبیر کر سکیں۔ جدید اردو نظم نے تشکیلی دور میں کئے جانے والے ہیئت کے تجربوں سے کہ ترقی پسند بلکہ جدید تر شاعروں تک معرّا اور آزاد اور RUN ON LINES کے پیٹرن PATTERN پر دیکھی جانے والی نظموں تک، بیرونی سطح پر تبدیلیوں کے باوجود ہمیں اپنی نظمیہ شاعری پر مشرقی

روایات کا سایہ صاف دکھائی دیتا ہے۔ راشد، میراجی، فیض، جعفری۔ اختر الایمان، مجید امجد، منیر نیازی، مختار صدیقی، عمیق حنفی، عادل منصوری، کمار پاشی، قاضی سلیم۔ یہاں تک کہ زاہد ڈار (ادھورے ذرد واے) عباس اطہر، صلاح الدین محمود، ساقی فاروقی، شہریار اور ان کے ہمعصروں تک تخلیقی شاعری کی سطح پر ہمیں روایات میں ایک توسیع کا احساس تو ہوتا ہے۔ اس سے انحراف کا نہیں۔

نثری نظم دراصل ایک انحراف سمجھی ہے۔ اور اجتہاد کی ایک کوشش بھی۔ اور اس بدعت کی ذمہ داری صرف راہ گم کردہ نوجوانوں کے سر نہیں جاتی۔ سجاد ظہیر، خورشید الاسلام اور محمد حسن سے قطع نظر اگر اس سے بھی پہلے رومانی نثر کے دور پر نظر ڈالی جائے تو سجاد انصاری کے نثر خیال اور میاں بشیر احمد کے طلسم زندگی تک میں ہمیں ایک منفرد یافت فکری اور تخلیقی مزاج کی موجودگی کا سراغ ملتا ہے۔ وزیر آغا نثری نظم کو نثم کہتے ہیں۔ اور نثری نظم کی اصطلاح کو خود تردیدی سمجھتے ہیں۔ دوسری طرف۔ بہت سے کئی شعرا نثری نظم کو ایک بشارت بے جاتے ہیں ادب کا منصب دینے پر تیار نہیں ہیں۔ اور اس امید میں ہیں کہ یہ تجربہ آپ اپنی موت مر جائے گا۔ لیکن اب آگے بڑھنے سے پہلے ہمیں دو چار اور باتوں پر بھی غور کر لینا چاہیے۔

ایک تو یہ کہ اظہار کی ہر ہیئت جس کے خلاف ردعمل ہوئے مقصد اور بے کار نہیں ہوتی۔ یہاں ایک بات میں دوبارہ یاد دلانا چاہوں گا کہ نثری نظم کے قضیے کو آزاد غزل یا نثری غزل کے قضیے سے الگ رکھنا چاہیے۔ دونوں کو ایک لاٹھی سے ہانکنا خلط مبحث پیدا کرنا ہے کیونکہ غزل بہرحال صدیوں کے سفر اور احساس و اظہار کے نئے منطقوں سے شناسائی کے باوجود ایک مقررہ ہیئت کی شاعری ہے۔ ہمیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ کرسی کو میز بنا دیں۔ دوسرے یہ کہ نظم کی صنف اٹھارویں صدی سے لے کر بیسویں صدی تک جو بس چند برسوں میں اختتام کو پہنچا چاہتی ہے۔ کسی بھی دور میں کسی ایک اور سراسر معینہ ہیئت کی پابند نہیں رہی۔ قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، غزل، یا یہ مسدس، مخمس، مربع، مستزاد، ثلاثی یہاں تک کہ ایک اکیلا مصرع بھی۔ (ادھار مانگی ہوئی ہر خوشی کا سود ہے غم۔ عمیق حنفی) یہ بطور ہیئت نظم کی اساس بن سکتا ہے۔

علاوہ ازیں کیا عجب کہ نثری نظم کا تجربہ کسی بڑے شاعر کے ظہور کی خبر دے گئے۔ پابلو نرودا کے حادثاتی مرتبے تک ابھی اردو نظم کو پہنچنا ہے۔ کیا تم پورا چاند نہ دیکھو گے کی شکل میں فہمیدہ ریاض نے اسی سمت میں قدم بڑھایا تھا۔ یہ سفر ادھورا رہا۔ لیکن ایک ویژن نا تمام کے حدود میں بھی یہ نظم ایک غیر معمولی تخلیقی طاقت اور جذبے کے جلال و اضطراب کی خبر دیتی ہے۔ نسرین انجم بھٹی کی بہت سی نظمیں اس خاص رخ کی ہیں۔ (ان کا کوئی مجموعہ میں نے نہیں دیکھا۔) کشور ناہید کے کم گرفتہ مجموعے (ملامتوں کے درمیان، سیاہ حاشیے میں گلابی رنگ، خیالی شخص سے مقابلہ) ناصر شہزاد کی محبت اور بیاوری کی نظمیں، شائستہ حبیب کی سونے پر دستک، عذرا عباس کی نیند کی مسافتیں اور میز پر رکھے ہاتھ، احمد ندیم سید کی جنگلی اور پار جنگل، افضال احمد سید کی چھپتی ہوئی تاریخ، اور دو زبانوں میں سزائے موت، ذیشان ساحل کی بے صد حیرانی کی نظموں کا مجموعہ چڑیوں کا شور، عتیق اللہ کا بین کرتا ہوا شہر، سارا شگفتہ کی کتاب آنکھیں، صادق کا مجموعہ کتھا، اور احمد فواد کی کتاب۔ یہ کوئی کتاب نہیں۔ ان سب کے نام ذہن پر زور ڈالے بغیر یاد آتے ہیں۔ اسد محمد خاں، عبادید شاہین۔ اور سرمد صہبائی سے سعید الدین تک (جن کی نظمیں اجمل کمال کے "آج" میں نظر سے گزریں اور حواس کو مرتعش کر گئیں۔) ہمیں اسی تاثر سے دوچار کرتے ہیں کہ نئی نظم نے نثری نظم کی شکل میں خود کو ایک نئی سطح پر تلاش کیا ہے۔ اس تلاش کا نمایاں ترین پہلو ایک نئے FUTURESTIC یا ایک قسم کی مستقبلیت کے عنصر سے ذہنی اور جذباتی وابستگی ہے اور اس سطح پر ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اردو کی نثری نظم آواں گارد میلانات کے ایک مرکزی ضابطے سے خود کو قریب تر لانا چاہتی ہے۔ اظہار کے اسالیب بے شک ماضی اور حال کا عکس ہوتے ہیں۔ لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ایک نئے اسلوب کی تشکیل کے واسطے سے ایک نئے تخلیقی، فکری اور جذباتی مستقبل کی جستجو کی جا رہی ہو۔ انیسویں صدی میں ہمارے بزرگ بھی یہی کچھ کر رہے تھے۔ اور ان کے نزدیک اظہار کے نئے ذرائع تک رسائی اپنی قوم کے لیے ایک نئی زندگی ایک نئے اجتماعی ماحول کی تعمیر سے عبارت تھی۔

ایک اہم نکتہ جو اس بحث سے نکلتا ہے اور جس کا تجزیہ کیے بغیر ہم آزاد اور حالی کے بعد سے اب تک کی شاعری کے بنیادی سروکار اور میلانات کو سمجھنے سے قاصر رہیں گے۔ یہ ہے کہ جدید نظم کی پوری روایت میں غالب ترین عنصر کی حیثیت تفکر کو حاصل رہی ہے۔ کیا حالی، اکبر، اقبال اور جوش اور کیا راشد، فیض اور اختر الایمان اور پھر کیا ہمارے عہد کی برہم اور بے قرار روحیں یہ سب کے سب اپنی نظموں کے

[باقی صفحہ ۹ پر دیکھیے]

ہاتھ میں اٹھاتے ہوئے اُس نے بڑے رازدارانہ انداز میں پوچھا۔
"نیا کی پاکستانی پتریکا؟" "یہ کیا پاکستانی پرچہ ہے؟" میں نے
اثبات میں جواب دیا تو انہوں نے پرچے کی قیمت — پانچ ٹکے کہتے ہوئے
ایک کاپی خریدی کہ وہ دراصل اپنے بہاری دوست کے لئے یہ پرچہ خرید رہے
ہیں۔ وہ صاحب بنگلہ ہی — بول رہے تھے۔ مگر ان کا لہجہ صاف چغلی کھا رہا
تھا کہ وہ بنگالی نہیں ہیں۔ انہوں نے اردو کا ایک رسالہ خریدا اور ساتھ ہی
ایک بنگلہ اخبار بھی اور پھر بنگلہ اخبار میں اردو پرچے کو لپیٹ کر اپنی راہ
ہو لئے۔

یہ نیا واقعہ میرے لئے نیا نہیں ہے بلکہ کبھی کبھی میں خود بھی اپنے لہجے
کی پہچان کو چھپا رہا ہوں۔ مد میں اتنا ہوشیار کبھی نہیں ہوا — اس زمانے میں جب
بہاری گندھو (بہاری بو) پاتے ہی لوگ خرچے کھاتے میں ڈال دیئے
جاتے تھے میں نے اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش نہیں کی بلکہ کبھی کبھار ایسا
بھی ہوا کہ میرے سامنے والے نے مجھے بنگالی سمجھنے سے انکار کیا اور تب
ہی سے میں نے اپنے آپ کو حالات کے کاندھے پر ڈال دیا۔ اور ایک
واقعے نے تو اور زیادہ مجھے نڈر بنا ڈالا۔ بنگلہ دیش کو ساڑھے ہوئے
ملائی تین مہینے گزرے تھے کہ میں ایک دھکیا دوست کے ساتھ ٹنگی پہنچا۔ دوست
نے ہنڈا اکھڑا کر کے مجھے ہدایت دی کہ میں ہنڈے کی رکھوالی کروں وہ بس
دو چار منٹ میں اپنے کام سے فارغ ہو کر واپس آئے گا اور یہ کہہ کر وہ اپنے
سے کے کارخانے کے اندر داخل ہو گیا۔ مگر دو چار منٹ کیا پورا نصف
گھنٹہ گزر گیا۔ اس کا پتہ نہ تھا۔ میں بور ہونے لگا۔ قریب ہی ایک جھونپڑی
چائے کی دوکان میں داخل ہو کر چائے کا آرڈر دے کر ایک بینچ پر
بیٹھ گیا۔ مگر تھوڑی دیر بعد ہی مجھے احساس ہوا کہ چائے خانے میں بیٹھے
سب تمام لوگوں کی نگاہیں میرے چہرے پر گڑی ہوئی ہیں۔ ستانیاں ہوا کہ
چہرے کے خدوخال بھی بتا دیتے ہیں کہ کس کمیونٹی کی مولیہ ہے میں کہ تم بہاری
کیسے چل رہے ہیں؟ ایک نوجوان میری طرف کھسکا اور بڑے رازدارانہ
انداز میں گویا ہوا۔
"آمر مونے ہوئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ ہمارے دیش کے آدمی
ہیں۔"
"آمی تمار —— میں تمہارے دیش کا آدمی ہوں مگر بہاری۔"
میں نے کسی خوف کے بغیر جواب دیا۔
"جی!!" نوجوان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ پھر اس نے کہا "آپنی
آپنی تو آ سچو باڑو س (آپ تو عجیب آدمی ہیں) آپ کو ذرا
بھی خوف نہیں کہ یہ جملہ آپ کہاں بول رہے ہیں؟" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ
کر اپنے سامنے بٹھایا پھر بڑے اطمینان سے کہا۔
"خوف بالکل نہیں اس لئے کہ مرنا برحق ہے۔ اور میں مسلمان ہونے کے
ناطے اس پر یقین رکھتا ہوں کہ اگر میری موت تمہارے ہاتھوں لکھی ہے تو دنیا
کی کوئی طاقت مجھے بچا نہیں سکے گی اور اگر تمہارے ہاتھوں میری موت نہیں ہے
تو پھر تم کوشش کے باوجود مجھے ختم نہیں کر پاؤ گے۔"
اس نے میرا جواب سنا تو ڈھیلا پڑ گیا۔ لگتا تھا جیسے اچانک غبارے
سے ہوا نکل گئی ہو۔ اس نے میری چائے کا بل خود ادا کیا۔ اور جب تک میرا
دھکیا دوست واپس نہیں آیا۔ میرا باڈی گارڈ بنا میرے ساتھ بیٹھا رہا۔
اس واقعے نے مجھے واقعی نڈر بنا دیا مگر واقعہ یہ ہے کہ کبھی کبھی یہ
سوچنے پر بھی مجبور ہوا ہوں کہ کیا واقعی میں خوف زدہ نہیں ہوں۔ اس کا
جواب مجھے نفی میں ملا ہے۔ اس لئے کہ آج بھی کوئی بنگالی چھوکرا مجھے "بہاری،
یہ موڑ" کہہ کر گالی دیتا ہے۔ تو مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے میں یکلخت
پنکچر ہو چکا ہوں۔ اور ٹیوب سے ساری ہوا نکل چکی ہے۔
لیکن میرا دوست، جس کی بیوی بنگالن ہے، جس کے بچے اردو
نہیں جانتے۔ جو ہمیشہ بنگالیوں کے درمیان رہا۔ اور جسے اب بھی بیشتر لوگ
بنگالی ہی جانتے ہیں مگر نہ جانے کیوں وہ اب بھی خوف زدہ ہے کہ اسے
کوئی بہاری نہ جانے۔ میرے دل نے یہ کہا پھر لا حول کی گردان شروع
کی تھی۔ سینکڑوں چلتے پھرتے لوگوں کے بیچ "بچاؤ — بچاؤ —" کی ایک
چیخ ابھری میں اپنی جگہ ٹھٹھک کر اس جانب تکنے لگا جہاں ایک موٹے
تگڑے شخص کو دو تین لونڈے اپنے حصار میں لئے ہوئے تھے۔ کوئی اس
کا بیگ چھین رہا تھا کوئی گھڑی اور کوئی اس کی جامہ تلاشی لے رہا تھا۔ اور
دوسری جانب سڑکوں پر سینکڑوں گزرتے ہوئے لوگ اس شخص کو بچانے
کی بجائے خود بچنے کی خاطر سر پہ پاؤں رکھے بھاگ رہے تھے۔ میں نے ایک لمحہ
اپنی تمام طاقتوں کو سمیٹا مگر دوسرے لمحے مجھے محسوس ہوا کہ میری تمام توانائیاں
مجھ سے رخصت ہو کر بھاگتے ہوئے لوگوں کے پیچھے بھاگ رہی ہیں۔
یہ کیسا خوف ہے؟ جس نے ہمارے پاؤں میں بیڑیاں ڈال رکھی ہیں
یہ کیسا قانون ہے کہ ایک شخص مدد کے لئے پکارتا ہے اور لوگ اپنی مدد کے
لئے بھاگتے دکھائی دیتے ہیں؟
سوالات کی بھیڑ میں میں خود کو تنہا پاتا ہوں۔ کوئی آواز نہیں کوئی شبد نہیں
میں نڈھال ہو کر اپنے دفتر میں داخل ہوتا ہوں اور اپنی کرسی پر خود کو
ڈال کر اپنی ٹانگیں میز کے نیچے پھیلا دیتا ہوں۔

شاذی ـــ ہیلو ۔ میں یہ دفتر سے ٹیلیفون کر رہا ہوں ۔

میں غلام نبی بول رہا ہوں ۔ ـــــــــــــ بولو ؟

میں صرف یہ ٹیلیفون کر رہا ہوں کیا شام کو تجھے فرصت ہے ؟ ایک کپ چائے آ کر پی سکو گے ؟

وقت نہیں ۔ ایسے لگا جیسے میں اس سے بدلا لے رہا ہوں ۔

اچھا ٹھیک آپ آگی نہ ہو سکے تو آ جاؤ ـــ وہ پھر بنگالن کا گیا شاید اس کے کمرے میں کوئی بنگالی ملاقاتی آ دھمکا ہو یا میں نے کوئی جواب دیے بغیر رسیور رکھ دیا۔

اور کتو چائے آ ـــ میں نے دفتر کے چپراسی کو چائے لینے کہا اور خود آج کی ڈاک دیکھنے لگا کئی خطوط تھے مگر سب سے پہلا خط میں نے شاکا اٹھایا۔

" ابا ! ابا کو جان کر خوشی ہو گی کہ پورے آٹھ مہینے دھکے کھانے کے بعد مجھے یہاں ایک جاپانیز فرم میں ملازمت مل گئی ہے آپ کسی قسم کی کوئی فکر نہ کریں " شا میرا بڑا بیٹا ہے اسے پچھلے دنوں میں نے ملیشیا بھیج دیا تھا۔ ملیشیا سے جانے والا وطن میرا بھانجہ ہے جس نے اسے ملیشیا میں دھکیل کر بے یار و مددگار چھوڑ کر اپنا الو سیدھا کر لیا۔ شا نے اپنے ہر خط میں یہی لکھا ہے ! ابا جس نے ہمیں دھوکا دیا ہے اسے بھول جائیے معاف کر دیجئے۔ بلکہ اس کے لیے دعا کیجئے کہ اللہ اسے نیک شخص بنائے اس کے آخری جملے مجھے چونکا دیتے ہیں۔ اور میں سوالات کی اگنی پر ننگے جاتا ہوں۔

اسے بھول جاؤ جس نے ہمیں دھوکا دیا ہے۔ کیسے بھول جاؤں۔ کیوں بھول جاؤں جس نے میرے جگر گوشے کو آٹھ ماہ تک پردیس ایک اجنبی ملک میں مسلسل عذاب میں گرفتار رکھا اور خود شا پورے مارکٹنگ کر کے دھوم دھڑاکے کے ساتھ اپنے گھر واپس آیا۔ اور ہم سے غلط بیانی سے کام لیا کہ اس نے بیٹے کو ایک اچھی جگہ ملازمت میں لگا دیا ہے وغیرہ ۔ اسے میں بھول جاؤں۔ میرا بچہ کہتا ہے اسے بھول جائیں ۔ اسے معاف کر دوں !!

چلو میں نے معاف کر دیا مگر میرا ذہن کہ ایک مسلسل عذاب میں مبتلا ہوں نہ مجھے معاف کر دے گا میرا بچہ روز و شب کا حساب کیسے دوں ؟ شا نے لکھا ہے کہ اس کے لیے دعا کرو اور شا بڑا لبیب خیرہ میں کہ ساری زندگی اپنے لئے دعائیں کرتا رہا۔ مگر وہ دعا کبھی وہاں تک نہیں پہنچیں جہاں کی آب و ہوا کو بے خبر ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔

شاید میں بہک رہا ہوں۔ گناہ کا مرتکب ہو رہا ہوں۔ خوف کی پرچھائیاں میرے سر سے ہو کر گزرتی ہیں۔ اور میں سراپا لرز جاتا ہوں۔

مر جائے !

میں چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے دوسرے خطوط دیکھنے لگتا ہوں۔

شام کا دھندلکا پھیل رہا ہے میں دفتر سے چھٹی کرنے والا ہوں کہ اکا لو دفتر کے سامنے ایک رکشہ رکتا ہے اور غلام نبی اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ میرے سامنے وارد ہوتا ہے۔ میں اس کی عجلت پسندی کو محسوس کرتے ہوئے پوچھتا ہوں۔

کار شاید جا رہی ہے اڑے۔

ہاں ! انہیں یونیورسٹی کی ایک تقریب اٹینڈ کرنا تھی۔

اچھا ہوا نہیں تو تیرا ذہن کار کی جانب رہتا۔ اور محض تیرا جسم میرے سامنے ایک بت کی طرح پڑا رہتا۔

وہ ہنسا، مگر کھل کر نہیں۔

نہ جانے کیوں میں نے اس کے ہونٹوں پر وہ مسکراہٹ کبھی دیکھی ہی نہیں۔ جیسے پھل جھڑی چھوٹ جائے۔ یا آتش بازی کی چنگاریاں چھٹکا پڑے ایسی مسکراہٹ میں نے اس کی بیگم کی ہونٹوں پر بھی نہیں دیکھی۔ ایک ڈری ڈری اور خوف زدہ سی مسکراہٹ ـــ اور میں نہ جانے کون سی ہنسی ہنستا ہوں۔ اس نے بھی کہ آئینہ کبھی تو سامنے رہا ہی نہیں کہ میں اپنی مسکراہٹ کو بھی دیکھ پاتا۔

ارے جیٹھ ! اچانک مجھے خیال آیا کہ میں نے اسے اب تک بیٹھنے کو کہا بھی نہیں بلکہ وہ ہنسنے لگا میری بوکھلاہٹ پر اور کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔

لگتا ہے تو بہت اچھا ہوا ہے ؟ کوئی خاص بات ؟ !۔

نہیں جیسے میرا چہرہ ندامت سے پسیج گیا ہو۔

ہاں میں تیرے پاس آج اس لئے آیا ہوں کہ میں نے ایک افسانہ لکھا ہے جسے تجھے سنانا چاہتا ہوں ۔

یہ تو خوشی کی بات ہے کہ ایک مدت کے بعد تو نے افسانہ لکھا ہے ضرور سنوں گا۔

مگر یہ افسانہ انگریزی میں ہے ؟

اس کی اطلاع پر میں چونکا۔ انگریزی میں مگر اردو کیوں نہیں میں کچھ کہنا چاہا کہ وہ افسانے کا مسودہ لے کر شروع ہو گیا سنانے۔ افسانہ ختم ہوا تو اس نے بڑی گہری نظروں سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔

کیسا لگا تجھے یہ ؟،

افسانہ اچھا ہے مگر کیا ہی اچھا ہوتا کہ یہ افسانہ تو انگریزی کے بجائے اردو میں لکھتا۔

[باقی صفحہ ۱۰۰ پر دیکھئے]

پریم کمار نظر

[تہذیب غوری کی نظر]

شعر و سخن اک کارِ زیاں ہے شہرت و ہجرت کیا
فظوں کے کچے دھاگوں سے صحبت و حجت کیا

ب تو عشق کے ایسے منبر پر بیٹھے ہو جہاں
سل و صال کا شنا کیا فرقت و رقت کیا

منظر سے اس منظر تک سب ہو ہم کی کشش
نہ جانے والے کیسے ہجرت و حجت کیا

پس منظر کا تماشہ کافی دیکھ چکے
خلائیں گھورنے والو حکمت و کمت کیا

کبھی کوتاہ قدی کا کچھ احساس ہوا
سے کہتا پھرتا ہے قامت و امت کیا

بدن کی اب تو پیراہن تک پھیل گئی
دل پھر موزونیٔ ... سے چاہت و اہمیت کیا

چرچ روڈ، سول لائنز ہوشیار پور (پنجاب)

اقبال متین

تو میرے درد کو دنیا نئی نئی دینا
مرے خدا مجھے کچھ اور آگہی دینا

وہ حسرتیں جو مری زندگی کا حاصل ہیں
ان حسرتوں کے اندھیروں کو زندگی دینا

جو تو نے اپنے کرم سے دیا ہے اپنوں کو
مری مژہ کو ان اشکوں کی بھی نمی دینا

یہ غم کدہ تو سنورتا رہا ہے برسوں سے
اُسے جو راس نہ آئے وہی خوشی دینا

میں تجھ سے کچھ بھی نہیں مانگتا مرے مالک
مرے قلم کو مرے خوں کی چاشنی دینا

جہاں سے دل کو بچا کر میں تجھ تک لاؤں
وہیں پہ سینے میں نیزے کی اک انی دینا

متین تیرا نہیں ہے تو اور کس کا ہے
بہشت دینا تو دوزخ کی آگ بھی دینا

● کہانی۔ کتاب نگر، نظام آباد ۵۰۳۰۰۱

ظہیر غازی پوری

یہ سچ ہے میں شکستہ آئینہ ہوں
مگر جینے کا فن بھی جانتا ہوں

المیہ ہوں مگر معجز نما ہوں
کہ اپنی لاش پر زندہ کھڑا ہوں

زباں پر حق پرستی کی دعا ہے
مگر خوں ریز لمحے جھیلتا ہوں

مجھے اعراف میں جینا پڑا ہے
میں دنیا کا اکیلا ذائقہ ہوں

مری پہچان کتبوں پر ملے گی
میں لفظ و فکر کا مارا ہوا ہوں

کہیں تشکیک کا پہلو نہیں ہے
میں صفحۂ روشن دائرہ ہوں

ظہیر آئینۂ احساس میں اب
میں بے چہرہ نظر آنے لگا ہوں

● ہاشمیہ کالونی محلہ چک پل، ہزاری باغ ۸۲۵۳۰۱

مشنو! ساتھ یہ کم بخت بھی ہے کہ شہزادی بھی رہیں شرم آتی نہیں رہی تو کیسے زبردستی شادیں۔"

"کچھ لوگ دوسروں کی خوشی کے لئے زبردستی بھی کرنے پڑتے ہیں۔" رضا نے کہا تو اس کی آنکھوں میں تعجب کے نقوش صد درجہ نمایاں ہوگئے: "لیکن آپ سے اتنے دقیانوسی ہوگئے ہو!"

"تم سمجھتی ہو کہ میں اور شینی کو صحت بھی کی بہت فکر ہے شاید!"

"بھئی بات ساری یہ ہے قارئین کہ تمہارے چڑچڑانے سے شادی کا سارا مزا خراب ہو رہا۔ ہم لوگ چاہتے ہیں کہ خوب انجوائے کریں۔ خاص طور سے تم! کیوں کہ اس تو تم ہو باقی تو ...."

رضا یہیں تک بولا تھا کہ سجو کمرے میں داخل ہوئی۔ "چلو ابٹن کی رسم ہونے والی ہے۔" اس نے بیلی کی بغل میں ہاتھ دے کر اسے اٹھایا۔ اور پھر شینی سے بولی: "دوسری طرف تم آجاؤ۔"

"او تھینک۔" شینی نے اک جماہی لی۔

"بیٹر سجو باجی یہ سب کیا ہے!" بیلی نے سجو کو خفگی سے دیکھا۔

"صرف دس پندرہ منٹ کی بات ہے۔... تم اتنی سی دیر کی قربانی بھی نہیں دے سکتیں!" سجو نے پیار سے سمجھایا۔

"مجھے پتہ ہے کیا ہوگا۔ دا اپوی! جو خاندہ ابھی سے ساتھ ہو رہا... سب لوگ منہ میں لڈو ٹھونسنے جا رہے ہیں۔ بیٹر یہ سوچے کہ لڑکی پر کیا گزر رہی ہے" بیلی نے ناراضگی سے کہا۔

وہ سجو اس کے رخسار پر پیار کر کے بولی: "شادی کے بعد جب ہو دی میں یہ سب کچھ دیکھو تو بہت اچھا لگتا ہے... میں نے اپنی شادی پر یہ رسم نہیں کرنے دی تھی۔ یقین جانو آج تک افسوس ہوتا ہے مجھے۔"

اب شینی نے دخل اندازی کی۔ "اشر سجو باجی! مجھے کم از کم آپ سے ایسی باتوں کی امید نہ تھی۔ کیا ہو گیا ہے آپ کو!"

"اگر ہماری ذرا سی قربانی سے بڑے خوش ہو جاتے ہیں تو اس میں حرج ہی کیا ہے! خوش ہو کر دعائیں ہی دیتے ہیں۔... سو دعا بلا تو نہیں مغرب ہو یا مشرق دعاؤں کی ضرورت سب کو ہوتی ہے نا!"

"مجھے بھی چلو۔ یہاں کسی سے کچھ کہنا سننا بیکار ہے" بیلی نے اکتاہٹ سے کہا اور قدم آگے بڑھایا۔ پھر بولی: "مگر ایک بات میں بتائے دیتی ہوں۔ اس رسم کے بعد پھر کسی دن نہ کوئی رسم ہوگی نہ کچھ اور۔ میں کسی کا کہنا نہیں مانوں گی۔"

"منظور ہے۔ آج تو مانوں گی نا!" سجو نے پوچھا تو بیلی نے صرف اسے دیکھا۔ ان نگاہوں میں ... کی شکستگی تھی۔ یہ سب نے محسوس کیا مگر

تم نے اس موقع کو غنیمت جانا۔ ہنستا بولی: "قدم ذرا دھیمے دھیما اٹھانا۔ اور سر کو تھوڑا سا جھکا لو... جب رسم ہونے لگے تب بھی تھوڑا سمٹ کر سکڑ کر بیٹھنا۔ اچھا۔ شاباش!"

"اچھا۔" بیلی نے یوں کلیتہً اطاعت کی ہامی بھر کر جیسے احسان کر رہی ہو۔

رسم شروع ہونے لگی۔ وہ زبردستی کی تصویر بن گئی۔ جیسے ہی کوئی اس کے منہ میں مٹھائی ڈالتا اس کا جی چاہتا منہ سے مٹھائی نکال کر اس کے چہرے پر دے مارے مگر آہ....

ادھر شینی اور رضا ہر بات سے بے نیاز بیزار دور کھڑکی کے پاس بچھے صوفے پر بیٹھے ان رسومات پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار حسب معمول انگریزی میں کر رہے تھے۔ اچانک شور برپا ہونے لگا۔ لڑکیاں شور کرنے کے ساتھ شرما بھی رہی تھیں۔ رسم ختم ہو چکی تھی۔ سجو بیلی کو کمر سے تھام کر اس کے کمرے میں لے جا رہی تھی۔

"لاؤ اس کو پکڑ کر لاؤ اور بٹھا دو یہاں۔" چھوٹی پھپھو ہدایات دے رہی تھیں۔ شادی شدہ افراد غیر شادی شدہ لڑکیوں اور لڑکوں کو پکڑ پکڑ کے اس کرسی پہ بٹھا رہے تھے جس پر ابھی ابھی بیلی لائی گئی تھی۔

شینی نے رضا سے پوچھا: "یہ کیا ہو رہا ہے!"

"مجھے کیا پتہ۔" رضا نے کندھے اچکائے تو قریب ہی بیٹھی رشتہ دار خاتون نے بتایا کہ "جس چوکی یا کرسی پر دلہن کی رسم ہوئی ہے۔ وہاں پہ کنواروں کو بٹھا دیں تو ان کی شادی جلدی ہو جاتی ہے۔ اس طرح رسم کی بچی ہوئی مٹھائی بھی کنوارے کھائیں تو بھی شادی جلدی ہو جاتی ہے۔ بڑے کہتے ہیں اسی لئے تمہاری چھوٹ بھی...."

"لاحول! یہ سب توہم پرستی ہے۔" شینی نے ان کی بات کاٹ دی۔

"اب کچھ بھی ہو بیٹی! ہم تو بزرگوں سے یہی سنتے آئے ہیں اور مان بھی لیتے ہیں۔ اس خیال سے کہ کچھ ہو نہ ہو وہ خوش ہو جاتے ہیں۔"

"آپ لوگ ساری عمر بڑوں کو خوش کرنے کی فکر میں ہی رہتے ہیں۔ اپنے بارے کچھ نہیں سوچتے۔ ضروری تو نہیں بڑے بوڑھے ہر بات درست ہی کہیں۔"

"ہاں تمہاری بات بھی صحیح ہے مگر ..." لیکن شینی وہاں سے اٹھ کر ٹیرس کی سمت جا چکی تھی۔

وہ ٹیرس پہ کھڑی مشہور انگریزی دھن پہ سیٹی بجا رہی تھی اور سوچ رہی تھی پتہ نہیں کیوں یہاں آگئی۔ کچھ دیر بعد اس نے یوں ہی گردن گھما کر دیکھا تو سجو بچے ہوئے لڈو کا کچھ حصہ اس کی جانب لے کر آ رہی ہے۔ اس نے ناگواری

اس تمام گفتگو کے دوران وہ میک اپ کرنے میں مصروف شیبی جو بل کی بڑی بہن تھی اور ابھی اس کی شادی نہیں ہوئی تھی ——— کیسٹ پلیئر کسی انگریزی دھن پر تھرک رہی تھی چٹ بھن کے جانے کے بعد مزے سے بولی "یار! کیسے کیسے نمونوں کو بلایا ہے تم نے اپنی شادی میں؟"

"میں نے بلایا ہے؟" اس نے شیبی کو کچا چبا جانے والی نگاہوں سے گھورا۔

"نن نہیں۔ میرا مطلب ڈیڈ ... اسے بھی جبان گیارہ سال بعد سے نہیں ملے تھے اس مدت کو گیارہ سال ایک مہینہ گزرتے اگلے مہینے ہوا ہے سارا ہے تمہاری شادی جلد کیا ایسا نہیں ہو سکتا تھا؟"

بیل سے بجائے رضا نے ذرا انکار کیا۔ "ہو تو سب کچھ سکتا ہے پر ... یہاں کوئی پلٹ جب نابیاں تو سب کو آثار قدیمہ تک دلچسپی ہے کہ کیا بتایا جائے۔ ڈیڈ ہماری بہن ہماری بہن ... اور تم ہاں میرا بھائی سب ہی منہ سے ہیں۔ ان دونوں کے دو تو شکر ہے ان سے جان کر ویزا نہیں ملا شاید ایمبیسی والوں کو بھی کچھ اصلیت کی خبر ہو گئی تھی ورنہ تو ہماری مصیبت آ جاتی۔" رضا نے ڈرایا۔

"کیوں؟ بیل کی مجبوری تو تھیں۔"

"مطلب وہ اس خاندان کے سب سے بڑے ہونے ہیں۔ یہ مختصر تو تجھے دب کر سے نکال رہی تھیں وہ تمہیں کیرڈ ... بدک کے تالا لگا دیتے اور قصہ ختم۔"

"کیا مطلب! میں کیا کوئی قربانی کا جانور ہوں جو رسیاں تڑا کے بھاگ جاتی۔" اس کا پارہ چڑھنے لگا۔

"یار! اپنے ہاں میں تو دلہن قربانی کے جانور سے بھی زیادہ مظلوم ہوتی ہے۔" رضا کا لہجہ اداس ہو گیا۔

"تھینک گاڈ! میں وہاں نہیں ہوں۔" اب وہ قدرے مطمئن نظر آ رہی تھی۔

"ہوں ———" شیبی نے باری باری دونوں کو دیکھا پھر بولی "مجھے تو تم پر تعجب ہو رہا ہے۔ جو کچھ چٹ بھن کہہ رہی ہیں وہی کیے جا رہی ہیں کچھ تو بولو نا۔ دھمکی کہ ڈیڈ خفا ہو جائیں گے۔ ڈانٹیں گے لا حول، خراب کرو خوشی کا موقع ہے۔ یہ ہے وجہ۔"

"صرف ڈیڈی کی بات ہوتی تو اتنا غصہ نہ آتا۔ کہ وہ ابھی تک پرانے زمانے سے لگاؤ رکھتے ہیں۔ میں ان پر حیران ہوں سمجھ باجی پر!!"

"ہاں واقعی! اب بیل بھی شامل ہو گئی چٹ بھن کی ہر بات میں ہاں میں ہاں ملا رہی ہیں۔ ایک دم سے بدل گئی ہیں! اور پھر تھا جب میں خفا ہوئی تو زرا تی تھی۔ پتہ نہیں کیوں مجھے یہ سب کچھ اچھا کیوں لگ رہا ہے ... مزو تھی؟" وہ دونوں ایک ساتھ بولے۔

"اور کیا! اور حد تو یہ ہے کہ مجھے تو کہہ رہی تھیں اللہ ڈیلینے کے دن تم پھوپھو! سا گھونگھٹ نکال لینا۔ ہدایت تو چٹ بھن کی ہے۔ مگر جی میرا بھی چاہ رہا ہے کتنی کیوٹ لگو گی تم ایسا کرتے! باؤ! سوچو ذرا۔" بل سائنس لئے بنا بولی چلی جا رہی تھی۔

رضا نے آگے بڑھ کر اپنے دونوں ہاتھ اس کے کاندھوں پر جما دیئے! اور اس طرح ٹھیک کرنے کی نیت سے بولا "جو کچھ بھی ہے ... جیسا بھی ہو رہا ہے بل ڈیئر لیکن تم یہ تو مانو گی کہ یہ چٹ بھن ہی کی وجہ سے تمہاری شادی ہو رہی ہے ورنہ تو ... بیٹھی رہ جاتی اس چڑیل کی طرح۔" اس نے شیبی کی جانب نگاہیں گھمائیں۔

"مجھے بالکل شوق نہیں ہے شادی وادی کا۔ یہ تو ایک طرح جلتے ہو۔ اور پھر ... ایسی واہیات شادی سے تو میں کنواری بھلی۔" شیبی نے کندھے جھٹک کر اطمینان سے کہا

چند لمحے خاموشی میں گزر گئے۔ پھر بل رضا سے جرح کے انداز میں بولی "بہت اچھا کیا جانی تم نے۔ کہ میری شادی چٹ بھن کی وجہ سے ہو رہی ہے۔ یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو۔ کالی اور میں ایک دوسرے کو چند سال سے جانتے ہیں۔ سب کو معلوم ہے یہ ہماری لو میرج ہے۔ پھر تم ..."

رضا نے بات کاٹ دی "لیکن کالی تمہیں ملا کیسے؟ خط تو چٹ بھن نے ہی ڈیڈ کو لکھا تھا کہ وہاں میرے سسرالی رشتے دار ہیں۔ ان سے ملو۔ میرے شوہر کی بہن کے بیٹے ہنو کا کزن۔ ہنہ یہ رشتہ داری ہے! میں نہیں مانتی ایسی اوٹ پٹانگ رشتہ داریاں ... اور پھر وہ تو یہاں سب سے ملا تھا لیکن ... انڈر اسٹینڈنگ تو صرف مجھی سے ہوئی کیوں؟"

اب شیبی نے اس کے آگے ہاتھ جوڑے "اچھا بابا تمہاری ہر بات صحیح ہر قدم درست اب صرف ایک بات مان لو۔"

"بولو؟"

"صرف دو دن کے لئے چپ ہو جاؤ۔ پھر اس کے بعد جو جی چاہے کرنا۔"

"ٹھیک ہے بات اگر صرف چپ چاپ ہو جانے کی حد تک ہے تو میں مان لوں گی لیکن ... اس کے بعد کوئی اوٹ پٹانگ بات میں نہیں مانوں گی۔"

"مثلاً؟"

یک کروٹ مخالف سمت موڑلی۔ اور وہ بارہ سیٹی بجانے میں محو ہو گئی۔

"ارے کہا لو۔"

"آں۔ کیا ہے یہ؟" وہ مڑی۔

بجو نے جو تھالی لڈو اس کی جانب بڑھایا۔ "لڈو ہے۔"

"میں کیوں کھاؤں اسے کس کا بچا اور جھوٹا لڈو۔" وہ بڑی لاپروائی اور بے نیازی سے بولی۔

"تمہیں تفصیل بتلانے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ بس میں کہہ رہی ہوں اسے کھالو۔" بجو اپنا ہاتھ اس کے ہونٹوں کے قریب لے گئی۔ اس نے بجو کو عجیب سی نگاہوں سے دیکھا۔ بجو نے سر ہلا کر گویا دوبارہ درخواست کی اور اس نے چپ چاپ منہ کھول دیا۔ بجو نے لڈو اس کے منہ میں رکھنے کے بعد تعجب سے کہا "کمال ہے آج تم بغیر کوئی سوال کئے کہنا مان گیا۔ پوچھا نہیں کہ کیوں کھلائی ہے یہ مٹھائی میں نے!"

"دیکھو نا بجو۔ ہو گی کوئی بیکار سی بات۔" یہ رضا بھائی غائب ہو گیا۔ اس نے بات ٹال دی جیسے کوئی کرب یہ دو روز بھی کٹ گئے اب ان کی شادی میں صرف چار گھنٹے باقی تھے۔ بیوٹی پارلر جانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ زیور، میک اپ، سینڈل، چوڑیاں اور دیگر اشیاء یاد کر کے ایک ہی جگہ رکھی جا رہی تھیں۔ تاکہ جاتے وقت کوئی چیز رہ نہ جائے۔ چست بجو جن کی شخصیت کو غیر اہم اور بے وقعت بنا دیا تھا بجوں کی ناپسندیدگی کے باوجود کچھ نہ کچھ بولتی رہتی تھیں۔ شاید اپنی فطرت سے مجبور تھیں۔ "تو اس دور کی عورتیں کیا جانیں ہماری دلہنیں کیسے تیار ہوتی ہیں۔"

"تمہیں چست بجو گوری نہیں تیار کرے گی؟ کس نے بتایا۔ یہاں بھی کچھ ہندوستانی پاکستانی عورتوں نے اپنے بیوٹی پارلر کھول لئے ہیں۔۔۔ وہ بالکل ہاں سے جیسا ہی تیار کرتی ہیں۔"

"اچھا۔" وہ غیر مطمئن سی ہو کر بولیں۔ پھر بجو کو اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ بجو آئی تو انہوں نے پوچھا "وضو کروا دیا تھا دلہن کو؟"

"جی کہہ دیا تھا۔"

"کہہ نہیں کروا بھی دیا تھا۔!"

"جی ہاں۔۔۔ وضو کرنے ہی کپڑے تبدیل کئے تھے اس نے" بجو نے بتایا پھر قدرے رک کر پوچھا "مگر چست بجو وضو کا ہم نے تو کبھی نہیں سنا تھا؟"

"ارے تم لوگوں نے کیا دیکھا ہے کیا سنا ہے اتنے دن میں پتہ چل گیا ہے مجھے دولہا دلہن دونوں وضو کرکے تیار ہوتے ہیں۔ نکاح سے پہلے اب کیا بات کر رہی ہو۔ تم لوگ تو اب کچھ بھی کرنے کے لئے تیار نہیں ہو" انہوں نے کہا پھر آنکھوں سے بجو کو کچھ اشارہ کیا وہ سمجھ نہ سکی اور جھک کر کان ان کے منہ کے قریب کر دیا انہوں نے اس سے کوئی سرگوشی کی۔

بجلی اس وقت کمرے میں اکیلی تھی۔ اور گھٹنوں میں سر دیئے کچھ سوچ رہی تھی قدموں کی آہٹ پا کر اس نے سر اٹھایا۔ بجو ہنستی مسکراتی اس کے نزدیک آ رہی تھی۔ اس کا ماتھا ٹھنکا اس نے ابرو اٹھا کر کیا ہوا؟

"بجو نے چند لمحے اسے دیکھا پھر قدرے افسردگی اور گھبراہٹ سے دھیمے دھیمے بولنے لگی "تم کسی کی بات سننے پر رضامند تو نہیں ہو بجلی، اور میں خود بھی کسی پر وار کرنے کو اچھا نہیں سمجھتی محض چست بجو کے کہنے پر آئی ہوں۔ وہ بیچاری اسی پرانے طرز پر سوچتی ہیں۔" وہ رکی بجلی نے اسے دیکھا۔ "جیسے کہہ رہی ہو۔" جلدی بکو!"

وہ پھر بولنے لگی "وہ مگر وہ مانیں جب نا۔۔۔ ان کا کہنا ہے کہ میں یعنی۔ مطلب یہ ہے کہ میں آج رات کی بابت تمہیں سمجھا دوں کہ۔" بجلی نے ایکدم اس کی بات کاٹ دی "مجھے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے ایک سرسری نگاہ بجو پر ڈالی پھر بولی "اور اس بات کی ضرورت تو پہلی رات پڑتی ہے۔" ❋

بقیہ صفحہ ۱۳ روسٹ لیس

میرا جواب سن کر وہ سکتے میں آگیا۔ اور میں سوچنے لگا ایک اردو کا افسانہ نگار انگریزی یا کسی اور زبان میں افسانہ کیوں لکھنا چاہتا ہے۔! میرے سوال کا جواب اس کے چہرے پر ڈھونڈنے لگا۔ اس نے اپنا سر اٹھایا۔ اور لرزتی آواز میں کہا۔

"لگتا ہے ہم لوگ روسٹ لیس ہو چکے ہیں" اس کے جواب میں ابھی میں کچھ کہنے ہی جا رہا تھا کہ اچانک میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو لرز رہے اور پھر وہ کچھ کہے سنے بغیر میرے درمیان سے تیر کی طرح نکل گیا۔ ❋

اپنا معاوضہ درج ذیل پتہ پر ارسال کیجئے۔
The "SHAIR" (Monthly)
MAKTABA QASRULADAB
BOMBAY CENTRAL POST OFFICE,
BOMBAY-400 008.

یعنی سزا

ت روتے!
ہارے باپ کی کسی خطا
ں نے بھی کی
در وقت کی سزا
مجھے بھی ملے گی۔
م کل!
یرے بچوں کے ساتھ
ں بھر کر روتا

بے بسی

نی آنکھیں نکال کر
سگریٹ بٹ کی طرح
ؤں تلے مسل دو
صولوں کے سارے اوراق
وکھی لکڑی کی طرح
سلا دو
سلم کی زبان
کسی سرپھرے کے سر کی طرح
اٹ دو
کہ اب
دیکھنا سوچنا اور لکھنا
گناہ ہے

حرف حرف لہو

ہماری توہین زدہ تاریخ کا
ہر ایک سیاہ ورق کا
حرف حرف
لہو بھرا ہے

نظم

جیو
تم اپنی مہکتی
دشال دھرتی پر
مگر ہمارے
یہ کچے مکان رہنے دو
یہ چند سوکھے درختوں کا
جھنڈ ہے جیسا
اسی طرح
اسے رہنے دو
بے ثمر
بے جان
کہ اگلے وقتوں کی
تہذیب کا
نشان تو ہے
یہ ایک گوشۂ بے نام
بے امان سہی
مگر زمیں پہ
محبت کا
آسمان تو ہے

حفیظ آتش

جنگ

کھلونوں سے نہیں کھیلا ہوں میں بھی
بچریوں کے لئے تم نے
کبھی آنسو بہائے ہیں
نہ میں نے
بھوگنے کے واسطے
آسماں مانگا
نہ تم نے گیہوؤں کے کھیتوں کو
اپنا مدعا جانا
قناعت ہی وراثت ہے
نصیبوں کو بُرا کہتے بھلا کیا
تمہاری میری آنکھوں نے
چرائے ہیں وہ منظر بھی

اکیلی کار میں کتے کا بچہ مسکراتا ہے
دھنک کے رنگ
مٹھی میں دبوچے
گنگناتا ہے
مگر یہ ابن آدم ننگے پیروں
کالی سڑکوں پہ
مسلسل دوڑتا ہے
ابھی تک اپنے حق کو مانگتا ہے
چھیننا سیکھا نہیں ہے
یہ جس دن
اپنے حق کو چھین لے گا
یقین جانو!

کھلونوں کو نہیں ترسے گا کوئی
نہ گڑیوں کے لئے آنسو بہیں گے

م فا سہیل

... ۳ اے محمد علی جوہر ٹاؤن لاہور - ۵۴۷۰۰ (پاکستان)

افسانہ اور عصری آگہی

افسانہ ایک ایسی متوازن صنف نثر ہے کہ اسے بلحاظ ہیئت اور مواد مساوی عناصر کے امتزاج کا حامل ہونا چاہیئے۔ اس کی ساخت یا بناوٹ کے کسی عنصر میں کمی بیشی نہیں ہونا چاہیئے اگر ایک آدھ آنچ کی کہیں بھی کسر رہ جائے تو شاہکار ہیں کھوٹ لگتی ہے۔ یہ افسانہ خواہ روایتی کا سیکی CONVENT FORM ہو یا اس کا اسلوب غیر روایتی ہو یعنی اسلوب بیان میں علامت یا تجدیدیت کو استعمال کیا گیا ہو۔ لیکن بہر حال افسانہ ہونا چاہیئے۔ قطع نظر اس بات سے کہ تمام مختلف تمام ہندوستان جدید افسانے کی صنف کی توجیہات کے نام پر من مانی تشریحات میں زمین اور آسمان کے قلابے ملا رہے ہیں۔ اور ایسی دور کی کوڑی لا رہے ہیں کہ توبہ بھلی تاہم اس افراط و تفریط کے بین بین اس اصل افسانے کے خدوخال بخوبی پہچان رہے ہیں کہ جو منطق اور فنی زمین پر پاؤں رکھ کر چلتا ہے اور چاروں طرف سے چوکس ہوتا ہے۔

افسانے کی ابتدائی یا خام شکل بہر حال کہانی ہوتی ہے۔ ہر چند کہ جدیدی افسانہ نگار کہانی کے وجود کا منکر ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ کہانی کے مروجہ اور روایتی افسانے کے مزاج میں شیر و شکر بن جانے والی کہانی کے وجود کا منکر ہے۔ بجائے خود کہانی کا نہیں کیونکہ غیر کہانی یا اینٹی اسٹوری بھی ایک کہانی ہوتی ہے۔ خواہ اس کی شکل بگڑ بھی جائے اور کیسی ہی بے ہنگی کتنی ہی مسخ شدہ DISTORTED FORM میں کیوں نہ ہو یا افسانے کے بین السطور میں کتنی ہی مستور اور کتنی ہی ہو یا ہو۔ اس کا ایک وجود ضروری ہوتا ہے اس کہانی کو افسانہ بنانے میں جو جو جتن کئے جاتے ہیں وہی افسانہ نگاری کا فن و آرٹ ہیں اگر کوئی بھی افسانہ نگار خواہ وہ روایتی افسانہ نگار ہو کہ علامتی یا تجریدی، کہانی کو افسانہ بنانے پر قادر نہیں ہے۔ تو خواہ وہ نام نہاد افسانہ نگار ہو اپنے حقیقی اور معروف معنوں میں مطلقاً افسانہ نگار نہیں ہوگا۔ کہانی کو افسانہ بنانے کا فن ہر کس و ناکس کو نہیں آتا۔ لیکن جو اس فن کو جانتے ہیں وہ ذرا سے اشارے میں کہانی کو افسانہ بنا دیتے ہیں۔ لیکن چونکہ ہماری بحث کا یہ کل نہیں کہ محض جزوی حصہ ہے۔ لہٰذا تنگ اس ضمن میں چند ضمنی معروضات عرض کر کے آگے بڑھ جاتا ہے اس بنا پر اس مقام پر یہ غور کرتے چلیے کہ روایتی افسانہ ایک مروجہ نہج پر قائم ہونے کے باوصف محض ایک اسلوب بیان ہے۔ یا ایک میکانکی جدولی کے حصار میں رہ کر ایک نقطے سے دوسرے نقطے تک سفر کی حالت ہے علامتی افسانہ ایک دوسرا اسلوب بیان ہے جس کا میکانکی ڈھانچہ خواہ ظاہر ہو کہ باطن میں موجود ضرور ہوتا ہے۔ وقس علیٰ ہذا تجریدی افسانے کو تیسرا اسلوب سمجھ لیجئے خواہ اس کا میکانکی ڈھانچہ اس کے بین السطور میں محذوف ہو قاری کے شعور یا تحت الشعور میں بتدریج آگے بڑھتا جاتا ہے۔ اور کسی ایک نقطے تک اس کا رسائی ضرور ہوتی ہے۔ لیکن اگر بفرض محال مذکورہ صورت معنًا موجود نہ ہو تو افسانہ نگار کا قصور ہے۔ بجائے خود صنف افسانہ قصور وار نہیں کہ افسانہ نگار کی کمزوری اس کے لئے موانع پیدا کرتی ہے۔ افسانہ بجائے خود عجز نہیں رکھتا۔

اس بحث کو تمہید میں صرف اس بنا پر پیش کیا گیا کہ اردو کی صنف افسانہ کی ارتقائی عمر کو کلیتہً ملحوظ رکھتے ہوئے یہ عرض کیا جا سکے کہ ہر دور کے افسانے نے عصری آگہی کا ثبوت فراہم کیا۔ ہیئت کی شکل میں بھی اور مواد کی صورت میں بھی اردو افسانہ خواہ پریم چند سے شروع ہو کر یلدرم سے اپنی عمر کے لحاظ سے اپنی بساط کے مطابق اس نے حتی الامکان عرانی، تاریخی، معاشرتی اور تہذیبی عوامل کو خود میں جذب کیا ہے یہی نہیں بلکہ اگر عرب سے محقق علمائے برصغیر سے چلنے والے افسانے کی روایت سے قطع نظر کر کے ایک لمحہ فکر کی اس بات کو مان لیا جائے کہ داستان اور قصے کی صورت میں افسانہ برصغیر میں ہمیشہ موجود رہا ہے۔ تب بھی اس نے عصری آگہی کی نہایت مہتم بالشان روایت کو تسلسل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ فادجہی کی سب رس ۔ اسلوب کے لحاظ سے علامتی زبان مقفیٰ مسجع عبارت ہی کی حامل نہیں بلکہ تصوف اور آداب معرفت کی ایک معرکۃ الآرا تصنیف ہے جو اپنے زمانے کے میلانات و رجحانات اور فلسفیانہ

فکر کا احاطہ کرتی ہے۔ اسی طرح تحسین کی نوطرز مرصع، قصۂ ارک ملائی تحسیل، امن کی باغ و بہار، سرور کی فسانۂ عجائب، سرشار کی فسانۂ آزاد اور نذیر احمد کی توبۃ النصوح وغیرہ میں بھی دلی اور لکھنؤ کی دو تہذیبوں کی ترجمانی ہوتی ہے جس میں ہر شہر اپنی عصری آگہی کی لہریں موجیں مارتی نظر آتی ہیں۔

اردو کا ہر افسانہ نگار اپنے معاشرے کے مبلغ علم اور بصیرت یا دوسرے لفظوں میں سطح عصر کو اپنے شعور کا حصہ بنا کر لکھتا رہا ہے اور اس کا ذہنی افق اپنے سابقین یا متقدمین کے مقابلے میں زیادہ وسیع ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ ذہنی افق اپنی روایات میں ایسی پیوست ہے۔ تہذیب و ثقافت کے طرفی شعار جیسی اور نت نئے علوم و فنون کی روشنی کا بھی احاطہ کرتا ہے جیسا کہ جب دہلی میں دہلی کالج قائم ہوا (۱۸۲۵ء) تو مغلوں کا جاگیردارانہ نظام اپنے زوال کی انتہا کو پہنچ رہا تھا۔ سیاسی لحاظ سے اقتدار میں اس حد تک سمٹا ہوا تھا کہ بنگال تو پہلے ہی ان کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ شمالی ہند اور جنوبی ہند کے اکثر علاقوں اور صوبوں پر برائے نام مغلیہ حکومت باقی رہ گئی تھی۔ تہذیبی اور علمی سوتے خشک ہوتے جا رہے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دہلی کالج قائم ہوتے ہی مسلمانوں کا ایک متعدد طبقہ اس کالج سے رجوع ہوا اور اس کے اثرات و ثمرات قبول کرنے لگا۔ پروفیسر رام چندر کی ادارت میں شائع ہونے والے رسالوں (محب ہند، فوائد الناظرین اور قرآن السعدین) نوجوانوں میں مقبول ہونے لگے اور اجتماعی زندگی میں جو جو اور جہاں جہاں خلا واقع ہو رہے تھے انہیں نئے نئے طرز سے فکر اور حکمت سے شعور پُر کرنے لگے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغلوں کی برائے نام حکومت ۱۸۵۷ء کے خاتمے کے فوراً بعد سرسید اپنے ہر اول دستے کے ساتھ میدان میں آ گئے۔ اور علمی تہذیبی اور ادبی محاذ پر رونما ہونے والے خلا کو پُر کرنے لگے۔ چنانچہ نذیر احمد کی ہر ناول کا درس عصری آگہی کا پتہ دیتا ہے۔ اسی طرح لکھنؤ نے جنگ آزادی کو جس طرح جھیلا تھا، طلسم ہوش ربا، فسانۂ عجائب اور سرور کی رزمیہ زبان میں اس کی ترجمانی ہے۔ اور اس کے مصنفین کے پختہ شعور کا بدیہی نتیجہ ہے۔ اور اگر ہم مغل افسانے کو محض مغرب کا ثمرہ سمجھا جائے اور اس کی ابتداء پریم چند سے کی جائے تو ریمنڈ کے طول و عرض میں دوڑتی ہوئی جدوجہد آزادی کی روح ان افسانوں کی جاری و ساری ملتی ہے۔ جن کو سوز وطن تو برطانوی سامراج کے لئے چیلنج بن گیا تھا جس کے نتیجے میں پریم چند کو سرکاری ملازمت چھوڑنا پڑی تھی۔

عصری آگہی یوں تو ہر زبان کے ادب کے تمام اصناف میں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہوتی ہے لیکن بطور خاص اردو افسانے سے رجوع کیجئے تو ہر دور کے افسانے میں اس کا عمل دخل موجود ہے۔ عصری آگہی لکھنے والے اور قارئین دونوں کے مابین ایک نقطۂ اتصال یا مفاہمت کی فضا پیدا کرتی ہے۔ دونوں کے اذہان اپنے زمانے کے اجتماعی شعور کی رو پر دوڑتے ہیں۔ اور فریقین میں سے کسی کو کہیں بھی خلا محسوس ہو تو مفاہمت کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔ یہ خلا یا تو قاری کو فنی تخلیق میں محسوس ہوتا ہے۔ اور اگر دوسری صورت میں افسانہ نگار کو قارئین کے ذہنی سطح کی پستی کا علم ہو تو (اور اپنے فن پر اعتقاد ہو تو) وہ شہرت و مقبولیت یا بعد ازاں حصول شہرت کی پیشکش کی پرواہ نہیں کرتا ہے بلکہ پستی میں اتر کر دانش و بینش کی تربیت سمجھتا ہے تاکہ قارئین کی ذہنی تربیت شروع ہو جاتی ہے۔ اور کچھ نہ کچھ اذہان اس سطح تک مزید پہنچ جاتے ہیں۔ ترقی پسند افسانے کی ابتدا میں بھی قارئین کی بیشتر صفوں میں یہی کیفیت پائی جاتی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ مغربی علوم و فنون سے لکھنے والوں کے دماغ تو ضرور مستفید تھے مگر پڑھنے والوں کے اذہان کی سطح پست تھی نتیجہ یہ ہوا کہ جیسے جیسے علوم و فنون کی تعلیم بڑھنے لگی ابہام و تفہیم کے دائرے بھی بڑھنے لگے اور بالآخر کہیں نہ کہیں پر مفاہمت ہو گئی۔

عصری آگہی کے واضح طور پر دو دائرے نظر آتے ہیں ایک کا تعلق اس بصیرت سے ہے جو معاشرے کی علمی سطح پر موجود ہوتی ہے اور دوسرے دائرے کا تعلق آفاق سے ہے یعنی کائنات سے۔ اب میں تمام علوم معلوم کی سب سے زیادہ بلند سطح کو فنکار چھو رہا ہو اور بیک وقت دونوں دائروں میں تطابق پیدا کر رہا ہو۔ ہمارے زمانے کے افسانوں نگاروں کی غالب اکثریت دونوں دائروں میں قدم رکھ چکی ہے۔ اور فنی لحاظ سے افسانے کے تمام ممکنہ اسالیب میں اس کا اظہار کر رہی ہے۔ آج سے ربع صدی قبل بالعموم افسانہ نگاروں کی غالب اکثریت کا یہ رویہ نہ تھا۔ اور ان کی فکر کا احاطہ اس قدر وسیع نہ تھا۔ اقتا شاداشعر لہٰذا اس عصری آگہی کے پیچھے گذشتہ پچیس سال کے سائنسی صنعتی اور فنی ارتقا کا یہ ایک جال پھیلا ہوا ہے۔ جس نے پوری کائنات پر پھیلی ہوئی زمین کے باشندوں کو یکجا ہونے کا احساس دلایا ہے۔ اور بطور خاص تیسری دنیا کی محرومیوں کو اجاگر کیا ہے نیز استحصال کنندہ عناصر کے چہروں کو واضح کر دیا ہے ریڈیو، ٹیلی ویژن، ٹیلی فون اور فلم کی نعمتوں کے ذریعے علوم کو تیز رفتاری سے دور دور تک پھیلایا ہے۔ لہٰذا عصری آگہی کا وہ مفہوم جو آج سے پچاس سال قبل تھا محدود تھا۔ آج زیادہ وسیع ہے۔ چنانچہ افسانہ نگاری کے وہ اسالیب جو پچاس سال قبل پائے جاتے تھے۔ آج پرانے اور فرسودہ ہو چکے ہیں اور افسانہ نگار جو ذرا ذرا سے اشاروں میں بات پیدا کر دیتا ہے۔ اس کے لئے بیسوں صفحات ضائع کرنا اب ضروری نہیں سمجھتا۔ جو مفاہیم اب سے کچھ سال قبل تک وضاحت طلب تھے آج اظہر من الشمس ہیں۔ تاہم میری اس گفتگو سے یہ خیال کرنا کہ میں کسی ایک مخصوص اسلوب بیان کی وکالت کر رہا ہوں، غلط ہے۔

... صرف اتنا حقیقت کے طور پر یہ کہہ رہا ہوں کہ فنکار کی بصیرت اپنے اظہار کا کوئی طریقہ یا اسلوب خود دریافت کرتی ہے جس طرح پانی اپنے بہاؤ پر راستہ خود بنا لیتا ہے یہی حال آگہی کے اظہار کے لئے نئے اسلوب بیان کا خود بخود وضع ہونا قرین مصلحت ٹھہرتا ہے چنانچہ افسانہ جو روایتی اسلوب میں لکھا گیا اپنی ضرورت کے تحت کسی نہ کسی سانچے میں ڈھلا اور اگر علامتی یا تجریدی اسلوب بیان میں ظاہر ہوا تو یہ بات بھی اس کی ضرورت کے عین مطابق تھا۔ ہے اور اگر نہیں ہے تو اسے بھی بدلنا پڑے گا۔ اور اس طرح جدید افسانہ معرض وجود میں آیا۔ اور جدید تر بھی لیکن تجرباتی سطح سے گذر کر اگر معاشرے میں اسے قبول عام بیس پچیس سال بعد بھی نہ مل سکا تو یقین کیجئے کہ یا تو کوئی متبادل اسلوب اور آئے گا یا روایتی افسانہ اپنی جگہ واپس آ جائے گا۔

آج سے تقریباً ایک صدی قبل یعنی ۱۸۸۰ء میں فرانس میں افسانے نے مروجہ روایتی چولا بدلا اور کسی رد عمل کے طور پر علامت اور تجرید کو اپنایا۔ ان کی ضرورت تھی ہمارا اس تاریخ سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ ممکن ہے بطور فیشن بعض لوگوں نے ان کی تاسی کی ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ علامت ہماری روایات سے مفقود نہیں ہے۔ علامت اور علامت نگاری دونوں اردو ادب کے ساتھ ساتھ رہی ہیں صرف فورٹ ولیم کالج کی سلیس نگاری کے دور اور سرسید اور ان کے رفقاء کے زمانے میں اظہار مافی الضمیر کے لئے آسان اور عام فہم زبان سے تشبیہ استعارے تمثیل اور علامت کو خارج کر دیا گیا تھا جس پر تکلفے میں ادب کی جا سمجھی ہے) کا طعنہ بھی عرصے تک دیا جاتا رہا ہے لیکن ترسیل خیال اور ابلاغ کا معذرت خواہانہ عجز علامت کے لئے مواقع پیدا کرتا رہا ورنہ علامت کچھ عرصے کے لئے غائب ہو کر ظاہر ہوتی رہی کچھ عرصے قبل پاکستان میں مارشل لا اور ایوبی دور کی جمہوریت کش ذہنیت نے ایک بار پھر سامنے آ کر علامت کو پناہ گاہ کے طور پر ظاہر کیا کہ خیال کو الفاظ سے کیموفلاج کر کے قاری تک پہنچایا جائے۔ اور اس طرح افسانے کے لئے علامتی اسلوب کو مجبوراً اپنایا جائے۔ دیکھا جائے تو علامت بجائے خود بری شے نہیں بلکہ وقت کی ضرورت اور اظہار کا وسیلہ ہے لیکن علامت کو علامت وہی لوگ بنا ڈالتے ہیں جو اس میں ابہام پیدا کر دیتے ہیں۔ بعض سوچے سمجھے بغیر محض فیشن کے لئے علامت استعمال کرتے ہیں۔ اور جسے وہ علامت سمجھتے ہیں وہ بسا اوقات علامت ہی نہیں ہوتی علامت سے کوئی چھوٹی چیز ہوتی ہے اور زیادہ تر استعارہ بن کر رہ جاتی ہے۔ علامت میں معنویت کا خفا CONCEALMENT نہایت درجہ بلاغت پیدا کر سکتا ہے بشرطیکہ تاریخ اساطیر دیو مالا یا مذہبی مابعد الطبیعیات میں اس کی جڑیں موجود ہوں ورنہ افسانہ نگار کی ذاتی اور مفروضہ علامات ابہام اور عجز کی بنا پر چونکہ معنی کی ترسیل نہیں کر سکتی لہٰذا مغلق اور بے معنی ہو کر رہ جاتی ہیں چنانچہ علامت کا استعمال بے سلیقہ پھوہڑ اور کم سواد افسانہ نگار کے ہاتھوں اپنی افادیت کھو دیتا ہے میں اس مقام پر بحث نہ کر کے صرف اتنا اشارہ کر سکتا ہوں کہ ہمارے یہاں پاکستان میں چند گنتی کے افسانہ نگار علامت نگاری کے اسلوب پر صحیح قدرت رکھتے ہیں۔ اور اکا دکا ہندوستان میں بھی۔ باقی علامت اور تجرید کے نام پر افسانہ نگاروں کی جو ایک فوج ظفر موج نظر آتی ہے وہ محض نگارش کے سوا ادب کی کوئی خدمت نہیں کر رہی ہے بلکہ یہ فوج چند معتبر افسانہ نگاروں کا [illegible] بن کر رہ گئی ہے۔

تجریدی افسانہ بھی ایک اسلوب ہے جس کا زیادہ تر تعلق مصوری سے ہے۔ میں ایک تجریدی افسانہ نگار کو کسی قدر قریب سے جانتا ہوں اس کے ذہن کی تربیت میں مصوری، اسٹیج، تمثیل، ڈرامہ، نظم اور ادب کو بہت دخل ہے۔ اور اس کے ذہن میں رنگوں روشنیوں اندھیروں اور آوازوں کے زیر و بم کے نقش و نگار کے پیچ و خم نے ایک خاص آہنگ پیدا کیا ہے۔ وہ مصوری پر بھی قادر ہے اور اسٹیج پر یونانی اور ہندوستانی اساطیر کے امتزاج سے اظہار کے نئے نئے اسالیب پیش کرنے میں کمال رکھتا ہے۔ اندھیرے اور روشنیوں کے تضادات سے مفاہیم کے تعین میں وہ تیز فہم رکھتا ہے۔ چنانچہ اگر روایتی افسانے پر مکمل مہارت رکھنے کے بعد وہ تجریدی افسانے سے رجوع ہوا تو چنداں مضائقہ نہیں کہ وہ ترسیل خیال پر یہاں بھی قدرت رکھتا ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو افسانہ نگار تجرید کی مبادیات سے بھی واقف نہیں وہ تجریدی افسانہ نگاری میں کیا گل کھلا رہے ہیں یعنی یہ مبلغ علم اور بصیرت کا معاملہ ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ علامت اور تجرید یا روایتی افسانے کے اسالیب بیان پر وہی اپنی گرفت مضبوط رکھ سکتے ہیں جنہیں بصیرت بھی ہو اور فن پر مکمل قدرت بس طرح کمہار کے گھومتے ہوئے چاک پر گیلی مٹی سے باکمال کمہار ہی سڈول ظروف تیار کر سکتے ہیں اسی طرح معاشرے اور کائنات سے خام کہانی کے مواد کی [illegible] سے افسانے کا ظرف تیار کرنے میں وہی افسانہ نگار کامیاب ہو سکتے ہیں جو اپنی انگلیوں کی فنکارانہ چابک دستی سے حسب ضرورت گیلی مٹی کو جب چاہیں جہاں چاہیں موڑ کر کوئی بامعنی شکل دے سکیں ---- افسانہ خواہ روایتی ہو یا علامتی یا تجریدی فن صورت گری سے مشابہ ہے اور فن صورت گری پر قادر نہیں ہو سکتا۔ معاشرے کی تمام علمی و فنی بصیرتیں جس پر عیاں اور روشن ہوں وہی افسانے کے خدوخال میں معنی کا رنگ بھر سکتا ہے۔

عصری آگہی کے سلسلے میں کہا جا سکتا ہے کہ اس کے مختلف دائرے ہیں: معاشرہ، شہر، صوبہ اور ملک بھر میں محدود ہو سکتے ہیں یعنی اگر لبنان میں فلسطینی مظلوموں پہ اسرائیلی عناصر نے جنگ مسلط کر دی ہے اور فلسطینی خاک و خون میں نہا رہے ہیں تو فلسطینیوں کا نقطۂ نگاہ اور ہوگا اور جارح اسرائیل کا مختلف گو دونوں کے آگہی کے دائرے ایک ہیں مگر نقطۂ نگاہ کے مختلف۔ جتنے سب ایک فلسفۂ فکر کا ترجمان ہوگا تو دو سو شعرا میں جو بہترین عالمی ان کا تعین کرنا اور پھر یہ کہ کیا تیز کرنا تدبر کے ساتھ ساتھ تفکر اور تشکک کے ذریعے درد و کا درد اور انسانی کہانی علیحدہ کرنا بھی ضروری ہے گویا یہ حاکم بھی فنکار کرتا ہے۔ تاکہ آفاقی قدروں کی تعداد کا عمل جاری رہے۔ عصری آگہی میں محض چند باتوں کا جان لینا کافی نہیں جتنا حاکم کر کے ان کی حیثیت کا تعین بھی ضروری ہوتا ہے۔ یہ کام اصل میں نقاد کرتا ہے لیکن چونکہ اردو افسانے کی داستان کی کمی نہ تو شدید تھی نہ تو شدید ہے اس لئے مختلف امزجہ افسانوی اسالیب کے زمانوں کے باہمی جو کچھ بھی نظر آتا ہے اسے فکری سطح پر نہیں کیا جا سکا اور اگر کسی نقاد عظیم نے یہ خدمت انجام بھی دی تو جلدی خود پر غیر نقاد عظیم تو پھر بھی ایک اچھے پڑھے لکھے نقاد تھے بعض کم سواد نقادوں نے محض اپنے دل کی قامت کو بلند کرنے کے لئے افسانے کی بیساکھی کو استعمال کیا اور افسانہ نگاروں کے کندھوں پر چڑھ کر شہرت کے آسمان پر پہنچ گئے۔ ایسے جعلی یا کھوکھلے نقادوں کی ایک کھیپ نظر آتی ہے جس سے ادب کو صنفِ افسانہ کو قاری کو یا خود افسانہ نگار کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ حالانکہ GENUINE افسانہ نگار کو نقاد کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ مگر صالح نقاد موجود ہو تو کم از کم دھبے یا بس کو علیحدہ کر کے صالح افسانہ نگار کی نشاندہی کر سکتا ہے۔ اور لوگوں کو بتا اور بتا سکتا ہے کہ صالح افراد عصری آگہی میں کس حد تک جھلک رہے ہیں۔ اور کس حد تک مزید غائب گی کی ضرورت ہے۔

کوئی پچیس تیس سال قبل تک اردو افسانے پر جو گورکی، دوستوفسکی چیخوف، موپاساں اور او ہنری کے فن کا سایہ پڑ رہا تھا وہ کم ہو گیا ہے۔ البتہ کچھ غیر معروف اور غیر مستحق روایت شکن افسانہ نگاروں کا اکا دکا ذکر نظر آتا ہے چند سکہ بند افسانہ نگاروں سے قطع نظر کیجئے تو بیشتر بہم خویش اپنی اپنی ندی میں اپنی راہ چلے جا رہے ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں کہ عصری آگہی سے محض نا آشنا بیٹھے ہیں۔ البتہ یہ بات قابلِ اطمینان ہے کہ جن لوگوں نے روایتی افسانے کو بھی سمجھا بوجھا ہے برتا اور استعمال کیا ہے۔ اگر علامت اور تجرید کی طرف مائل ہوئے ہیں۔ تو انہوں نے فن کی بھی وقیع خدمت کی ہے اور افسانہ نگاری کے تمام ادبی تقاضوں کو انتہائی ذمہ داری سے پورا کیا ہے۔ ایسے افسانہ نگاروں کا ذہنی افق بھی نہایت وسیع ہے اور نظر آتا ہے کہ انفس و آفاق کے ہر جہت اور ہمہ گیر موضوعات سے پنجہ آزمائی کرتے ہوئے بعض اوقات انہوں ایسے عمدہ افسانے تخلیق کئے ہیں کہ اردو یا دیگر اچھی تنگ دامانی کے عالمی افسانوی ادب میں ایک اہم مقام حاصل کر سکتی ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ ابھی اردو افسانہ بہت سی زبانوں کے افسانوی ادب سے پیچھے ہے لیکن حوصلہ شکنی کی حد تک بہت پیچھے بھی نہیں ہے۔

عصری آگہی کے ضمن میں ایک کی طرف اشارہ ضروری ہے کہ اردو افسانہ میں ہمارے دیہی معاشرے کی ترجمانی تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے پریم چند، احمد ندیم قاسمی، بیدی، کرشن چندر، اور ابتدا میں اسد رشن کے علاوہ اور کسی نے برصغیر کی پچاس فیصد آبادی کی ترجمانی نہیں کی ہے چند برسوں سے اس ضمن میں جو کچھ بھی کاوشیں کی ہیں ان کا عدم وجود برابر ہے ضرورت ہے کہ برصغیر کے ہر ہر علاقے کے دیہی خطوں کی ترجمانی اردو افسانہ کرے اگرچہ علامتی اور تجریدی افسانے میں لوک کلچر کو جذب کرنے کی کم سے کم گنجائش ہے لیکن روایتی افسانے میں اسے جذب کرنا مشکل نہیں۔

عصری آگہی کے سلسلے میں ہمارے افسانے کی صنف کو ایک خاص قسم کے نقاد سے بہت نقصان پہنچ رہا ہے یہ نقاد بھی جعلی یا سوڈو ہے کیونکہ یہ گروہی مفادات کو ملحوظ رکھ کر بعض سوڈو قسم کے افسانہ نگاروں کا ڈھنڈورا اس طرح پیٹ رہا ہے کہ GENUINE افسانہ نگار اور اس کا فن اس میں دب کر رہ گئے ہیں۔ بعض لوگوں نے باقاعدہ التزام یا اہتمام کیا ہے کہ گلوں محلوں قریوں قریوں، چوک پہ سے بٹھا رکھے ہیں۔ اور شکاریوں کو گھات میں لگا رکھا ہے کہ خبر دار جو ابھرتا ہوا شاعر یا افسانہ نگار یا انشا نگار وغیرہ نظر آئے فوراً گرفتار کر کے اپنے حلقے میں شامل کر دو اور اپنا حلقہ بگوش بنا کر اسے ایسے کنوئیں میں ڈال دو کہ آسمان نظر ہی نہ آئے۔ اس طرح اس کا بار بار ذکر کرو۔ بیانگ دہل اس کا ذکر کرو کہ نہ تو اسے اور کوئی آواز سنائی دے۔ اور نہ سننے والوں کی کچھ سمجھ میں آئے چنانچہ دیکھتے دیکھتے ہی نگاروں کی ایک کھیپ کی کھیپ تباہ ہو گئی ہے۔ جن کی تخلیقی صلاحیتیں بانجھ ہو چکی ہیں۔ اور اب ان کی سمجھ میں یہ بات آ رہی ہے کہ ان کو دھوکہ دیا گیا تو وقت گزر چکا ہے اور تلافی مافات ممکن نہیں۔ دراصل یہ فریب اردو ادب سے کیا جا رہا ہے۔ اور یہ قومی و ملی سطح ہی پر نہیں نوع بشر کی سطح پر انسانی نقصان ہے۔ اور انسانی صلاحیتوں کا ایسا ہی استحصال ہے جیسے بیگار کیمپ

یا بردہ فروشی کا گھناؤنا دھندہ، ظاہر ہے کہ ایسے افسانہ نگاروں کو کنویں کے اندر سے جتنا آسمان نظر آتا ہے۔ وہ بہت مختصر ہوتا ہے چنانچہ عصری آگہی سے محرومی ان کا اور اردو افسانے دونوں کا مقدر ٹھہرتی ہے۔

گذشتہ ربع صدی میں دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے۔ ہمارے معاشرے کو بہت سی باتوں کی کانوں کان خبر تک نہیں ہے بعض مواقع ایسے بھی ہیں کہ ہماری آبادی کا بیس بائیس فیصد حصہ جو باخبر اور خواندہ ہے اس تک بھی بوجوہ بہت سی خبروں کی رسائی نہیں تاہم تخلیقی صلاحیتوں سے مالا مال باخبر شاعر یا افسانہ نگار جب ایسی خبروں تک کسی نہ کسی طرح رسائی حاصل کر لیتے ہیں۔ اور بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کے نقطۂ نظر سے انسانی معاشرے کی بھلائی اور کائنات کی بقا کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ اسے لوگوں تک پہنچایا جائے تو موانع کے باوجود کوئی نہ کوئی راستہ نکالنا پڑتا ہے اور اب تو کچھ عرصے سے ع ۔ دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ ۔ والا معاملہ درپیش ہے۔ قطرے کو گہر ہونے تک بڑے بڑے ہفت خواں طے کرنا پڑتے ہیں لیکن تخلیقی صلاحیت رکھنے والا افسانہ نگار نہایت دردمندی ہنرمندی سے فنی پردے میں چھپا کر وہ خبر یا وہ خاص آدرش ادب کے ذریعے لوگوں تک پہنچا دیتا ہے۔ ہمارے بعض افسانہ نگار بڑی نیک نیتی اور مستعدی سے اس نیک کام پر لگے ہوئے ہیں اور انتہائی دیانتداری سے یہ خدمت انجام دے رہے ہیں قطع نظر اس بات سے کہ ان کے راستے کی مشکلات گرانہیں دار کا راستہ دکھاتے ہیں کہ سنت منصور کے تتبع پا سکتے ہیں بہرحال ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم اور اقل قلیل سہی مگر غنیمت ہے کہ ایسے ہی روشنی والوں کی آبرو سے قوموں کی آبرو قرنوں تک زندہ رہتی ہے۔

افسانے کے نقادوں سے بجا طور پر یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ صنف افسانہ کا بالاستیعاب مطالعہ کریں گے اور عمرانی تاریخی اور معاشرتی محرکات و عوامل کا مفصل جائزہ لیتے ہوئے جدید افسانے، روایتی افسانے، علامتی اور تجریدی افسانے کو تناظر میں رکھ کر وہ باتیں کہیں گے جن کے نہ ہونے سے جنون افسانہ پنپ نہیں سکا اور جنون افسانہ نگار پھل پھول نہیں رہا ہے۔ ہمارے نقاد کا فرض بہت گمبھیر ہے اب فرقے بازی اور فتویٰ سازی کے دور کو الوداع کہنے کا وقت آن پہنچا ہے۔

عصر حاضر کے اردو افسانے میں جو رجحانات اور میلانات زمانی و مکانی تغیرات کے ساتھ ساتھ رونما ہوتے رہے ہیں وہ طین TAINE کے نظریے کے ماتحت وقت، ماحول، تاریخ اور نسل کے تناظر میں دیکھے جائیں کہ بہرحال تخلیقی ادب پر ماحول کے نظریات اور محرکات اثر انداز ہوتے ہیں چنانچہ ۱۹۴۷ء سے قبل بھی برصغیر کے تاریخی معاشرتی عمرانی معاشی تہذیبی اور ثقافتی حالات صنف افسانہ کو متاثر کر رہے تھے اور جب ترقی پسندی ایک تحریک اور تنظیم کی صورت میں ڈھلی تو بطور خاص استعمار، استحصال اور رجعت پسند قوتوں اور تحریکوں کے خلاف جد و جہد، احتجاج اور مزاحمت کے رجحانات تیزی سے صنف افسانہ میں جگہ پانے لگے قطع نظر سطحی اور جذباتی افسانوں کے فکری اور عقلی تجزیے بھی ہوئے جنہوں نے معتبر پختہ کار اور معیاری افسانہ نگار پیدا کئے جنہوں نے آزادی کی تحریکوں کو اس فن میں جذب کیا اور ان اہم افسانہ نگاروں نے اعلیٰ درجے کے افسانے تخلیق کئے یہ زمانہ کم و بیش ایک دہائی تک چلتا رہا۔ اور وہ ممالک جو استعمار کے خلاف جنگ کے حوالے سے آزاد ہو رہے تھے انہیں دیکھ کر برصغیر میں جد و جہد کی تحریکیں کامیاب اور کامران ہونے لگیں یہ بھی ملحوظ رہے کہ اس زمانے میں دوسری جنگ عظیم برپا ہوئی روس، امریکہ، برطانیہ نے آمریت اور فسطائیت کے خلاف جنگ جیت لی، آمریت کے پہلو بہ پہلو رجعت پرست طاقتوں کو جن میں فیوڈل سسٹم اور سرمایہ دارانہ دونوں شامل تھے، روسی انقلاب نے ہزیمت سے دوچار کر دیا تھا لہٰذا روس کے نئے سوشلزم انقلاب نے بھی اردو افسانے کو بے حد متاثر کیا۔

قیام پاکستان اور بھارت کی آزادی کی تحریک کامیاب تو ہو گئی لیکن برصغیر میں فسادات پھوٹ پڑے اور افراتفری اور انتشار کے اس دور میں افسانہ صحت مند ڈگر پر قائم رہا۔ اردو کا افسانہ نگار صحت مند فکری اور عقلی لیکھ پر چلتا رہا۔ اگرچہ عرصۂ دراز تک اردو افسانہ فسادات کے پس منظر میں سفر کرتا رہا۔ لیکن من حیث المجموع معروضی تجزیوں اور فضا کو خوشگوار کرنا دراصل غور کیجئے تو ترقی پسند تحریک اور تنظیم نے جو شعور لکھنے والوں کو دیا تھا اور ترقی پسند نقادوں نے جو کردار اس تناظر میں ادا کیا تھا یہ سب اس کا کرشمہ تھا۔

۱۹۷۰ء اور ۱۹۸۰ء کے عشرے میں برصغیر کے ممالک اپنے اپنے معاشروں کی تشکیل تعمیر اور تعبیر میں لگے رہے تاہم کسے بھی رجوع رہے۔ ور معاشی حالات سے دوچار رہے یہ بھی درست ہے کہ ماضی کے احیاء کے لئے بنیاد پرستوں نے بڑی دندناہٹ دکھائی دونوں اطراف میں بعض افسانہ نگار بے سوچے سمجھے اس کا بھی شکار رہے لیکن زیادہ تر افسانہ نگار رجعت کی اور مستقبل کی راہ کے ساتھ ہو لئے اس عشرے میں افسانے کا سایہ

میں نت نئے تجربے کیے گئے اگرچہ روایتی افسانہ بھی چھپتا رہا لیکن علامتی اور تجریدی افسانہ بھی اس زمانے میں پیدا ہوا۔ دونوں اطراف کے تمام
کے افسانہ نگاروں نے فن کی تفہیم کے لیے حتی الامکان نقادوں نے اہم کردار ادا کیا اور اپنے متوازن آرا میں معروضی تجزیے پیش کئے۔ خود
کیا جائے تو دونوں ممالک کے معاشی مسائل گمبھیر تھے۔ چونکہ دونوں ملکوں کا انحصار زیادہ تر زرعی صنعتی معیشت پر تھا۔ لہٰذا بہت جلد دونوں کو احساس
ہوگیا کہ زرعی معیشت کو جب تک تیز رفتار صنعتی معیشت میں تبدیل نہیں کیا جائے گا ترقی کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ ہندوستان نے بہت جلد
اپنے اہداف حاصل کرنا شروع کر دیئے۔ وہاں جمہوری اقدار کے متوازن اور صحت مند راستے موجود تھے پاکستان میں ایسا نہیں ہوا کیونکہ یہاں فرسودہ
جاگیردارانہ نظام اور قدیم قبائلی سرداری نظام عامۃ الناس کے راستوں میں حائل رہا اور بعض شہروں میں جو تھوڑی بہت صنعتی ترقی ہوئی بھی تو تھے
سرمایہ داروں نے اس کا منافع ملک اور قوم پر صرف کرنے کے بجائے اپنی جیب میں رکھنا شروع کر دیا چنانچہ ہوا یہ کہ پاکستان کے معاشرے میں کوئی
پائیدار سیاسی جمہوری اور اقتصادی نظام قائم نہ ہو سکا۔ لہٰذا ہمارا افسانہ کھلی فضا میں سانس نہیں لے سکا۔ اور بیشتر افسانہ نگار گھٹن کا شکار
رہے۔ اور اپنے دروں میں داخل ہو گئے۔ اس داخلیت کے سبب افسانے کا داخلی رخ نفسیاتی بھول بھلیوں میں گم ہونے لگا۔ فرائڈ اور یونگ
کے نظریات کی مدد سے نقاد تجزیئے کرنے لگا۔ اور افسانہ نگار BREATHING SPACE کی تلاش میں سرگرداں رہے۔ ہندوستان
کے اردو افسانہ نگار کے لیے بھی بعض سیاسی اور معاشی موانع موجود رہے لیکن ہے دوسری زبانوں کے افسانہ نگار کے لئے یہ موانع نہ ہوں۔
بہرحال ایک خوش گوار پہلو دونوں ملکوں کے افسانہ نگاروں کے سامنے نمودار ہوا کہ جبر و استبداد جہاں اور جس معاشرے میں پیدا ہوا مزاحمت
اور احتجاج کی لَے تیز ہوئی۔ جذباتیت فروغ علم و آگہی کے ساتھ ساتھ کم ہوئی اور ذہنی افق سوچ اور فکر کی وسعت کے ساتھ ساتھ پھیلتا رہا۔ اسی
اثنا میں سقوط مشرقی پاکستان کا المیہ رونما ہوا اور قیام بنگلہ دیش نے ایک نئی صورت حال سے جو تاریخی معاشرتی اور معاشی تھی، ارباب دانش
کو دو چار کیا۔ اور فکر کا ایک نیا تناظر پیدا ہوا کہ مذہبی تحریکوں کی گرفت معاشروں پر ڈھیلی ہوتی رہی۔ مارکس کے مادی جدلیاتی نظریے کے تحت
معاشی سوشل نظریہ غالب آنے لگا۔ لیکن سقوط مشرقی پاکستان کے المیے اور قیام بنگلہ دیش کے سیاسی اور معاشی محرکات خواہ کچھ بھی ہوں ہندوستانی
کی آبادی کے سواد اعظم نے مذہبی پس منظر میں بنیاد پرستی کو تقویت پہنچائی اور ہندوستان کے جمہوری سیکولر ڈھانچے پر کاری ضرب لگائی چنانچہ
ہندوستان کا اردو افسانہ نگار بھی فکری انتشار کا شکار رہا۔ اور اس کا احساس جمال متاثر ہوا اس کی جمالیاتی متخیلہ جو کلاسیکی اور بریخت کی
تعبیروں سے تربیت حاصل کر رہی تھی اس کی دلچسپی اور رومانیت کا شیرازہ بکھر گیا۔

۱۹۷۰ء سے ۱۹۹۰ء تک کی دو دہائیوں میں جو دنیا میں عموماً اور برصغیر میں خصوصاً تغیرات رونما ہوئے اور انقلابات آئے انہوں نے بالواسطہ اور
بلاواسطہ اردو افسانے کو متاثر کیا۔ ۱۹۹۱ء سے اب تک چار سال کے مختصر عرصے کو بھی شامل کر لیا جائے تو ۱۹۷۰ء تا ۱۹۹۵ء تقریباً ایک
چوتھائی صدی کا عرصہ بنتا ہے۔ جس میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی غیر معمولی ترقی نے دانش و بینش کے افق پھیلا دیئے۔ سوچ اور فکر کے ساتھ ساتھ احساسات
جذبات خیالات اور نظریات میں انقلابی تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ عوام الناس سے قطع نظر دانشوروں کے مذہبی اور مابعد الطبیعیات عقائد و نظریات
میں اور ماورائی مفروضوں میں زلزلہ آگیا۔ اور تاریخ کے مادی جدلیاتی تصورات میں استحکام پیدا ہوا۔ اسباب و علل کے تناظر میں معروضی تجزیوں
پر اعتقاد مستحکم ہوا۔ منطقی استدلال پر لوگوں کا غیر متزلزل یقین پختہ ہوا۔ اگرچہ فرانس کے مشہور دانشور سارتر کی مادی سوچ سے فرد کو اہمیت حاصل
ہوئی لیکن بعض طبقوں خصوصاً پاکستان میں محمد حسن عسکری کے متبعین نے رینے گینوں کے نظریات کو نہ صرف قبول کیا بلکہ ان کی ترویج و اشاعت میں غیر
معمولی دلچسپی بھی لی۔ جس سے بعض نقادوں اور افسانہ نگاروں نے بھی اثر قبول کیا تاہم اس سوچ و فکر کے اثرات جو نمایاں طور پر نظر آئے تو بعض افسانہ
نگاروں نے نیوراتیت کو غیر معمولی اہمیت دے کر دروں ذات کو افسانے میں اس شدومد سے داخل کر دیا کہ معاشرے کے گردوپیش سے وہ بے
نیاز ہو گئے۔ اور متخیلہ کی دروں بینی کی بھول بھلیوں میں خود بھی گم ہو گئے اور افسانے میں کہانی کی دوڑ کو بھی گم کر دیا۔ ہر چند کہ معدودے چند
گم کردہ راہ نئے اور جو دروں ذات سے باہر نکل کر معاشرتی روابط استوار کرنے میں کامیاب ہوئے وہ فنی طور پر غیر معمولی افسانہ نگار ٹھہرے۔ ہماری ایک
معروف افسانہ نگار کا موضوع تاریخیت یا HISTORICITY ہے۔ وہ تاریخی تناظر میں معاشرتی تہذیبی اور عمرانی واقعات کی فضا میں اور
گردوپیش کے ماحول میں کرداروں کی تخلیق پر بڑی چابکدستی سے گرفت قائم کرتی ہیں وہ جس چابکدستی کے ساتھ ساتھ ڈھالنے ونیز میلنے سے بھی کام لیتی ہیں

اور اپنے ذہنی افق کی وسعت و پہنائی کا ایسا سمندر لئے ہوئے کہ معمولی قاری کنارے ہی پر کھڑا رہ جاتا ہے۔ اس افسانہ نگار نے گزشتہ ربع صدی میں جو
تشکیل قائم کئے ہیں وہ افسانے ناولٹ اور ناول تک میں پھیلے ہوئے ہیں یہ بات جس حد تک ہے کہ موصوف نے نہایت جرات سے مفروضوں کے حصار کو توڑ
کر حقائق کو دریافت کیا۔ اس طرح اردو افسانہ بھی دانش و بینش کی سطح پہ ہے ملاقند ہو گیا۔ اردو ذہنیت کا غیر ضروری اور مبہم تانا بانا بھی ٹوٹ گیا۔
فنی چابکدستی اور ہیئت کے حوالے سے ہمارے بعض نامور افسانہ نگاروں نے جو روایتی افسانے کی ہیئت میں مرکزی نقطۂ نظر قائم کرکے واقعاتی و
کرداری پرکار سے دائرے قائم کئے تھے وہ اپنی جگہ اہم ہیں۔ ان کا کینوس چھوٹا اور محذوفات کے دوائر دیتے ہیں۔ جس میں قاری کا ذہن کم زیادہ مستعدی
سے سرگرم سفر رہتا ہے۔ اس میں تہذیبی ثقافتی تاریخی اور اساطیری تلمیحات سے کام لیا جاتا ہے۔ جو اردو افسانے کی پختگی کی دلیل ہے
روایتی افسانے نے مغربی افسانے سے بہت کافی فائدہ اٹھایا۔ انقلاب روس سے قبل بھی روس کا افسانہ اردو افسانے کو متاثر کرتا رہا تھا۔ اور
اس کے بعد بھی کرتا رہا۔ لیکن گزشتہ ربع صدی میں روس جرمنی اور فرانسیسی افسانے کے تراجم جو اردو میں ہوئے ان سے اردو افسانے کا دامن
وسیع ہوا۔ سقوط روس سے تاریخی واقعے نے جو سیاسی اقتصادی اخلاقی اور تاریخی لحاظ سے اہم ہے۔ سوشلزم پر دانشوروں کی سوچ کو متزلزل کر دیا لہٰذا
مارکسی سوشلزم کی طرف جس افسانے کا رخ قائم ہوا تھا۔ وہ قدرے تبدیل ہو گیا۔ اگرچہ سوشلزم کی روح کو سمجھنے والے پختہ کار دانشوروں کا ایمان بدستور
قائم رہا۔ لیکن دوسرے ادبی اصناف کے ساتھ ساتھ افسانے پر تھوڑا بہت منفی اثر ضرور ہوا ہے جیسا کہ لوکاچ اور بریخت کا فلسفہ جمالیات جو سراسر مارکسی فلسفہ
ہے۔ وہ اور اس کی اساس جو مارکسی جمالیات پر قائم ہے۔ نہیں بدلی۔ کیونکہ ادیب سے اس کا براہ راست تعلق ہے اور افسانہ نگار براہ راست اس سے
منسلک ہے وہ جوں کی توں قائم رہی ہے۔ تاہم بعض سطحی نقادوں نے اردو افسانے کے لئے اسے فال بد سمجھ کر منفی نعرے دینا شروع کر دیئے اور یہ کہہ
دیا کہ سقوط روس، سقوط مارکسزم ہے اور گویا اس سقوط سے سرمایہ دارانہ نظام کا جواز پیدا ہو گیا ہے۔ لیکن اس غلط تفہیم کے اثرات وقتی اور عارضی
ہیں۔ لہٰذا اردو افسانے کو ایک بار پھر اپنے منطقی نتیجے پر دوٹ کر اسی سرگرمی اور انہماک سے وہی خدمت سرانجام دینا ہے۔ جس سے اس کا تشخص قائم ہوا تھا
اور جس کے سبب وہ اردو ادب میں معتبر بنا تھا۔
مشرق وسطیٰ یورپ امریکہ اور کینیڈا میں اردو افسانہ نگار اور اس کے قاری دونوں اپنی نئی بستیاں بسا چکے ہیں اور چونکہ دنیا سمٹ
کر ایک گلوبل ولیج بن چکی ہے۔ لہٰذا اردو افسانے کو نئی سمت کے تعین تک کئی جہتیں مل چکی ہیں اور اس کا فکری کینوس وسیع سے وسیع تر ہو رہا ہے امید
کی جا سکتی ہے کہ ان نئی بستیوں کے مکین اردو افسانے کو کئی اعتبار سے مالا مال کریں گے۔

*

بقیہ صفحہ ۹ نثری نظم کا مسئلہ

لیے ہمیں کسی نے کسی باب الافکار تک لے جانا چاہتے ہیں۔ خود کچھ سوچ رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ سوچ بچار کے اس سلسلے میں ان کے ساتھ
ہم بھی اپنے عہد اور اسلوب تشکیل کے ساتھ شامل ہوں۔ اس عہد کی نثری نظموں کے لہجے اور آہنگ تک میں تفکر کے آثار دیکھے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ یہاں
بات بھی کہی جا سکتی ہے۔ کہ نثری نظم ایک نئے تخلیقی کلچر کا خاکہ ترتیب دے رہی ہے۔ اور اس کلچر کی اساس جس شعریات کے اصولوں پر قائم
کی وہ یہی جنگ عظیم کے بعد کی شاعری میں صورت پذیر ہونے والی ہے۔ VEHICLE AESTHETICS یا TYPE-WRITER AESTHETICS
آگے کی چیز ہوگی یہ نظمیں ایک تخلیقی تجربے، بیان STATEMENT تنقیدے CRITIQUE یا صرف ایک سرگوشی اور خود کلامی کے
طور پر بھی پڑھی جا سکتی ہیں۔ اور ان کی جمالیاتی حیثیت اور تخلیقی معنویت کو متعین کرنے کے لئے ہمیں ایک نیا منشور مرتب کرنا ہوگا۔ ہمیں یہ بھی سوچنا
ہوگا کہ ان نظموں کے واسطے سے جذبات کا یا تصورات کا جو مرکب سامنے آیا ہے۔ زمانے کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ اس میں بھی تبدیلی آئی ہے اور
نظموں کے روایتی مرکبات کی بنیاد پر ہم ان کے اچھے یا برے ہونے کا فیصلہ نہیں کر سکتے۔ ہر نظم کی طرح ان نظموں میں بھی ایک مرکزی جذبے کے
ساتھ بہت سے ذیلی جذبے سرگرم اظہار ہیں۔ اور ایک مرکزی ارادے (رسمی اصطلاح کے مطابق منشائے مصنف) کے ساتھ ایک نئے آہنگ،
نئے میلانات طبع اور ماحول کے عناصر بھی شامل ہیں۔ انہیں سمجھے بغیر ہم نظم کا تیا پانچہ (اصطلاحاً DECONSTRUCTION) تو کر سکتے ہیں نظم
کے مفہوم تک شاید نہیں پہنچ سکتے۔

*

غیاث متین

اغذوں کے ٹکڑوں سے آئینہ بناتے ہیں
م ہیں کیسے دیوانے کیا سے کیا بناتے ہیں

ہ عصائے موسیٰ تھا، یہ قلم ہمارا ہے
س سے ہم بھی پانی میں راستہ بناتے ہیں

ب ہماری بستی کا حشر بھی وہی ہوگا
ب ہمارے بچے بھی زائچہ بناتے ہیں

آنکھ، خواب، تنہائی، دھوپ، ریت، سناٹا
ن پرانی اینٹوں سے گھر نیا بناتے ہیں

ہم اداس موسم کے آخری پرندے ہیں
برف زار پر اپنے نقشِ پا بناتے ہیں

تلیوں کے پر جیسے خواب ہیں متین اپنے
اتھ میں نہیں آتے، سلسلہ بناتے ہیں

● ۳/۵۳۶۔۸۔۱۶، نیو ملک پیٹھ، حیدر آباد ۵۰۰۰۳۶

مختار شمیم

گفتگو میں آپ کی اک مصلحت کا رنگ بھی
ہے پسِ آئینہ یوں تو آئینہ کا زنگ بھی

یہ بھی سچ ہے معرکہ میں قتل ہوتا ہے مجھے
سچ تو یہ ہے ظالمو! ہارے ہو مجھ سے جنگ بھی

نقش لاحاصل ہے اپنی زندگی یوں ہی سہی
کون کہتا ہے کہ ہے دشتِ تمنا تنگ بھی

چاہتوں میں رنجشیں بھی ہیں کہیں طرفہ مزاج
پھول قدموں میں بچھائے اور پھینکے سنگ بھی

شعر میں خود کو چھپانے کا ہنر بھی دیکھنا
دیکھنا مختار اپنی شاعری کا رنگ بھی

● ایف ۲۔ گورنمنٹ گرلس پوسٹ گریجویٹ کالج کیمپس، اندور

شاہد کلیم

کوئی موسم رہے میرے گھر میں ہمیشہ فضا ایک سی
آئینے تو بہت ہیں مگر پرتوِ آئینہ ایک سا

میری ہر رہگزر تری ہی راہ سے متصل ہو گئی
تیرے گھر کے لئے کتنی سمتیں مگر راستہ ایک سا

آہنی بیڑیاں ہوں کہ کنگنے کی زنجیر ہو پاؤں میں
وقت کے ساز پر دیکھ پھر سے سکت دل کی صدا ایک سی

میں بھی کھو جاؤں گا تو بھی کھو جائے گا دھند میں ایک دن
فرق میرے ترے درمیاں ہے مگر سلسلہ ایک سا

اس کی مرضی ہے تو مجھ کو مصلوب ہونا ہے ہر حال میں
جرم کوئی بھی ہو میرے ہر جرم کی اب سزا ایک سی

لوگ جائیں کہاں لوگ ڈھونڈیں کہاں کوئی جائے اماں
شہر کیا دشت کیا ہر جگہ ہر طرف اب ہوا ایک سی

عمر لمبی ملے، کامراں بھی رہو، شادماں بھی کلیم
صرف الفاظ ہیں مختلف ورنہ سب کی دعا ایک سی

● دودھ کٹورہ، آرہ ۔ ۸۰۲۳۰۱ (بہار)

غضنفر
اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سنٹر، اے۔ ایں۔ مدن موہن مالویہ مارگ، لکھنؤ

بھیڑ چال

"پاپا۔ پاپا کوئی کہانی سنائیے نا۔"

"اچھا سنو! ایک راجہ تھا۔ اس کی ایک رانی....."

"یہ کیا پاپا! دادی اماں کی طرح آپ بھی وہی گھسی پٹی انسانوں کی کہانی لے کر بیٹھ گئے! کوئی نئی کہانی سنائیے! جانوروں کی کہانی! جس میں شیر ہو، چیتے ہوں، بھیڑیا ہو۔"

"ہاں پاپا! ایسی ہی کوئی کہانی جس میں ایڈونچر ہو، سسپنس ہو، تھرل ہو!"

نئی کہانی کی فرمائش سن کر میں سوچ میں پڑ گیا۔ ذہن ایسی کسی کہانی کی تلاش میں بھٹکنے لگا۔ نگاہیں دور تک پہنچ گئیں۔

"کیا سوچ رہے ہیں، سنائیے نا!"

"ابھی سناتا ہوں۔ ذرا کہانی کو ٹھیک سے یاد تو کر لینے دو۔ ہاں سنو!"

بچے الرٹ ہو کر بیٹھ گئے۔

کسی جنگل میں بہت سارے جانور تھے۔ ان میں بھیڑیں بھی تھیں۔ بھیڑوں کے ریوڑ جنگل میں چاروں طرف جگہ جگہ بکھرے ہوئے تھے۔

ان بھیڑوں کو جنگل کے کچھ جانور پسند نہیں کرتے تھے اور ان کے خلاف دل میں میل بھی رکھتے تھے۔ ناپسند رکھنے اور میل رکھنے کی پہلی وجہ یہ تھی کہ جانوروں کے خیال میں بھیڑیں باہر سے آئی تھیں۔

"کیا سچ مچ بھیڑیں باہر سے آئی تھیں؟"

سنتے تو یہی ہیں کہ ان کے پرکھے باہر سے آئے تھے مگر انہوں نے جنگل کو اپنا گھر بنا لیا تھا۔ بہت سی بھیڑوں کو تو اس بات کا پتہ بھی نہیں تھا۔

نفرت کرنے کی دوسری وجہ یہ تھی کہ بھیڑیں بچے بہت پیدا کرتی تھیں۔ جنگل میں جگہ جگہ ان کے ریوڑوں کے پھیلے رہنے سے ان جانوروں کو چلنے پھرنے اور بھاگنے دوڑنے میں دقت ہوتی تھی۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ بھیڑوں کا رہن سہن اور کھانا پینا ان جانوروں سے الگ ڈھنگ کا تھا۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جنگل کا راجہ شیر بھیڑوں پر مہربان تھا۔ اور بات تھی کہ شیر کی مہربانیاں زیادہ تر ان چند بھیڑوں تک ہی محدود تھیں جن کے بال زیادہ سفید اور کافی گھنے تھے۔

بھیڑوں کی بہت بڑی تعداد تو ایسی تھی کہ جن کے بدن پر بال نہیں تھے اور جن پر تھے بھی وہ کالے دھبے سے اور بچے کھچے تھے اور ان کے پیٹوں میں بڑے بڑے گڈھے بھی تھے۔

"گڈھے کیوں تھے پاپا؟"

"اس لیے کہ پیٹ بھر چارہ نہ ملنے سے وہ خالی ہو کر گڈھے بن گئے تھے۔"

"اوہ! ۔۔ اور چارہ کیوں نہیں ملتا تھا؟"

"پیٹ بھر چارہ انہیں اس لیے نہیں ملتا تھا کہ جنگل کی بہت سی چراگاہوں میں انہیں گھسنے نہیں دیا جاتا تھا۔"

"بیٹا! تم سوال بہت کرتی ہو! کہانی سننے دو! آگے کیا ہوا پاپا؟"

بھیڑوں سے نفرت کرنے والے جانور شیر سے بھی جلتے تھے۔ شیر سے ان کی دشمنی کی وجہ یہ تھی کہ وہ جنگل کا خیال کم اور اپنا زیادہ کرتا تھا۔ اس کی من مانی بھی دن بدن بڑھتی جا رہی تھی۔

شیر سے جلنے والے ہمیشہ شیر کو نیچا دکھانے کی تاک میں لگے رہتے تھے مگر کامیابی نہ ملنے پر اپنا غصہ بھیڑوں پر اتارتے تھے۔ کبھی بھیڑوں کے بچے پکڑے جاتے۔ کبھی بوڑھوں کو مار گراتے اور کبھی کبھی ریوڑوں پر حملہ بول کر انہیں اتنا دوڑاتے کہ بہت سی بھیڑیں آپس میں ٹکرا ٹکرا کر کچل جاتیں۔

شیر سے ان کی دشمنی بڑھتی گئی۔ اور اس حد تک بڑھ گئی کہ انہوں نے ایک دن شیر کے خلاف جنگل کے بہت سے جانوروں کو ایک پیڑ کے نیچے جمع کر لیا۔ اور نہایت ہی اثردار اور غصے سے بھری آواز میں کہا۔

"شیر کی من مانی برداشت سے باہر ہوتی جا رہی ہے۔ ہمیں اس کے خلاف مل جل کر کچھ کرنا چاہیے۔ یوں بھی اس جنگل پر اس کو راج کرتے بہت

کافی عرصہ ہو چکا ہے۔ اب کسی دوسرے کو موقع ملنا چاہیئے۔

پھر کیا ہوا؟

پھر یہ ہوا کہ آپس میں مشورہ کرکے ان میں سے کچھ جانور شیر کے پاس گئے۔ اور نہایت نرم ہوتے ہوئے گمبھیر لہجے میں شیر سے کہا ہمیں آپ پر بھروسہ نہیں رہا۔ اب ہم اپنا راجہ کسی اور کو بنانا چاہتے ہیں۔

شیر نے ضبط اور صبر کے ساتھ ان کی بات سن کر پوچھا۔

کیا یہ جنگل کے سبھی جانوروں کی رائے ہے؟

جانوروں نے زور دے کر جواب دیا۔

ان جنگل کے سبھی جانور چاہتے ہیں کہ ان کا راجہ اب کسی دوسرے کو بنایا جائے۔

ان کا جواب سن کر ـــــ شیر بڑی نرمی سے اطمینان بھرے لہجے میں بولا۔

"مگر میری جانکاری کے مطابق سبھی جانور ایسا نہیں چاہتے۔ پھر بھی میں اس کے لئے تیار ہوں کہ آپ اپنا راجہ کسی اور کو چن سکتے ہیں شرط صرف یہ ہے کہ میدان جنگ میں میں بھی اتروں گا۔

جانوروں نے شیر کی شرط مان لی۔ اب یہ طے کرنا تھا کہ شیر کے مقابل میدان میں مقابلہ کس کو کیا جائے۔ جانوروں کی خواہش جاننے پر پتہ چلا کہ باگھ، بھیڑیا، تیندوا اور بھالو، سبھی راجہ بننا چاہتے ہیں۔ ایک ساتھ چاروں تو بن نہیں سکتے تھے۔ اس لئے فیصلہ یہ ہوا کہ چاروں ہی میدان میں اتریں جو جیت جائے گا اسے جنگل کا راجہ بنا دیا جائے گا۔

اس فیصلے کے بعد باگھ، تیندوا، بھیڑیا، اور بھالو، چاروں جنگل میں گھوم گھوم کر تمام چھوٹے بڑے جانوروں سے ملنے لگے۔

یہ چاروں امیدوار باری باری سے بھیڑوں کے پاس بھی پہنچے اور اپنے اپنے دانتوں کو چھپاتے ہوئے میٹھی آوازمیں بولے۔

ہم اگر راجہ ہو گئے تو تمہارے لئے جنگل کی ساری چراگاہیں کھول دیں گے۔ کوئی روک ٹوک نہیں ہوگی۔ ہمارے راج میں تم پر کوئی حملہ نہیں کرے گا۔

تمہارا ایک بچہ نہیں مارا جائے گا۔

بھیڑوں کے ریوڑ سے کچھ بھیڑیں اپنی گردن اچکا اچکا کر ان کی طرف دیکھنے لگیں۔

ادھر شیر نے بھی جنگل کے جانوروں کو اپنے پاس بلا بلا کر ان سے ملنا شروع کر دیا تھا۔ ایک دن اس نے زیادہ سفید اور کالی گھنے بالوں والی بھیڑوں کو بھی اپنے کچھار میں بلایا۔ اور دیکھنے والے کے کانوں میں کہا کہ جب وہ کچھار سے باہر نکلیں تو ان کی آنکھیں ستاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ پھر کیا ہوا؟

ایک دن جنگل کے سبھی جانور ایک بڑی سی وادی میں جمع ہوئے۔ راجہ بننے کی خواہش رکھنے والے شیر، باگھ، تیندوا، بھیڑیا، اور بھالو بھی ہجوم سے ہٹ کر پانچ کونوں پر کھڑے ہو گئے۔

ایک ایک کرکے جانور اپنے اپنے جھنڈ سے نکل نکل کر پانچوں کے پاس پہنچنے لگے۔ زیادہ سفید اور کالی گھنے بالوں والی بھیڑیں دو دو تک چلتے ہوئے اپنے ریوڑ سے نکل کر شیر کی طرف بڑھیں۔ ان کے پیچھے پیچھے چھدر چھدر کرتا ہوا بھیڑوں کا سارا ریوڑ بھی شیر کے پاس پہنچ گیا۔

شام تک جانوروں کا سارا ہجوم پانچ حصوں میں بٹ گیا۔ تو ان کی گنتی شروع ہوئی۔ شیر کے پاس جمع ہونے والے جانوروں کی تعداد سب سے زیادہ نکلی۔ شیر جیت گیا اور پھر سے جنگل کا راجہ بن بیٹھا۔

باگھ، تیندوا، بھیڑیا اور بھالو اپنی ہار سے بہت دکھی ہوئے اور شرمندہ بھی۔ ان سب نے اپنی ہار کا ذمہ دار بھیڑوں کو ٹھہرایا۔ باگھ اور بھیڑیا نے تو مارے غصے کے بھیڑوں کے ریوڑ پر جگہ جگہ حملے شروع کر دیئے۔

بدحواس ہوکر بھیڑیں شیر کے پاس پہنچیں۔ شیر نے ان کی آہ و زاری سن کر غراتے ہوئے اعلان کیا۔

"خبردار! اب اگر کسی نے ان پر حملہ کیا تو اس کا برا انجام ہوگا۔ مگر شیر کی غراہٹ کے باوجود حملے نہیں رکے۔

کچھ دنوں بعد تیندوا۔ اور بھالو ایک ساتھ مل کر بھیڑوں کے پاس گئے۔ اور بہت ہی اعتماد کے ساتھ ہمدردانہ انداز میں بولے۔

"گھبراؤ نہیں، ہم تمہاری حفاظت کریں گے ہم وعدہ کرتے ہیں کہ تمہارے واسطے ہم جنگل کی دوسری چراگاہیں بھی کھلوا دیں گے"

تیندوے اور بھالو کی نرم ملائم باتیں سن کر بھیڑیں جگالی کرنے لگیں جیسے ان کے سوکھے معدوں سے بہت ساری ہری ملائم پتیاں ان کے منہ میں آگئی ہوں۔ ان کے سر ہلنے لگے، پاؤں آگے پیچھے ہونے لگے۔

خرگوشوں کے ذریعہ شیر تک جب یہ خبر پہنچی تو گھبرا کر فوراً اس نے اپنی صلاح کار لومڑی کو طلب کیا۔ لومڑی نے اپنی آنکھیں نچا کر خبر کی گمبھیرتا سے شیر کو آگاہ کیا۔ شیر نے بنا دیر کئے اپنے ہاتھی درندے جنگل کے کونے کونے میں دوڑا دیئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے باگھ اور بھیڑیئے کے بہت سارے حامی پکڑ لئے گئے۔

... بھیڑیے، بھیڑیا اس حرکت سے جلا اٹھے اور شیر کو اس کی اس حرکت کا مزہ چکھانے کے لیے دونوں آپس میں مل گئے۔ دھیرے دھیرے انہوں نے اپنے ساتھ گیدڑ اور بندروں کو بھی ملا لیا۔

شیر سے مقابلے کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ سبھی جی جان سے جُٹ گئے۔ گیدڑوں کی باقاعدہ میٹنگیں ہونے لگیں۔ ہواں ہواں نکلنے لگا۔ دُور دراز کے گیدڑ بھی اس کورس میں شامل ہو گئے۔ گیدڑوں نے اپنی میٹنگوں سے بھیڑوں کو ڈرانا شروع کیا۔

بندر بھیڑوں کے ریوڑوں کے آس پاس کے پیڑوں پر چڑھ کر دانت کچکچانے لگے۔ قلابازیاں کھانے کے بہانے بھیڑوں کی پیٹھوں پر دھم دھم کودنے لگے۔ باگھ اور بھیڑیئے نے بھی اپنے حملے تیز کر دیئے۔

بھیڑیں اوپر نیچے دائیں بائیں چاروں طرف سے پریشان ہونے لگیں۔ جگہ جگہ ان کے بچے کچلے جانے لگے۔ بوڑھی بھیڑیں اپنی جانوں سے ہاتھ دھونے لگیں اور نوجوان بھیڑیں لنگڑانے لگیں۔

تنگ آ کر سفید اور گھنے بالوں والی بھیڑوں کے پیچھے بہت سی دوسری بھیڑیں بھی اپنی فریاد لے کر شیر کے کچھار میں پہنچیں۔ رو رو کر حال سنایا۔ خون رستے ہوئے زخم دکھائے اور درندوں سے اپنی حفاظت کے لئے شیر کے پیروں پر جھک کر ماتھے رگڑنے لگیں۔

شیر نے اپنے شیروں کو حکم دیا کہ وہ حملہ روکنے کا جتن کریں۔ مگر اس کے باوجود باگھ اور بھیڑیئے کے حملے نہیں رکے۔

بھیڑیں شیر سے ناامید اور مایوس ہو کر رحم طلب آنکھوں سے دوسری طرف دیکھنے لگیں۔ زیادہ سفید اور گھنے بالوں والی بھیڑیں بھی ں ان کے ساتھ ہو گئیں۔ یہ دیکھ کر بھیڑیں ان کی طرف دیکھنے لگیں۔ ں باگھ اور اس کے ساتھیوں نے حملے روک دیئے۔

بھیڑیں اطمینان کا سانس لینے لگیں مگر کچھ روز بعد اچانک ایک رات کی تنہائی میں ان پر پھر حملہ ہو گیا۔ اس حملے میں کافی ساری بھیڑیں مریں۔ بھیڑوں کے ریوڑ میں کہرام مچ گیا۔ ان کی چیخ و پکار سے سارا دہل اٹھا۔ ان کے غم میں شریک ہونے اور ان سے ہمدردی جتلانے کے کونے کونے سے جانور پہنچ گئے۔

اپنا سارا کام کاج چھوڑ کر جنگل کا راجہ شیر بھی ان کے پاس آ پہنچا۔ ان کی حالت دیکھتے ہی اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ شیر نے بھیڑوں کا حال پوچھا۔ آگے بڑھ کر ان کے زخموں پر مرہم رکھا۔ ی کے بول بول کر ڈھارس بندھائی۔ ہر طرح کا دلاسا دیا۔ اور اپنے کارندوں سے کہہ کر ان کے آگے ہری ہری گھاس کا ڈھیر لگا دیا۔ صرف یہی نہیں کہ شیر نے بھیڑوں کے غم میں آنسو بہائے۔ ان کے لئے مرہم پٹی اور چارہ پانی کا بندوبست کیا بلکہ ان کی تسلی کے لئے بہت سے گیدڑ بندر اور کچھ باگھ بھیڑیئے پکڑ کر بند کر دیئے۔

شیر کے آنسوؤں اور اس کی چارہ گری کے جذبوں سے بھیڑیں پسیج گئیں۔ شیر کے خلاف ان کے دلوں میں بیٹھا ہوا میل دھل گیا۔ اور وہ پھر سے ممنونیت کے ساتھ شیر کی طرف دیکھنے لگیں۔

"پھر کیا ہوا؟"

"جس رات بھیڑوں کے ریوڑ پر حملہ ہوا تھا اس رات کی نوجوان بھیڑیں جاگ رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں نے حملہ کرنے والوں کو پہچان لیا تھا۔ اس رات حملہ کرنے والوں میں باگھ، بھیڑیئے اور ان کے ساتھی نہیں تھے۔"

"حملہ کرنے والے پھر کون تھے؟"

"یہ نہیں بتاؤں گا۔ آخر سسپنس بھی تو چاہیے نا!"

"ہاں سسپنس تو چاہیے۔ آگے!"

ان نوجوان بھیڑوں نے جب دوسری نوجوان بھیڑوں کو یہ بتایا کہ اس رات ہم پر حملہ کرنے والے کون تھے تو ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل رہ گئیں۔ مگر بوڑھی بھیڑوں کو یقین نہیں آیا۔ خاص طور سے زیادہ سفید اور کافی گھنے بالوں والی بھیڑوں کو تو بالکل نہیں آیا۔

اس حادثے کے بعد نوجوان بھیڑوں کو شدت کے ساتھ یہ احساس ہو گیا کہ جنگل میں رہنا ہے تو اپنے بچاؤ کے لئے خود ہی کوئی راستہ ڈھونڈنا ہو گا۔ اور اس احساس کے ساتھ ہی وہ راستے کی تلاش میں پھرنے لگیں۔

ایک دن دو نوجوان بھیڑیں کسی بات پر آپس میں جھگڑ رہی تھیں اور ایک دوسرے کو ٹکریں مار رہی تھیں کہ اچانک انہیں اپنے جسموں پر پڑی چوٹ کی درد کی ٹیس سے محسوس ہوا کہ ان کے پاس تو کوئی بڑی کارآمد چیز موجود ہے۔ دونوں آپس کی لڑائی کو بھول کر ایک دوسرے کے سروں کی طرف دیکھنے لگیں۔ کچھ دیر بعد دونوں کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"ان کے سروں میں کیا تھا پاپا؟"

"سسپنس!"

"سوری پاپا۔ آگے؟"

ان دونوں نے پہلے نوجوان اور بعد میں بوڑھی بھیڑوں سے اپنے اپنے سروں کی طرف دیکھنے کو کہا۔ اپنے سروں کو دیکھ کر ان کی آنکھیں بھی

[باقی صفحہ [illegible] پہ دیکھیے]

خورشید اکبر

کب کسی ٹھہرے سمندر کو ہوا کھینچے گی
سطح پر تیرتی موجوں کو نوا سینچے گی

دو بدن درد کی لہروں پہ بھی مل سکتے ہیں
اس رسالت کو کہاں بادِ صبا کھینچے گی

روح کا زخم نہ بھر پائے گا گو تم پھر بھی
وہ پجارن اسی پتھر کو خدا کھینچے گی

وقت کافر کی خدائی ہے گنہگار بہت
ساری معصوم نمازوں کو قضا کھینچے گی

اس حویلی کی روایت ہی شریفانہ ہے
خود کو نیلام چڑھا کر بھی بجا سینچے گی

جانے کب آئے گا خورشید شادؔ میں
کب یہ تنہائی مجھے غارِ حرا کھینچے گی

● معرفت بک ایمپوریم، سبزی باغ پٹنہ - ۴ (بہار)

شکیل جمالی

ابھی کچھ دن قیامت اے خدا نئیں
ابھی جی کھول کر بندہ ہنسا نئیں

ہمارے ہی یقیں کا مسئلہ نئیں
کسی روشن ضمیروں کا پتہ نئیں

بچھڑ جانے میں سب کا فائدہ ہے
کہ اب رشتوں کے اندر کچھ بچا نئیں

صدائیں مرنے والے نے بہت دیں
کوئی ٹی - وی کے آگے سے ہٹا نئیں

شرافت سے گذرتی ہے ابھی تک
تمہارے بعد کیا ہوگا پتہ نئیں

کبھی جو بیس گھنٹے جاگتے تھے
اور اب یوں ہے کہ کوئی مشغلہ نئیں

کئی حملے ہوئے ہیں زندگی کے
مگر احساس زندہ ہے مرا نئیں

● جامع مسجد بازار، چاندپور - ۲۴۶۷۲۵ (یوپی)

عارف شفیق

◆

جب زباں کو تجربوں کا ذائقہ مل جائے گا
شاعرِ خوددار کو لہجہ نیا مل جائے گا

میں بھی پیاسا ہی کھڑا ہوں اب لبِ نہرِ فرات
میرے سینے میں بھی دشتِ کربلا مل جائے گا

پتھروں کے دیس میں تھا مجھکو تنہائی کا غم
کیا خبر تھی راستے میں آئینہ مل جائے گا

پوچھتے ہیں لوگ مجھ سے کیوں مرا نام و نسب
سوچ لیں پیغمبروں سے سلسلہ مل جائے گا

تم نے ہر اک راستے پر کیوں لگا رکھے ہیں بند
دیکھنا دریا چڑھا تو راستہ مل جائے گا

● بی - ۱/۳۵، بلاک - الکرم اسکوائر - کراچی

مظہر سلیم

سی - ۱۵ - ۱۱ کے مڑی چال، ڈی بی نگر ۱۱، بمبئی

آدم ہاؤسنگ سوسائٹی

میں جس گھر میں منتقل ہوا تھا وہاں پر مجھ سے پہلے آدم نام کا کوئی شخص رہتا تھا۔ جو ایک معمولی سیدھا، سادا، اور بھولا بھالا آدمی تھا۔ پولس کے ظلم اور جبر کی وجہ سے وہ اپنے محلے میں مشہور ہو گیا تھا اس کے چھوٹے سے فلیٹ پر اندھا دھند تلاشی کا عتاب نازل ہوا تھا۔ کھڑکیاں اور دروازے توڑ دیئے گئے تھے۔ وال کلاک کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے قرآنی آیت کی بے حرمتی کی گئی تھی۔ فرش اور دیواروں پر جگہ جگہ خون کے دھبے نظر آ رہے تھے۔ ساز و سامان بکھرا ہوا تھا۔ گودریج کی الماری کی شکل بگاڑ دی گئی تھی آدم کی تصویر والے فریم کی کرچیاں بکھری ہوئی تھیں۔ یہ سارا منظر دیکھ کر میری آنکھوں کے سامنے مسجد کی شہادت پر رونما ہونے والے فساد کی ویڈیو فلم چلنے لگی۔ اور ایک لمحہ کے لئے میں خوف سے گزر گیا۔

آدم کے چھوٹے بھائی رستم نے مجھے درمیان میں ہی روک دیا اور کہا مگر کہاں کھو گئے آپ! کیا سوچنے لگے۔ کیا کوئی خوفناک منظر یاد آ گیا۔

"پھر..."

نہیں۔ کچھ نہیں۔ بس یوں ہی۔

یہ لیجئے چابی۔ اور یہ سب ٹوٹا پھوٹا سامان میں لئے جا رہا ہوں۔ اب یہی آدم کی یادوں کا سرمایہ ہے۔ جاتے جاتے اس نے یہ بھی کہا کہ آپ جب تک چاہیں یہاں رہ سکتے ہیں۔ احمد بھائی دودھ والا نے آپ کو بھیجا ہے وہ آدم کے بہت اچھے دوست اور خیر خواہ تھے۔ ویسے بھی اب آدم اس دنیا میں نہیں رہا۔ اور میں یہاں آ کر رہ نہیں سکتا۔ آخر کب تک رہوں گا ایک دن تو مجھے یہاں سے جانا ہی ہو گا۔ رستم کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چشمے پھوٹ پڑے۔ میری بھی آنکھیں بھر آئیں۔

پھر میں نے کھڑکیاں اور دروازے درست کروائے۔ دیواروں پر سفیدی کروائی۔ فرش دھلوایا۔ فلیٹ کی صفائی کروانے کے بعد سب سے پہلے بزرگوں کے کہنے کے مطابق خیر و برکت کے لئے قرآن خوانی کروائی۔

جب میں یہاں باقاعدگی سے رہنے لگا تو پڑوسی بار بار ہمارے گھر میں آ کر دیکھتے۔ کوئی کھڑکی سے جھانک لیتا تو کوئی سرسری گزر جاتا۔ کوئی رک کر پوچھ لیتا کیا نئے کرایہ دار ہیں؟

ہاں نئے لوگ ہیں۔

کوئی اندر آ کر بے تکلفانہ انداز میں کہنے لگا۔ یہاں آدم رہتا تھا بڑا بھلا آدمی تھا۔ لیکن اب نہیں رہا۔ اس کا سب کچھ لٹ گیا۔ برباد ہو گیا۔ پولیس نے اس بے گناہ کے ساتھ بڑی زیادتی کی پہلے تو تلاشی کے نام پر اس کے فلیٹ کا نقشہ ہی بدل کر رکھ دیا گیا۔ اور بعد میں اسے گولیوں سے بھون دیا۔ آدم کی مخبری بھی کسی مسلمان نے ہی کی تھی۔ وہ بے چارہ تو صرف اتنا ہی کر رہا تھا کہ اس کالونی کے مکینوں کو فسادی جنونیوں سے بچا رہا تھا۔ وہ جب تک رہا۔ فوراً مسجد پر حملہ نہیں ہونے دیا۔ آدم کے قتل کے بعد دوبار مسجد پر حملہ ہوا۔ اور ایک دیوار بھی شہید ہو گئی۔

میں تو "پرتکشا نگر" سے صرف اسی لئے یہاں منتقل ہوا تھا کہ کم از کم محفوظ تو رہوں گا۔ مگر یہاں بھی ویسے ہی حالات ہیں۔ وہی پولیس۔ وہی فسادی اور وہی تلاشی کچھ بھی تو نہیں تبدیل ہوا تھا۔

اس درمیان مجھ سے ملنے کئی لوگ آئے اور ہر شخص آدم کے بارے میں کچھ نہ کچھ معلومات دے جاتا۔ کوئی تعریفوں کے پل باندھتا تو کوئی آدم کو بیرونی ثابت کرتا۔ کوئی اس سے ہمدردی ظاہر کرتا۔ تو کوئی اس کے قصے سنا جاتا۔ کوئی آدم کی تلوار کا قصہ لئے بیٹھتا۔ آدم جس تلوار سے مقابلہ کرتا تھا وہ تلوار اب پولیس کے قبضہ میں تھی۔

آدم کے واقعات اور بہادری کے قصے سن کر میں دھیرے دھیرے اس کے قریب پہنچ جاتا ہوں۔ اور مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے آدم سے میری پرانی شناسائی ہو۔ ہمارے یہاں آدم جیسے بہادر ایک اور صرف ایک ہی کیوں ہوتے ہیں۔ آدم بھی تنہا تھا بے چارہ شہید ہو گیا ملت کے لئے

دوسرے دن جب صبح میں اخبار پڑھنے کی غرض سے سکندر بھائی کے
گھر گیا تو اخبار میرے منتظر پروفیسر صاحب لے گئے تھے جو کسی کالج میں اردو
پڑھاتے تھے۔ سکندر بھائی مسکراتے ہوئے طنز سے کہنے لگے "اخبار عمارت کے
سبھی مکینوں کا سفر کرتا ہوا اگر اپنی اصلی حالت میں آجائے گا تو پڑھ لینا۔ آؤ
بیٹھو۔ جب تک ہم گپ شپ کرتے ہیں۔ ایک ایک پیالی ہو جائے۔" میں بیٹھ
گیا۔ اور بات شروع کی۔ "سکندر بھائی کیا سنجے دت بم دھماکہ مقدمے سے بری ہو
جائے گا۔ اور نردوش کہلائے گا" تو وہ میری بات کاٹتے ہوئے کہنے لگے۔
"آدم بھی نہیں مل پایا تھا" پھر وہ آدم کی زندگی کے اندھیرے راستوں کی طرف
چل پڑے اور بہت دور نکل گئے۔ میں بھی آدم کی ٹریجڈی کے متعلق دلچسپی
لینے لگا۔

سکندر بھائی نے کہا کہ آدم کو پناہ دینے کے جرم میں انہیں بھی پولیس
کے ظلم کے چابک سہنے پڑے۔ اور آئے دن تلاشی کے نام پر ان کے فلیٹ کا
نقشہ بگاڑ دیا جاتا رہا۔ تاقیامت کے ڈر سے خاموش رہنا پڑ گیا ہے۔ ایسا نہیں کہ آدم
کے دشمن صرف پولیس اور ترشول بردار ہی تھے بلکہ ایک دفعہ تو عمارت کے
سبھی بچے، جوان، عورتیں اور بوڑھے بھی اس کے دشمن ہو گئے تھے۔

جاتے ہوئے سکندر بھائی نے کرسی قریب کھسکا کر سرگوشیانہ انداز
میں کہا "پہلے تو آدم پر شک کیا گیا۔ پھر اس پر کڑی نظر رکھی گئی۔ اور ایک دن آدم
غیر فطری فعل کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں دھر لیا گیا۔ عمارت کے نوجوانوں نے
اس کی پٹائی کی۔ اس کا منہ کالا کیا گیا۔ اور پھر اس سے نفرت کا سلسلہ شروع
ہو گیا۔ محلے کے کچھ نوجوان اسے دیکھ کر سیٹی بجاتے، فقرے کستے۔ اور چھیڑ
چھاڑ کرتے۔ ان دنوں صرف میں نے ہی آدم کو انسانی ہمدردی کی نظر سے
دیکھا اور اس کا ساتھ دیا۔ تو عمارت کے لوگوں نے میرے خلاف بھی ایک
محاذ بنا لیا۔ مجھ کو بھی ذلیل کیا گیا۔"

سکندر بھائی اداس ہو گئے۔ وہ آدم کے بارے میں سوچ جاتے
تھے۔ انسانی رشتے سے وہ آدم کے مددگار اور ہمدرد تھے۔ اداسی کے بادل
چھٹے تو وہ کہنے لگے "اب ہمیں ترشول برداروں سے کہیں زیادہ خطرہ
تو اپنے لوگوں سے ہے۔ ان مسلمانوں نے آدم کو پہچانا نہیں۔ اس کی قدر نہیں
کی۔ اسے توجہ کا کم ہی سمجھتے رہے۔ وہ بڑا بہادر اور نڈر تھا۔ سیف الدین بھائی
کے ساتھ رہ کر بھی وہ ڈرپوک نہیں تھا۔ ہاں اس میں تھوڑی بہت برائیاں
تھیں۔ وہیں وہ بڑی خوبیوں کا مالک بھی تھا۔"

آدم کے بارے میں جتنا کچھ جان پایا تھا کہ وہ ہر جگہ مجھے دکھائی دینے
لگا۔ کبھی وہ میرے سامنے آجاتا۔ مجھ سے باتیں کرنے لگتا۔ کبھی مسکرا کر رہ جاتا۔
تو کبھی قہقہے لگاتا۔ اور کبھی اداس ہو جاتا۔ سکندر بھائی کی طرح کبھی ٹیرس
پر ٹہلنے لگتا۔ کبھی میرے کمرے میں آجاتا۔ میری بچی نغمہ کے ساتھ کھیلنے لگتا۔ اسے
گود میں اٹھا کر پیار کرتا۔ کبھی غریب نواز پان شاپ پر کھڑا جگالی کرتا رہتا۔ اور
کبھی موگرے کے گجرے سونگھتے ہوئے مسکراتا رہتا۔

میں ڈر گیا تھا۔ مجھے لگا آدم خوفزدہ کر رہا ہو۔ میں نے تو اس کا گھر کرایہ
پر لیا ہے۔ اور ڈپازٹ بھی دیا ہے۔ کوئی ناجائز قبضہ تو نہیں کیا۔ بلکہ اسی بہانے
اس گھر اور آدم کی حفاظت کر رہا ہوں۔ عمارت کے لوگوں نے شاید آدم کو گمنامی
کی اندھی قبر میں بہت گہرائی تک دفن کر دیا تھا۔ مجھے اب بھی یوں محسوس
ہوتا ہے کہ فضا میں بربریت اور انتقام کی بارود بکھری ہوئی ہے۔ اور وہ
بارود کسی عفریت کی طرح میرے تعاقب میں ہے۔

ابھی میں یہ سب سوچ ہی رہا تھا کہ ابو بکر بھائی دوڑتے ہوئے آئے
اور کہنے لگے "کیتی، دس منٹ پہلے ورلی پر سینا بھون کے سامنے ایک زبردست
بم دھماکہ ہوا۔ اور دادر ریلوے اسٹیشن پر دوسرا دھماکہ۔" شہر ایک بار پھر
تناؤ کی لپیٹ میں آگیا۔ بھگدڑ، افراتفری، اور خوف و ہراس نے شہر کا محاصرہ
کر لیا۔ شام ہوتے ہی خوفناک سناٹوں نے اپنے تیز ناخن شہر کی گردن میں
پیوست کر دیے۔ عمارت کے سبھی لوگ اپنے بچاؤ کی تدبیریں کرنے لگے
اور مورچے پر جم گئے۔ ٹیرس پر چہل پہل ہونے لگی۔ ہتھیار یہاں سے
وہاں تبدیل کیے جانے لگے۔ ٹیرس لائٹ لگا دی گئی۔ سبز جھنڈیاں چٹائیوں
پر چپک گئیں۔ تلواریں چمکنے لگیں اور فضا نعرۂ تکبیر سے گونجنے لگی۔

میں سیدھا سکندر بھائی کے گھر چلا گیا۔ مجھے خوب پتہ تھا کہ سکندر
بھائی ہی عمارت کے لوگوں کی صحیح رہنمائی کریں گے۔ کیونکہ وہ ایک
تجربہ کار شخص ہیں۔ سکندر بھائی کا گھر مقفل پاکر مجھ پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ
پڑا۔ پتہ چلا کہ وہ اپنے بیوی بچوں کو لے کر قریش نگر چلے گئے ہیں۔ یہ سن کر
اطمینان کے سورج کو بے چینی کا گہن لگ گیا۔ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں
اپنے آپ کو بچانے کے لیے۔ پرتکشا نگر سے تو "جے شری رام" کا نعرہ لگا کر
بھاگ نکلا تھا۔ ترشول برداروں نے مجھے اسی شہر میں پر حیرت دان دیکھا
مگر یہاں پر کیا ہوگا۔ اور کیسے ہوگا۔ اگر حملہ ہوا تو اس کے بعد گرفتاریاں
اور تلاشیاں۔ ان کے تصور ہی نے مجھے اندر سے لرزا دیا۔

عمارت کے نوجوان ٹیرس پر بیٹھ کر گپ شپ کر رہے تھے۔ اور
اپنے ہتھیاروں سے باخبر تھے۔ ہندوؤں کے محلے کی جانب نظریں لگائے
حملے کے منتظر تھے۔ دو چار روز بڑے قیامت خیز ہوں گے۔ میں بار بار ٹیرس
پر آتا ہوں۔ موسم دیکھ کر مجھے اطمینان تو ہوتا ہے مگر شک کی دیمک

مجھے کھوکھلا کیے جاتی ہیں کہ اگر حملہ ہوا تو کیا میں بچ پاؤں گا۔ اور کیا یہ ذہن
ناکامیاب ہو جائیں گے دفاع کرنے میں۔

نیند کا پرندہ آنکھوں کے گھونسلے سے اڑ چکا ہے اور رات کی شمع
دھیرے دھیرے پگھل رہی ہے میں کسی تتلی کی طرح بے چین یہاں سے
وہاں جا رہا ہوں بکھرا اور رات کے سناٹے میں نعروں کی آوازیں سن رہا ہوں
بارود کی بو فضا میں رچی ہوئی ہے۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے کوئی شخص
میرا تعاقب کر رہا ہے۔ میرے ساتھ ساتھ ہے آگے ہے پیچھے ہے۔ مگر کون ہے
میں جان نہیں پاتا ہوں۔ اچانک دروازے پر دستک ہوتی ہے۔ اتنی رات
گئے کون ہو سکتا ہے۔ میں گھبرا جاتا ہوں۔ مگر پھر سوچنے لگتا ہوں شاید پڑوس
کے بچے نوجوان پانی پینے آئے ہوں گے یا پھر سکندر بھائی۔ نہیں وہ تو رشتہ
گھر گئے ہوئے ہیں۔ اسی کشمکش میں گھبرائے ہوئے دروازہ کھولتا ہوں۔
تو حیرت و خوف سے میرے اندر سے ایک چیخ ابھرتی ہے خون میں لت پت
اجنبی شخص کو دیکھ کر میں حواس باختہ ہو جاتا ہوں۔ اس کے ہاتھ میں ایک
ننگی تلوار ہے جو اندھیرے میں چمک رہی ہے۔ میں اپنے حواس یکجا کر کے
اس اجنبی شخص سے دریافت کرتا ہوں کون ہیں آپ؟ کس نے آپ کی
یہ حالت؟ اندر یہاں کیوں؟ میری بات ختم کر سکنے کی وہ بہت زیادہ زخمی
ہے اس کے جسم کے ہر حصے سے خون بہہ رہا ہے۔ اسے دیکھ کر میرے ذہن
کی گلیوں میں یادوں کا اسٹیج سجنے لگا۔ زخمی ہونٹ پھڑپھڑائے۔ یہ
گھر میرا ہے میں آدم ہوں اور یہ میری تلوار ہے اسے لو سنبھالو اسے۔

کھڑاک۔ کھڑاک۔ کھڑاک۔ ذہن کی گلیوں میں ساتھ تیز ہو گیا خون
میری رگوں میں تیز تیز دوڑنے لگا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ پاتا۔ وہ مجھے
تلوار تھما کر غائب ہو گیا۔ اور میں شش و پنج کے بحران میں مبتلا آدم کے
بارے میں مسلسل سوچ رہا ہوں کہ آخر یہ آدم اچانک کہاں سے آ گیا۔ اب
میرا یقین پختہ ہو گیا تھا کہ اس گھر میں آسیب ہے آدم یہیں کہیں موجود ہے
اگر ہے تو کہاں ہے مجھے دکھائی کیوں نہیں دیتا۔ اور اس تلوار کا میں کیا کروں؟

میں واقعی ڈر گیا تھا۔ رات مجھ پر بھاری تھی۔ ایک بہت بڑا بوجھ تھا
میرے ذہن پر آدم کا تصور مجھے بے چین کیے ہوئے تھا۔ بڑی مشکلوں سے میں
نے رات کو دن کیا۔ اور صبح سویرے آدم کا یہ گھر چھوڑ کر بڑے بھائی کے
پاس اسلام پورہ چلا گیا۔ جہاں سبھی مسلمان پوری طرح محفوظ تھے۔ یا وہ ایسا
سمجھتے تھے کہ وہ وہاں محفوظ ہیں کیوں کہ اس علاقہ کو چھوٹا پاکستان کہا
جاتا تھا اور یہاں پر کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ نہ دھر پکڑ، نہ گرفتاریاں، نہ تلاشیاں
اور نہ کومبنگ آپریشن۔ بے عزتی اور خود کو محفوظ کرنے کا اور کوئی راستہ
بھی نہیں تھا۔ راستے تو بند کر دیے گئے تھے۔

کئی دنوں بعد جب حالات امن کی سانس لینے لگے تو میں واپس آ گیا
رحمت نگر کالونی میں خوش تھا کہ چلو خیر ہو گئی۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ گھر
کے لوگ مجھے حقارت اور نفرت سے دیکھ رہے تھے گھور رہے تھے۔ کچھ منہ
بنا رہے تھے کسی نے کچھ کہا نہیں میں نظریں جھکائے چپ چاپ گھر میں
چلا گیا۔ شام کے اندھیرے سائے دھیرے دھیرے بڑھ رہے تھے۔ اور مجھے ان
اندھیرے سایوں سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ تبھی چند نوجوان میرے گھر
آئے اور کہنے لگے۔ ابھی تھوڑی دیر بعد امن کمیٹی کی میٹنگ ہے۔ آپ کی
شرکت ضروری ہے۔ ان میں کچھ ہندو بھی دکھائی دیے میں نے حامی
بھرلی اور نیاز محمد سے سرگوشی کی۔ آخر ہوا کیا۔ حملہ ہوا تھا؟ ہم کامیاب ہوئے
.. طبلے کے بجنے کی آواز کانوں میں گونجنے لگی وہ بھی گنگنانے لگا
ہم ہوں گے کامیاب ایک دن۔
من میں ہے وشواس۔ پورا ہے وشواس۔ ایک دن۔
ہم ہوں گے کامیاب ایک دن۔۔۔ اُدھر۔۔۔ اُدھر ہے
نیاز محمد نے سوچ کے سلسلے کو توڑ دیا اور تعجب سے کہا۔
تم کو معلوم نہیں کیا اسے سب کرشمہ ہو رہا ہے۔ کرشمہ گر کیسے
آخر ہوا کیا میرے تجسس کے پر سے پھڑپھڑانے لگے۔ اب بتاؤ بھی مجھے
واقعی علم نہیں۔

دراصل بات تو یہ ہے کہ اس عمارت کے پیچھے جو مسجد ہے نا نورانی
مسجد۔ ہاں۔ اس مسجد پر ہندوؤں نے دو بار حملہ کیا ایک رات وہ تلواریں
کیروسین اور پیٹرول بم چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ اور جھگڑے میں پتے تو ترپ
اور اٹھ نہ سکے پھنسے تو بیار بھاگے۔ پولیس کو تو جلاب چالو ہو گیا۔
مگر ایسا کیا ہوا تھا کہ اچانک ______ بھگدڑ مچ گئی۔

نیاز محمد قریب آ کر بڑی آہستگی سے کہنے لگا۔ نورانی مسجد کے گیٹ پر
ترشول دھاریوں کو کوئی لمبا تڑنگا آدمی ننگی تلوار لیے دکھائی دیا جو سفید
جبہ پہنے ہوئے تھا۔ اور جس کی سفید داڑھی سینے تک پھیلی ہوئی تھی ایک
دم لمبا تڑنگا آدمی۔ وہ لوگ ایسا چیخ رہے تھے جیسے واسطے تو وہ مانڈولی
کرنے آ گئے ہیں۔!! ایک اور بات آج رات ٹی وی پے سب کی کارگزاری سے کالونی
کا نام جل کر آدم کو آپریشن ہاؤسنگ سوسائٹی رکھا جا رہا ہے۔ چلو تم آؤ
ذرا دیکھو۔ انسپکٹر کا ٹیلی گرام آنے والا ہے۔ صبح اُدھر گھمائیں گے
کالونی کے نئے بورڈ کا۔!!

میں دروازہ بند کر کے اندر چلا جاتا ہوں۔ رات کی شمع دھیرے
[باقی صفحہ ۳ پر دیکھیے]

کاشی ناتھ امبلگے

تصویریں

تصویریں کتنی بے شمار
آتی ہیں سامنے میرے بار بار
ایک کے پیچھے ایک دوڑتی ہوئیں
مجھ سے مخاطب ہونے کے لئے
یہ میں تو میں تو، کرتی رہتی ہیں
ذہن ماؤف کر جاتی ہیں۔
ایک ایک کو پاس بٹھا کر
پرانی باتیں چھیڑنے کی کوشش کرتا ہوں
تو وہ اور بھی بے عکس ہو جاتی ہیں۔
انہیں پہچانوں تو کیسے پہچانوں
کہ وہ نئے نئے مکھوٹے پہنے جاتی ہیں۔
پیاز کے چھلکوں کی طرح
ان کو چھیلتے جاتا ہوں
تو پاتا ہوں کہ ان میں
سمندر اور سیہہ ہے
اور ان میں رام بھی میں ہی ہوں
اور رحیم بھی میں ہی ہوں

کامیاب شاعر

میں ایک کامیاب شاعر ہوں
اس لئے مجھے اپنے لوگوں سے
ملنے جلنے کی فرصت نہیں ملتی
میں گھر میں کہیں ہوتا ہوں
میں اب صرف آکاشوانی میں رہتا ہوں
دوردرشن میں رہتا ہوں
نہیں۔
ایک کامیاب شاعر ہوں
اس لئے کبھی کبھار گھر میں ہوتا ہوں
تو ادھر کچھ دنوں سے
کناٹ پلیس کے بنگلے میں
مہانگر پالیکا کی گیٹ کے سائے میں
وسیع کمروں میں بند ہوں
تب بھی میرے گاؤں کی ہوا
جھرنے، ندی، باؤلی سے ہوتے ہوئے
گیہوں کی دودھ بھری بالی سے
گزرتے ہوئے میرے پاس آتی ہے
بے وقوف گورکھا اسے بھی
روکنے کی کوشش کرتا ہے
ہوا رکے گی کب
مجھے ہوا کی یہی تو بات اچھی لگتی ہے
کہ اسے کوئی روک نہیں سکتا

آسمان

میں ایک پتنگ ہوں
مجھ پر بڑی بڑی آنکھیں
بنا لی گئی ہیں
میری دم بہت لمبی ہے
میں وسیع آسمان میں اڑتا ہوں
سورج سے آنکھ ملانے کی کوشش کرتا ہوں
چاند سے بات چیت کرتا ہوں
ستاروں سے کھیلتا ہوں
لیکن۔
میں ہمیشہ سے جانتا ہوں
کہ میری ڈور اس دھرتی کے
کسی بالک کے ہاتھ میں ہے
میں ایک پنچھی ہوں
آسمان کی اونچائی کو ناپتا ہوں
سارا سمندر پار کرتا ہوں
برفیلے پہاڑوں کو پل بھر میں پیچھے چھوڑتا ہوں
ریگستانوں کی پرواہ نہیں کرتا
بادلوں کو چیرتا جاتا ہوں
لیکن۔
میں ہمیشہ سے جانتا ہوں
کہ مجھے دانہ چگنے کے لئے
اس دھرتی پر آنا ہے

ترجمہ: اکرام باگ

● صدر شعبۂ اردو، ایس ایس کے بی کالج باسو اکلیان۔ ۵۸۵۳۲۷ (کرناٹک)

ت

...ہے کہ
...یک دن مستقبل میں
...بچوں کی لغت میں
...ے لفظ کا اضافہ ہوگا
...لفظوں کا خزانہ
...تہائی مالا مال ہوگا
...یک لفظ
...بھی ہوگا
...کے دنوں میں
...بچے آنکھیں بند کر
...یاد کریں گے
...معنی پیار ہوتا ہے،
...معنی پیار ہوتا ہے،

ترجمہ: جاوید اقبال

روزنامہ جن ستا (ہندی) ایڈیٹر بسو ناتھ نریان ... بمبئی۔

البیر کامو

شہرہ آفاق اور نوبل انعام یافتہ ناول نگار البیر کامو کے آخری مگر نامکمل سوانحی ناول 'پہلا آدمی' LE PREMIER HOMME کی اشاعت نے فرانس اور کسی حد تک عالمی ادب میں بھی سنسنی کی ایک لہر پیدا کی ہے۔ اس کے ساتھ ہی کامو کے نظریات اور ان کے حوالے سے عالمی ادب میں مروّج چند نظریات پر بحث کے نئے دروازے بھی کھل گئے ہیں۔

۱۹۵۷ء میں ادب کا نوبل انعام حاصل کرنے والے کامو ۴ جنوری ۱۹۶۰ء کو پیرس کے جنوبی علاقے میں کار کے ایک حادثے میں لقمۂ اجل ہونے تک عالمی شہرت کے حامل بن چکے تھے۔ ۴۶ سال کی مختصر زندگی میں وہ دی اسٹرینجر THE STRANGER دی پلیگ THE PLAGUE جیسے ناول، ڈرامے CALIGULA اور فلسفیانہ مضامین کا مجموعہ[1] کی تخلیق کر چکے تھے۔ ان تخلیقات نے بیسویں صدی کے ادبی ماحول کو وضع کرنے اور اسے وسعت دینے میں اہم حصہ ادا کیا تھا۔ اس کا لب لباب یہ تھا کہ ہم اپنے تئیں ایک لایعنی دنیا میں بود و باش اور حرکت کے لئے موجود ہیں جس کی کوئی منطق یا وجہ معلوم نہیں ہے۔ ہم دوسروں کے واسطے جینے کے لئے بنے ہیں مگر ہماری موت صرف اپنے لئے ہوتی ہے۔ کامو نے اپنی تخلیقات میں جس زندگی کا عکس پیش کیا، خود ان کی زندگی بھی اسی نشیب و فراز اور لمحے سے دوچار رہی۔

کامو کی موت کے بعد جائے حادثہ پر ان کا کار ڈرائیور نما سیاہ بریف کیس ملا جس میں زیر تخلیق سوانحی ناول 'پہلا آدمی' کے مسودے کے ۱۴۴ صفحات بھی تھے۔ ۸۰ ہزار الفاظ پر مشتمل ہاتھ سے لکھا گیا یہ مواد دراصل ان کے سوانحی ناول کے پہلے حصے کا غیر نظر ثانی شدہ مسودہ تھا۔ کامو کی بیوہ فرینکین نے اس کی اشاعت کی تمام پیشکشوں کو مسترد کر دیا تھا۔ ۱۹۷۹ء میں ان کی موت کے بعد کامو کی وراثت کے ساتھ اس مسودے کی مالک ان کی بیٹی کیتھرین بنی۔ ۴۸ سالہ کیتھرین نے بالآخر اس مسودے کو منظر عام پر لانے کا فیصلہ کیا۔ تین سال لگا کر انہوں نے اپنے والد کی غیر واضح تحریر میں لکھے گئے مسودے کو صاف کیا۔ فرانس میں اپریل کے وسط میں اشاعت کے ساتھ ہی یہ تخلیق دلچسپی اور بحث کا موضوع بن گئی۔ اور یہ صورت حال ابھی جاری ہے۔

مختصر سے عرصے ہی میں اس کتاب کے سات سے زائد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ ایک لاکھ تیس ہزار سے زائد جلدیں بک چکی ہیں۔ بیس غیر ملکی ناشرین اس کے ترجمے کی اشاعت کے حقوق حاصل کرنے کے لئے کوشاں ہیں۔ اور عجب نہیں کہ ان سطروں کے لکھے جانے تک بعض ناشرین کامیاب بھی ہو چکے ہوں۔

اشاعت اور مقبولیت کی سطح پر اس حیرت انگیز کامیابی سے سب سے پہلا سوال یہ ابھرتا ہے کہ جس ادیب کی موت کو ۳۴ سال ہو چکے ہوں اس کی ایک تخلیق کے غیر نظر ثانی شدہ جزوی حصے کی ایسی پذیرائی کیوں؟ خود اسے منظر عام پر لانے والی کیتھرین حیرت زدہ ہے اور مانتی ہے کہ اس کے باپ زندہ ہوتے تو اس کی اشاعت کی اجازت ہرگز نہیں دیتے۔ مگر انہیں بنیادوں پر اس غیر معمولی کامیابی کے اسباب کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔ ایک شہرۂ آفاق ادیب کی داخلی زندگی میں بغیر استحقاق جھانکنے کے عمل سے کون باز رہ سکتا ہے؟ اس ادھورے سوانحی ناول میں کنفیوژن کا احساس ہے۔ ان تمام خصوصیات کے ساتھ جو کامو کی زندگی میں اشاعت پذیر ان کی تخلیقات میں موجود ہیں۔

۱۔ THE MYTH OF SISYPHUS

اب یہ کہنا مشکل ہے کہ کامو اپنی طرز تحریر میں کچھ تبدیلی لانا چاہتے تھے۔ یا وہ اس انداز میں دو آتشہ جولیا پنوناتی کے لئے زندہ
ہی رہے۔ بہر حال اس نامکمل سوانحی ناول کا ہیرو جیکوئس کورمری JACQUES CORMERY (کورمری کامو کی پردادی کا سرنیم) اپنے
خالق سے بالکل الگ نہیں ہے۔

دونوں کی پیدائش فرانس کی ایک کالونی الجیریا میں ہوئی۔ دونوں کی ماؤں کی تعلیمی صلاحیت حرف آشنائی تک محدود تھی دونوں
زیادہ گونگی تھیں۔ ناول کے مرکزی کردار کی طرح اس کے خالق کے والد انہیں ایک سال کا چھوڑ کر آنجہانی ہو گئے۔ دونوں کی موت پہلی
جنگ عظیم کے دوران ۱۹۱۴ء میں مارنے میں ہوئی۔

والد کی تلاش کے عنوان سے کتاب کے پہلے حصے میں شامل باب میں کامو کی ذات اور شخصیت کا ان گھڑ ہیجو سامنے آ جاتا ہے اور
احساسات کی عکاسی ملتی ہے جس کا کامو نے اپنی زندگی میں کبھی اظہار نہیں کیا۔ اس میں الجیریا سے 'کامو کے جیبن الجیریا سے اس کی گہری محبت
اور وارفتگی بھی منعکس ہوتی ہے۔ اور فرانس اور یورپ کے ان لوگوں کے لئے بھی یہی جذبہ ہے جو جنوبی افریقہ کے اس خطۂ زمین پر
بسے تھے۔ زمانۂ تخلیق میں جذبات و احساس بائیں بازو کے ادیبوں اور ان کے پیرکاروں اور نظریہ ساز ژاں پال سارتر کے لئے
قابل قبول نہیں تھے۔ الجیریا نوآبادیاتی نظام کے پنجے سے آزاد ہونے کے لئے جدوجہد کر رہا تھا۔

الجیریا میں ڈھائے گئے مظالم کی مذمت نے کامو کو دونوں خیموں کے عتاب کا نشانہ بنا دیا تھا۔ خاص طور پر سارتر اور ان کے حواریین
فریق وجودیت کے ان علمبرداروں کا جنہوں نے مارکسزم کے نظریے کے لئے لامحدود آزادی کی تھیوری میں اپنی جگہ بنالی تھی۔ ادھر
آزادی کے لئے الجیریا کی جدوجہد کامو کی موت کے دو سال بعد کامیاب ہوئی۔

ان نظریاتی پناہ گاہوں کے سائے میں آنے سے انکار نے کامو کو اس دور میں بیگانہ بنا دیا تھا۔ مگر ان خود ساختہ نظریاتی محلوں کے
زمین بوس ہونے کے اس دور میں کامو کی اس تخلیق کی اشاعت اور اس کی بے حد پذیرائی سے کامو کی نئے سرے سے تفہیم اور ان
کے مقام کے تعین کی راہیں روشن ہوئی ہیں۔

پیرس کے مشہور اخبار "لے موند" LE MONDE کے مبصر نے لکھا ہے "کیا ہم سیاسی اور تاریخی تعصبات کے بغیر کامو کو
نئے سرے سے دریافت کر سکتے ہیں۔ سچائی کی اس کی تلاش یہی ہے"۔

نقاد FRANCOUISE GIROUD نے لکھا ہے کامو کی آواز ایک ایسی گرم اور مسلسل آواز ہے جو بعض اوقات آپ کے
دل کو چھید ڈالتی ہے۔

رسالہ LE POINT میں JACQUES PIERRE AMETTE نے تبصرہ کیا ہے۔ کامو کی زبان، شائستہ اور
سب سے زیادہ تیز آواز آج کی نسل سے مخاطب ہے۔

"کیا ہم کامو کو نئے سرے سے دریافت کریں گے؟" اس پر ٹائم انٹرنیشنل میں پال گرے کا تبصرہ ہے: جواب ہاں میں ممکن
ہے۔ اور اس ادھورے سوانحی ناول کے تراجم کی اشاعت کے ساتھ ہی کامو کی فنی وسعتوں میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ ✱

MARGOT HORNBLOWER. (PARIS)

'TIME' MAY 16, 1994

بقیہ صفحہ ۳۵ آدم ہاؤسنگ سوسائٹی

وہ مچل رہا ہے۔ اور نیند کا پردہ آنکھوں سے کچھ فاصلے سے اٹھ چکا ہے۔
وہ سرشار بھری نگاہوں سے بار بار میری طرف دیکھے جا رہی ہے۔ گلاب
کی پنکھڑیوں کو محسوس کر رہی ہے اور کروٹیں بدل رہی ہے۔ میں
آہستہ بیوی کی طرف جھکتا ہوں۔ اس کے بدن کی آگ مجھے اپنی طرف
کھینچتی ہے۔ میں اس کی طرف لپکتا ہوں۔ اور اپنے سخت کھردرے ہاتھ اس
کی نرم پیٹھ پر رکھ دیتا ہوں۔ بس اسی وقت مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے میں
بالکل سرد ہو گیا ہوں۔ برف کے تودے میرے اندر کہیں پگھلنے لگتے ہیں۔
اور میں بیوی کے قریب ہی ڈھیر ہو جاتا ہوں۔ ✱

ہیرانند سوز

پہلے تو خواب ذہن میں تشکیل ہو گیا
پھر سیلِ وقت میں کہیں تحلیل ہو گیا

بے نور راستوں میں جو بھٹکے ہوئے تھے لوگ
جگنو بھی ان کے واسطے قندیل ہو گیا

وقتِ طلوع آیا گہن آفتاب پر
دن چڑھ رہا تھا رات میں تبدیل ہو گیا

لوحِ جبیں پہ وقت نے وہ حرف لکھ دیئے
چہرہ غمِ حیات کی تفصیل ہو گیا

اپنے گھروں کے ہو گئے آنگن لہو لہو
ہر شخص میرے شہر کا قابیل ہو گیا

تھا جس غنی کے پاس خزینۂ علم و فن
وہ عصرِ نو کے ہاتھ میں زنبیل ہو گیا

صد شکر سوز میرے خیالات کے لیے
میرا قلم وسیلۂ ترسیل ہو گیا

● ۲۷۱/۱ سیکٹر ۷، فرید آباد۔

مجید اختر

چمن میں کچھ تو اُجالے کا سلسلہ رکھیں
شبِ سیاہ کے ہاتھوں پہ اک دیا رکھیں

نہ جانے کون سے لمحے صبا کا جھونکا گزند
حصارِ جاں میں کوئی ایک در کھلا رکھیں

اگر نفاق ہی معیارِ دوستی ہے تو پھر
ریا کا نام بھی سب مل کے اب وفا رکھیں

یہ قرضِ روز و مہ و سال آج چکا لیں
اسے بھی کیوں کسی کل کے لئے اُٹھا رکھیں

عذابِ آب و دانہ مقدر تو کیا ضروری تھا
تلاشِ نانِ جویں میں بھی مبتلا رکھیں

جو دل کے زخم سے روشن حریمِ جاں ہے تو پھر
یہ اہتمام کریں زخم کو ہرا رکھیں

بگڑنا اور سنورنا ہی گر کشش ہو
مثالِ کوزہ گراں جسم کی بنا رکھیں

● CONTRADE, INC
10395 SLUSHER DRIVE UNIT 2
SANTA FE SPRINGS
CA 90670

جمال اویسی

میرے مستقبل کی ضمانت لے گا کون
میں لمحہ ہوں مجھ کو امانت لے گا کون

دنیا اک دن ضائع کر دے گی مجھ کو
میں شاعر ہوں میری وراثت لے گا کون

میری پیٹھ پہ لکھی ہے غم کی تحریر
نم آنکھوں سے دل کی بشارت لے گا کون

میں نے اک نامہ لکھا ہے وقت کے نام
کیسے اس کو پوسٹ کروں خط لے گا کون

مہر و ماہ کی گردش میں اب لطف نہیں
لمحوں کی یورش سے لطافت لے گا کون

● محلہ فیض اللہ خان دربھنگا ۸۴۶۰۰۴

شاہین نقی

سب ایڈیٹر سعودی گزٹ، پوسٹ بکس نمبر ۶، ۵۵ جدہ (سعودی عرب)

ایک کمینے کی آرزو

مائیکل چاچا نے بندو خاں کو ایک زناٹے دار تھپڑ مارا۔ بندو خاں تلملا کر رہ گیا مگر کچھ بولا نہیں۔ تھپڑ کھا کھا کر وہ ڈھیٹ ہو چکا تھا۔ دن بھر میں یہ تیسرا تھپڑ تھا۔ مائیکل چاچا کا یہ معمول تھا کہ جتنی بار اس محلے میں آتا بندو خاں کو ایک تھپڑ رسید کرتا۔ آج اس کا محلے میں بار بار گذر ہو رہا تھا۔ شاید وہ فرصت میں تھا۔ لگتا تھا دوسرے محلوں میں آج سکون تھا۔ یا ممکن ہے اس محلے میں اس نے بغاوت کی کوئی بو سونگھ لی ہو۔ یا پھر ہو سکتا ہے بندو خاں کے سازشی ذہن میں پکنے والی کسی نئی کھچڑی کا پتہ مائیکل چاچا کے جاسوس دماغ کے رڈار نے دیا ہوگا۔ جو بھی ہو، آج وہ بار بار اس محلے کا بلکہ پورے علاقے کا راؤنڈ لے رہا تھا۔

اس کی آمد پر محلے کے لوگ بظاہر خوشی کا اظہار کرتے تھے کہ اتنا بڑا آدمی اُن کی طرف نظر کرم کئے ہوئے ہے۔ مگر اندر ہی اندر سارا محلہ خوف زدہ بھی رہتا۔ پتہ نہیں کیا سوچ کر آیا ہے۔ بے مقصد گھومنے کی فرصت اسے کہاں ہے۔ اس نے تو اپنے اوپر پورے شہر کا امن و امان برقرار رکھنے کی ذمہ داری لے رکھی ہے۔ اتنا بڑا شہر۔ بیسیوں علاقے۔ ہر علاقے میں بیسوں محلے ہر محلے میں الگ الگ طرح کے لوگ۔ ہر ایک کے الگ الگ طرح کے مسائل ہر ایک کا حال جانتا۔ ہر ایک کی چال پر نظر رکھتا۔ معاذ اللہ یہ کوئی کھیل نہیں۔ مگر مائیکل چاچا شہر کا بڑا تھا اور بڑا بن کر جینا چاہتا تھا۔

اس نے ہر علاقے اور ہر محلے میں بااثر اور گماشتے پال رکھے تھے جن کے ذریعہ وہ اپنی حکمرانی قائم رکھے ہوئے تھا۔ بندو خاں بھی اس کا ایسا ہی ایک گماشتہ تھا۔ اس کی ہی طرح کمینہ اور مکار۔ مگر اب وہ مائیکل چاچا کی نظروں سے گر چکا تھا۔ کبھی وہ مائیکل چاچا کے اشاروں پر اپنے محلے اور اپنے علاقے کے لوگوں کو ذلیل و خوار کیا کرتا تھا۔ اب وہ خود ستم زدہ تھا۔ اس کا ذمہ دار کچھ بہت حد تک وہ خود تھا۔ بات ہی کچھ ایسی تھی۔ گماشتہ کو گماشتہ ہی رہنا چاہیے تھا۔ بندو خاں اپنی حد کو پار کر گیا۔ اپنی طاقت کے نشے میں ایک ایسی حرکت کر گیا جس سے مائیکل چاچا کے کان کھڑے ہو گئے۔ ملکہ مائیکل چاچا کے دل کی بھی ملکہ تھی۔ بندو خاں نے ایک صبح اُسے اغوا کر لیا۔ ببانگ دہل۔ نہ صرف اُس کا محلہ بلکہ سارا شہر ششدر رہ گیا۔

مائیکل چاچا کے لئے یہ واقعہ سیتا ہرن سے کم نہ تھا۔ اُس نے اُسے بندو خاں کی بغاوت سے تعبیر کیا۔ شدید ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے چوبیس گھنٹے کے اندر اندر ملکہ کی رہائی کی مانگ کی۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ اغوا کی کاروائی کے لئے مائیکل چاچا نے ہی بندو خاں کو اکسایا تھا اور اب اس کو بہانہ بنا کر اُس کا سر کچلنا چاہتا تھا کیونکہ بندو خاں کی بڑھتی ہوئی طاقت سے وہ فکر مند ہونے لگا تھا۔ مائیکل چاچا کی یہ پرانی روش تھی۔ پہلے کسی کو خوب چڑھاتا۔ پھر جب اپنا اُلّو سیدھا ہو جاتا یا اس کی بڑھتی ہوئی طاقت سے خطرہ کی بو آنے لگتی تو اُسے ایسا پھنساتا کہ دوست دشمن سب اُس سے کنی کاٹنے لگتے۔ بندو خاں بھی ایسا ہی راندۂ درگاہ بن چکا تھا۔

کچھ اپنی دلیری اور کچھ مائیکل چاچا کی شہ پر اس نے اپنے محلے والوں پر وہ وہ ظلم ڈھائے تھے کہ لوگ بھولے نہیں بھولتے تھے۔ مگر کسی کی اُف کرنے کی مجال نہیں تھی۔ اُس کا محلہ امیروں کبیروں کا تھا۔ دولت کی ریل پیل تھی وہاں۔ پورے شہر کی نظر تھی اس محلے پر۔ ہر ایک محلے والوں سے دوستی چاہتا تھا۔ مائیکل چاچا کی عقابی نظریں بھی یہاں گڑی ہوئی تھیں۔ وہ محض دوستی سے مطمئن نہیں ہو سکتا تھا اُسے تو مکمل تسلط بھی چاہیے تھا محلے پر۔ تب بندو خاں معمولی غنڈہ ہوا کرتا تھا۔ بس اپنے ٹکڑ والوں سے ہفتہ وصول کر کے مطمئن ہو رہنے والا چھٹ بھیا۔ مائیکل چاچا نے اُسے اپنے دست شفقت سے نوازا اور وہ سر ابھارنے لگا۔ محلے والوں نے اسے اپنے لئے اعزاز تصور کیا کہ حاکم وقت نے اُن میں سے کسی کو اپنا خلیفہ مقرر کیا ہے۔ بندو خاں محلے والوں کا رہنما بن گیا۔ اس سے دوستی کا دم بھرنا [illegible]

مگر کہنے کی گیدنگی جانتے نہیں جاتی چاہے تھے جو بھی دور بدل ہوتے
ملکہ اس علاقے کی جان تھی۔ بے حد حسین اور بہت مالدار۔ اُس کے حسن اور
اس کی دولت کا چرچا ایک عالم میں تھا۔ ہر ایک اُس کے قرب کا خواہاں
رہتا۔ بندو خاں اس کا پڑوسی تھا۔ بڑے اچھے تعلقات تھے دونوں کے۔
ملکہ کے محل میں شہر کے تمام ذی حیثیت لوگوں سے تھے۔ اس کے یہاں ہر
شام محفلیں جمتیں جن میں شہر کی جانی مانی ہستیاں یکجا ہوتیں۔ کبھی کبھی
مائیکل چاچا بھی موجود رہتا۔ اس دن محفل کا رنگ نکھار اور بڑھ جاتا۔ ملکہ
میزبانی کے فرائض نبھانا خوب جانتی تھی۔ ہر مہمان کو اس کے رتبے اور منصب
کے مطابق عزت بخشتی۔ ملکوں میں اس کی توجہ سماجی حیثیت معتبر کرنے کا ذریعہ تھی۔

پڑوسی ہونے کے ناطے بندو خاں کا واسطہ ملکہ سے بہت زیادہ تھا
وہ اس کی دولت اور اُس کی شہرت سے بے حد مرعوب تھا۔ گو دولت
کی کمی بندو خاں کے پاس بھی نہیں تھی۔ اس نے بہتوں کا مال ہڑپ رکھا تھا
اور علاقے کو تحفظ فراہم کرنے کے نام پر کمزور دل رئیسوں سے موٹی موٹی رقمیں
وصول کرتا رہا تھا۔ دولت اور طاقت نے اُس کے عزائم کو ایک خطرناک
موڑ دیا۔ اس کے دل میں یہ خیال آیا کہ اگر ملکہ اس کے قبضے میں ہو تو سارا
شہر بشمول مائیکل چاچا اُس کا لوہا مانے گا اور اس طرح اُسے خود مختار
حیثیت بھی حاصل ہو جائے گی۔ چنانچہ ایک صبح اُس نے ملکہ کو پیغام بھیجا
کہ وہ اس کی زوجیت میں آ جائے۔ ملکہ کے لئے یہ حرکت غیر متوقع تھی۔
اس نے انتہائی حقارت سے اس تجویز کو مسترد کرتے ہوئے بندو خاں کو اس
کی اوقات یاد دلائی۔ بندو خاں کے لئے یہ وقار کا معاملہ تھا۔ اُس نے
اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا اور چہار دیواری پھلانگ گیا۔

یہ خبر شہر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ مائیکل چاچا
نے صرف شدید ردعمل کا اظہار کیا بلکہ بندو خاں کے خلاف زبردست حملہ
کر لیا اور ایک غیر معمولی لشکر لے کر اُس کے محلے کی طرف روانہ ہوا۔ وہاں
پہنچ کر اُس نے بندو خاں کے گھر کا محاصرہ کیا اور اعلان کیا کہ بندو خاں اگر
اب بھی اپنی حرکت سے باز آ جائے تو اُسے معافی مل سکتی ہے۔ مگر بندو خاں
نے سنی ان سنی کر دی۔

اعلان اور پھر جواب کے انتظار میں سارا دن بیت گیا مگر کوئی نتیجہ
نہیں نکلا۔ چنانچہ جب رات کی تاریکی نے سارے شہر کو اپنی آغوش میں
لے لیا تو مائیکل چاچا نے بندو خاں کے گھر پر پہلا نشانہ داغا۔ پھر دوسرا
نشانہ۔ پھر تیسرا۔ پھر چوتھا۔ پھر پانچواں۔ دیکھتے دیکھتے بندو خاں کا
گھر تباہ و برباد ہو کر رہ گیا۔ بندو خاں کے ہوش اڑ گئے اور وہ بھاگ
کھڑا ہوا۔ اب وہ مائیکل چاچا کے رحم و کرم پر تھا۔ وہ چاہتا تو کسی
وقت بندو خاں کا کام تمام کر سکتا تھا۔ مگر اس نے ایسا نہیں کیا کیونکہ
اب بندو خاں کی زندگی اُس کی آرزوؤں کی تکمیل کا ذریعہ تھی۔ بندو
خاں کی پسپائی نے مائیکل چاچا کے قد کو اچانک بہت اونچا کر دیا تھا
وہ اُس کی بے پناہ طاقت کا جیتا جاگتا ثبوت تھا۔ وہ ہر چھوٹی بڑی
طاقت کو ایک خاموش پیغام تھا کہ مائیکل چاچا کی حاکمیت کو قبول کیا جائے
رہے۔ بندو خاں کے توسط سے مائیکل چاچا کو نہ صرف اس علاقے پر بلکہ
پورے شہر پر مکمل تسلط حاصل ہو گیا تھا۔

اب صورت حال یہ ہے کہ بندو خاں اپنے گھر کے ملبے پر بیٹھا اونگھتا رہتا ہے
اور مائیکل چاچا کا یہ معمول ہے کہ جب بھی اُس کی راستے سے گزر ہو تو
ایک زناٹے دار تھپڑ رسید کرے ——— ہر تھپڑ پچھلے تھپڑ سے کرارا ہو۔ *

◆ بقیہ صفحہ ۳۰ بھیڑ چال ◆

چمک اٹھیں۔ سب اپنی رگوں میں ایک عجیب طرح کی راحت محسوس کرنے لگیں
مگر ایک دن ایک بوڑھی بھیڑ نے نوجوان بھیڑوں کو بلا کر کہا۔
- ہم نے اپنے سروں کو تو دیکھ لیا مگر جب تک ہم اپنے پیروں کو
نہیں دیکھیں گے تب تک ہم کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔

نوجوان بھیڑوں کی نگاہیں اپنے پیروں پر مرکوز ہو گئیں۔ دن رات
وہ پیروں پر محنت کرنے لگیں۔

جنگل میں راجہ کو ہٹانے کی ہر ایک بار پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔ جانور پھر سے
وادی میں جمع ہوئے۔ امیدوار کناروں پر کھڑے ہو گئے۔

اپنے اپنے جھنڈے تھام کر جانور امیدواروں کی طرف بڑھنے لگے۔ نیلا؟
سفید اور کالی گھنے بالوں والی بھیڑیں اپنے ریوڑ کی اگلی صف سے نکل
کر آگے بڑھیں اور کوئی بھی بھیڑ ان کے پیچھے نہیں گئی۔ یہ دیکھ تمام جانوروں
کی آنکھیں حیرت میں ڈوب گئیں۔ وادی پر سناٹا چھا گیا۔ ایک ایک جانور انہیں
آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔

تب اگلی صف سے ایک نوجوان بھیڑ گردن اٹھا کر سناٹے کو چیرتی ہوئی
بولی۔ "ہمیں اس طرح آپ کیوں دیکھ رہے ہیں۔ ہم کوئی اجنبی نہیں۔ بلکہ وہی
بھیڑیں ہیں جو برسوں سے اس جنگل میں رہ رہی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے
کہ اب ہم اپنی چال بھول چکے ہیں۔ اور ہمیں یہ احساس ہو گیا ہے کہ ہمارے
سروں پر دو نکیلے سینگ ہیں۔

تمام جانوروں کی نگاہیں ان کے پیروں اور سینگوں کی طرف اٹھ
گئیں۔ دور دور تک بھیڑیں فوجیوں کی طرح پاؤں کے بل اٹھا کھڑی تھیں۔ ●

افتخار امام صدیقی

خواب احساس

ی کبھی
لگ ہی
محسوس ہوتا ہے۔
گویا
ارے خواب
اطے
مجھ میں بکھر اپڑا ہے
مہ کے تمام خواب
بطے کا حصہ بننے والے ہیں
بھی کو تعبیریں مل جائیں گی۔
نے والے سارے خواب
یک دنیا بن جائیں گے۔

ن!
یہ خواب احساس
کو
کر دیتا ہے۔

دنیا کیسے حاصل ہو

میں!
اپنی ناک کے اگلے حصے پر
نگاہ جمانے کی کوشش میں
اب تک ناکام ہوں۔

نگاہ اور ناک
ناک اور سجدہ،
دنیا
یہیں کہیں ہے۔

لیکن!
کبھی نگاہ کے محور سے ناک
تو کبھی،
ناک کے کنارے سے سجدہ
کوئی بھی
ٹھیک زاویے پر نہیں بیٹھ رہا ہے۔

دنیا کیسے حاصل ہو؟

خدا اور میں

میں سوچ رہا ہوں
ان تین تاریک پردوں کے متعلق
جہاں!
شکل در شکل
میری تشکیل ہوئی تھی

میں جاننا چاہتا ہوں
موجود سے معلوم کی طرف
میری ترتیب و تدوین میں
ان تاریک پردوں نے
مجھ میں
کیا کیا سمو دیا تھا۔

پیٹ،
شکم،
اور میری تعمیر گاہ۔

خدا اور میرے درمیان
انہیں تاریک پردوں میں
کائناتی اسرار گم ہیں۔

کنواری آنکھیں

میں اپنی آنکھیں دیکھنا چاہتا ہوں
لیکن!
کبھی آئینہ درمیان میں آجاتا ہے
کبھی دنیا راہ میں آجاتی ہے
یہ اپنی آنکھیں!
اَن دیکھی ہی رہی جارہی ہیں۔

وہ آنکھیں!
جن میں میرے خالق کا عکس ہے
خالق کے آس پاس کی فضا،
وہاں کے سارے منظر
سارا احساس،
نور،
تہہ نور۔

ایک تجسس
مسلسل جستجو میں
اپنی آنکھوں کو دیکھ لینے کی خواہش۔

آنکھیں
مجھ میں
کنواری اور تنہا رہی جارہی ہیں۔

خلا، کرب

یہ جو تم
خیال لمس کو
فن اکائی بناتے ہو۔
مجموعی ذہنی گویائی کو
دل و داستان کرتے ہو
فن پارے میں
خدا کو جگہ دیتے ہو
اور سرشار ہو جاتے ہو۔

لیکن!
اس پورے عمل کے بعد
تم!
اپنی تخلیق گاہ میں
نامعلوم مدت کے لئے
بنجر ہو جاتے ہو۔

اس وقت
تمہارے کرب میں
کوئی سامع
قاری،
ناقد
کوئی تمہارا
بہت اپنا
شامل نہیں ہوتا

تب تم
کیا سوچتے ہو

اردو کا مستقبل کیا ہوگا

وادیٔ کشمیر کے معروف ادیب ابن اسمٰعیل کی تخلیقی اور تحقیقی کتابیں

شاہکار افسانے

"اُردو کے جدید افسانوی ادب میں یہ مجموعہ ایک اہم سنگ میل ثابت ہوگا۔ افسانوں کا یہ غیر معمولی گلدستہ اُردو کے افسانوی ادب میں ابن اسماعیل کو ایک بڑا مقام دلوانے کے لیے کافی ہے۔" [پروفیسر محمد حسین]

صفحات: ۲۰۰ [آفسیٹ پرنٹنگ] قیمت: ۳۵۰ روپے

زوال

انسان کے اندر کے زوال کی عبرت خیز داستان۔ نوبل انعام یافتہ ادیب البیر کامو کے شاہکار ناول THE FALL کا ترجمہ۔ فلسفۂ وجودیت کو سمجھنے کے لیے اس ناول کا مطالعہ لازمی ہے۔

صفحات: ۲۰۰ ✿ قیمت: ۱۰۰ روپے

اُردو طنز و مزاح احتساب و انتخاب

اردو طنز و مزاح کی تاریخ، تحقیق، تنقید اور انتخاب کا ایک مثالی کارنامہ۔ ایک ناگزیر کتاب

صفحات: ۴۵۰ [تیسرا ایڈیشن] قیمت: ۱۰۰ روپے

دوستوفسکی

اُردو میں پہلی بار عالمی ادب کے بڑے ادیب فیوڈر دوستوسکی کی حیات اور فن پر ایک تحقیقی اور تنقیدی کتاب۔

صفحات: ۴۰۰ ✿ قیمت: ۳۰۰ روپے

نوبل انعام یافتہ ادیب سولزینٹسن کے ناولوں کا تجزیاتی مطالعہ اُردو میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب۔

صفحات: ۳۱۰ ✿ قیمت: ۱۷۵ روپے

دستِ قضا

بنی اسرائیل کی تاریخ کا ایک خونی ورق۔ مشہور انگریزی ناول BELSHAZZAR کا ترجمہ

صفحات: ۴۰۰ [دوسرا ایڈیشن] قیمت: ۱۵۰ روپے

چراغ حرم

مرحوم ظفر علی خاں کی نظموں کا ایک خوبصورت انتخاب

صفحات: ۱۵۰ ✿ قیمت: ۶۰ روپے

رسائل ابن اسماعیل ✿ **ابن عربی اور فلسفۂ وجودیت**

شائع شدہ مذہبی رسائل کا انتخاب [زیر طبع]

ایک اہم فلسفیانہ نظریے کی تفہیم شیخ اکبر کے حوالے سے [جلد منظر عام پر آ رہا ہے]

رابطہ:
● گلشن پبلیشرز۔ گاؤکدل چوک، سرینگر (کشمیر)
● عمر بک سروس - نیا پل چھانکھن سوپور کشمیر ۱۹۳۲۰۱

..... ہمیں کسی نہ کسی طرح تقلید سے اجتہاد کی طرف بڑھنا چاہیے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہماری جماعت میں فاضل و عالم اور اربابِ کمال زیادہ سے زیادہ موجود ہیں۔ جب ان میں سے بعض کو عربی فنِ عروض پر کامل عبور حاصل ہے تو وہ اسی سے اردو عروض کی تخلیق بھی کر سکتے ہیں اور قواعدِ شاعری اپنی ہی زبان میں مرتب فرما سکتے ہیں۔ ایسے قواعد جو ہندوستان کے ہر طبقے میں بآسانی سمجھے جائیں۔ جن کے سمجھنے کے لئے ہمیں کسی دوسری زبان کا منت کش نہ ہونا پڑے، جو ہماری لسانی اور ماحولی ضرورتوں کے مطابق ہوں اور جن میں ایطا جیسی غیر ضروری قیود قطعاً نظر انداز کر دی جائیں۔

[۱۳ دسمبر ۱۹۳۰ء، دہرہ دون]

سیماب اکبر آبادی

مدیر

افتخار امام صدیقی

معاون

ناظر نعمان صدیقی

قیمت ۶ روپے

زرِ سالانہ ۶۰ روپے ◆ لائبریریوں سے ۷۵ روپے

تاعمر خریداری ۱۰۰۰ روپے ◆ معاونین سے ۱۰۰ روپے

ممالکِ غیر سے
۲۵ ڈالر — ۱۵ پونڈ

رفعت سروش کی کتابیں

اُردو کے مشہور و معروف شاعر اور ادیب گذشتہ ۵۵ سال سے مسلسل لکھ رہے ہیں ان کی کتابیں مکتبہ جامعہ، انجمن ترقی اردو اور دیگر اداروں کے علاوہ ہم نے بھی شائع کی ہیں بہت سی کتابیں اب دستیاب نہیں ہیں۔ جو اس وقت موجود ہیں حسبِ ذیل ہیں۔

قافلے

ہم عصر ادیبوں اور شاعروں پر تنقیدی اور تاثراتی مضامین
۱۹۹۴ ✿ ۱۰۰ روپے

اور بستی نہیں یہ دلّی ہے

[خود نوشت] اس کتاب میں رفعت سروش نے ۱۹۴۵ء سے ۱۹۹۳ء تک اپنے حالاتِ زندگی اور اپنے ماحول کو اس طرح پیش کیا ہے کہ اس دور کی ادبی ثقافتی تاریخ سامنے آجاتی ہے۔ اس کتاب میں آپ کی ملاقات سیکڑوں جانے انجانے کرداروں سے ہوتی ہے
۱۹۹۳ ✿ ۲۰۰ روپے

شعورِ آگہی

[منظوم ڈرامے] اوپیرا اور ڈانس ڈراموں کا مجموعہ۔
۱۹۹۳ ✿ ۱۰۰ روپے

شاخِ گل

[مجموعۂ کلام]
۱۹۹۴ ✿ ۷۵ روپے

ڈگر پنگھٹ کی

[ڈرامے] نثری ڈرامے جن میں حضرت امیر خسرو پر رفعت سروش کا مشہور ڈرامہ بھی شامل ہے۔
۱۹۹۱ ✿ ۶۰ روپے

کربِ تنہائی

[مجموعۂ کلام] وہ نظمیں اور غزلیں جو شاعر نے اپنی مرحومہ بیوی کی یاد میں کہیں۔
۱۹۹۰ ✿ ۵۰ روپے

یادوں کے چاند ستارے

[پاکستان کا سفرنامہ]
۱۹۹۰ ✿ ۲۰ روپے

غزل کے رنگ

رفعت سروش کی غزلوں کا انتخاب
۱۹۹۴ ✿ ۱۰۰ روپے

ریت کی دیواریں

ناول [دیوناگری رسم الخط میں]
۱۹۹۲ ✿ ۴۰ روپے

رفعت سروش شخصیت اور فن

[مرتبہ ڈاکٹر رضیہ حامد] جس میں ۶۵ قلم کاروں کے تاثرات و مضامین شامل ہیں۔
۱۹۹۱ ✿ ۱۰۰ روپے

رفعت سروش بحیثیت نثر نگار

[مرتبہ: ڈاکٹر رضیہ حامد]
۱۹۹۱ ✿ ۱۰۰ روپے

اوپیرا نگاری

[مرتبہ: ڈاکٹر رضیہ حامد]
۱۹۹۲ ✿ ۱۰۰ روپے

یہ سب کتابیں آپ ہم سے خریدیں۔ کتابوں کی پیشگی قیمت وصول ہونے پر ۲۵٪ کمیشن دیا جائے گا اور ڈاک خرچ بھی ادارہ برداشت کرے گا۔ عام طور پر ہم بذریعہ وی پی کتابیں نہیں بھیجتے

نوبلٹی کتاب گھر ۲۔ ڈی بلاک [illegible]

شہاب سرمدی ۶ جاذب نظر سنگیت
شمس الرحمٰن فاروقی ۱۴ شہریار کی نئی شاعری
شفق سوپوری ۲۶ موسیقی، جمالیات اور نفسیات

جوزف کیوں اکے ۴۱ وہ بھی سوہنیں پائیں گے
تابان لولیونگ ۴۱ غصہ
جونابس مبیٹی ۴۱ خوف کے چہرے
یوسف قاسم ۴۲ خالی پن
شیخ الے سکیری ۴۲ کچھ تو بولو
امینہ قاسم ۴۲ موت کی پیشین گوئی
کلف لیوا ۴۲ لاپا بو
لبان ایراپو ۴۳ احتیاط
ہنیری ماہلو ۴۳ تعمیر وطن
جبر ڈانگیرا ۴۳ بھوک

جمیل زبیری ۹ تاوان
اختر یوسف ۱۹ صبا نگر میں ایک آدمی
حسن جمال ۳۱ صرف جنس نہیں
نعیمہ ضیاء الدین ۳۶ بیسوا

محمد انصاری ۔ آشفتہ چنگیزی ۱۸
واجد قریشی ۔ صابر زاہد ۔ حسن شکیل مظہری ۲۴
ارمان نجمی ۔ ماہ طلعت زاہدی ۔ تنویر قاضی ۳۰
مرغوب علی ۔ سرفراز شاکر ۔ سعدیہ روشن صدیقی ۳۵

حکیم منظور ۱۳ غزل
افتخار نسیم ۱۳ غزل

کالیداس گپتا رضا ۸ ۵ ۔ غزلیں

عبدالقادر سروری ۵ [بنام] مسعود حسین خاں

ناظر حسینی ۴۴ کتب و رسائل کا تعارف اور تبصرہ

افتخار امام صدیقی ۴۵ خوب سیرت فن پارہ ۔ ایک روشن حسن کی

سرورق

آمد بہار ٭ شعر شبلی نعمانی

عمل

علام الہندی
[بنارس]

ساجد حمید ۔ کاوش عباسی ۔ کنور سین
قصیر الحق شیخ ۔ رام پرکاش کپور ۔ محمد اسلم
جمال جمیل ۔ خالد جاوید ۔ علیم اللہ حالی
عبدالمجید بٹ ۔ سعد ساجد ۔ کامران نجمی
سید علی رضا ۔ پریم کمار نظر ۔ یعقوب مرزا
احتشام اختر

۴۵

شمارہ ۔ ۹ [۱۹۹۴] جلد ۶۵

جمیل زبیری

بی ۱۳۲، بلاک ۔ ۱، گلشن اقبال ۔ کراچی (پاکستان)

تاوان

یوسف چیگل سے میری اب اچھی ملاقات ہو گئی تھی۔ وہ لوکل گورنمنٹ میں ملازم تھا اور بارسوخ آدمی تھا۔ اس کی وساطت سے مجھے تین کمروں کا ایک پختہ مکان کرایہ پر مل گیا تھا۔ میں نے کئی ماہ ایک کچے مکان میں بسر کئے تھے جہاں پانی اور بجلی کی سخت تکلیف تھی، اور کچا مکان ہونے کی وجہ سے میرا زیادہ تر وقت اسے صاف کرنے اور جھاڑ پونچھ کرنے میں گزر جاتا تھا۔

اس نئے پختہ مکان میں تین بڑے بڑے کمروں کے سامنے ایک بڑا سا برآمدہ تھا۔ آگے پیچھے دونوں طرف کافی بڑا صحن تھا۔ صحن کے اطراف باؤنڈری وال تھی۔ اور ایک جانب لوہے کا گیٹ لگا ہوا تھا۔

جب میں نے پہلی مرتبہ اس مکان کو اندر سے جاکر دیکھا تو میرا دل بیٹھ گیا۔ پورے صحن میں جگہ جگہ مٹی کے ڈھیر تھے۔ کہیں پتھر اور روڑے پڑے تھے۔ ان پتھروں پر چھ سات کتے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ ہمیں آتا دیکھ کر اٹھ کر باہر بھاگ گئے۔ مجھے خطرہ تھا کہ بھونکیں گے۔ یا شاید کاٹ بھی لیں مگر وہ کچھ زیادہ ہی سیدھے تھے۔ مکان کے پچھلے حصے کی حالت تو اور بھی زیادہ خراب تھی۔ جو لوگ پہلے اس مکان میں رہتے تھے وہ شاید صفائی کے لفظ ہی سے ناآشنا تھے۔ اس حصے میں بے شمار خالی ڈبے اور خالی شیشیاں ٹوٹے ہوئے برتن سگریٹ کے ڈبے اور پھٹے ہوئے کاغذوں کا ڈھیر تھا۔ گندہ پانی جس کے نکاس کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ ایک طرف جمع تھا۔ جس کے اطراف بڑی بڑی گھاس اگ آئی تھی اور مچھر پلنے ڈیرے جمائے تھے۔ مگر کمرے بڑے بڑے اور نسبتاً صاف تھے۔

بہر حال صفائی تو کرائی جا سکتی تھی۔ یہ سوچ کر میں نے وہ مکان لے لیا اور صفائی کی مہم فوراً شروع کر دی۔ سب سے بڑا کام ان کتوں کو وہاں سے بھگانا تھا۔ انہیں وہاں رہنے کی عادت پڑ گئی تھی۔

اگر گیٹ بند ہوتا تو وہ باؤنڈری وال پھلانگ کر اندر آجاتے پھر حال آہستہ آہستہ اس مشکل پر بھی قابو پا لیا۔

میرے اکیلے کے لئے یہ گھر کافی بڑا تھا۔ اس لئے میں نے سوچا کہ اپنے ساتھ دفتر کے کچھ اور لوگوں کو بھی رکھ لوں۔ وہ بھی دوسرے شہروں سے آئے ہوئے تھے۔ اور یہاں بے پناہ گرانی ہونے کی وجہ سے مجبوراً کچے مکانوں میں رہائش پذیر تھے۔ جب میں نے ان سے ذکر کیا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ چنانچہ ہم نے وہاں ایک ہوسٹل بنا لیا۔ اور کھانا پکانے کے لئے ایک باورچی رکھ لیا۔ اس باورچی کا نام اسد علی تھا۔ اسکو کھانا پکانا معمولی سا ہی آتا تھا مگر غنیمت تھا۔

مجھے اس شخص میں شروع ہی سے کچھ خاص بات نظر آتی تھی۔ وہ عام لوگوں سے قدرے مختلف تھا۔ تراش خراش میں، رہن سہن میں، اپنی سوچ اور گفتگو میں۔ وہ کبھی دو دو دن کا کھانا پکا کر رکھ دیتا تھا اور غائب ہو جاتا تھا۔ میں نے اس سے ایک آدھ مرتبہ پوچھا بھی مگر جواب میں وہ اپنے پورے بدنما دانت نکال کر ہنسنے لگتا تھا۔ یہ سوچ کر کہ شاید وہ کہیں دور اپنے گاؤں میں جاتا ہوگا۔ اس بات کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔

یہ مکان جس میں ہم اب شفٹ ہو گئے تھے چاروں طرف چھوٹے چھوٹے کچے مکانوں سے گھرا ہوا تھا۔ البتہ مغرب کی سمت ذرا فاصلے پر رنگا فران کا کلب تھا جو پختہ بنا ہوا تھا۔ ایک روز شام کو جب میں اس خیال سے باہر نکلا کہ کسی مالی کو تلاش کروں۔ شاید آس پاس ہی کوئی مل جائے۔ یا کوئی پڑوسی اس سلسلے میں میری مدد کرے۔ اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ ان مکانوں میں رہنے والے کوئی غریب لوگ نہ تھے۔ ہر گھر پر ٹی۔ وی کا انٹینا لگا ہوا تھا۔ اور جن مکانوں میں بجلی نہیں تھی۔ وہاں چھوٹے چھوٹے جنریٹر لگے تھے۔ جن سے وہ اپنے گھر کے لئے بجلی بھی مہیا کرتے تھے۔ اور وی سی آر پر فلمیں بھی دیکھتے تھے۔ وہ لوگ وی سی آر استعمال کرنے پر

اس لیے مجبور تھے کہ مکران میں کسی جگہ بھی شادی کی تقریبات دکھائی نہیں دیتی تھیں۔

اسی وقت ہمارے مکان کے سامنے والے گھر سے ایک نوجوان بھاگ دوڑ میں بڑھ کر اس سے ملا اور اپنا تعارف کرایا۔ اس نے اپنا نام محمود بتایا۔ وہ یہ جان کر خوش ہوا کہ میں اس کا پڑوسی تھا۔ اس نے مہمان نوازی کے ثبوت کے طور پر اپنے گھر سے جا کر چائے پینے کی دعوت دی۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ اور کہا کہ اس کی چائے قرض رہی۔ فی الحال تو مجھے مالی کے بارے میں معلومات کرنی تھی۔ ہم لوگ وہیں کھڑے باتیں کرتے رہے۔ وہ بہت جلدی بے تکلف ہو گیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کا سالا ہم زلف مسقط کی فوج میں بھرتی ہو کر چلا گیا ہے۔ اور وہ وہاں سے کافی رقم بھیج دیتا ہے جس سے ان کی گزر بسر اچھی طرح ہو جاتی ہے۔

جب میں نے اس سے پوچھا کہ وہ خود کیا کرتا ہے۔ تو اس نے مسکرا کر نظریں جھکا لیں اور کہنے لگا کہ آج کل تو کچھ نہیں کر رہا۔ اب کچھ کاروبار کرنے کا ارادہ ہے۔ اس نے ایک مالی بھیجنے کا وعدہ کیا جس کا نام اس نے صالح بتایا۔

اگلے روز شام کو مالی آ گیا۔ تنخواہ وغیرہ طے ہو گئی۔ اور اس نے اگلے ہی دن سے کام کرنے کی حامی بھر لی۔ چنانچہ وہ صبح سویرے ہی آ گیا۔ مگر وہ بڑا ہی باتونی تھا۔ جتنی دیر وہ کیاریاں بناتا یا پودے لگاتا وہ برابر بولتا رہتا تھا۔

وہ ہمارے گھر کے آس پاس رہنے والے تمام لوگوں سے واقف تھا۔ اس نے باری باری سب کے قصے سنائے اور اس دوران میں اس نے بتایا کہ محمود ویسے تو اچھا آدمی ہے۔ مگر کوئی کام نہیں کرتا۔ اور غصے کا بڑا تیز ہے۔ اس کی بیوی کا بھائی جو پیسے مسقط سے بھیجتا ہے۔ وہ بیوی سے زبردستی لے کر دوستوں میں اڑا دیتا ہے۔ اس معاملے میں بیوی سے اکثر جھگڑا رہتا ہے اس کی بیوی بڑی محنتی عورت ہے۔ حالانکہ اس کا ایک سال کا بچہ ہے مگر وہ سارا سارا دن گھر کا کام کاج کرتی رہتی ہے۔

وقت یوں ہی گزرتا رہا۔ مالی کے لگائے ہوئے پودے اب بڑے ہونے شروع ہو گئے تھے۔ پھر ایک شام جب میں دفتر سے گھر لوٹا تو دیکھا کہ سامنے والے مکان میں ایک کہرام مچا ہوا تھا۔ بہت سے لوگ جمع تھے۔ کسی عورت کے زور زور سے رونے پیٹنے اور چیخنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں ایک دم پریشان ہو گیا صالح بھی انہی لوگوں کے درمیان کھڑا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر قریب آیا اور اس نے بتایا کہ محمود کا سالا جو مسقط کی فوج میں ملازم تھا وہ فوت ہو گیا۔ محمود کی بیوی (یعنی اس کی بہن) کا برا حال ہے۔ وہ رو پیٹ رہی ہے۔ ظاہر ہے جوان بھائی کا غم کتنا بڑا ہوگا۔ صرف اتنا پتہ چل سکا کہ اسے دو چار روز بخار آیا تھا۔ اور اسی میں اس کا انتقال ہو گیا۔

مرنے والا مر جاتا ہے وقت کی رفتار جاری رہتی ہے۔ گھڑی کی سوئیاں گھومتی رہتی ہیں۔ دن ہفتوں، مہینوں، اور سالوں میں بدل جاتے ہیں۔ محمود چونکہ خود کوئی کام نہیں کرتا تھا اس لئے اس کے گھر کی حالت دن بدن خراب ہوتی گئی۔ ایک روز اس کی بیوی سے اس کا بہت جھگڑا ہوا۔ اس کے اگلے روز محمود گھر سے غائب ہو گیا۔ اسے ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی گئی پولیس میں بھی رپورٹ درج کرائی مگر اس کا کوئی نشان پتہ نہ مل سکا۔

اب اس کی بیوی کا کوئی ذریعہ آمدنی نہیں رہا تھا مگر اسے اپنا اور اپنے بچے کا پیٹ تو بہر حال پالنا تھا۔ صالح نے مجھے ایک روز بتایا کہ اس نے کسی دوسرے محلے میں ملازمت کر لی ہے۔ اور گھر پر بھی لوگوں کے کپڑے سیتی اور کاڑھتی ہے

اس بات کو اب چھ سال کا عرصہ گزر چکا تھا اس روز شام کو جب میں دفتر سے واپس لوٹا تو میں نے دیکھا کہ میرے گھر کے بالکل سامنے اور سامنے والے کچے مکانوں کے درمیان جو کھلا ہوا میدان تھا اس میں ایک جانب کچھ شامیانہ سا لگا ہوا تھا اور بہت سے لوگ ادھر ادھر دوڑ رہے تھے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ آج یہاں کوئی محفل ہونے والی ہے مجھے اور لوگوں نے بتایا کہ وہاں ایک بڑی محفل ہو رہی ہے۔ جس میں بلوچی کے کئی بڑے فنکار حصہ لینے والے ہیں۔

جب رات ذرا بھیگ گئی تو ہم لوگ بھی کھانے سے فارغ ہو کر باہر نکل آئے۔ فرش سے بنائی ہوئی چٹائیوں سے بنائے ہوئے اسٹیج پر کچھ گانے والے آ کر بیٹھ چکے تھے۔ کچھ کا انتظار ہو رہا تھا۔ مائیک پر اعلان ہو رہا تھا کہ آج کی محفل میں اہم گانے والے سبزل سامی اور مراد بخش ہیں جو آنے والے تھے۔ سازندے اپنے ساز ملا رہے تھے بینجو اور ڈھول کی ملی جلی آوازیں آ رہی تھیں۔ بلوچوں میں اس قسم کی موسیقی کی محفل کا بہت رواج ہے۔ وہ ہر خوشی کے موقع پر منعقد کی جاتی ہیں۔ محفل کوئی بھی کرائے وہ پاس سے ملنے اور

قصبے کی محفل ہوتی ہے۔ اس میں کوئی بھی شریک ہو سکتا ہے۔ ایسے موقعوں پر کوئی اپنا پرایا نہیں رہتا۔ سب گھر ایک ہی گھر ہو جاتا ہے۔ چائے پانی چٹائیاں فرش جس کی بھی ضرورت ہو کسی بھی گھر سے آجاتی ہے۔
لیکن آج منتظمین نے روشنی کا انتظام صحیح نہیں کیا تھا۔ میدان بھی بڑا تھا اس لئے چند پٹرول مکس جو یہاں لاکر رکھے گئے تھے۔
اس جگہ کے لئے بہت ناکافی تھے۔ لوگوں کے صرف سائے سے نظر آ رہے تھے۔ بہر حال پورے قصبے کو محفل کی اطلاع ہو چکی تھی بلکہ دور دور تک خبر پہنچ چکی تھی اور لوگ جوق در جوق چلے آ رہے تھے۔ کچھ پیدل کچھ موٹر سائیکل پر وہ آتے جا رہے تھے۔ اور ایک بڑے دائرے کی شکل میں بیٹھتے جا رہے تھے۔ ایسی محفلوں میں فرش نہیں بچھایا جاتا۔ لوگ زمین پر ہی بیٹھ جاتے ہیں۔ یہاں بلوچوں نے زمین پر گھٹنوں بیٹھنے کا ایک اچھا طریقہ نکال لیا ہے۔ ہر شخص کے پاس ایک پھول سی چادر ہوتی ہے جسے وہ اپنے کندھے پر ڈالے پھرتا ہے جب زیادہ دیر کہیں بیٹھتا ہو تو وہ دونوں گھٹنے کھڑے کرکے اس چادر کو پیچھے کمر پر کرکے اور گھٹنوں پر باندھ لیتا ہے اس طرح بیٹھنے سے نہ ٹانگیں تھکتی ہیں۔ نہ کمر دکھتی ہے۔
ذرا ہی دیر میں صالح ایک چٹائی ہمارے لئے لے آیا۔ ہم اس پر بیٹھ گئے۔ اور صالح اس مجمع میں غائب ہو گیا۔
مجھے وہاں رہتے کافی عرصہ ہو گیا تھا۔ اور بلوچی موسیقی خاص طور پر ان کی لوک داستانوں سے بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی سبزل اور مراد بخش کے نام ہی کسی محفل کی رونق کے لئے کافی تھے۔ مجھے پتہ تھا کہ رمضان (جوری کے نام سے مشہور ہوا) اشرف فدا اساکی اور شفیع محمد بلوچ کے بعد اس وقت بلوچی فنکاروں میں شام مزا یا بڑا نام سبزل اور مراد ہی بڑے گوتے تھے جنہیں سننے کے لئے دور دور سے لوگ آتے ہیں۔
میں صالح کے آنے کا انتظار کر رہا تھا تاکہ آج کی محفل کی تفصیلات معلوم کروں اتنے میں بینجو پر دھن شروع ہوئی۔ (کسی کو نہیں معلوم کہ بلوچی موسیقی میں بینجو ایک مغربی ساز ہونے کے باوجود کیسے اور کب داخل ہوا اور اس کی اہمیت کس طرح ہوئی) بہر حال مجھے پتہ چلا کہ وہ کون بجا رہا تھا۔ میں نے اس سے پہلے کراچی میں بلاول بلجیم کو بڑی ہی خوبصورتی سے یہ ساز بجاتے ہوئے سنا تھا۔

ذرا ہی دیر میں ایک طرف سے شور ہوا۔ کچھ لوگ اس مدھم روشنی میں کوئی بھاری سی چیز اٹھا کر لا رہے تھے۔ میں سوچ رہا تھا نہ معلوم یہ کیا چیز تھی۔ ہمارے قریب ہی پہنچے۔ ہوئے ایک شخص نے دوسرے سے کہا: "لو جی آج تو شہ پرجا بھی آ گیا ہے۔" میں ایسا بیر نہ کر سکا۔ اور اس سے پوچھا کہ شہ پرجا کیا ہوتا ہے۔ وہ چونکا پھر بولا آپ نہیں جانتے یہ صرف ایک طرف سے منڈھا ہوا ایک بہت بڑا ڈھول ہوتا ہے۔ ویسے تو یہ شادیوں میں ضرور بجایا جاتا ہے۔ مگر آج یہاں بھی لایا گیا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کون بجائے گا؟ وہ بولا آپ اس کو بھی نہیں جانتے۔ اس کو تو سارے ہی لوگ جانتے ہیں امید علی ایک ہی تو آدمی ہے جو اسے بجا سکتا ہے۔
امید علی میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ امید علی کون امید علی؟ وہی جو ہمارے میس میں کھانا پکاتا ہے میں ایک دم پوچھ بیٹھا۔
۔ ہاں وہ دن میں ملازمت کرتا ہے اور رات کو شادیوں اور محفلوں میں شہ پرجا بجاتا ہے۔ اب پوری بات میری سمجھ میں آ گئی تھی کہ وہ غائب کیوں ہو جاتا ہے۔
اتنے میں ایک طرف سے پھر شور بلند ہوا۔ لوگ سبزل اور مراد بخش کا نام لے لے کر پکار رہے تھے۔ اب لوگوں کی تعداد بہت بڑھ چکی تھی مگر کوئی شور نہیں تھا۔ سب لوگ آہستہ آہستہ بول رہے تھے۔ بینجو پر دھن بج رہی تھی۔
ذرا ہی دیر میں ایک طرف کچھ گڑبڑ ہونے لگی۔ کچھ لوگ کھڑے ہو گئے اور زور زور سے باتیں کرنے اور ہنسنے کی آوازیں آنے لگیں۔ دراصل وہ لوگ بھی کسی کا استقبال کر رہے تھے۔ مجھے مدھم سی روشنی میں احساس ہوا کہ وہ کچھ خواتین تھیں۔ اس بات پر بڑی حیرت ہوئی کیونکہ بلوچوں کی روایت کے مطابق عورتیں اس طرح گھروں سے باہر نہیں نکلتیں نہ مردوں کے ساتھ کھلے عام محفلوں میں اس طرح ناچتی ہیں میں سوچنے لگا کہ کیا ماجرا ہے۔ مگر کسی سے پوچھنا مناسب نہ لگا اس لئے خاموش بیٹھا رہا۔
پھر محفل کا آغاز ہوا گانا شروع ہونے سے ذرا ہی دیر پہلے گھنگروؤں کی آواز آنے لگی۔ مجھے محسوس ہوا کہ کچھ خواتین ناچتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہیں۔ جب وہ قریب آ گئیں تو پتہ چلا کہ وہ دراصل زنخے تھے۔ وہاں کے لوگ انہیں "کمدشے" کہتے ہیں۔ مگر ہر محفل اور ہر شادی میں ان کے ناچ کا باقاعدہ انتظام کیا جاتا ہے۔

ان کے ناچ کے بعد مراد بخش کا گانا شروع ہوا وہ کافی دیر گاتا رہا اور
لوگ تالیاں (واہ واہ) کرتے رہے پھر ایک طرف سے ایک جلوس نمودار ہوا جس میں کچھ
لوگ سروں پر پیٹرومیکس رکھے آگے آگے چل رہے تھے۔ ان کے
پیچھے ناچنے والوں کی ٹولی تھی۔ اور ان کے پیچھے کچھ خواتین تھیں
جو خوشی کے گیت گا رہی تھیں۔ ایک عورت نے سر پر ایک تھال رکھا ہوا تھا
جس میں چراغ جل رہے تھے۔ صالح محمد نے مجھے بتایا کہ وہ محمود کے
گھر والے تھے اس کی بیوی اور کچھ دیگر رشتہ دار۔ دراصل آج کی
محفل انہوں نے ہی سجائی تھی۔ کیونکہ آج محمود کی بیوی نے اپنے
بیٹے کی بڑی دھوم دھام سے ختنہ کی رسم کی ہے۔ وہ اسے دولہا بنا
کر اپنی بہن کے گھر سے لا رہی ہے۔ وہ آج نہایا ہے اور اسی کی
خوشی منائی جا رہی ہے ۔۔۔ اب پوری بات میری سمجھ میں آگئی تھی۔

جب وہ لوگ محفل میں پہنچ گئے تو اس لڑکے کو لے جا کر اسٹیج
پر بٹھایا گیا۔ منزل کا گانا شروع ہوا۔ اور اس نے "بالاچ گورگیج" کی
داستان شروع کی جو دشمن سے بدلہ لینے کی عجیب داستان ہے۔

لوگ داستان سنتے رہے۔ رات بھیگتی گئی۔ اب کافی رات ہو گئی
تھی۔ اس وقت لوگوں نے دیکھا کہ وہی میزبان عورت جو تھوڑی دیر
پہلے لڑکے کو جلوس میں لے کر گاتی ہوئی آئی تھی اپنے گھر سے نکل کر ایک
جانب دوڑنے لگی۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا چاقو تھا۔ وہ دوڑتی
ہوئی اسٹیج کے پیچھے چلی گئی۔ پھر چیخ و پکار کی آوازیں آنے لگیں۔
ایک بھگدڑ سی مچ گئی۔ ہماری سمجھ میں کچھ نہ آیا چنانچہ ہم چپ چاپ
اپنے گھر آ گئے۔ اور دروازہ بند کر لیا۔

بڑی دیر تک چیخ و پکار کی آوازیں آتی رہیں۔ کافی دیر بعد
ہمارے دروازے پر دستک ہوئی میں نے ڈرتے ڈرتے دروازہ
کھولا۔ باہر صالح محمد کھڑا تھا۔ اسے اندر بلا کر دروازہ جلدی سے
بند کر لیا میں نے گھبرا کر اس سے پوچھا کیا ہوا۔ یہ محفل میں گڑبڑ
کیوں ہو گئی تھی۔ کیا ہو گیا تھا؟

اس نے بتایا کہ اس عورت کا شوہر محمود جو کئی سال پہلے
اسے بے آسرا چھوڑ کر ایران بھاگ گیا تھا۔ اور وہاں جا کر شادی
کر لی تھی۔ اور اس غریب عورت نے رات دن محنت و مشقت
کر کے، فاقے کاٹ کر اپنے بچے کو پالا تھا آج چھپ کے وہ محفل
میں اپنے بیٹے کی رسم میں شرکت کرنے آ گیا تھا۔ اور چھپ کر اسٹیج
کے پیچھے بیٹھ گیا تھا مگر کسی نے اس کی موجودگی کی اطلاع اس کی بیوی
کر دی تھی۔

اس وقت اتنے سالوں کی گھٹی ہوئی آگ اس عورت کے دل میں بھڑک
اٹھی اور اسے اپنے اوپر قابو نہ رہا۔ وہ دوڑتی ہوئی اسٹیج کے پیچھے
پہنچ گئی اور اپنے شوہر کے چھرا گھونپ دیا۔ *

◆ بقیہ صفحہ ۱۹ مہانگر میں ایک ۔ آدمی ◆

دھیرے مہانگر میں اتر رہی تھی۔ اس نے پھر ایک بار سوچا تھا۔ اسے آج
لوٹ جانا چاہیے۔ ٹرین کا وقت ابھی تھا۔ وہ اب یہاں ہرگز نہیں رہ سکتا۔
چند ہی دنوں میں تو اس کے اندر بے حد کھوکھلا پن بھر گیا تھا۔ اگر چند روز
مزید رہ گیا تو پھر وہ خود کو پہچان بھی نہیں سکے گا۔ اسے اب فوراً لوٹ جانا
چاہیے۔ پل پر چلتے چلتے اس نے کچھ ایسے خیال میں اپنے بارے میں دیکھا تھا۔۔۔
اچانک ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا بڑی نرماہٹ لیے اس کے اندر اتر گیا
وہ ٹھہر گیا تھا۔ نیچے مٹیالے اور کچھ سرمئی پانیوں والا دریا ہولے ہولے بہہ
رہا تھا۔ چھوٹی بڑی کشتیاں جا بجا شام کی اجلی سنولی دھند میں غائب
اور موجود کے درمیان ٹھہری ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ تھوڑی ہی دیر
بعد چند قدم کے فاصلے پر پہنچنے والے گھاٹ کی سیڑھیوں سے اتر
کر وہ ٹھیک دریا کے قریب پہنچ گیا تھا۔ دریا اس کے سامنے بہہ رہا تھا۔۔۔
دور سے آسمان جھکا جھکا سا تھا، وہاں پہ سیندوری سرخی اب ایک
چوتھائی رہ گیا تھا۔ پرندوں کی ڈار فضا میں ہر طرف کھنچی ہوئی تھی۔۔۔
وہ دیکھ رہا تھا۔۔۔ دریا۔۔۔ سرمئی اور مٹ میلا دھیرے دھیرے بہہ رہا تھا
پانیوں میں اٹھا لگتا تھا۔ دور دور تک ایک چپ سی دم سادھے ہوئی تھی
لوگ سندھیا اشنان کر رہے تھے۔ دریا بہہ رہا تھا۔ آہستہ آہستہ رات۔۔۔
اتر رہی تھی۔ پانیوں پہ کشتیاں اب روشن اور نیم روشن تھیں ایک پیلا سا
ستارا آسمان سے کر دریا تک پھیل رہا تھا۔ وہ شاید اکیلا رہ گیا تھا۔
سندھیا اشنان اور پوجا کرنے والے لوگ اب جا چکے تھے۔۔۔ ہوا
تھوڑی خنک ہو چلی تھی۔۔۔ اس نے دیکھا تھا۔ دور کے اوپر آسمان کے
ایک اندھیرے کونے میں بڑا روشن تیز سا ستارہ ابھر آیا تھا۔ ستارہ
اسے بے حد اچھا لگ رہا تھا۔ وہ یک ٹک اسے دیکھے جا رہا تھا۔ اس کی
آنکھیں اس پر ٹکی تھیں۔ پھر ایسا ہوا کہ وہ بالکل حیرت زدہ رہ گیا۔ جب
اس نے دیکھا۔ دریا کا اندھیرا پانی بالکل زرد روشن لہروں میں تبدیل
ہو کر دور دور تک بہہ رہا تھا۔۔۔

گھاٹ کی آخری سیڑھی پہ ایک سکتے کے عالم میں بیٹھا رہ گیا تھا۔ اس کے
پاؤں اب سٹیشن کی طرف نہیں جا رہے تھے۔۔۔۔ *

شمس الرحمان فاروقی

۱۳ رانی منڈی، الہ آباد ۳ ـ ۲۱۱۰۰

شہریار کی نئی شاعری

شہریار کی شاعری ایسے شخص کی شاعری ہے جس کا بہت کچھ، یا شاید سب کچھ کھو چکا ہے، یا چھن گیا ہے۔ وہ اس صورت حال پر رائے زنی تو کر سکتا ہے لیکن اس صورت حال کو بدلنے پر وہ قادر نہیں۔ بعض اوقات ایسا لگتا ہے کہ تجربے کی شدت نے عمل کی قوت چھین لی ہے۔ اس میں کسی قسم کا اخلاقی یا سیاسی تذبذب یا ڈائیلما نہیں۔ بس ایک منزل ہے، ایک وقت ہے جو ٹھہر گیا ہے۔ ایسے بہت سے لوگ ہیں، یا شاید سب لوگ ایسے ہیں، وقت جن کے لئے ٹھہرتا نہیں، تجربہ جن کے لئے ایک گزرتے ہوئے فلم کی طرح ہے۔ کبھی کبھی وہ پردے پر ہونے والے واقعات میں ذہنی طور پر اس قدر شریک ہو جاتے ہیں کہ وہ واقعات انہیں اصلی اور خود اپنے پر گزرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ منظر انہیں اس قدر بے قابو کر دیتے ہیں کہ وہ ان کے ساتھ دوڑنے لگتے ہیں اور اپنے گرد و پیش کے لوگوں کو وہ اپنا شریک یا حریف سمجھنے لگتے ہیں۔ شہریار کی نظموں غزلوں میں متکلم جمود کے صحرا میں اکیلا ہے۔ اس حقیقت کو بیان کرنے کے لئے بعض اور حقائق بھی بیان کرنے پڑتے ہیں۔ مثلاً ایسا بھی ہے کہ متکلم کو اپنی صورت حال کا پوری طرح احساس اس وقت ہوتا ہے جب وہ اپنی تنہائی کی وجہ معلوم کرنا چاہتا ہے ؎

میں پھنس گیا ہوں کہیں ریت کے بھنور میں کیا — تری مدد کو جو محتاج آج اتنا ہوں
یہ راستہ بھی گھنے جنگلوں سے گزرے گا — میں اس سفر میں اسی واسطے اکیلا ہوں
ہر ایک رنگ میں دیکھا ہے میں نے راتوں کو — میں خواب خوف سبب بے شمار جاگا ہوں

ان اشعار میں شکوہ شکایت نہیں، رنج بھی نہیں۔ ان میں خود آگہی اور ماحول کی حقیقت کو پہچاننے کی کوشش ہے۔ ان کا لہجہ ایسے شخص کا لہجہ ہے جس نے دکھ درد سنانے، لوگوں کو متوجہ کرنے، اور خود کو گفتگو یا دلچسپی کا محور بنانا سیکھا ہی نہیں۔ ان اشعار میں کچھ معانی کی کثرت ہوتی تو میراجی کی سی تہ داری کا سا رنگ پیدا ہو جاتا، کیونکہ ان میں جتنا انکشاف ذات ہے اتنا ہی گرد و پیش کی دنیا پر تبصرہ بھی ہے لیکن میراجی کا مسافر تلاش حقیقت اور دنیا کو سمجھنے کی کوشش سے مایوس نہیں ہوا ہے۔ اس کے یہاں سعی و جہد کی ذہنی سطح عملی سطح نہیں، متحرک اور فعال ہے۔ مندرجہ بالا اشعار میں اختتام کا احساس ہے کہ اس کے آگے کچھ نہیں۔

اختتام کا احساس، اور یہ احساس کہ اگر اچھی چیزیں ختم ہو جاتی ہیں تو شاید بری چیزیں بھی ختم ہو جاتی ہیں، شہریار کی تازہ شاعری کا مرکزی تاثر یا تصور ہے۔ لیکن بری چیزوں کے ختم ہونے کا احساس کسی اطمینان کی سانس، کسی جھوٹی امید کی مصنوعی کرن، کسی مخالف و معاند آندھی کے تھم جانے کا اعلان نہیں۔ شہریار کا متکلم جہاں کھڑا ہے وہاں یہ سب چیزیں بھی ختم ہو چکی ہیں

ڈوبتی شام کے اس پار / کھڑے تھے جو لوگ / ہم نے ان آنکھوں سے دیکھا ہے / کہ
ان لوگوں کی / مٹھیاں بند تھیں / یہ ریت کہاں سے آئی ! (حیران کرنے والی ایک بات)

(اب تک میں نے دو اقتباسات پیش کئے ہیں۔ دونوں میں ریت کا استعارہ ہے۔ میں حیران ہوں کہ یہ میرا غیر شعوری انتخاب تو نہیں۔ ممکن ہے پڑھنے والا اپنی آنکھ سے پڑھتا ہو۔ لیکن متن کی INTEGRITY اور سالمیت کچھ تو ہوتی ہوگی؟ ورنہ اس کلام میں بار بار .

ریت پر اصرار کیوں؟ یہ کچھ تو معنی رکھتا ہوگا؟)

(آخری دعا)

آگ جسم کب برف ہوگیا! / سوچتا ہوں میں / اور سوچ کر اپنے آپ سے اس سوال پر /
کچھ اداس سا ہو رہا ہوں میں / آسمان پر رات کے سوا کچھ نہیں رہا / آخری دعا مانگنے کو ہوں

جب آسمان پہ رات کے سوا کچھ نہیں تو دعا بھی کیا مانگی جا سکتی ہے؟ یہ اختتام کی وہ منزل ہے جہاں امیدوں کا محل اور دعا بھی اجڑے ہوئے گھر کی طرح ہو جاتا ہے۔

کہیں بھی زیست کے آثار دکھائی نہیں دیتے — یہی صورت رہی جو چند دن بکھر جائیں گے ہم بھی
عجب وحشت سی تھی گھر کے سارے دروازے کھلے رکھے — ہمیں معلوم تھا اک روز دھوکا کھائیں گے ہم بھی

ایسی نظمیں بھی، جن میں بظاہر کامیابی ہے، ہمیں فوراً احساس دلاتی ہیں کہ یہ کامیابی دراصل شکست ہے، خود اپنے اوپر بھی اور اس پر بھی، جس نے متکلم کو اس کامیابی سے ہمکنار کیا تھا۔ لہٰذا یہ کامیابی عجب غیر اطمینان بخش، ادھوری اور بالآخر ناکامی ہی معلوم ہوتی ہے۔ زندگی کے ایسے تجربے کو کوئی کم کاوش غزل نظم کرتا تو بڑی دھوم دھام کا اہتمام کرتا، ہمیں طرح طرح سے احساس دلاتا کہ دیکھو بیسویں صدی کے اواخر میں زندگی یوں جیتے ہیں اور خود آگہی کو یوں بیان کرتے ہیں۔ شہریار کی شاعری کا سب سے بڑا کمال اس کا (UNDERSTATEMENT) کم بیانی یا سہل بیانی ہے، کہ وہ اپنے کلام میں جذبات کا وزن کم رکھتے ہیں اور اس کی رگ دیے یا بجلیاں چمک کر گرا لینے سے محترز رہتے ہیں۔ شروع میں بھی شہریار کو غیر ضروری الفاظ سے پرہیز اور کسی بات کو کہنے کے لئے کم سے کم توجہ انگیزی اختیار کرنے کی عادت تھی۔ یہ ان کی پختگی اور شاعرانہ قوت مزید عروج کی علامت ہے کہ اب وہ اپنی بات کو ذاتی حوالے سے کہتے ہیں تو بھی جذبات کے جھاڑ گرسنے کے بغیر کہتے ہیں۔ ان کی بات اتنے فطری انداز میں، اتنے نامیاتی رنگ سے ادا ہوتی ہے کہ اعلیٰ درجے کے ستار پر کسی راگ کے بے تکلف ادا ہو جانے کا تاثر ہوتا ہے۔

میرا تو ارادہ تھا / ہونٹ سیڑھیوں سے میں / آسمان تک جاؤں / تو نے اس جگہ مجھ کو / اتنی
دیر تک روکا / یہ بھی بھول بیٹھا میں / میرا کیا ارادہ تھا / اس وجودِ خاکی میں / جسم کچھ زیادہ تھا / (میرا تو ارادہ تھا)

یہ نظم "ایک اور پیشین گوئی" کی طرح کا نغمہ ہے لیکن اس کا متکلم اب کچھ زیادہ تجربہ آشنا اور سرد و گرم چشیدہ ہے۔ اس کے لہجے میں "ایک اور پیشین گوئی" جیسا المیاتی شدید حزن نہیں، بلکہ ہر چیز کے ادھورے، ناکام اور بے اثر ہونے کے احساس، خود اور مخاطب پر طنز، اور ہر طرح کے جرم سے اپنی برأت کا اعلان ہے۔ وجود خاکی میں جسم زیادہ نہ ہوتا تو اور کیا ہوتا؟ مندرجہ ذیل نظم "ایک اور پیشین گوئی" کی براہ راست یاد دلاتی ہے۔

زرد پتے نحیف شاخوں پر / رات کے آخری کنارے سے / آنے والی مہیب آندھی کا / دیکھو انتظار کرتے ہیں /
لوگ سب اس عجیب منظر کو / بے ضرر کیوں شمار کرتے ہیں۔ (رات کے آخری کنارے سے)

یہ منظر بالکل عجیب نہیں ہے، اور ہم لوگ جو موت و زیست کے چکر کے عادی ہو چکے ہیں، ان کے لئے تو موت جیسی آندھی اور شاخوں کی بے طاقتی بے ضرر ہیں، کیونکہ ہم لوگ قدرت اور دنیا کے ہر پہلو کو اپنے فائدے کے لئے استعمال کرنا اور فطرت کا استحصال کرنا اپنا حق جانتے ہیں۔ لیکن متکلم کے لئے موت اختتامی حقیقت ہے۔ اس کی آندھی ایسی نہیں جس کے جھکڑوں کا لطف لیا جاسکے۔ اور اس سے بڑھ کر زرد پتوں کا انتظار ہے کہ ہم وہ زرد پتے ہیں جنہیں اپنے انجام کا انتظار ہے کہ زندگی ان کے لئے اب بے معنی ہو چکی ہے۔ متکلم کی آنکھ ظاہر کا پردہ چیر کر باطن کو دیکھتی ہے وہ موت کی آندھی کا انتظار کرتے ہوئے پتوں کے ناگزیر انجام کو روک نہیں سکتا، لیکن وہ ظاہر بیں لوگوں سے بہرحال یہ کہہ سکتا ہے کہ زندگی اور موت کے چکر کو ان کی نگاہ سے بھی دیکھو جو اس کے قدموں تلے آکر کچلے گئے ہیں ؎

اس بات پر کس واسطے حیران ہیں آنکھیں — پت جھڑ میں ہوتے ہیں جدا پتے شجر سے

نحیف شاخوں پر زرد پتوں کو دیکھنا اور یہ احساس نہ ہونا کہ وہ موت جیسی مہیب آندھی کے منتظر ہیں ایسے ہی لوگوں کے کام ہیں جو حسین ابن علی کو

تنہا موت کے منھ میں جانے دیتے ہیں۔ ؎

گذرے تھے حسینؑ ابن علیؑ رات ادھر سے
ہم میں سے مگر کوئی بھی نکلا نہیں گھر سے

نظم اور غزل پر یکساں قدرت شہریار کی نمایاں صفت بنتا جا رہا ہے۔ جیسے جیسے شاعر کے پاس کہنے کو کم ہوتا جاتا ہے۔ نظم کہنا اس کے لئے مشکل ہوتا جاتا ہے۔ غزل میں تو مروج مضامین اور پہلے کی کہی ہوئی باتوں کو الٹ پھیر کر کام چل سکتا ہے (بڑی غزل اس طرح نہیں بنتی، لیکن کامیاب غزل ضرور بن سکتی ہے۔) مگر نظم میں کامیاب ٹھہرنا کیا قدم ٹکانا بھی ناممکن ہے جب تک کوئی بات اپنے دل سے نکل کر کہنے کے لئے نہ ہو۔ حالیہ نظموں میں شہریار کے یہاں جسم کا احساس، اور کسی مدمقابل کے جسم کا احساس واضح ہوتا نظر آتا ہے۔ جس بات کو وہ اب تک بمشکل ہی صاف صاف کہتے تھے۔ اب اس کی پرچھائیں بے تکلف بعض نظموں پر پڑ رہی ہے۔

(۱) دریلئے خوں رگوں میں / بے تاب ہو رہا تھا / میں ہو رہا تھا پاگل / (۲) ... میرے ہونٹوں نے / جسم پر تیرے بہت دیر تلک / حرف ناگفتنی تحریر کیا / (۳) میں جب اپنے وجود میں مطمئن تھا / تم نے یاد کرکے / بدن کے بند کھولے / آؤ میں تم پر یہ بھی اسرار کھولوں / کب تراندر میں تمہیں تا دیر تولوں / آخری سسکی تلک میں چپ رہوں اور کچھ نہ بولوں / بس اسی اک کام میں مشتاق ہوں میں /

اس نظم میں رسائی، نارسائی، خیالی جسم اور حقیقی جسم، اپنی مضبوطی میں اپنی کمی کا شعور کئی طرح کی پیچیدہ باتیں بیک وقت یوں حل ہو گئی ہیں کہ نظم اپنی طرح کا شاہکار بن گئی ہے لیکن بعض اوقات شاعر بالکل مختلف طرح کا شخص معلوم ہونے لگتا ہے، کہ معاصر دانشوری اور دانشوروں کے کھوکھلے پن کے تئیں اس کا جذبۂ تحقیر اس کو سفاک بنا دیتا ہے، اور وہ شاعر جو خیالی / اصلی محبوب کے سامنے جھکتا ہوا نظر آتا ہے، اپنے ساتھیوں کو یوں مخاطب کرتا ہے۔

انھیں زندہ رہنے کی تمنا ہوس / جو دکھائی دیتے تھے ہم نفس / کبھی روشنی کے حصار میں / کبھی چھچھوندروں کی قطار میں /
(ہندوستانی دانشوروں کے نام)

یہ نظم ہمارے تمام نہاد دانش وروں کے نام پیغام بھی ہے اور ان کے کردار پر کھلا تبصرہ بھی۔ شاعر کا احتساب کبھی کبھی اوپر تنقید میں بھی نظر آتا ہے اور اس طرح ایک اعلیٰ انصاف پسندی کا ثبوت ملتا ہے ؎

جنوں کے جتنے تقاضے تھے بھولے جاتے ہیں
کہ ساتھ وقت کے لوہم بھی بدلے جاتے ہیں

غزل میں شہریار کی ممنونی اور احساس زیاں ان کی نظم سے بھی ہلکے لہجے میں معرض بیان میں آئے ہیں۔ ان کا انداز اس قدر لطیف اور لہجہ اس قدر دھیما (کبھی کبھی طنز کی ہلکی تیزی کے باوجود) کہ اگر قاری بہت ہوشیار نہ ہو تو وہ کئی اشعار پر سے بے کھٹکے گزر جائے گا۔ شہریار استعارہ بہت کم استعمال کرتے ہیں، ان کا پورا شعر استعارے کا کام کرتا ہے ؎

کہ آن پہنچا ہے دریا ترے زوال کا وقت
جو ہم سے لوگ کنارے پہ ٹھہرے جاتے ہیں

زمیں نے ہم کو بہت دیر میں قبول کیا
جل حدت میں یہ بات سمجھ جاتے ہیں

سیاہ رات نے بے حال کر دیا مجھ کو
طویل کر نہیں پایا کسی کہانی کو

بجائے میرے کسی اور کا تقرر ہو
قبول جو کرے خوابوں کی پاسبانی کو

جینے کا حق ادا کوئی ہم سے نہیں ہوا
تاویل اس کی کیا کریں کیسے نہیں ہوا

دن ڈھلے اور شام کا دیدار ہو پھر
کام دن بھر اس لئے اتنا کیا ہے

ان اشعار کی خوبصورتی اور ان کے معنی کی تہوں تک پہنچنے کے لئے تامل کی ضرورت ہے۔ ان اشعار کے کہنے والے نے اپنا زیادہ تر فن آستین میں چھپا رکھا ہے۔ صرف ایک بات پوری شدت سے ظاہر ہے کہ محمد علوی جیسے لوگوں کو چھوڑ کر آج شاید ہی کوئی ایسا ہو جو بظاہر اتنی آسانی سے، کوشش اور زور کے بغیر اس انداز میں شعر کہہ سکتا ہو۔ فرق یہ ہے کہ محمد علوی اکثر ایسی باتیں

صمد انصاری

روشنی تک روشنی کا راستہ کہہ لیجئے
رات کو شام و سحر کا فاصلہ کہہ لیجئے

بند ہے حرفِ وفا پر شہرِ مقتل کی زباں
رنگِ خوں کو دستِ قاتل پر حنا کہہ لیجئے

سوچئے کتنی بہاریں ایک فصلِ زرد و
رنگ و بو کو موسموں کا خوں بہا کہہ لیجئے

تو بھی ہے عمرِ رواں میں تمنا کی تھکن
حرفِ غم کو گنبدِ جاں کی صدا کہہ لیجئے

کتنا آخر کر گئیں لمحوں کو خوں ریزیاں
دوستی کو دشمنی کی انتہا کہہ لیجئے

کچھ نظر آتا نہیں جن میں چراغوں کے سوا
ان اجالوں کو اندھیروں کی بنا کہہ لیجئے

بال و پر کھلتے نہیں جن کے نشیمن کی طرف
ان اڑانوں کو ہواؤں کی غذا کہہ لیجئے

کاٹ دے لکھنے ناامیدی نے خیالوں کی ...
حرفِ آوارہ کو اب تکرار سا کہہ لیجئے

ہے نقیبِ فصلِ گل کھلتے دریچوں کی صدا
بام و در کو شہر کی آب و ہوا کہہ لیجئے

کچھ نہیں ملتا صمد پتھر کو تکنے کے سوا
آدمی کو آدمی، نامِ خدا کہہ لیجئے

● ۳ ای - ۱۳/۱۲، ناظم آباد کراچی (پاکستان)

آشفتہ چنگیزی

سانحہ جب ہو ہی گیا ہے، تو رہے
اب رقیبوں کو گلہ ہے، تو رہے

میں رکوں گا، وہ پکارے تو سہی
راہ میں کوہِ ندا ہے، تو رہے

اس سے یہ کس نے کہا، دونوں میں ہم
ایک بستر ہی بچھا ہے، تو رہے

حرمِ قلعہ میں رکھنا ہے قدم!
سازشِ خواجہ سرا ہے، تو رہے

کہیں اٹھتے، کہیں پڑتے ہی قدم
اب کے یہ سب بھی روا ہے، تو رہے

جو بھی کر سکتے تھے، سو ہم نے کیا
وہ اگر اب بھی خفا ہے، تو رہے

دل میں رہنا ہے تو دھڑکن بن جائے
صرف مسجد میں خدا ہے، تو رہے

ملیں، نہ ملیں کچھ گلہ نہیں ہوتا
اثر کسی کا بھی اب دیرپا نہیں ہوتا

پرانے لفظ برتتے ہوئے جھجکتا ہوں
فراق و وصل سے مطلب ادا نہیں ہوتا

عجیب رشتہ ہے، ملنے کو روز ملتے ہیں
جو ہونا چاہیے وہ معجزہ نہیں ہوتا

تمہاری خوشی کیلئے یہ بھی جھوٹ بولوں گا
کہ تیرے بعد کوئی سلسلہ نہیں ہوتا

یہ محفلوں سے جو بچتا ہوں، یہ بھی حکمت ہے
اکیلے رہنے میں نقصِ انا نہیں ہوتا

کسی کے ساتھ بھی چلیے تو تھکنے لگتا ہوں
جو پوچھئے تو مجھے کچھ پتہ نہیں ہوتا

کسی نے کچھ بھی کہا اور ہم نے مان لیا
بہت سی باتوں میں کچھ فائدہ نہیں ہوتا

اگر سلیقے سے کچھ فیصلے کئے ہوتے
جو اتفاقات ہوا ہے، ہوا نہیں ہوتا

● معرفت، شعبۂ اردو، علیگڑھ مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ

اختر یوسف

[illegible] ۱۹۵۱ء، ۱۰ مارچ - ۲۰۰۲-۳-۲۸

مہانگر میں ایک آدمی

ٹرین جب بہت شور سے پلیٹ فارم پہ رکی تو وہ پریشان سا ہو گیا تھا.....

پلیٹ فارم ہے یا... آدمیوں کا کوئی لمبا چوڑا دریا....
کوئی زبردست آفت سی آ گئی ہے کہ لوگ سب تماشا ایک دوسرے پر گرتے پڑتے بھاگتے جا رہے ہیں..... ہا گیا..... یہ کہاں بھاگے جا رہے ہیں...
اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور سوچتا، اس کے ساتھ والے مسافر نے اسے پیچھے سے جھنجھوڑ دیا تھا.....
کیوں جی... اترنا نہیں ہے کیا...؟ وہ مسکرا رہا تھا۔
آں... ہاں... اس کے منہ سے نکلا تھا...

پلیٹ فارم کے ایک کونے میں کھڑا رہنا اس نے بہتر سمجھا تھا۔ دراصل پیچھے ہی وہ اترا تھا... اسے لگا تھا، وہ بھیڑ کے تھپیڑوں کی زد میں آ گیا تھا... چلنا اس کے لئے دوبھر تھا.... بس جیسے وہ لڑھکنے لگا تھا. دراصل پہلی بار وہ کسی مہانگر کے پلیٹ فارم پہ اترا تھا. دریا جیسے پلیٹ فارم سے اس کا سابقہ پہلی بار پڑا تھا. وہ انجان تھا. بھاگتی اور ایک حد سے بڑھی ہوئی بھیڑ اس نے کبھی دیکھی ہی نہیں تھی... لگاتار بھیڑ کے تھپیڑے کھا کر وہ اب بھی خندس سا تھا.
پلیٹ فارم کے ایک کونے میں وہ کافی دیر سے کھڑا تھا. بھیڑ کی کم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی... پے در پے ٹرینیں آ رہی تھیں... جا رہی تھیں. شاید اس نے سوچا تھا بھیڑ تھوڑی کم ہو جائے تو وہ باہر نکلے... ایک گھنٹہ گزر گیا تھا. وہ کب تک کھڑا رہے گا وہ گھبرا گیا تھا. کندھے پر لٹکا ہوا تھیلا بھی اب اسے بھاری لگنے لگا تھا. بھوک بھی لگ رہی تھی گھر سے چلتے وقت اس کی ماں نے جو روٹیاں بنا کر زبردستی اس کے تھیلے میں رکھ دی تھیں، وہ انہیں دو قسطوں میں ختم کر چکا تھا... چنگا بھلا سا لگتا تھا جب وہ پلیٹ فارم پہ اترا تھا۔ اور اب

پسینے ڈھنڈ بہہ رہے تھے. دوپہر ہو گئی تھی. وہ کب تک یہیں بت بنا کھڑا رہے گا. باہر نکل کر اسے کوئی ٹھور بھی تو دیکھنا تھا. اس مہانگر میں اس کا کوئی نہیں تھا. ظاہر تھا اسے بہت ساری دقتوں کا سامنا تھا
کسی طرح وہ ٹی اسٹال تک پہنچ چکا تھا. اتنا تو اس نے کر لیا تھا. اوپر ریلوے کی بڑی سی گول گھڑی میں تین بج چکے تھے. تھیلا اب اس کے ایک ہاتھ میں تھا. کندھے کو تھوڑا آرام ملا تھا. بسکٹ کھانے کے بعد چائے اسے اچھی لگ رہی تھی. چائے ویسے اچھی تھی بھی. تھوڑی راحت سی محسوس کر رہا تھا. اس کے اندرون میں توانائی کی ایک لہر کی حرکت رہی تھی.

پلیٹ فارم سے نکلنے کے بعد تو یک بارگی تھیلا اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا. وہاں تو آدمیوں کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا. اچانک اس نے اپنے آپ کو گم کرتا ہوا محسوس کیا. چلتے وقت اس کے ایک دوست نے ٹھیک ہی کہا تھا.
مہانگر جا رہے ہو. کہیں کھو نہ جاؤ...!
اس نے تو اپنے دوست کی بات کو مذاق میں ٹال دیا تھا. مہانگر بھی تو ایک شہر ہی ہوتا ہے. اس نے لے سوا اپنی نگاہوں سے دیکھا تھا. میں کوئی دیہات کا رہنے والا ہوں. میرا شہر شہر نہیں ہے کیا!
یہ سن کر اس کا دوست ہنس دیا تھا. وہاں پہنچو گے تب معلوم ہو گا...!
اس نے بھی اس کے دوست نے ٹھیک ہی کہا تھا. پہنچتے پہنچتے اسے کچھ تو معلوم ہو ہی گیا تھا. ویسے بھی مہانگروں کے بارے میں اس نے بہت سے کچھ دیکھ تو سن اور پڑھ بھی رکھا تھا بلکہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا. یا دیکھنے کی ابتدا کر رہا تھا.
رات ہو چکی تھی. دھکے کھا کھا کر... ٹھوکریں کھاتے... لگاتار ٹھوکریں برداشت کرتے ہوئے وہ بہت پریشان ہو گیا تھا کہ

● "لاتقنطوا" اور "نغمۂ سنگ" کے بعد "بدن نژاد قبا" نابغۂ شعریات کمپیوٹری شاعر مقیم اثر بیاولی کی تیسری اہم جست ہے۔ مقیم اثر بیک وقت نظم و غزل [بشمول آزاد غزل] پر فنکارانہ، خلاقانہ، عارفانہ، حکیمانہ و عاقلانہ قدرت رکھتے ہیں۔ موصوف کے پاس فی نفسہٖ تقریباً ۳۵ دواوین کا وقیع سرمایہ ہے جو اس حقیقت پر دال ہے کہ عہدِ میر سے ہم عصر زندگی تک اتنا بڑا شعری اثاثہ اردو شاعری خصوصاً غزل کے ذخائر میں کسی کے پاس نہ کل تھا نہ آج ہے۔ ہمارے اس تشہیر پسند عہد میں مقیم اثر نے نام سے زیادہ کام پر اپنا شاعرانہ انہماک و انتساد صرف کیا ہے جو بجائے خود ایک عظیم کارنامہ ہے۔

● صابر زاہد

● "بدن نژاد قبا" نئے عہد کی تخلیقیت کا ایک نو جمالیاتی اور نو اقداری ہنگامۂ یوسفی ہے۔ جو اس حسن و خوبی سے بندِ حجاب سے باہر آیا ہے کہ بڑے بڑے ادارہ رسیدہ ترقی پسند اور فیشن گزیدہ جدیدیت پسند ادبی فرقہ پرست ریاپیشہ و جفا پیشہ مجھے فرشتوں کا دل بھی بے اختیار حیرت لیے اور فکر و فن کے ساتوں آسمان اس کے گرویدہ ہو جائیں۔ مقیم اثر کی تخلیقیت آفریں شاعری کی آفاقی آگ، رفو گرِ درد مندی اور بصیرت افروز نور، نو جمالیات اور نو اقداریات کی تخلیق تشکیل و تعمیر میں کامیاب ہے جو کلاسیکیت کی اساس ہے۔

● نظام صدیقی

● مقیم اثر کو ہمیشہ ایک جہانِ دیگر کی تلاش رہی۔ یہی سبب ہے کہ لاتقنطوا نے نغمۂ سنگ کی جست عرصے کے لحاظ سے بہت ہی مختصر مگر فاصلے کے اعتبار سے ایک طویل جست ہے۔ ہمارے بہت سے شاعروں نے جدید حسیت کے اظہار کے لئے میر کے رنگ کو اپنایا ہے لیکن مقیم اثر کے ساتھ ایسا نہیں ہے ان کا ایک ایسا درد مندانہ لب و لہجہ ہے جو آبگینوں کو ٹھیس لگ جانے والی ادا کے سبب سب سے الگ تھلگ اپنی شناخت رکھتا ہے جس پر نہ ناصر کاظمی کے اثرات کا لیبل چسپاں کیا جاسکتا ہے نہ ظفر اقبال کے اثرات کا۔ اس فانی دنیا میں حرفِ اچھی تحریر کو بقائے دوام حاصل ہے۔ [ورجل]

● ڈاکٹر کرامت علی کرامت

● "بدن نژاد قبا" میری تیسری ادبی پیش کش ہے۔ اس شعری تصنیف کا شمار بھی اچھی تحریروں میں اگر آگیا تو میں اپنی کوشش کو کامیاب تصور کروں گا۔ فیصلہ اربابِ ذوق پر موقوف ہے۔

● مقیم اثر بیاولی

ضخامت: ۴۸۰ صفحات * قیمت: ۱۵۱ روپے

رابطہ: ۲۶۱ - ایم - ایچ - بی کالونی - مالیگاؤں - ۴۲۳۲۰۳

شفقت سوپوری

شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی، حضرت بل، سرینگر۔ ۶

موسیقی، جمالیات اور نفسیات

——— موسیقی کی جمالیات کے لئے نفسیات کی اہمیت کے سلسلے میں کہا گیا ہے کہ کوئی بھی نظریہ (چاہے وہ کتنا ہی مضبوط کیوں نہ ہو)، جمالیات کا کوئی بھی فلسفہ (چاہے وہ اپنی فلسفیانہ بنیادوں پر کتنا ہی مستحکم کیوں نہ ہو) نفسیاتی نقطۂ نظر سے انحراف کر کے موسیقیانہ تجربہ MUSICAL EXPERIMENT پر بحث نہیں کر سکتا۔ یہ خیال بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ جمالیات اپنے آپ کو فن پارے کے حسن میں ظاہر کرتی ہے اور یہی حسن - فنکار کی تخلیقی قوت اور اثر پذیر سامع RESPONSIVE LISTENER کے جمالیاتی تجربے سے ایک جمالیاتی شئے بن جاتا ہے۔

جمالیاتی ترسیل دو ذریعوں سے ہو سکتی ہے۔ پہلا ذریعہ جمالیاتی طور سے حساس یا بیدار شخص ہے۔ دوسرا ذریعہ فن پارہ ہے جو الفاظ دیگر فنکارانہ وجدان کی تجسیم یا جمالیاتی خیال بھی ہوتا ہے۔ پس ان میں سے ایک پر لازم ہے کہ وہ جمالیاتی ترسیل کی بنیاد ڈالے۔ چنانچہ فن تک رسائی کے دو راستے کھلتے ہیں۔ پہلا راستہ نفسیات کا اور دوسرا مظہریات کا۔ خالص نفسیاتی رسائی کے ذریعے ہم داخل کے ہر ایک عمل پر رد عمل کرتے ہیں اور (موسیقی کے) لطف و ادراک کے براہ راست تجربے سے باشعور ہو جاتے ہیں۔ مظہریاتی رسائی میں ہماری توجہ فن اور اس کی ہیئت ترکیب و تعمیر کے طریقوں اور ان داخلی قوتوں پر مرکوز ہوتی ہے جو فن پارے میں اپنے آپ کو ظاہر کرتی ہیں۔

سوال یہ نہیں کہ جمالیاتی تجربے کے دوران میں ہمارے شعور میں کیا کچھ گزرتا ہے بلکہ سوال یہ ہے کہ اسے (یعنی جو کچھ گزرتا ہے) کس طرح جمالیاتی کیفیت کے نزدیک لایا جا سکتا ہے اور کون سی قوت ہمیں اس کا جائزہ لینے کے قابل بناتی ہے [یہ سوال بھی اہم ہے کہ داخلی ادراک کی کل تشخیص کیسے کی جائے۔ اور اگر ہو بھی گئی تو اس کل تشخیص کی کیسے کامل تشریح ہو سکتی ہے اور مجموعی طور پر جو تجربات ہم نے حاصل کئے ہیں ان کی بنیادوں پر جمالیات کے لئے کس طرح ایک عام نفسیاتی بنیاد قائم کریں گے۔ !]

اس قوت کو داخلی نفسیات و منبع SUBJECTIVE PSYCHOLOGICAL ATTITUDE کہا گیا ہے جو نفسیاتی جمالیات PSYCHOLOGICAL AESTHTICS کی تہہ میں موجود ہوتی ہے اور جس کا عمل دماغ یا دماغی مظاہر میں جس کو بیدار کرنے پر آمادہ کرتا ہے یعنی ہم اپنی توجہ داخل کی طرف لے جاتے ہیں۔ اور کیفیت مزاج یعنی MOOD اور جذبات کا تجربہ کرنے کے علاوہ ان خیالات کا بھی تجربہ کرتے ہیں جو فن پارے پر دھیان CONTEMPLATION دیتے وقت اور اس سے کیفیت حاصل کرتے وقت ہم میں ابھرتے ہیں۔

جمالیات میں نفسیاتی نقطۂ نظر کے حوالے سے ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا موسیقی کا مقصد محض حقیقی جذبات کو ابھارنا ہے یا پھر یہ کہ کیا موسیقی ایک خود حرکی یا غیر شعوری موسیقیات کے موضوع MUSICAL CONTENT یا یہ موسیقیانہ خیالات ہیں جو پر صدا SONIFEROUS مادے ہی میں، یا اس کے ذریعے سے اپنا حسی قابل ادراک اظہار پاتے ہیں۔

یونانی لذت پسندوں HEDONISTS نے سب سے پہلے حس کو بیدار کرنے کے مفروضے کو قائم کیا۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنے اصل نظریات میں تبدیلی پیدا کی اور دعویٰ کیا کہ الاکیت، ملائمیت کہاں ادا کرنے اور ان پر غالب آنے میں ہے

اپنی تشریح میں انہوں نے افلاطون کا یہ نظریہ پیش کیا کہ فن روح کو ان نغماؤں کے بجائے صرف احساس تک محدود ہے۔ افلاطون نے یہ مان بھی لیا کہ فنکار لازمی طور پر احساساتی کیفیت سے کوئی تعلق نہیں ہے، تخلیق فنکار کو اپنے ذہن سے آتا ماتھا۔ افلاطون کا خیال نفسی مادہ PSYCHICAL MATERIAL کو روحانی تعقل SPIRITUAL INTELLECTUAL سے میز کرنا تھا۔ افلاطون کے نظریات کی صحیح تشریحات کی خاطر یہ جاننا ضروری ہے کہ اس کے دور میں موسیقی کو سب فنون پر سبقت حاصل تھی۔ یونانیوں نے موسیقی کو عظیم ابہام تصور کیا تھا۔ ان کے نزدیک موسیقی کائنات کی مجموعہ تخلیق قوتوں کی مظہر تھی۔

ارسطو کے مطابق موسیقی اپنی خصوصیات کے لحاظ سے تعقل سے زیادہ قریب ہے اس نے پہلے ہی دعویٰ کیا تھا کہ فن کا مقصد محض فطرت کی نقالی نہیں بلکہ ان سب امور کی تکمیل ہے جو کچھ فطرت نے نامکمل چھوڑے ہیں۔ نو افلاطونیت کے سب سے زیادہ متاثر کن نظریہ ساز فلاطینس PLOTINUS کے نزدیک فن حسی کیفیت سے زیادہ جمالیاتی حسن کے قریب ہے۔ فلاطینس نے بھی تعقل کو احساس پر فوقیت دی وہ کہتا ہے کہ خیالات ہی مادے کو ہیئت دے سکتے ہیں۔ اور صرف خیال ہی بنیادی اختلافات کو ایک معنی خیز کالی کے سانچے میں ڈھالنے پر قادر ہے۔ فلاطینس پہلا فلسفی تھا جس نے FANTASY کو تخلیقی عمل کے لئے بہت اہم قرار دیا۔ اس کے مطابق FANTASY احساسات اور تعقل کے درمیان ایک پیش بندش ہے۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ فلاطینس کے تصورات کا اثر جمالیات کے نقادوں پر ۱۹ ویں صدی تک نہیں پڑا۔ اگرچہ VICO GIAMBATISTA نے تعقل کی دنیا کے تعلق سے جمالیاتی دنیا کی خود مختاری پر زور دیا ہے اور کانٹ نے بھی جمالیات اور تعقل کے درمیان حد امتیاز مقرر کرتے ہوئے حسن کے نظریہ کو منطق اور جمالیات کے دائرے سے آزاد کر لیا۔ تاہم انہوں نے ۱۹ ویں صدی کے وسط تک فن کو نفسیاتی بنیادیں کو فراہم کرنے کی کوشش نہیں کی نتیجہ یہ کہ حسن محض ایک تجرید بن کر رہ گیا جس کا ماخذ مقدس حسن مانا گیا۔ جمالیات کے نقاد ہمیشہ فن کے معنوں میں حسن اور جمالیاتی تجربے سے دور رہے۔ ان لوگوں کی توجہ کا مرکز خاص کردہ تصورات اور تشریحات تھیں جن کا تخلیقی رجحانات اور محسوس فن پاروں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ کانٹ نے موسیقی کے بارے میں حفظان صحت کا HYGIENIC نظریہ پیش کر کے اسے سستے، عامیانہ اور بازاری خیال کے ساتھ ملا دیا جس کے مطابق تبسم اور موسیقی برابر ہیں۔

موسیقی کی داخلی فطرت کی گہرائیوں میں جھانکنے سے نظریہ سازوں کے لئے حیاتیاتی BIOLOGICAL اور ایک طرح جذباتی نظریات غیر مستحکم ہو گئے۔ SCHOPENHAUER اور EDWARD HANSLIK نے جذباتی نظریات کے خلاف اعلان جنگ کیا اور موسیقی کو اظہار ہیئت کی مخصوص مثال قرار دیا۔ بعد میں اس نظریہ کی اشاعت جوش اور مستعدی سے ہوئی کہ موسیقی کا جذباتی پہلو غیر جمالیاتی ہے۔ اور جذبات کی پرورش حسن کے خلاف ہے۔ یہ خیال بھی پیش کیا گیا کہ موسیقی کو مخصوص کیفیات، جذبات اور جوش کو برانگیختہ کرنے سے احتراز کرنا چاہیے، بصورت دیگر اس کی خود مختاری اور اس کا میدان عمل سلب ہو جائے گا۔

جرمن نقاد REVESZ کہتا ہے کہ "میں بھی موسیقی سے بیدار ہونے والے جمالیاتی تجربے کے تاثر اور کیفیت مزاج کی اہمیت سے انحراف کرنے کے بغیر اس نقطہ نظر کا حامی ہوں" اس کے مطابق جذباتی کیفیات کو تجربے کے لئے اس کی کیفیت میں فائق نہیں ہے احساس کا بے شک تخلیقی کام اور اس کی لطف اندوزی میں حصہ ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ یہ تخلیقی عمل اور جمالیاتی تجربے کے درمیان ایک فیصلہ کن کردار ادا کرتا ہے۔ ایسی صورت میں پھر ہمیں احساس کی اہمیت کے لئے موسیقی کی تخلیق اور اس کے لطف کے دوران اس کی داخلی موجودگی اور اس کی متاثر کن قوت کو ثابت کرنے کا اہل ہونا چاہیے تھا۔

اس سلسلے میں تمام موسیقار ایک ممتاز جذبے کے تحت اپنے موسیقانہ خیالات اخذ کر کے انہیں انگیخت کر سکتے تھے۔ یہ ممکن ہے کہ مخصوص موضوعات کا وجود مخصوص ذہنی کیفیات اور مخصوص داخلی تجربوں کی پیداوار ہو، مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ جذبات فی الحقیقت تخلیق کو جنم دے سکتے ہیں اور بعض اوقات اس کی عمومی خصوصیات پر بھی اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہ اس کی ہیئت اور اس کے جوہر کو مقرر نہیں کر سکتے کیونکہ موسیقی کے تکمیلی اجزاء اور اس کی ہیئتیں موسیقیانہ اظہار کی خود ودیعتیں ہیں۔

سُر اپنے نفسی عضویاتی PSYCHO - PHYSIOLOGICAL فطرت کے باعث جسم پر قوی اثرات مرتب کرسکتے ہیں اور روح کو نفاقی سطح کو برانگیختہ کرتے ہیں۔ اس طرح سے جو احساسات ابھرتے ہیں وہ بہرحال موسیقانہ احساسات نہیں ہیں کیونکہ بہروں اور گونگوں میں بھی خوشی اور رنج کے وقت، ایسے ابتدائی جذبات دیکھے جاتے ہیں جو ارتعاشات سے خارج ہوتے ہیں۔

اگرچہ موسیقانہ تجربے کے دوران میں ہم حقیقی احساسات ACTUAL FEELINGS کو دبانے میں کامیاب بھی نہیں ہوتے اور وہ بالفرض ابھر ہی گئے، تب بھی موسیقی کے جمالیاتی نقطۂ نظر سے ان کی اہمیت کم ہے۔ اگر موسیقی ہم پر غنائی اثر کرتی ہے تو ہمیں اجمالی میں اس کی تشخیص ان جذبات سے کرنی چاہیے جو سُروں سے انگیختہ ہوتے ہیں۔ یہاں دو باتیں ذہن نشین ہونی چاہئیں، ایک یہ کہ فن پارہ کا اثر اندازہ نہیں ہوتا، دوم یہ کہ یہ حسی نفسیاتی SENSOUS PSYCHOLOGICAL اور عضویاتی اثر کا معاملہ ہے۔

اگرچہ اس طرح سے برانگیختہ ہونے والے جذبات موسیقی کو ایک مخصوص جادو بخشتے ہیں، تاہم یہ خالص جمالیاتی تجربے کے نا فق ہیں بلکہ یہ جمالیاتی کیف کی ترسیل میں مانع ہوتے ہیں۔ پس موسیقی کے جمالیاتی ردعمل کے لیے ضروری ہے کہ جمالیاتی طور پر حساس شخص نفسی جوشش کو ذہنی PSYCHIC EXCITATION کو دبا کر موسیقی کے تخیلی حافظے CONCATENATION کے مطابق اپنے آپ کو بنائے۔ صرف اسی ذریعے سے وہ موسیقی سے منسلک سلاسل کو منضبط کر کے انہیں فنی تجربے سے تجاوز ہونے سے روک سکتا ہے۔

جمالیاتی رسائی یا مظہریاتی ہیئت حاصل کرنے کے لیے ایک دوسری ہی بات کا تقاضا کرتی ہے یہاں فن پارہ اپنے تشکیلی عناصر (ہیئت، بناوٹ، تنوع، وسعت، ہیئت کی اکائی وغیرہ) کے ساتھ فیصلہ کن شے ہوتی ہے۔ یہ براہِ راست رسائی نہیں ہے۔ موسیقانہ تخلیقات کو ان کی جمالی خصوصیات کے حوالے سے سمجھنے اور ان پر فیصلہ دینے کے لیے جمالیاتی وجدان، قوت تجزیہ، وسعت علم اور اسلوب کا قطعی احساس ہونا لازمی ہے۔ چنانچہ FRANCIS J COLEMAN نے فن کے نقاد کے لیے اوّلین شرط عمیق احساس قرار دی ہے۔ فن موسیقی کے نقاد کے بارے میں وہ کہتا ہے:

"IF HE IS A CRITIC OF MUSIC HE MUST HAVE GOOD PITCH" پس مظہریاتی رسائی کا اصل مقصد موسیقی سے قطع نظر دیگر علامتی فنون میں زیادہ آسانی سے تشریح کے پہلو نکالنا ہے۔

اگر ہم موسیقی کو اسکے ہمہ جہت اثرات مرتب کرنے کے لیے آزادانہ ماحول فراہم کریں تو علامتی فن کی طرح ہم اس سے بھی بیرونی رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ فن میں مظہری رسائی کا مطمح نظر فن پارے کو اس کی فنی ہیئت، اس کے تمام پہلوؤں اور اس کی محرکاتی قوتوں کو گرفت میں لانا ہے۔ تخلیق فن کار کا ارادہ جمالیاتی طور پر حساس شخص کی مظہری رسائی سے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ کانٹ کے خیالات میں جمالیات کی عمومی قدر و قیمت کو داخلی تخلیق میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ کسی بھی فن کا جذباتی اور جمالیاتی موضوع عمومی قدر و قیمت کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ موسیقی کی سماعت یا کسی مجسمے پر دھیان دیتے وقت سب میں ایک ہی طرح کے کیفیت مزاج، راحت اور سکون کے احساسات پیدا نہیں ہو سکتے۔ کسی بھی فن پارے کے پُرکیف اثرات یا ان کی مخالف سمت اس کی عمومی قدر و قیمت کی سند نہیں ہو سکتے، بلکہ فن کی قدر و قیمت کا معیار جمالیاتی تجربہ ہونا چاہیے، جو جمالیاتی تجربہ ہم مظہری اور تجزیاتی ساختیاتی رسائی ANALYTIC STRUCTURAL APPROACH سے حاصل کرتے ہیں اور یہی جمالیاتی تجربہ جمالیاتی تحسین کی تنقیدی بنیاد بھی ہے!

نفسیاتی مظاہر (جذبہ، احساس وغیرہ) اقداری دنیا سے خارج ہیں۔ حتیٰ کہ وہ مخصوص احساسات اور کیفیتِ مزاج جو فن کی پیداوار ہیں اور جنہیں عموماً ابتدائی جمالیاتی احساسات کہا جاتا ہے۔ جمالیات سے نہیں نفسیات سے متعلق ہیں۔ نتیجہ یہ کہ جمالیات میں نام نہاد نفسیاتی جمالیات کا کوئی رجحان نہیں۔ نفسیاتی جمالیات تجزیاتی نفسیات کا ایک شعبہ ہے جس کے مطابق فن (بشمول موسیقی) کا فنی قدر و قیمت کے ساتھ نفسیاتی رشتہ ہے۔ اسے شئے کو روح محسوس کرتی ہے اور ذہنی ہیئت دے کر مکمل طور پر اس کو تشخص بخشتا ہے۔

G - REVESZ کے مطابق فن کار جذباتی تجربے کے لیے فن کی تخلیق نہیں کرتا ہے بلکہ اس کا مقصد اپنے آپ کو اپنے وجدانی مقاصد کے ساتھ ظاہر کرنا ہوتا ہے ایک زرخیز فن کار اپنے ان موسیقانہ خیالات کو ہیئت دے کر مرتب کرتا ہے جو اسے وجدانی طور پر

اصل ہوسکتی ہے جب کہ جمالیاتی طور پر حساس سامع ان خیالات کو اپنے اندر ضم کر کے فن پارے کے بہت قریب آجاتا ہے۔
سُروں کے مرکب حتیٰ مادہ کی علامت ہوتے ہیں۔ انہیں بہ انداز نو ہیئت پذیر کر کے موسیقی کے اندر حسن پیدا کیا جا سکتا ہے۔ ایک ماہر موسیقی
چاہے کہ وہ دوسروں کے فن پاروں کی تخلیق نو میں ان نفسیاتی عوامل کا تجزیہ بدرجہ اتم کر کے اپنی دفاعی قوت کو بروئے کار
لے تاکہ کاغذ پر لکھے ہوئے سُروں میں جان پڑ جائے۔ موسیقی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ اپنی اس مخصوص ہیئت کی وجہ سے انسانی عمل کو ایک
نغموں اور خود وجود دیتا ہے جو دوسرے عوامل سے آزاد ہے۔ یہ لفظ اور حرکت کے درمیان ہم آہنگی کی ایک لطیف علامت ہے۔ چنانچہ فن
کی کوئی اور شاخ موسیقی کے مقدار کے برابر ترکیب حاصل کرنے کی اہل نہیں ہے۔

دوسرے فنون کے مقابلے میں موسیقی کے تخلیق ہوتے ہوئے زیادہ گہرے اور پنہاں ہوتے ہیں ایک ایسی فضا بنتے ہیں جس میں فرد INDIVIDUAL اور اجتماع COLLECTIVE ایک غیر منقسم ترکیب بناتے ہیں۔ خود عظیم اساتذہ موسیقی کے فن پارے بھی ان مخصوص خیالات، ہیجانات اور تمناؤں کے حامل ہیں جن کی جڑیں اجتماع میں پیوست ہوتی ہیں۔ اس نقطہ نظر سے دیکھیے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔ کہ موسیقی نہ صرف فنکار کے موسیقانہ خیالات کی مظہر ہے بلکہ یہ ان اجتماعی مقاصد کو بھی ظاہر کرتی ہے۔ جو اس کی پیدائش اور ترتیب میں برابر معاون ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ زندگی کی تہ میں اور فنکار کے علاوہ روح کی آرزوئیں اور میلانات بھی جو حیطۂ شعور میں بھی داخل نہیں ہوتے موسیقی میں بیان ہوتے ہیں۔

فن اپنی حساس قوت کی وجہ سے انسانی شعور کی سطح کی تہوں میں کار فرما قوتوں کے عوامل سے بہت قبل رد عمل کرتا ہے پس فن بالخصوص موسیقی کے لیے ارادہ INTENTION بہت اہم ہے۔ *

بقیہ صفحہ ۳۹ بیسوا

ے فارغ ہو کر ادھر کسے... پھر الآخر فراغت سے چند روزہ رخصت اصل کی اور BISTRO میں دروغن کا کام ہونے لگا۔ کھڑکیاں، دروازے پلریں اور پھر پردے فرنیچر، برتن، آرائشی مجسمے کٹ لک کی جان اور محرابیں جھاڑیں کتنا ہی سامان تھا۔ ہر روز فہرست میں اضافہ ہوتا رہتا۔ ایک کمرہ جس کے ساتھ کچن اور ٹوائلٹ بھی تھا گذشتہ ان روز سے بودھ راج تیلا کی غلامی میں حاضری دینے نہیں گیا تھا۔ افریقی اور وہ دونوں اسی جگہ ڈیرہ ڈالے بیٹھے رہتے بھی ادھر ہی بسر ہو جاتی۔

افریقی دھلے ہوئے برتن کپڑے سے خشک کر کے کاؤنٹر کے دروازے والی الماریوں میں سجا رہا تھا۔ اور بودھ راج میزوں پر گل دستے نمک مرچ کی شیشیاں ترتیب دینے میں مصروف تھا۔ یہ آخری دن تھا جس کے بعد BISTRO کا افتتاح قرار پایا تھا۔

یکایک بیرونی دروازہ کھلا۔ تیلا اور آنند پاس چند پولیس افسران کے ہمراہ اندر داخل ہوئے۔ یہی ہے... یہی ہے... تیلا انگلی اٹھا کر کسی بد مست جنونی کی طرح چنگھاڑی۔ اور آفیسر نے آگے بڑھ کر اس کا بازو تھام لیا۔

وہ اسے کشاں کشاں کھینچتے ہوئے باہر آئے افریقی تازہ تازہ یتیم ہونے والے بچے کی مانند سسکیاں چھپاتا زخمی نگاہوں سے ساتھ ساتھ کھنچا چلا آیا۔ بودھ راج کسی میت کی مانند اس کاندھوں کے ساتھ دفنانے لے جایا جا رہا تھا۔

باہر آکر پولیس کی وین میں بیٹھنے سے پہلے بودھ راج نے مڑ کر حسرت سے BISTRO کی جانب دیکھا شب و روز کی گہرائی میں جاکر کیا جائے تو سالہا سال کی محنت کا یہ چمکتا ہوا شاندار نتیجہ یکایک اس سے چھین کر دور کر دیا گیا تھا۔ دروازے پر کھڑا افریقی شانے پر پڑے کپڑے سے اپنے آنسو پونچھ رہا تھا۔

اور آنند پاس نے اگلا دروازہ کھول اپنی گاڑی کی نشست سنبھالی۔ پچھلی سیٹ پر تیلا کے پہلو سے لگا بیٹھا بودھ راج... بہت واضح طور پر بودھ راج کو دکھائی دیا تھا۔ اور پولیس وین کا رخ ایئرپورٹ کی جانب جانے والی شاہراہ کی جانب موڑ دیا گیا.....

ایک تر و تازہ نئی بیسوا منڈی میں آچکی تھی۔ *

شاعر کی توسیع اشاعت میں تعاون دیجئے

ارمان نجمی

خیالِ خواب کی دنیا اُجڑ ہی جاتی ہے
شگفتہ زندگی کی صورت بگڑ ہی جاتی ہے

کشادگی کی فضائیں سمٹ کے رہتی ہیں
زمیں کے سینے پہ دیوار گڑ ہی جاتی ہے

ہوا کے سامنے سینہ سپر رہے کب تک
شجر کی سانس بھی آخر اکھڑ ہی جاتی ہے

رواں تو پھر بھی وہ رہتی ہے خشک سالی میں
ندی کی چال مگر سست پڑ ہی جاتی ہے

شگفتگی کا مقدر ہے بے نشاں ہونا
مہکتے پھولوں کی پتی بھی جھڑ ہی جاتی ہے

بچا کے لاکھ رکھو اپنے بام و در لیکن
گزرتے لمحوں کی کچھ چھاپ پڑ ہی جاتی ہے

کسی بھی رشتے کی میعاد دائمی تو نہیں
بدن سے روح بھی اک دن بچھڑ ہی جاتی ہے

● پوسٹ بکس ۹۳ - جیزان (سعودی عرب)

ماہ طلعت زاہدی

ایک جزیرہ خوابوں کا تھا جس میں رہتے تھے میں اور وہ
دھوپ رنگیلی چھاؤں نشیلی تھی گھومتے رہتے تھے میں اور وہ

چار دنوں کے اس جیون میں ایک دن ایسا آتا تھا
صبح سے لے کر شام ڈھلے تک خوب ہنسے تھے میں اور وہ

دکھ کے طوفاں درد کے دھارے چار طرف تھا ان کا شور
تھا سیلاب بلا کا جس میں آ کے پھنسے تھے میں اور وہ

باتیں چاند ستاروں جیسی دل بیلے کی کلیوں سے
کہاں گئے وہ موسم جن کے دیوانے تھے میں اور وہ

خواب سی باتیں خوابوں ہی میں بیت گئیں جب آنکھ کھلی
اپنی اپنی دنیاؤں میں تنہا ہوئے تھے میں اور وہ

میں اور وہ تھے ایک حقیقت لیکن خوابوں سے کٹ کر
بے مایہ تھے اس لئے تو روتے رہتے تھے میں اور وہ

● ۱۹۱۸ - اسٹریٹ ۱۵ - آئی - ۱/۱، اسلام آباد (پاکستان)

تنویر قاضی

ان عذابوں ہی میں غزال نہ
اس کا بھی میرے ایسا حال نہ

اس کی آنکھوں کے کھیت سبز
خواب کوئی بھی پائمال نہ

وقت سے پہلے ٹوٹ جائے
جن کھلونوں کی دیکھ بھال نہ

آتی جاتی رُتوں کے منظر
کیا خبر موسمِ وصال نہ

کاش آئینے ٹوٹ کہنے لگ
کوئی تصویر حسبِ حال نہ

ایسی بے شکل اک گلی کہ جہا
فکرِ تبدیلیِ خط و خال نہ

خوف ہے پچھلے موسموں کی طر
یہ بھی تنویر دکھ کا سال نہ

● مکان نمبر ۲۲۷۵-۳ سلم
راہوالی، گوجرانوالہ کینٹ

بان ایلیو

احتیاط

سنو
اگر واقعی میں تمہیں چاہنے لگا ہوں
تو بھی اس کا اظہار نہ کرو
میری انا کی شکست تک
انتظار کرو
سنو
اگر تمہیں اپنی آنکھوں پر وشواس ہے
تو ذرا ٹھہر جاؤ
دل میں دھڑکنوں کے متوازن ہونے تک
میرے کندھے کو اپنا تکیہ نہ بناؤ
سنو
رنگوں کا سیلاب گزر جانے دو
مناظر کو اپنی جگہ ٹھہر جانے دو
چلتے چلتے اچانک کہیں رک جاؤ
ہنستے ہنستے بے وجہ خفا ہو جاؤ
کبھی دن بھر نظر نہ آؤ
کبھی آتے ہی رخصت ہو جاؤ
سنو
میری باہوں میں آکر
بے اختیار بوسوں سے
میرے ہونٹ بند نہیں کرو
ان پہ پہلے وعدے کے پھول کھلنے دو
دل سے دل کو ملنے دو
سنو
جب ہاتھ آزاد ہوں
سانسیں آزاد ہوں
دل آزاد ہو
اس وقت میرے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دو

جنری مارلو

تعمیر وطن

آج میں نے بھی
وطن کی تعمیر میں ہاتھ بٹایا ہے
چیف سیکریٹری کی کار کو چلایا ہے
اسے ایک اہم سرکاری اجلاس میں پہنچایا ہے
اجلاس کی دعوت میں
لنچ، ڈنر اور بات چیت کا ٹھہراؤ
بھنے ہوئے چکن اور مسائل کا سلجھاؤ
آئس کریم، کھٹے میٹھے لطیفوں کے سنگھار کے لئے
کوفی۔ واپسی میں تھوڑی سی ڈکار کے لئے

آج میں نے بھی
وطن کی تعمیر میں ہاتھ بٹایا ہے
اپنا ملکی فرض نبھایا ہے
چیف سیکریٹری کی کار کو دن بھر چلایا ہے
اسے خیریت سے واپس گھر پہنچایا ہے
پچھلی سیٹ پر ادھ لیٹا وہ
مسلسل جمائیوں کے بیچ
یہ ایک جملہ
"تم نے کھانا کھایا"
دوسرا جملہ
"بھوک نہیں لگی"
میں نے بھی آج کچھ نہیں کھایا
سرکاری ذمہ داریوں سے فرصت کہاں
وقت سے کھانے پینے کی قسمت کہاں
ہم دونوں نے تعمیر وطن میں اپنا فرض نبھایا تھا
ایک مجبوری کی بھوک سے ہلکان تھا
دوسرا زیادہ کھا جانے سے پریشان تھا

جیوتی ناگر

بھوک

کھیتوں میں مکئی ضرور لہلہائے گی
برسات آئے گی
یہ نوجی خوش وقت
ٹھہر جائے گی
راشن بھوک کو مٹائے گا
اور سرشی سکڑی آنتوں میں
اناج جگمگائے گا
لیکن جب تک
بہت سے بابا ہو جائیں گے
سفید لباسوں میں ملبوس پادری
ان کی آخری دعاؤں کے لئے ہاتھ اٹھائیں گے
اس وقت تک بہت سے
ابھی قبروں میں
زمینی کیڑوں کی غذا بن جائیں گے
اور مہابلی سکھ کے دانے
مرنے والوں کی
آخری رسم کے کام آئیں گے

۱۰۳ ـ اسمر اپارٹمنٹ ڈاکٹر پٹنہ

جلد — ۶۵
شمارہ — ۱۰
فون: ۳۸۲۹۹۰۳

اصلاح بھی ایک نوع کا خاموش درس ہے —
شاعری ایک فن ہے۔ جس طرح دوسرے فنون لطیفہ موسیقی، مصوری، صناعی، اداکاری وغیرہ کے لیے معلم کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح فن شعر کے اکتساب کیلئے بھی ایک قادر الکلام، کہنہ مشق اور کہن سال ادیب کو رہنما بنا لینا ضروری ہے۔ بعض لوگ فن شعر میں کسی کی رہنمائی تسلیم نہیں کرتے میرے خیال میں یہ طریقہ کار غلط ہے۔ اس میدان میں خود روی، گمراہی کے معنی رکھتی ہے۔ اصلاح سے لسانی، فنی اور علمی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ کسی استاد کا شاگرد ہونے سے ایک خاص ادارۂ خیال (اسکول) سے نسبت ہو جاتی ہے۔ ایک ہموار راستہ چلنے کے لئے مل جاتا ہے۔ جو شاعر کسی کا شاگرد نہیں ہے، وہ زبان اور محاورے کے اختلافات میں ہمیشہ بھٹکتا ہے۔ اسالیب و تراکیب کے استعمال کے لئے اس کے پاس کوئی سند نہیں ہوتی اور متروکات و مختارات کی عہد بہ عہد تبدیلیوں سے وہ آگاہ نہیں ہو سکتا۔ [دستور الاصلاح۔ جنوری ۱۹۴۰ء]

سیماب اکبرآبادی

مدیر

افتخار امام صدیقی

●

معاونت

ناظر نعمان صدیقی

قیمت ۶ روپے

زر سالانہ ۶۰ روپے ◆ لائبریریوں سے ۷۵ روپے

تاحیات خصوصی ۱۰۰۰ روپے ◆ معاونین سے ۱۰۰ روپے

ممالک غیر سے
۲۵ ڈالر — ۱۵ پونڈ

معیار پبلی کیشنز کی مطبوعات

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱	کیفی اعظمی عکس اور جہتیں	شاہد ماہلی	۲۰۰/=
۲	معیار سکیفی اعظمی نمبر	شاہد ماہلی	۱۵۰/=
۳	امیر خسرو	وحید مرزا	۴۰/=
۴	امیر خسرو دہلوی (انگریزی)	پروفیسر ممتاز حسین	۸۰/=
۵	فائر ایریا (ناول)	الیاس احمد گدی	۱۵۰/=
۶	سرمایہ (شعری مجموعہ)	کیفی اعظمی	۴۰/=
۷	صاحبِ نظر پریم چند	محمود راز قریشی	۶۰/=
۸	فرہنگ کلام میر	شاہینہ تبسم	۱۰۰/=
۹	سبز پرندوں کا سفر (افسانے)	شفیع مشہدی	۴۰/=
۱۰	ٹوٹتے لمحوں کا کرب (ناول)	جعفر عباس	۳۰/=
۱۱	اُردو ہندی شاعری کی علامتوں کا مطالعہ	ڈاکٹر سرور احمد	۱۰۰/=
۱۲	انڈین نیشنل کانگریس کی تاریخ	شاہد ماہلی	۲۵۰/=
۱۳	کشکول (شعری مجموعہ)	ڈاکٹر صادق	۵۰/=
۱۴	دیواروں کے بیچ (سوانحی ناول)	ندا فاضلی	۹۰/=
۱۵	مٹی کی آنچ (افسانے)	تبسم بانو	۴۰/=
۱۶	شمس الرحمٰن فاروقی (شعر غیر شعر اور نثر کی روشنی میں)	محمد سالم	۹۰/=
۱۷	دھوپ کے کئی نام (شعری مجموعہ)	سدیپ بنرجی	۹۰/=
۱۸	مٹی موسم رنگ (شعری مجموعہ)	مشتاق علی شاہد	۵۰/=
۱۹	سنہری اداسیاں (شعری مجموعہ)	شاہد ماہلی	۱۰۰/=

نئی حسیت کی پہلی کتاب

پتھروں کی چاپ سُن لیتی ہے اعتبار کرے
آنے والی یہ صدی پوچھے گی کیا انتظار کرے

"منظر پس منظر" کے بعد

شاہد ماہلی

کا دوسرا مجموعۂ کلام

سُنہری اُداسیاں

[غزلوں کا انتخاب]

پھیلیں گی چار سمت سنہری اداسیاں
ٹھہرے گی کوئی شے نہ بکھر جائے گی یہ شام

جنوری ۱۹۹۵ء میں منظرِ عام پر آجائے گا

بہترین کتابت
خوبصورت طباعت ◆ دیدہ زیب گٹ اپ

نامی انصاری

۲۹۵/۹۹، نالا روڈ، چمن گنج، کانپور ۔ ۲۰۸۰۰۱

مرثیے کی سماجیات پر ایک نظر

اردو میں مرثیے کا سراغ یوں تو قدیم دکنی ادب سے ملنے لگتا ہے۔ مگر شمالی ہند میں سودا نے اسے پہلی مرتبہ نظم و ترتیب کے ساتھ پیش کیا اور موازنہ انیس و دبیر لکھ کر علامہ شبلی نعمانی نے مرثیے کی تنقید و تفہیم کی داغ بیل ڈالی۔ بعد میں اس کی موافقت اور مخالفت میں متعدد رسالے اور مقالے منظر عام پر آئے مگر ان کا دائرہ فکر و نظر محدود تھا اور زبان و بیان کے محاسن و معائب، جذبات نگاری، منظر کشی، رزم و بزم، بلاغت بیان اور بین و شیون کے نادیدہ نقطوں سے مرثیوں کے تجزیے کا عمل بار بار دہرایا گیا۔ مرثیے کے ناقدوں نے اشارۃً اتنا تو لکھا کہ مرثیوں کے کردار عرب ہیں۔ مگر ان کے اذکار و افکار خالص ہندوستانی ہیں یعنی ہندوستانی معاشرے کے قدیم ورثے میں ہی یہ سارے کردار اپنا تعامل انجام دیتے ہیں۔ مگر کسی ناقد نے اس زاویے سے مرثیوں کا سیر حاصل جائزہ نہیں پیش کیا۔

ڈاکٹر سید محمد عقیل رضوی نے پہلی مرتبہ مرثیوں کو سماجی صورت حال پر مبنی نقطہ نظر سے غور کیا اور اس کے نتیجے کی صورت میں ان کی نئی کتاب "مرثیے کی سماجیات" منظر عام پر آئی۔ یہاں اس بات کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اگر مرثیوں کو صرف مذہبی چیز سمجھا جائے جس کا مقصد غم حسین میں نالہ و شیون، رلانا اور ثواب دارین حاصل کرنا ہے۔ تو اولیاء کے ملفوظات کی طرح مرثیے کے بارے میں بھی کسی چون و چرا کی گنجائش نہیں ہے۔ اس طرح کی مذہبی نوعیت کی بھی تحریریں خواہ نثر میں ہوں یا نظم میں تنقید و تبصرے سے بالاتر ہوتی ہیں۔ لیکن اگر مرثیوں کی ادبی حیثیت کو تسلیم کیا جائے گا تو پھر اس کا جائزہ بھی ادبی نقطہ نظر سے ہی کیا جائے گا اور اس کے محاسن و معائب کو ادب کے تنقیدی اصولوں کی روشنی میں پرکھا جائے گا جس میں سماجیات، نفسیات، اقتصادیات، جمالیات اور اسی قسم کے تمام علوم شامل ہیں۔ اس لئے اگر مرثیوں کی سماجیات پر سید عقیل رضوی نے علمی نقطہ نظر سے غور کیا ہے۔ تو اس پر کسی کٹھ ملا ذہن کے شاد یا ناشاد ہونے کی بات ہی کیا۔

سید عقیل رضوی کا مرثیوں کی سماجیات کا یہ جائزہ فضلی کی کربل کتھا سے لے کر جوش، رئیس اور دور حاضر کے معتبر مرثیہ گو شاعروں تک پھیلا ہوا ہے اور اس کے عہد بہ عہد تبدیلیوں اور ارتقائی کیفیتوں کی کہانی کہہ رہا ہے۔ مصنف نے ایک بڑی اہم بات کہی ہے کہ امام حسین کی شہادت کے بعد برسر عام جلسوں اور مجلسوں میں واقعات کربلا کا بیان کرنا، بنوامیہ کے خلاف ایک احتجاجی تحریک تھی۔ ہندوستان میں اس نے احتجاج کے رخ کو چھوڑ کر مظلومیت کے رخ کو اپنایا اور لکھنؤ کا ہر حسینی سے زیادہ مظلوم، حسین کا عزادار بن گیا۔ یہ اس وقت کے سیاسی حالات کا تقاضا تھا کیونکہ سترہویں اور اٹھارہویں صدی کے زوال کے بعد مقاومت کا جذبہ ختم ہو گیا تھا۔ ـــــ اور عیش کوشی و بے عملی کا دور دورہ تھا جس سے مرثیوں کے رجحانات بھی متاثر ہوئے۔ دوسری طرف غم حسین میں آنسو بہانے اور مغفرت کرانے کی پالیسی میں نالہ و شیون کرنا ہی جنت کی کنجی ٹھہرا۔ لکھنؤ کے مزاج و کردار کی انفعالیت کا اثبات ثقافتی اقدار کی صورت میں نمودار ہوا۔ آخری تاجدار اودھ نواب واجد علی شاہ قید کر کے مٹیا برج پہنچا دیے گئے۔ اور حسین کی مظلومیت کا ماتم کرنے والا ایک رونا بھی کھڑا نہیں ہوا۔

مرثیے کی سماجیات کا سب سے اہم نکتہ مرثیوں کے سماجی تفاعل میں غیر اسلامی بلکہ ہندوانہ رسم و رواج کا غلبہ ہے جس کی وجہ سے کہیں کہیں ایسی منزلیں در تک پہنچا دی جاتی ہیں کہ مرثیے کی غم انگیز فضا بھی تھوڑی دیر کے لیے پس پشت پڑ جاتی ہے۔ اور ایک تضحیک آمیز ماحول کا احساس ہونے لگتا ہے۔ مرثیہ گویوں نے قاسم کے بیاہ کی تفصیلات بیان کرنے میں اتنی زیادہ توجہ صرف کی ہے۔ اور اس کو شمالی ہند کے ہندوانہ رسومات سے اس قدر خلط ملط کیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ کربلا میں حق و باطل کی جنگ کا معرکہ نہیں تھا بلکہ صرف حضرت قاسم کی شادی کا جلسہ تھا۔

چھپ جائے جس سے نور کا ناتا ہو صبا جو — دولہا، دلہن کے لینے کو آ آئے صبا جو
بھنیں کہ مرحبا، فوا نے آنچل سنے پہ آئیں — اب دیر کیا ہے، جوسے باہر دلہن کو لائیں
دل پر ہے، فراق کی شمشیر تیز کو " — ماں سے کہو دلہن کے نکلنے جہیز کو

مرثیوں میں اس قسم کے مناظر پیش کرنے کا مقصد یہی تھا کہ شمالی ہند کی عہد بہ عہد تمام تہذیبی صورتوں کی نقش آرائی کی جائے بغیر اس حقیقت کا لحاظ کئے ہوئے کہ یہ تمام رسومات غیر شرعی اور غیر اسلامی ہیں۔ جن کو یہاں کے مسلمانوں نے ہندوؤں سے سیکھا اور کچھ کمی و بیشی اور کچھ ذرا سے فرق کے ساتھ اپنی تہذیب میں ملا لیا۔ مصنف نے اس موقع پر ایک بڑا چبھتا ہوا سوال کیا ہے کہ:

"ہندوستان میں جن لوگوں نے عیسائی مذہب قبول کیا اگرچہ وہ اسی سرزمین سے وابستہ تھے اور مسلمانوں کے مقابلے میں ہندوؤں کی رسموں سے زیادہ واقف تھے۔ مگر انہوں نے ہندوستان کی کسی رسم کو اپنی سماجی زندگی میں داخل نہیں کیا۔ اور نہ یہاں کے توہمات اور تہواروں کی طرف کوئی توجہ کی۔ نہ شادی بیاہ کی رسمیں اپنائیں نہ مرنے جینے کے رسوم۔ انہوں نے اپنا رشتہ مغرب اور خصوصاً انگریزی کی عیسائی روایات سے جوڑا۔۔۔ لیکن ہندوستان کے مسلمان جو اس بات کے مدعی ہیں کہ ان کے اسلاف عراق، ایران، افغانستان، سبزوار، بخارا، شروان، مرو و خراسان وغیرہ سے آئے۔ انہوں نے شمالی ہند میں اپنی تمام رسمیں اسی طرح شمالی ہندوستان سے سیکھیں۔ دکن کے مسلمانوں نے دکن کے مقامی باشندوں میں اپنے اسلامی رسم و رواج کو ملا لیا۔ کشمیر اور لداخ کے مسلمانوں نے مقامی کشمیری ہندوؤں کے سارے رسم و رواج اپنائے۔ نہ صرف رسمیں اپنائیں بلکہ مبارک اور منحوس ہونے کے شگن اور بدشگونی کو بھی اسی طرح اختیار کیا جو اپنی اسپرٹ میں آج بھی ہندو سنسکار ہیں۔ یہ اخذ و قبول اس وقت ہے جب کہ مسلمان ہندوستان کے حکمراں بھی ہیں۔" (صفحہ ۲۶)

واقعہ دراصل یہ ہے کہ جو مسلمان وسط ایشیا اور عرب سے ہندوستان میں آئے ان کی زندگی بالکل سادہ اور بے رنگ تھی ان کے یہاں تہذیبی مظاہر نہ ہونے کے برابر تھے۔ جب کہ ہندوستانی باشندوں کی زندگی از اول تا آخر ہر قسم کے تہذیبی مظاہر سے بھری تھی اس خلا کو پر کرنے کے لئے نو وارد مسلمانوں نے بھی اور ان کی صاحب تجربہ نسلوں نے بھی بڑی تیزی سے ہندوؤں کے تہذیبی رسوم اس حد تک اپنائے کہ یہ ان کی معاشرتی ضرورت بن گئی۔ یہاں کے مسلمان صوفیوں، حکمرانوں نے بھی اپنی اپنی ضرورت کے تحت اس تہذیبی اخذ و قبول کی حوصلہ افزائی کی۔ تیمور کے خاندان و مذہب کو کیا پوچھتے ہو صاحب اب ان سے تو: قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا۔ نوابین اودھ تو سرتاسر اس رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اس لئے ہندوؤں کے رسم و رواج ایک تہذیبی ارتباط کی شکل میں مرثیہ گویوں کی شاعری میں در آئے۔ اور چونکہ اس وقت کے معاشرے کے انداز فکر سے یہ مظاہر پوری طرح ہم آہنگ تھے اس لئے مرثیوں کے سامعین نے بھی ان کی خوب خوب پذیرائی کی اور کسی کو خیال تک نہ آیا کہ ان غیر اسلامی تہذیبی نقش و نگار سے معرکۂ کربلا کی اصل صورت کیسی مسخ ہو گئی ہے۔

سید عقیل رضوی نے انیس و دبیر کے مرثیوں سے واضح مثالیں پیش کر کے یہ دکھایا ہے کہ مرثیہ گویوں نے حسین کو بادشاہ کی صورت میں پیش کر کے تمام شاہی کروفر اور آداب و تسلیمات کو ان سے منسوب کر دیا جس کی وجہ سے وہ میدان کربلا میں معرکۂ حق و باطل کے مجاہد رہنما نہیں بلکہ اودھ کے شاہ نظر آتے ہیں۔ وہی کروفر، شاہانہ طور طریق، آداب و تسلیمات، خادموں اور کنیزوں کے جلوس، دربان، چوبدار، نوبت، نقارہ، شاہی تام جھام اور شان و شکوہ کے سارے مظاہر مرثیوں میں ابھرتے ہیں اور اودھ کے حکمرانوں کی شاہانہ زندگیوں کی نقش آرائی کرتے ہیں۔

آتے ہیں اب حضور، خبردار! ہوشیار! — نذریں خوشی کی دینے کو حاضر ہوں جاں نثار
گھوڑے سمند و سرو دیشاں سے ساتھ ہیں، — پریوں کے غول تخت سلیماں کے ساتھ ہیں،
دربان عصا اٹھا کے بڑھے جانب یسار — داہنی طرف نقیب گئے باندھ کر قطار
آآ کے در پہ لونڈیاں چلاتی ہیں بار بار — آئے ادھر سے اب، نہ کوئی جائے زینہار
آواز غیر سن کے وہ اندیشہ کرتی ہیں — آہستہ بولو دختر زہرا اترتی ہیں (دبیر)
فرش سے دستی ہے اخدام شہ عرش نشیں — صاف کرنے لگے فراش ترائی کی زمیں، (انیس)

بلراج کومل

دھوپ

دھوپ کل تک
چھتوں سے منڈیروں سے
آہستہ آہستہ
شرماتی، سمٹی
دبے پاؤں
آنگن میں نیچے اترتی تھی
معمول سے
کیسے کھل جایا کرتی تھی وہ دیکھتے دیکھتے
رنگ
سونا
تمازت
لٹاتی تھی ہاتھوں سے
جی کھول کر
اپنے چاروں طرف
سب کو چاہتی اور چوبند رکھتی تھی
دن کے سفر میں
عجب دھوپ تھی
وقتِ رخصت
شفق رنگ
شیریں تبسم کے جادو سے
وعدہ یہ کرتی
وہ کل صبح پھر آئے گی
اور دن بھر رہے گی
یہیں درمیاں وہ ہمارے
یہیں شام تک

یہی وہ دھوپ تھی
جو ذرا دیر پہلے
یہاں آج آنگن میں اُتری تھی
واماندہ قدموں سے
پل بھر رُکی
بس فقط ایک پل ہی
اچٹتی ہوئی ایک خالی نظر سے
سمیٹا تھا آنگن کو
اور ایکا ایکی
وہ چپ چاپ
اُلٹے قدم ایسے چل دی
کہ اب اس طرف
بھول سے بھی
کبھی لوٹ کر وہ نہیں آئے گی۔

رن بھومی

کالی رات بھی میرے اندر
سُرخ، سنہرا روشن دن بھی میرے اندر
ننھا سا اک بالک بھی
عمر کے آنگن سے چھپتی چھپتی
اک بوڑھا بھی میرے اندر
اک ناری کے اندر میں تھا
اک ناری اب میرے اندر
میں قاتل تھا، میں نے جس کو
اپنے ہاتھ سے قتل کیا تھا
وہ بھی میں تھا
میں ہی مجرم
میں ہی وہ مظلوم جو اب بھی دستک دیتا ہے
منصف کے دروازے پہ
صبح سویرے ہوا کا جھونکا
شام ہوئی تو آگ کا طوفاں
دُور دُور تک پھیل گیا ہوں

میں ہی لوری
میں ہی نغمہ
رقص کا ہالہ
میں ہی نوحہ
میں شبنم میں ہی انگارہ
کیسی جنگ رہی صدیوں سے
میری رن بھومی میں جاری
اندر باہر شور ہے میرے
میں ہی جیتا میں ہی ہارا

ای-۱۲۹، کالکاجی، نئی دہلی — ۱۹

انوخان

۴۸/۱۲۲، کنگھی والی چال، شیخ برہان قمرالدین اسٹریٹ، بمبئی

بسر ہو سکے تو بسر کیجئے

نالش کر رہا تھا کہ پھر فون آیا۔ چونکا والد صاحب نے اٹھایا۔ نس روڈ سے رمیش بھائی کا فون تھا۔ رمیش بھائی سوشل ورکر ہیں۔ اور بڑی تن دہی سے کام کرتے ہیں۔ اپنے علاقے کی بہبودی کا انہیں بڑا خیال رہتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ چند ماہ بعد اسمبلی انتخابات ہونے والے ہیں۔ اس لئے ان دنوں وہ کچھ زیادہ ہی سرگرم ہیں۔ بہرحال وجہ جو بھی ہو کم از کم اپنے علاقے کے لوگوں کے کام تو آتے ہیں۔ ویسے بھی آج کل بے غرض کوئی کام نہیں کرتا۔ ورکر سے بھی کیوں۔ اب ہماری سوچ بدل گئی ہے۔ اب تو ہم خود نہیں چاہتے کہ کوئی بے غرض ہمارا کام کرے اس میں ہمیں ہتک محسوس ہوتی ہے۔ کام کرو اور اپنا پیسہ لے۔ وہ اپنے گھر خوش ہم اپنے گھر خوش۔ اس رقم جیب پر زیادہ گراں نہ ہو۔ فسادات کے بعد ان کا چھٹا یا ساتواں فون تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ہم بہنس روڈ پر اپنی ڈسپنسری پھر شروع کریں۔ جو فسادات کے دوران بری طرح توڑ دی گئی تھی۔ غنڈے دروازے تک نکال کر لے گئے تھے۔

وہاں زیادہ تر لوگ غریب ہیں۔ جھونپڑیاں بہت ہیں۔ بلکہ بعض جگہ تو زمین میں گہرے گڑھے کھود کر ایک منزلہ جھونپڑیاں بنائی گئی ہیں۔ چلتے چلتے دفعتاً زمین کی سطح پر آنکھیں ابھرے لگے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور انسان سہم سا جاتا ہے۔ برسات میں پانی بھر جاتا ہے پھر ملیریا تیزی سے بڑھ جاتا ہے۔ غلاظت کے انبار ہر طرف جمع رہتے ہیں۔ ہفتے میں ایک بار صفائی والے آتے ہیں۔ نصف غلاظت اٹھاتے ہیں آدھی وہیں چھوڑ دیتے ہیں۔ دو روز بعد پھر وہی انبار جمع ہو جاتا ہے۔ [illegible] اسلامی تنظیم نے صفائی نصف ایمان ہے کے پوسٹر لگا رکھے ہیں۔ کچرے اور غلاظت کی وجہ سے لوگ آئے دن بیمار رہتے ہیں۔ ہماری ڈسپنسری وہاں خوب چلتی تھی۔ ۳ تا ۷ بند رہتا تھا۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہم اور علاقے سے کم پیسے لیتا تھا۔ مجھے بہت ہے۔ یہ غریب لوگ زیادہ پیسے نہیں دے سکتے۔ والد صاحب نے مجھے ڈاکٹر اسی خیال سے بنایا ہے کہ میں خلق خدا کی خدمت کروں اور دنیا عقبیٰ دونوں سدھ جائیں۔ وہ خدا ترس انسان ہیں۔ [illegible] نمازی ہماری پشتینی کپڑوں کی دکان ہے۔ اس لئے مالی آسودگی بھی ہے ہمارے گھر کا ماحول بھی کچھ ٹھیک ٹھاک ہے۔ ایسے ہی [illegible] اور گھروں میں آپ دیکھتے ہیں۔

والد صاحب ڈسپنسری دوبارہ شروع کرنے پر رضامند نہیں پہلے ہی تقریباً پچاس ہزار کا فرنیچر تباہ ہو چکا ہے۔ والد صاحب دوبارہ رسک نہیں لینا چاہتے۔ رمیش بھائی کے اصرار پر والد صاحب نے مجھے بھیج دیا ہے۔ رمیش بھائی کا کہنا ہے کہ آس پاس کے ڈاکٹر ایک تو فیس دوگنی لیتے ہیں۔ دوسرے کئی دن تک علاج جاری رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کا پیتھولوجیکل لیباریٹریوں سے بھی کمیشن بندھا ہوا ہے۔ مریض کو آئے دن کسی نہ کسی ٹیسٹ کی ہدایت رکھتے ہیں۔ اور سینکڑوں روپے یونہی نکل جاتے ہیں۔ ان لوگوں کے درمیان کام کرتے ہوئے انسیت سی ہو گئی تھی۔ اس لئے میں خود دوبارہ وہاں جانا چاہتا ہوں۔ لیکن ایک اندیشہ یہ بھی ہے کہ ایسے غنڈے جو سوشل ورک کے نام پر سفید پوش بنے ہوئے ہیں۔ شاید میری واپسی پسند نہ کریں۔ اطراف کے ڈاکٹروں سے وہ نذرانے وصول کرتے رہتے ہیں۔ اور ڈاکٹر برائے عافیت خاموشی سے ان کا منہ بھرتے رہتے ہیں۔ بلکہ ایسا ظاہر کرتے ہیں کہ وہ اپنی خوشی سے دے رہے ہیں۔ ان سوشل ورکروں کی دوا دارو میڈیکل ٹیسٹ سب فری ہوتے ہیں۔ اگر میں واپس گیا تو یہ سوشل ورکر ممکن ہے ان ڈاکٹروں کی خاطر پھر کوئی ہنگامہ کروا دیں۔ اس لئے رکا ہوا ہوں ورنہ چلتی ہوئی پریکٹس سے کون منہ موڑ سکتا ہے۔ میں نے حسب عادت

کی ... شخصیت ... میں یکجا تھیں۔ اس کی ذاتی تسکین
کے لیے ان میں سے کسی شخصیت اور گھر کے سکون کی قربانی کیوں دوں؟
کیا یہ خواہش کے چناؤ کو تھا ہے اور اس کے درمیان
کھویا ہوا کسی کشمکش کا کچھ پتا نہیں ہے۔ پھر آخر یہ قضیہ
حل کیوں نہیں ہو سکتا
اس کا ایک ہی حل میری سمجھ میں آیا ہے کہ میں اپنا اور بیرن
بھائی کا سر قلم کر کے اسے خوان میں پیش کر دوں کہ اب اس کے بعد
وہ خوش ہو، جشن منائے یا ابیل کی طرح دھاڑیں مار مار کر روئے
دیکھنا صرف یہ کہ اس کا حسب حال کیا ہے۔
وہ سب خون کا پیاسا ہے کیا کیا جائے۔
اسے خون کا رشتہ ہے کیا کیا جائے
اچانک ہی نیچے سے چیخنے کی آوازیں آنے لگیں۔ فرحان کا
دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔
اس نے کانپتے ہاتھوں سے چائے کی پیالی میز سے اٹھا کر ہونٹوں
سے لگالی۔ چائے برف ہو گئی تھی ہاتھ تیزی سے کانپا اور پیالی فرش
پر گر کر چور چور ہو گئی۔
نیچے سے مسلسل تیز تیز آوازیں آ رہی تھیں۔
فرحان نے جھانک کر دیکھا اس کا بڑا بھائی ہاتھ میں ننگی تلوار
لیے مغلظات بک رہا تھا
اس کی شریانوں میں لاوا پکا ہوا گرم ہونے لگا۔ آج اس نے یہ فیصلہ کن
خراج پیش کر دینا ہے۔
وہ ایک جست میں سیڑھیاں طے کر کے نیچے پہنچا اور سینہ تان
کر کھڑا ہو گیا۔ لو آج آخری فیصلہ کر لو۔ تو بے خون کا پیاسا بھائی، ہمیشہ
کے لیے بھائی تو تلوار میرے اندر پیوست کر دو۔
اس جھگڑے کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دو۔
مگر گالیاں اگلتی ہوئی اس کی آواز خاموش ہو گئی۔
اس کی گردن جھکتی ہی چلی گئی۔
اس کے ہاتھوں سے تلوار چھوٹ کر گر گئی اور خستہ لکڑی کی طرح دو
ٹکڑے ہو گئی۔
وہ پھپک پھپک کر بچوں کی طرح رونے لگا۔ ✻

بقیہ صفحہ ۱۲۱ — کالا سپیکر

وہ وہاں سے چلا اور پھر بستی کے باہر آ گیا۔ اس کی ہمت جواب
دینے لگی۔ اس کا دل بوجھل ہونے لگا۔ کال چکر میں پھنس کر موکش کا
کلمات ڈھونڈنا کتنا کٹھن ہے۔ مگر جس نے تقدہ راستہ ڈھونڈ لیا تھا
بہت پہلے، پھر گم کیسے ہو گیا۔ وہ تھک کر پھر اسی پیڑ کے نیچے لیٹ گیا۔ الجھا
الجھا سا، پریشان اور مجبور انسان کی طرح۔
وہ نیم غنودگی میں تھا کہ ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی۔ اس نے دیکھا کہ
کروٹ بدلنے سے چیونٹیاں اور بڑھ گئیں۔ وہ چونک پڑا بھری نظروں سے ادھر ادھر
دیکھنے لگا۔ ہوا میں تیزی آ گئی تھی۔ فضا میں غبار سا چھا گیا ہر چیز
دھندلی ہونے لگی۔ پہاڑ، درخت، میدان، دھرم شالا سب کچھ
دھول میں چھپ گیا۔ یہ تو آندھی آ رہی ہے۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا
ہوا چیخنے لگی تھی۔ وہ اٹھا اور پورب کی طرف کو بھاگا۔ وہ بھاگتا
رہا بھاگتا رہا۔ نہ اسے بھوک یاد تھی اور نہ پیاس نہ تھکن کا احساس
تھا بس روح کی نجات کے لیے اسے ضروری لگا کہ وہ اسی طرح
بھاگتا رہے۔
اچانک وہ چونک اٹھا اور وہاں سی جگہ پہنچ گیا تھا جہاں سے
اس نے اپنا سفر شروع کیا تھا سامنے ہی وہ پتھر کی چٹان تھی جس پر
وہ تحریر کندہ تھی۔
"اے انسان تو کال چکر میں پھنسا ہوا ہے"۔ راہل کی آنکھیں
دھندلانے لگیں اس نے آنکھیں پھاڑ کر چٹان کو گھورا
"نروان پانے کے لیے آتما کو کشٹ دینا ہی پڑے گا"۔
راہل نے اس پتھریلی چٹان پر اپنا سر رکھ دیا۔ اور پھوٹ
پھوٹ کر رونے لگا۔ ✻

بقیہ صفحہ ۴۰ — رجحانات

سچے ادیب ہیں تخلیق کار اپنے لفظ و معنی کو از سر نو سجائیں۔ سنواریں۔ اس کے لیے مذہب بیزاری کے بغیر، دانشوری کی تمام موجود
و معلوم شاہراہوں کے تناظر میں اپنے شعر و ادب سے روشن خیالی کی ایک نئی تاریخ ترتیب دیں۔ جدیدیت، مابعد جدیدیت یا اس سے بھی آگے جو کچھ
ہو گا وہ سب نامعلوم سے نامعلوم کی طرف ذہنی سفر ہو گا۔ لیکن اب اس سفر کو ۶ سو سال کی مذہب بیزاری والی دانشوری سے الگ کرنا ناگزیر ہو گیا ہے
اس پر تدبر کیجئے۔ ✻

ساقی فاروقی

10, SUNNY GARDENS ROAD
LONDON NW4 1RY
(U.K.)

نگاہ قہر آسا اور مصرعہ مخدوم

اگر اس امر کو خود ستائی یا غیر ضروری انانیت پر محمول نہ کیا جائے تو میں یہ کہنا چاہوں گا کہ میں ۱۹۳۶ء کے اوائل تک ترقی پسند شعراء کی تحریک اور ان کے لب و لہجے کے اثرات سے آزاد ہو چکا تھا۔ اتفاق سے یہ وہی سال ہے جب ترقی پسند مصنفین کی تحریک نے اپنی زندگی کے ۵۰ سال پورے کئے اور میں نے بھی اسی کے ساتھ بائیسویں برس میں قدم رکھا۔ میری بدقسمتی کہ اردو ادب میں ترقی پسند مصنفین کی انجمن کے قیام کا وہی سال ہے جو میری پیدائش کا سال ہے۔ یعنی ۱۹۳۶ء۔ اس طرح ہم دونوں ایک ہی سال معرض وجود میں آئے۔

گو کہ میں ترقی پسند شعراء کے اثرات سے کلیتاً آزاد ہونے میں کامیاب ہو چکا تھا مگر ان کے طرز فکر یا ان کے نظریات سے علاحدگی نہیں اختیار کی تھی کہ یہ دردمند لوگ تھے اور ایک بہتر معاشرے اور بہتر مستقبل کے خواہاں۔ یہی وجہ ہے کہ جتنا ہی ہماری تیسری دنیا اور خاص طور پر ہمارا برصغیر افلاس و ناانصافی کی جال میں پھنستا گیا اتنا ہی ذاتی طور پر میں ان کے نظریات سے قریب ہوتا گیا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ میں ایسے تذبذب، مایوسی یا قنوطیت میں گھرا ہوا ہوں کہ ڈر لگتا ہے کہیں کسی صحت مند سوچ کے فقدان کی بنا پر محض مزاج کا غرور اور ضد کر کے رہ جاؤں۔

چونکہ اس طرح کے تفکرات میں مبتلا ہونے اور اس کے نتیجے میں ترقی پسندوں کے مخصوص رجحانات پر یلغار سے نظر ڈالنے سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہو رہا ہے میں عجیب گومگو میں مبتلا ہوں۔ اگر ماضی قریب پر نظر ڈالوں تو ترقی پسند ادب کے گمراہ کن رجحانات مجھے ان سے دور ہٹا لے جاتے ہیں۔ کیوں کہ ان تمام حضرات کے طریق کار یعنی معروضیت کے بجائے جزبیت، شعری اخلاص کی جگہ صحافتی مصلحت، تدریس و تعمیر کی حد بندی، سوالوں کے بجائے محض جوابوں میں غلطیاں رہنے یا ابہام و تحلیل کی جگہ قطعیت کے استعمال نے صداقت کل کو عصری تدریس کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا رکھا ہے۔ اس سلسلے میں ان تمام حضرات نے بہت سے پاکیزہ، محترم یا آفاقی نوعیت کی تفہیم سے بھرپور الفاظ کی بے حرمتی کو بھی اپنا شعار بنا لیا ہے اور یہ کچھ اس طرح ہوا ہے کہ ہر معنی خیز اور بھرپور اصطلاحات اور ترکیب کی نوعیت محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ مثلاً ادبیات کا تصور صرف برطانوی سامراج سے رہائی اور سحر کے معانی روسی انقلاب بن کر رہ گئے۔ انفرادی طور پر فنکاروں نے شعریات و جمالیات سے قطع نظر کر کے جبری نوعیت کے آدرش اپنائے۔ اس کو آپ خواہ ایک آمرانہ نظریہ کہیں یا فکری آمریت مانیں مگر حقیقت امر یہ ہے کہ شکست ذات یا تسلیم انا کا نتیجہ شاعر اور شعریت کی موت ثابت ہوا۔ لہٰذا یہ ذکر کہ فرسودہ نظریات و تصورات کی کوریں دکوتاہ نظر تقلید نے گھسے پٹے جملوں، ترکیبوں اور سیاسی نعروں کی وضع کی تراکیب کو ادب کا مقام عالی عطا کرنے میں ہاتھ بٹایا، اب غیر ضروری سا لگتا ہے۔ جو شعر جیسا کہ میں سمجھتا آیا ہوں تکمیل شخصیت کے کم حقہ اظہار ہی نہیں بلکہ خود زمزمہ ہائے حیات کی رنگ آمیزیوں سے عبارت ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ شاعر ایک مخصوص تاریخی تناظر ہی کی پیداوار ہوتا ہے لیکن معنی اس کے یہ ہرگز نہیں کہ وہ ہمیشہ ایک ہی محور پر مقیم رہے۔ اس کو تو ہر وقت ایک طرح کی حالت سفر ہی میں رہنا ہے۔ بلکہ اور آگے بڑھ کر نئے امکانات، نئے جہان معنی اور نئے تصورات زمان و مکان سے ہم آہنگ ہونے کی کوشش کرنا چاہئے۔ اور اسی کے ساتھ پھر اس کا منصب یہ بھی ہے کہ وہ لاشعور اور نامعلوم سے بھی دست و گریباں رہے۔

مگر ایک عجیب مشکل یہ ہے کہ فیض، مخدوم، مجاز، سردار جعفری، اس زمانے کے ندیم، ساحر، کیفی، وامق، نیاز اور مطلبی وغیرہم کے بعد آنے والے نہال فناؤں کا جائزہ لیجئے تو صرف چند گھسے پٹے تصورات یا اصطلاحات ہی ہاتھ لگتے ہیں۔ گویا صلیب، دار، مقتل، سویرے، اور انتساب [illegible]

مظفر حنفی

میں شاعر ہوں، مری پرچھائیں مستقبل پہ پڑتی ہے
مگر تاریخ کی ہر چوٹ میرے دل پہ پڑتی ہے

مری کشتی کو بھر دیتا ہے جلتی ریت سے ظالم
اگر پتوار سے اک چھینٹ بھی ساحل پہ پڑتی ہے

سبھی کو جان پیاری ہے، کوئی سمجھائے منصف کو
نظر کیوں پھیر لیتے ہیں اگر قاتل پہ پڑتی ہے

بگولے کا سفر اندھا سہی، لیکن بلندی سے
ہماری گمرہی کی گرد ہر منزل پہ پڑتی ہے

مظفر دوستوں نے زخم پھر سے کر دیئے تازہ
دلاسا کیا ہے، اک تلوار سی بسمل پہ پڑتی ہے

● شعبۂ اردو، کلکتہ یونیورسٹی، کلکتہ (مغربی بنگال)

ظفر گورکھپوری

آنکھ کھلنے کی کوئی ساعت تھی
وہی اپنے لئے قیامت تھی

اس نے اب سوچنا شروع کیا
حادثہ کی اُسے ضرورت تھی

ایسے انکار پہ تعجب کیا؟
یہ تو دیوار کی عبارت تھی

تھا کلہاڑی کا زخم برگد پر
چھاؤں اپنے لہو میں لت پت تھی

وقت سے پہلے لازمی تھی موت
دیکھنے سوچنے کی عادت تھی

ہائے وہ دن جب اس کا دھیان تھا سائباں
نیند نہ تھا پھر بھی سر پہ اک چھت تھی

● اے۔ ۳۰۲، شاستری نگر۔ اندھیری، بمبئی ۵۸

شارق جمال

تھا اس کے اختیار کے باہر کبھی کبھی
نکلا ہوں میں حصار کے باہر کبھی کبھی

راہِ سفر تھی، دھند کا جنگل مرے لئے
آیا ہوں اس غبار کے باہر کبھی کبھی

ہوتا نہیں ہے شہر وہ میرے یقین میں
رہتا ہے اعتبار کے باہر کبھی کبھی

اس راہ گیر کو بھی ملا لطف چھاؤں کا
اشجارِ سایہ دار کے باہر کبھی کبھی

میرے قلم نے لمحے ملاقات کے لکھے
اک حرفِ انتظار کے باہر کبھی کبھی

بے فکر و مطمئن وہ ملا نفس کے خلاف
ماحولِ خوش گوار کے باہر کبھی کبھی

دیکھا ہے موجِ آب کی تحریر کا طلسم
کاغذ پہ، جوئبار کے باہر کبھی کبھی

● مومن پورہ۔ ناگپور (مہاراشٹر)

پر تقریباً روزانہ ہی گھر والوں پر چلاتے تھے اور جب کھانا کھانے بیٹھے تو انہیں اور بھی حیرت ہوئی۔ آج دال اور اچار کے بجائے آلو کا ساگ، پوری دہی بڑے اور میٹھی چٹنی نظر آئیں۔ ایسا کھانا تو صرف تہوار پر ہی نصیب ہوتا تھا۔ وہ خوش ہو گئے۔ انہوں نے بیوی کی طرف دیکھا! آج بھی اس کا منہ سوجا ہوا تھا۔ تین دن سے وہ ایسا ہی دیکھ رہے تھے۔ ان تین دنوں میں انہوں نے وجہ بتانا چاہی۔ مگر وہ تو ان کے پاس بیٹھی ہی نہیں۔

کھانا کھانے کے بعد معمول کے مطابق جب وہ پلنگ پر لیٹنے لگے تو تینوں لڑکے ان کے سامنے دست بستہ سر جھکائے آ کھڑے ہوئے۔ یہ بات خلاف توقع تھی۔ انہوں نے غور سے بیٹوں کو دیکھا پھر پوچھا "کیا بات ہے؟"

"آپ سے ایک گزارش ہے" ایک نے کہا:

"ایک نویدن ہے" دوسرے نے سر جھکاتے ہوئے کہا

"ایک پرارتھنا ہے" تیسرے نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا

"ہم لوگ تو سبھی کیا بات ہے؟" انہیں حیرت ہوئی۔

"آپ ہمارے مہان باپ ہیں!"

"آپ نے ہمیں بہت محبت سے پالا ہے

آپ نے دکھ مصیبتیں جھیل کر ہمیں ہر طرح کا آرام دیا ہے خوب پڑھایا ہے، مگر بات تو بتاؤ۔ آج کون سی ایسی مصیبت پڑ گئی کہ تم تینوں میرے پاس ایک ساتھ آئے ہو؟"

تینوں نے ایک ساتھ ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر بڑے نے اخبار ان کے آگے بڑھا کر ایک خبر پر انگلی رکھ دی۔ انہوں نے خبر پڑھی۔

صوبائی ملازموں کو اب وقت سے پہلے مرنے میں بہت فائدہ

دارالحکومت — صوبائی حکومت نے آج ایک حکم جاری کر کے ان سرکاری ملازمین کے قرضے معاف کرنے کا فیصلہ کیا ہے جو ملازمت میں رہتے ہوئے مر جائیں گے ان کے لواحقین کو گریجویٹی بھی دگنی ملے گی۔ پینشن پوری ملے گی اور مرنے والے کی بیوی یا بیٹے یا بیٹی جو بھی ملازمت کرنا چاہے گا اسے ملازمت ملے گی۔"

خبر پڑھنے کے بعد انہوں نے تینوں لڑکوں کو دیکھا: "اس خبر میں کیا بات ہے میں سمجھا نہیں —" ایک بیٹے نے کہا "پتاجی آپ نے اچھی عمر پالی ہے۔ شاندار طریقے سے زندگی گزاری بہترین طریقے سے نوکری کر کے جوانی رنگین بنائی لیکن ہماری جوانی بنا نوکری کے نالی کے کیڑے کی طرح رینگ رہی ہے۔"

"ارے مقصد تو بیان کرو۔"

دوسرے بیٹے نے سعادت مندی سے عرض کیا "پتاجی — اصل بات یہ ہے کہ آپ جب تک نوکری پر رہے — ہمیں فائدہ دیتے رہے۔ اب ہم چاہتے ہیں کہ آپ جلدی سے پرلوک سدھار کر ہمیں اور بھی فائدہ پہنچائیں۔"

کیا مطلب؟ ان کی آنکھیں تن گئیں۔

تیسرے بیٹے نے دست بستہ ہو کر کہا۔ "پتاجی آپ کے ریٹائرڈ ہوتے ہی آپ کی تنخواہ آدھی رہ جائے گی، مکان کا کرایہ بند ہو جائے گا۔ گھر بھر کی بیماری کے علاج کے پیسے اور قرضوں کے بیوں کے پیسے ملنا بند ہو جائیں گے ہر ماہ کا گھر بیٹھے کا "ٹی اے، ڈی اے" ختم ہو جائے گا۔ اور جو رشوت ملتی تھی وہ بھی بند ہو جائے گی۔"

"پھر — کہنا کیا چاہتے ہو جلدی کہو!"

چھوٹے بیٹے نے کہا "پتاجی آپ کو تو معلوم ہے سرکاری نوکری کا ملنا آجکل کتنا مشکل ہو گیا ہے۔ حکومت نے جو رعایت دی ہے کہ جو سرکاری ملازم ملازمت میں رہتے ہوئے مر جائے گا اس کے ایک بیٹے کو نوکری مل جائے گی چونکہ آپ تین دن بعد ریٹائرڈ ہو رہے ہیں۔ اس لئے پورا گھر اندھیرے میں ڈوب جائے گا ہم چاہتے ہیں کہ آپ ریٹائرڈ ہونے سے پہلے مر جائیں تاکہ اس گھر میں دیئے جلیں۔

"بدتمیزو! تمہیں شرم نہیں آتی مجھے مارتے ہوئے" وہ غصے میں کانپنے لگے اور ایک زوردار تھپڑ چھوٹے بیٹے کے مارا۔

میں نے تمہیں اسی لئے کھلا پلا کر بڑا کیا ہے کہ مجھے مار ڈالو کمینو! ذلیلو" وہ ایک ایک بیٹے کو زور زور سے جھنجوڑتے ہوئے چلاتے۔ تینوں لڑکے سر جھکائے سعادت مندی سے کھڑے رہے۔ "اجی سنتی ہو تمہارے سپوتوں کی باتیں" وہ بیوی کو بلانے کے لئے چلاتے۔

ان کی بیوی جو دروازے کے پاس ہی کھڑی ہوئی تھیں جلدی سے کمرے میں داخل ہوئیں اور کہنے لگیں۔ "ارے ہے۔ بچے سچ

وہ کمرے میں پہنچے تو بیوی نے ان کے لئے کھانا لاکر رکھ دیا۔ اور خود بھی ان کے قریب بیٹھ گئی۔

"اے جی میں تو ڈر گئی تھی کہ کہیں تم سچ مچ ہی نہ مر جاؤ۔"

وہ جھنجھلا گئے، کہنے لگے۔ "تو کیسی دھرم پتنی ہے پہلے تو مرتا۔ سہاگن مرنے سے سیدھے سورگ میں جائے گی۔"

"ارے بچوں کے فائدے کے لئے کوئی جھوٹ تو کہے تو میں تیار ہوں مرنے کے لئے کوئی کہے تو۔ لیکن میرے مرنے سے بچوں کو کوئی فائدہ تھوڑی ہو گا؟ اب دو وقت کی روٹی پکا دیتی ہوں یہ اس سے بھی جائیں گے!"

"تم میں تو آٹا گوندھنے کے بھی گن نہیں ہیں۔"

لیکن میں نے تیرے ساتھ ایسا کون سا برا سلوک کیا ہے جس سے تو مجھے آتم ہتیا کرنے پر مجبور کر رہی ہے۔"

وہ رونے لگ گئیں، "بھلا اپنے سہاگ کو بھی مرنے کو کوئی عورت کہہ سکتی ہے۔ میرا تمہارا تو جنم جنم کا ساتھ ہے مگر مجبوری تو صرف بچوں کی ہے اگر وہ اچھے کام دھندے پر لگ گئے ہوتے، نوکر ہوتے تو تمہیں مرنے کا کہتا ہی کون؟"

وہ رونے لگ گئے۔ ماں باپ اولاد کی اس لئے تمنا کرتے ہیں کہ وہ کام آئے گی، سہارا بنے گی دکھ درد میں کام آئے گی۔ لیکن یہ تو مجھے زندہ ہی مارنے پر تلے ہوئے ہیں۔"

بیوی بولیں "دیکھو مرنا ہے تو مر جاؤ۔ نہیں مرنا ہے تو مت مرو مگر خود مت یہ اپ شکنی مت کرو۔ بڑھاپے کی عمر ہوتی ہے ہم ہر آن کو کہتی ہوں کہ مگر ان سب کو بڑھاپا آنے سے پہلے ہی اٹھا لیا کرے۔ بچے دیتے کوئی بڑھاپے میں کام نہیں آتے۔ ماں باپ، سڑے گلے پڑے رہتے ہیں پھر اس پہ ان کی بیویاں اور ستاتی ہیں"

"میں تو مر کر بڑھاپے سے چھٹکارا پا جاؤں گا مگر تو زندہ رہے گی بڑھاپا جھیلے گی۔ تیری دوا دارو کون کرے گا۔ خدمت کون کرے گا۔

بتا جی آپ اس بات کی ضمانت کیجئے۔"

انہوں نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ تینوں لڑکے سامنے کھڑے تھے۔

"آپ ہم سے قسم لے لیجیے" ایک بیٹے نے کہا۔

"محلے والوں کے سامنے گیتا اٹھوا لیجیے"،

"دو روپے کے اسٹامپ پر لکھوا لیجیے" تیسرے بیٹے نے کہا۔

"آپ کے مرنے کے بعد ماں کو ذرا سی بھی تکلیف ہم نہیں ہونے دیں گے۔" تینوں نے یک زبان ہو کر کہا۔

بیوی بولیں "اب تو چنتا چھوڑ دو۔ اب تو مر جاؤ۔ ایسی لائق اولاد کسے نصیب ہوتی ہے۔"

وہ گم سم ہو گئے انہوں نے گردن جھکا لی۔ بیوی اپنے پتی کی طرف جھکتی ہوئی نرمی سے بولی "ذرا سوچو تو، ماں باپ اپنی اولاد کے لئے ساری اٹھا پٹک دھوکہ دھڑی بے ایمانی کرتے ہیں تاکہ وہ سکھ سے رہیں۔ ہم نے اپنی جوانی بہت سے گذاری سرکاری عمر تو اٹھاون سال ہے لیکن حقیقت میں تمہاری غیر سرکاری عمر پینسٹھ سال ہے۔ کنڈلی دیکھو تو اب نہیں مروگے تو دو چار سال بعد مجبوری سے مروگے۔ لیکن یہ تو آتم ہتیا ہے پاپ ہے۔"

اوہو۔ زندگی بھر بیوی بچوں کے لئے کون سے نیک کام کئے۔ پاپ ہی پاپ کمائے مرنے کا ایک پاپ اور سہی۔ پتا جی! بڑا لڑکا ادب سے بولا: سارے پاپ دان پنیہ سے دھل جاتے ہیں اگر آپ ہماری فرمائش پر مر جاتے ہیں تو ہم ایک سو ایک برہمنوں کو کھانا کھلائیں گے۔ اصلی ڈالڈا گھی کا۔"

پتا جی! دوسرا لڑکا بولا، "تیجا اور بارھواں دھوم دھام سے باجے گاجے کے ساتھ کریں گے۔"

پتا جی! تیسرا لڑکا بولا "ہم آپ کی قربانی یاد رکھنے کے لئے ایک میموریل کرکٹ ٹورنامنٹ رکھا کریں گے۔"

پتا جی پلیز! مر جائیے نا۔ تینوں لڑکوں نے یک زبان ہو کر گذارش کی۔ ——— "لیکن میں ابھی مرنا نہیں چاہتا۔"

"تو پھر کب مروگے" بیوی بولیں۔

"اگر دو دن بعد مرے تو پھر کیا فائدہ؟"

اب تمہاری کون سی تمنائیں باقی رہ گئیں ہیں؟ بڑھاپے میں تو بس بچوں کے رحم و کرم پر پڑے رہوگے اور بوجھ بنے رہوگے پتا جی یہ سنہری موقعہ ہاتھ سے مت جانے دیجئے۔ بڑا لڑکا بولا آپ کو یاد ہوگا۔ ابھی ڈیڑھ سال پہلے اس شہر میں دنگا فساد ہوا تھا کئی لوگ مارے گئے تھے سینکڑوں لوگ زخمی ہوئے تھے۔ حکومت نے مرنے والوں کے رشتہ داروں کو ایک ایک لاکھ روپیہ

ضرور تھا جیسا بیٹی کو ڈگری دی تھی۔ ترقیوں کو ہزاروں روپے
بچاتے تھے بینکوں سے کم سود پر بنا رشوت لے لیست جلد اور فراخ دلی
سے قرض دیئے تھے۔ شہر کے لوگ کہتے ہیں کہ ہمیں پتہ نہیں فساد کب ہونگے
فسادات سے آغاز بردست فائدہ ہوگا۔ ورنہ ہم بھی دنگے میں مر جاتے
یا کم ایک ٹانگ یا ایک ایک ہاتھ ہی دنگائیوں سے کٹوا لیتے۔
تو فائدہ ہوتا۔ اب پتہ نہیں دنگا فساد ہو یا سی انتظار میں بیٹھے ہیں نہ
معاوضے سے سرکاری ملازم تو دنگے میں مرنے کے لئے تیار ہیں۔ دو دو
سو روپیہ ملیگا۔ ڈھیر سارا سرکاری قرض معاف ہوگا اور دوسرے فنی فٹ الگ"
تیسرا لڑکا بولا۔

"ہاں پتاجی" تیسرا لڑکا بولا "اسی لئے تو سرکاری ملازم
سرکار سے ہر مد میں ڈھیر سارا قرض لینا شروع کر دیا ہے اور اب
لگے فساد کے انتظار میں ہیں۔ مگر اب پتہ نہیں کب دنگا ہو لیکن
قدرت نے آپ کے لئے ہمارے اس گھر کے لئے ایک سنہری
موقع دیا ہے۔ اسے کھوئیے مت" پتاجی بڑا لڑکا بولا۔ "آپ نے
حکومت سے ہر مد میں قرض لیا ہے لیکن واپس ایک پیسہ
نہیں دیا ہے۔ یہ سب پنشن میں کٹ جائے گا۔ بتائیے اب پنشن
ملیں گے کتنے روپے۔ اگر پنشن پانے سے پہلے آپ مر جاتے
ہو تو سارا قرضہ معاف۔ ذرا سوچئے۔"

"سچ تو کہہ رہے ہیں تمہارے یہ بیٹے" بیوی بولیں "جو دوسروں
لئے مرتا ہے وہ شہید کہلایا جاتا ہے۔
تم اپنے بیٹوں کی محبت کے لئے دم بھرتے ہو کچھ تو ثبوت دو۔
لی دو امر ہو جاؤ گے۔"

"ہاں پتاجی پلیز مر جائیے نا" منجھلا گڑگڑایا۔

"تم سب ہمارے بوڑھے باپ کو مارنا چاہتے ہو۔ میری جائداد
لوٹنا چاہتے ہو۔" وہ غصے میں کانپنے لگے پھر بیوی سے
مخاطب ہوئے "اور تو کیسی بدل گئی۔ دیکھ لینا میرے مرنے کے
بعد تجھے کوئی پوچھے گا بھی نہیں۔ یہ لوگ زمین جائداد کے بٹوارے
میں ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے۔" "نہیں پتاجی" بڑا
بولا۔ "ہم سب نے آپس میں طے کر لیا ہے کہ ہم لڑیں گے نہیں۔
جائداد [illegible] کے مطابق بانٹ لیں گے۔"

دوسرا لڑکا بولا "چھوٹا بھائی آپ کی جگہ نوکر ہو جائے گا۔
کہ اس کی عمر ابھی کم ہے اس لئے زیادہ عرصے تک

نوکری کر کے خوب کمائے گا۔"

چھوٹا بولا "مجھے بھائی سو بیگھہ زمین کنواں اور ٹریکٹر کے مالک
ہو گئے۔"

بڑا بولا "آپ کی ساری گریجویٹی بینک میں جمع شدہ رقم زیورات
شیئرس۔ یہ مکان مع چھ دکانوں کے یہ منجھلا مالک کل ہوگا۔
البتہ آپ کے جو تین بنے بنائے پلاٹ ہیں اس میں ایک میرا اور ایک
چھوٹے کا ہوگا۔"

چھوٹے نے کہا۔ "اور تیسرا پلاٹ وہ آپ کے آخری کریا کرم
کے لئے ریزرو ہے۔"

منجھلے نے کہا۔ "چونکہ ماں کو فیملی پنشن ملے گی دوا دارو کا
خرچہ حکومت دے گی۔ اس لئے ماں منجھلے کے ساتھ ہی رہے گی ماں
کا آخری کریا کرم وہی کرے گا ہماری کوئی ذمہ داری نہیں ہوگی۔"

"کتنے لائق ہیں ہمارے بیٹے" ماں نے اپنے بیٹوں کی طرف دیکھ کر
بلائیں لیں۔ "سارا بٹوارہ کتنی شانتی اور محبت سے کر لیا۔"

"ہاں پتاجی۔ نہ لڑائی جھگڑا نہ جگ ہنسائی۔
نہ مارپیٹ نہ تھانے میں رپورٹ
نہ اسپتال کی مصیبت نہ عدالت کے چکر۔
پتاجی ہمیں آشیرواد دیجئے۔" تینوں پتا کے قدموں کی
طرف جھکے۔

"نکل جاؤ کمینو! نالائقو! تم لوگ میرے دشمن ہو دشمن،
میں تم لوگوں کی صورتیں دیکھنا پسند نہیں کرتا۔ تمہارا کوئی حق نہیں
میری دولت جائداد پر۔ اور کہتا تو بھی نکل۔ آج سے تو اور
میں الگ الگ۔" انہوں دھکے دیکر سب کو کمرے سے باہر نکال دیا اور
کواڑ بند کر لئے۔ بیوی نے دروازہ پیٹتے ہوئے کہا۔ "اجی کھولو،
کھانا تو کھا لو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں میں تمہاری دھرم پتنی ہوں
میں تمہاری بھلائی چاہنے والی ہوں۔ سوچو تو تمہارے بڑھاپے کا
وقت ہے۔ اب ہم ان کے رحم و کرم پر ہیں۔ اگر یہ خوشحال رہیں گے
تو ہمیں بھی سکھ سے رکھیں گے۔ سوچو تو۔" "پتاجی۔ پتاجی" بڑا لڑکا
دروازے پر ہونٹ رکھتے چیخا "ذرا ہوش سے کام لیجئے۔ غصے
میں یہاں اس کمرے میں آتم ہتیا مت کر لینا ورنہ ہم مصیبت میں پڑ جائینگے
ہاں پتاجی اگر آپ نے اس گھر میں آتم ہتیا کر لی تو ساری زمین جائداد
مفت میں کچہری اور تھانے میں تقسیم ہو جائے گی ہم کنگال ہو جائینگے

پھر ماں کا کریا کرم بھی نپٹ جائے [illegible] کریں گے۔" "کمال ہے" چھوٹے نے کہا "کیا زمانہ آ گیا ہے۔ پہلے زمانے میں تو اولاد ہی نالائق ہوتی تھی مگر اب تو باپ بھی نکمے ہونے لگ گئے۔"

صبح کے نو بج رہے تھے تینوں لڑکے دیر تک سونے کے عادی تھے۔ چھوٹا لڑکا پہلے اٹھا آس پاس چکر لگا کر تیزی سے واپس آیا اور دونوں بھائیوں کو جھنجھوڑا۔ "بھیا بھیا اٹھو۔ پتا جی نے کھانا کھایا ہے بہت خوش ہیں ماں سے ہنس ہنس کے باتیں کر رہے ہیں۔"

تینوں لپک کر باپ کے کمرے میں پہنچے پتا جی دفتر جانے کے لئے تیار تھے ہاتھ میں فائل تھی چہرہ بشاش تھا ماں پاس ہی کھڑی تھیں خوش دکھائی دے رہی تھیں۔

"پتا جی" تینوں ہاتھ جوڑتے ہوئے ان کے قدموں پر جھک گئے۔

"جیتے رہو" انہوں نے تینوں کے سروں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے آشیرواد دیا۔

"پتا جی آپ مہان ہیں۔ ہم کبھی آپس میں لڑیں گے نہیں۔"

"پتا جی آپ بہت دیاوان ہیں ہم کبھی آپ کو بھولیں گے نہیں"

"پتا جی ہم آپ کی اس قربانی کا جیون بھر پرچار کریں گے آپ کو امر بنائیں گے اور لوگوں کو آپ کے نقش قدم پر چلنے کے لئے تیار کریں گے۔"

تینوں بیٹے اشکبار تھے ماں کی آنکھیں بھی چھلک آئیں۔

"بیٹو! باپ کتنا ہی سنگدل سہی مگر اپنے بچوں پر مہربان ہوتا ہے"

وہ جب جانے لگے تو چھوٹے بیٹے نے کہا "آتم ہتیا بہت ہوشیاری اور احتیاط سے کیجئے گا اگر ذرا کہیں چوک ہو گئی تو پولیس کیس بن جاتا ہے آپ لولے لنگڑے ہو جائیں گے۔ اسپتال کے چکر ہمارے بس کی بات نہیں۔"

"چپ" بڑے نے ڈانٹا "وہ ہمارے باپ ہیں ہم سے زیادہ سمجھدار ہیں۔"

انہوں نے ایک نظر سب پر ڈالی اور دروازے سے باہر نکل گئے۔ لڑکوں نے ہاتھ جوڑ کر آنکھیں بند کر کے پتا کو آخری پرنام کیا۔ بیوی پھپھک پھپھک کر رونے لگی تو تینوں بیٹوں نے انہیں لپٹا کر تسلی دی۔ "ماں رو مت۔ دھیرج رکھو بس ایک دو سال کی بات ہے پھر آپ اور پتا جی دونوں ایک ساتھ سورگ میں ہوں گے۔"

تینوں بیٹوں کو امید تھی کہ باپ جس طرح خوش خوش آشیرواد دے کر گئے ہیں تو وہ اب واپس نہیں [illegible] انہوں نے [illegible] جاگرن کا پروگرام رکھا تاکہ ان کی آتما [illegible] رات بھر بھجن کیرتن ہوتے رہے۔ پاس پڑوس والے [illegible] تک کیرتن کرتے رہے پھر وہ دھیرے دھیرے کھسکنے لگے۔ تینوں لڑکے پہلے ہی اپنے کمرے میں جا سوئے تھے۔ ماں بھی کیرتن والے کمرے میں ایک کونے سے لگی اونگھ رہی تھی۔ پنڈت [illegible] آگے بیٹھا شلوک پڑھ رہا تھا اور اس کے سامنے بیٹھا [illegible] پنڈت کے شلوکوں کو دہرا رہا تھا۔

صبح سب سے پہلے چھوٹے کی آنکھ کھلی کان میں شلوکوں کی آواز پڑی کھڑکی سے جھانکا سویرا ہو رہا تھا۔ وہ لپک کر گھر سے باہر نکلا اور دکان سے اخبار لے آیا۔ پورے اخبار کو چھان ڈالا۔ من چاہی خبر اسے نہ ملی اس نے دونوں بھائیوں کو اٹھایا اور اخبار بڑے کو دیتے ہوئے کہا۔

"بھیا اس اخبار میں تو کہیں بھی کسی بھی آدمی کے آتم ہتیا کرنے یا حادثے میں مرنے کی خبر نہیں ہے۔"

"ضروری تھوڑی ہے کہ پتا جی نے گھر سے نکلتے ہی آتم ہتیا کر لی ہو۔ پتا جی سمجھدار آدمی ہیں۔ پہلے انہوں نے اپنے کاغذات مکمل کئے ہوں گے پھر خودکشی کا پلان بنایا ہوگا۔ موقعہ محل دیکھا ہوگا۔ ہو سکتا ہے خودکشی کا مناسب موقعہ، جگہ شہر سے دور ہو پریس رپورٹر کو خبر دیر سے ملی ہوگی۔" "ہم نے غلطی کی" منجھلے نے کہا۔ "ہمیں ایک پریس رپورٹر پتا جی کے پیچھے لگا دینا چاہئے تھا تاکہ ان کے آتم ہتیا کرتے ہی خبر وقت پر پریس میں پہنچ جاتی اور آج صبح اخبار میں آجاتی۔"

"کوئی چنتا کی بات نہیں" بڑے نے کہا "آج نہیں تو کل خبر چھپ جائے گی۔"

ابھی وہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ پڑوس کا ایک بچہ بھاگتا ہوا آیا "اجی باہر پولیس والے کھڑے تمہیں بلا رہے ہیں۔"

"پولیس والے" وہ چونک اٹھے انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا "میرے خیال سے پتا جی نے آتم ہتیا کر لی ہے" بڑے نے کہا "لاش کی شناخت کروانے کے لئے آئے ہوں گے" وہ تینوں بھاگتے ہوئے دروازے پر پہنچے سامنے دو سپاہی اور ایک حوالدار کھڑا تھا۔

حوالدار نے پوچھا "کیا آپ لوگ ہی شری [illegible]

[باقی صفحہ [illegible] پر دیکھئے]

عتیق اللہ

ہم جو تیری پناہ میں آئے تھے
اپنے دشمن بھی ساتھ لائے تھے

ہاں یہ قصہ انھیں دنوں کا ہے
جب نئے برگ و بار آئے تھے

وہ جنھیں ایک پھول تھا مطلوب
باغ کا باغ کاٹ لائے تھے

پھر وہ صورت نظر نہیں آئی
دوسری مرتبہ جب آئے تھے

کتنے برسوں کے بعد میرے رفیق
اب ذرا روشنی میں آئے تھے

ایک آنسو بھی کم نہیں ہوتا
ہم چراغوں میں بھر کے لائے تھے

واقعے کا یہ ایک پہلو ہے
ہم نے بھی آشیاں جلائے تھے

ہم نے بیٹوں کا سر کٹایا تھا
ہم نے ماؤں کے دل دکھائے تھے

● ۲۳۱، غالب اپارٹمنٹس، پیتم پورہ، دہلی-۳۴

ظفر صہبائی

کتنے کام پڑے ہیں بابا کرنے کو
تم بیٹھے ہو اب بھی ہمت دھرنے کو

کیسی اذیت ناک سزا ہے خوابوں کی
چھوڑ گئے ہیں سونے گھر میں مرنے کو

بیدردی سے نوچ لیا پھر ظالم نے
ورنہ اک دو دن میں گھاؤ تھا بھرنے کو

اب تو جاں پر کھیل سکو تو کھیلو تم
پہلے عصا تھا دریا پار اترنے کو

نیند میں اکثر چلنے لگتا ہے مریض
کتنی رات بچی ہے اور گزرنے کو

چاہت بھی جینے کی ڈوبنے والوں میں
کچھ موقع مل جاتا کاش ابھرنے کو

آب رواں بن جائیں گے طے کر ڈالا
جب دیکھا پھر سے پھوٹتے جھرنے کو

● ۳۶ - صوفیہ ہاؤس - موتیا پارک - بھوپال

نثار ترابی

نور بہ نور رنگ شب تاب کا پیچھا کرتے
عمر گزری ہے یہاں خواب کا پیچھا کرتے

ہم کسی ساحل خوش بخت پہ موجیں گنتے
ہم کسی گوہر نایاب کا پیچھا کرتے

ہم کسی ریشمی رستے کے مسافر بنتے
ہم کبھی منزل نایاب کا پیچھا کرتے

شب کے ہاتھوں پہ اترا آتا کوئی تازہ گلاب
خواب گرویدہ ہے خواب کا پیچھا کرتے

وقت کی دھوپ کو زنجیر کیے بیٹھا تھا
کس طرح سایۂ شاداب کا پیچھا کرتے

آ کے ٹھہرا ہی نہیں حد پہ ستارا کوئی
کیوں شب تار میں مہتاب کا پیچھا کرتے

کاش امڈے ہوئے طوفاں کا تجسس رکھتے
کاش ٹھہرے ہوئے گرداب کا پیچھا کرتے

کتنی صدیوں کی غنودہ تہِ آبی آئی
ہم جو اس لمحۂ بے تاب کا پیچھا کرتے

● ۵ / راین، محمد گاہ، راولپنڈی (پا

براج کمار

پلاٹ نمبر ۴۰ ادھم پور ۲۰ جموں و کشمیر

ایک خط — باتیں ہزار

شاعر ۹۳/۳ میں راشد عبدالحمید اور مشرف عالم ذوقی کے نمونے اس لحاظ سے دلچسپ ہیں کہ وہ ۱۹۸۰ء کے بعد آنے والے قلم کاروں کی الگ شناخت کی نشاندہی کرتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ ترقی پسندی اور جدیدیت کی تحریکوں نے جدید تر قلم کاروں کی کچھ حد تک ذہنی نشوونما کی ہے۔ مگر اس سے نئی نسل کو ان تحریکوں کا احسان مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ رویوں اور رجحانات سے متاثر ہونا فطری ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان دو ادبی تحریکوں نے ادبی پراگندگی اس حد تک پھیلا دی ہے کہ دم گھٹتا ہے۔ صحت مند ادبی رجحانات کی فطری افزائش کے بجائے جب ادب کی آرگنائزڈ فارمنگ شروع ہو جائے تو YIELD بڑھ جائے گی۔ مگر معیار کی قربانی بہر صورت دینی پڑے گی۔

ترقی پسند سادہ سے لوگ تھے۔ ایک خورد بینی اقلیت کے ہاتھوں میں ذرائع پیداوار اور سرمائے کی تدریجی منتقلی و مرکزیت اور معاشی بدحالی کی شکار اکثریت کے مابین کشمکش ناگزیر تھی اور اس تاریخی پس منظر میں مارکس اور لینن جیسی شخصیات کا ابھرنا یقینی تھا۔ دنیا کے ایک خطے میں مارکس کے اقتصادی نظریات کے سیاسی نظم حقیقت میں بدل جانے کے بعد پوری دنیا میں معاشی بدحالی کے شکار عوام کو خوشحالی کے سگنل چلے گئے۔ اور دانشوروں نے طبقاتی کشمکش کی حمایت میں قلم اٹھانے۔ بڑا اچھا مقصد تھا۔ نیک خیالات تھے وہ لوگ تو تھے۔ دنیا کا کوئی سا ادب ہے جو زندگی کو درپیش مسائل کی ترجمانی نہیں کرتا۔ زندگی کے لاتعداد مسائل کی بھیڑ میں ایک مسئلہ معاشیات کا بھی ہے۔ ترقی پسندوں نے اس مسئلے کو ابھارا۔ بڑا مستحسن قدم تھا۔ لیکن ان لوگوں نے ایک غلطی کی کہ اس مسئلے کی نسبت سے پیدا ہونے والے دوسرے مسائل کی منفی تصویر کے علاوہ باقی کچھ بھی دیکھنے سے انکار کر دیا۔ یہ اسپیشلائزیشن کا دور ہے۔ دل کے ماہرین الگ ہیں۔ کینسر اور ٹی بی کے الگ۔ کپڑے کی دکانیں الگ ہیں، الیکٹرانکس اور کاسمیٹکس کی الگ — ادیب بھی اسپیشلسٹ ہے۔ زندگی کا ادیب کی نظر پوری زندگی کو دیکھتی بھی ہے اپنی گرفت میں لیتی ہے یا ایسا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ شاعر و ادیب زندگی کے کسی ایک ہی پہلو کی ترجمانی نہیں کر سکتا — وہ کوایف سید مثلاً ادب یا شاعری ہوگی۔ موضوعاتی یا پروپیگنڈے کا ادب۔ پھر آپ شاعر کو پیغمبر کا درجہ کیوں دیتے ہیں؟ پیغمبر تو پوری زندگی کا ایک اکائی کی صورت میں احاطہ کرتا ہے۔ حوالے کر لیجئے، شاعر کا منصب ہی اس کا متقاضی ہے کہ وہ مکمل زندگی کو اکائی کی صورت میں جذب کرے۔ یہ بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ زندگی کے حصے بخرے کر کے نہیں دیکھے جا سکتے۔ زندگی کو مجموعی اکائی کی صورت میں قبول کرنا پڑتا ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ دہلی اس لئے چھوڑ دیں کہ قطب مینار اور کناٹ پیلس کے باوجود وہاں فضائی آلودگی بڑھ گئی ہے۔ یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ آپ بمبئی کی تمام تر رعنائیوں سے محض اس لئے کنارہ کش ہو جائیں کہ یہ کنکریٹ کا جنگل بنتا جا رہا ہے۔ اور یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ آپ اپنے گھر سے اس لئے فرار ہو جائیں کہ گھر میں کوئی بوڑھا آدمی رات بھر کھانستا ہے۔ زندگی جس شکل میں ہے جیسی بھی ہے اسے قبول کرنا پڑتا ہے۔ اگر ہر مرد شری دیوی یا مادھوری ڈکشت جیسی خوبصورت دلہن ڈھونڈنے لگے۔ تو دنیا کی بیشتر عورتیں کنواری مر جائیں۔ ایسا نہیں ہوتا۔ پانی جب تک بہتا رہتا ہے تر و تازہ رہتا ہے اور جہاں رک گیا اس میں سڑاند پیدا ہو گئی۔ زندگی کا کام اپنی مجموعی شکل میں زندہ رہنا ہے۔ پتہ نہیں کتنے عرصے سے زندگی بہتی ہے۔ اس زمین پر زندگی اچانک ہی ظاہر نہیں ہو گئی۔ کروڑوں سال تک یہ زمین جلتی رہی۔ ٹھنڈی ہوتی رہی۔ بارشیں ہوتی

اور پھر جب صحیح درجۂ حرارت، صحیح نمی اور صحیح فضا کی آمیزش ہوئی تو زندگی ظاہر ہو گئی۔ ایک CELL کے AMOEBA سے اوپر اٹھ کر HOMO SAPIENS تک زندگی کا ارتقا و بقا کی جدوجہد کی ایک طویل داستان ہے۔ DINOSAURS بڑی ہوئی جسامت، موسمیاتی اور طبعی تبدیلیوں کے ہمراہ نہیں چل سکے، وہ ختم ہو گئے۔ مگر مینڈک آج بھی زندہ ہے۔ پانی سے خشکی کی طرف زندگی کی ہجرت کا ایک مظہر۔ DINOSAURS نے زندگی کو مجموعی حیثیت سے قبول نہیں کیا۔ انہوں نے زندگی کو جزئیات میں دیکھا، وہ ختم ہو گئے۔ اشتراکی ادب، مذہبی ادب، صوفی ادب، روحانی ادب، نسائیت نامہ خاوند و بیوی۔ اور پاک باز خاتون قسم کا ادب ختم ہو جائے گا۔ باقی رہے گا زندگی کا آفاقی تصور، زندگی کی تنوع، اکائی اور ہمہ گیریت۔ کسی ایک جزو کا احاطہ شاعر و ادیب کا مسلک نہیں بلکہ کسی بھی تحریک، آرگنیزم کا مسلک نہیں۔ لہٰذا زندگی کے کسی ایک عنصر، ایک پہلو کو خارجی سطح پر ENLARGE کرتے رہنا آئیڈیالوجیکل فاشزم ہے، ادب نہیں۔ معاشرتی اصلاحات اور معاشی مسائل کا حل اصلاح کاروں اور سیاست دانوں کا کام ہے۔ شاعروں اور ادیبوں کا نہیں۔ مہاتما گاندھی کی اہمسا کو درست ثابت کرنا ڈائریکٹوریٹ آف آئیڈیا اینڈ ورڈ پبلسٹی کا کام تھا۔ علی سردار جعفری کو اس کے جواز میں نظمیں لکھنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ ذہنی آزادی اور قلبی سکون کے بنا زندگی کو اس کے تمام مظاہر سمیت دیکھنا، سمجھنا، اور لطف اندوز ہونا ناممکن ہے اور واضح ہو کہ دنیا کے ہر شخص کا وجود UNIQUE ہے۔ اس کا کوئی ثانی نہیں اور اس لئے ہر شخص خارجی اور داخلی سطحوں پر مختلف محرکات سے مختلف حدود تک مختلف انداز سے متاثر ہوتا ہے۔ اور اس کا ردّ عمل مختلف ہوتا ہے۔ ترقی پسندوں نے غلطی کر دی۔ انہوں نے شاعروں اور ادیبوں کو ORGANISED SECTOR میں لانے کی کوشش کی۔ انہوں نے شاعروں اور ادیبوں کی REGIMENTATION کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے یونین بنا لی، فائر RETREAT اور چارج کا حکم ملتے ہی شاعروں اور ادیبوں کو ایک ہی انداز میں REACT کروانے کی تربیت کا کام قطعی غیر فطری تھا۔ اور زیادہ دیر چل ہی نہیں سکتا تھا۔ اشتراکیت کی سرخی کے ساتھ باقی کے چھ رنگوں کو چھپا پانا ممکن تھا۔ مگر پھر بھی کتنی حیرت کی بات ہے کہ ہر دور میں لوگ کسی نہ کسی کاز، نعرے یا ISSUE سے رضاکارانہ خودکشی کی حد تک متاثر ہوئے ہیں۔ کہ اب چاہے اگلے دور میں وہ کاز یا ISSUE بے معنی اور IRRELEVANT لگے۔ آج ترقی پسند حضرات شاید اس اسکوئیر، دیوار برلن کی مسماری اور روس میں لینن کے مجسمے کی بے حرمتی کا کچھ بھی جواز پیش کرتے پھریں اس تلخ حقیقت سے صرف نظر نہیں کر سکتے کہ ایک LOST CAUSE کی حمایت میں انہوں نے اپنی بہترین صلاحیتوں کو ضائع کر دیا۔

لیکن تمام تر رواداری کے ساتھ یہ تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں کہ مقصدیت کے مخصوص سانچوں میں ڈھال کر ادب کی MASS-MANUFACTURING کے باوجود ترقی پسندوں نے اردو ادب کو بہت کچھ دیا ہے اور اردو قاری کو زبان و بیان کے نئے پیمانے اور پرکشش مکالموں سے متعارف بھی کروایا ہے۔ یہ لوگ اردو شعر و ادب کے محسنوں میں سے ہیں۔ اب اگر طبقاتی جدوجہد، اقتصادی اور معاشرتی شعور کے اس دور کے تاریخی پس منظر میں ادب کو COMMIT کرنے کی کوشش اگر انہوں نے کی تو بھی اس جرم میں انہیں گردن زدنی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اور یہ کہ ان کے صدق دلانہ ایمان و اعتقادات کی تحقیر و تضحیک کسی بھی پیمانے سے جائز اور منصفانہ نہیں کہی جا سکتی۔

ترقی پسندوں کے اس انتہا پسندانہ رویے کے خلاف احتجاج ناگزیر تھا۔ مگر یہ جدیدیئے اچانک کہاں سے نمودار ہو گئے؟! مغرب میں انیسویں صدی میں جدیدیت کی لہر شروع ہو چکی تھی۔ صنعتی انقلاب، نئے نئے سائنسی انکشافات و ایجادات اور نئی ٹکنالوجی نے مغرب کی عمومی زندگی کو بنیادی سطح پر تبدیل کرنا شروع کر دیا۔ اور صدیوں سے محفوظ مذہبی، معاشرتی اور سیاسی عقائد کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اور ماضی کی نام نہاد عظمتوں کو تشکیک کے کٹہرے میں لا کھڑا کر دیا۔ لازمی تھا کہ اس دور کی اخلاقیات، نظریات، اور حسیت متاثر ہوتی۔ اور ہوئی۔ وہ لوگ بدلتے دھاروں کے ساتھ بہتے رہے۔ اور تشکیک، تنہائی، ذات کا کرب، ٹوٹتی قدروں اور بے روزگاری وغیرہ ان کے مسائل بنتے رہے۔ لیکن ایشیا اور خصوصاً برصغیر ہند میں ان دنوں آپ کیا کرتے رہے؟ مغرب جب [illegible]

اسٹیم انجن، ٹیلیفون، ٹیلیویژن، ہوائی جہاز، ویکسی نیشن، الیکٹرک بلب ایجاد ہو رہا تھا تو آپ کیا کر رہے تھے؟ افیون کی کاشت؟ وہ لوگ جب سینے پر اس موزیک، اسلام اور میکاگالان کی تشکیل کر رہے تھے، تو آپ کیا کر رہے تھے؟ بجبن پیر ترت اور وظائف؟ جب نیوٹن، گورکی، لارنس، کافکا رسل، وزیر وضاحکار تعین کر رہے تھے، تو آپ کیا لکھ رہے تھے۔ کربلا اور بابا فرید کا الف سین؟ میں پوچھتا ہوں کہ اخلاقیات کی نظریاتی اور فلسفیانہ اساس میں کب کا حصہ کیا ہے۔ صفر؟ مغرب نے اس کرب کو جھیلا ہے۔ واردات ان کے ساتھ ہوئیں۔ انہوں نے غیر یقینی کے باغوں میں مدتوں بھٹکے کاٹے اور پھر انہوں نے اپنی BEARINGS تلاش کیں۔ بدلتے ہوئے نظام زندگی کو از سر نو منظم کرنے کی کوشش کی۔ اپنے نظریات ترتیب دیئے مستعار نہیں لئے۔ اس لئے آج اگر مغرب کا فنکار تنہائی اور بے رشتگی کی شکایت کرتا ہے۔ تو یہ تجربہ اس نے خود محسوس کئے ہیں۔ مگر نہ وہ کسی اردو کے فنکار مغرب کے بال اور داڑھیاں بڑھا کر مغربی دانشوروں کا بھیک اب کیوں کر رہے ہیں؟ آپ کو کون سی تنہائی کا کرب کاٹے جا رہا ہے؟
CONSTERNATION, GHETTOS 'CRUSADES HOLY' SPANISH INQUISITION کیتھولک پروٹسٹنٹ کشمکش کنسنٹریشن کیمپوں، گیس چیمبروں، پہلی اور دوسری عالمی جنگوں کے رزمیے کرشمے دیکھنے والے مراحل سے گزرا ہے۔ مغرب اور آپ ایک ہی تقسیم پر رکھو گئے؟ جہاز آپ نہیں بنا سکتے۔ بندوقیں آپ نہیں بنا سکتے۔ کار آپ مغرب سے مانگتے پھرتے NAIL CUTTER اور کنڈوم تک آپ کو دساور سے منگوا رہے ہیں۔ یہاں کون سا سائنسی انقلاب آ گیا؟ ماروتی اور ٹیلیویژن کے اسپیئر پارٹس باہر سے منگوا کر یہاں اسمبل کرنے میں کون سا سائنسی کارنامہ سر انجام دیا ہے؟ تنہائی اور بے رشتگی کب سے مغرب کی سطح پر آپ کے مسائل بن گئے؟ ورلڈ بینک اور بین الاقوامی مالیاتی فنڈ کے دروازوں پر آپ کشکول لئے کھڑے رہتے ہیں۔ بین الاقوامی مسائل پر آپ کی رائے کی کوئی وقعت نہیں۔ مغرب کی اترن پہنا ہیں نئے ولا کوٹ آپ پہن رہے ہیں۔ آپ کے مسائل تو ہونے چاہئیں۔ بے بسی، بے چارگی، مجروح انا، پسماندگی، جذباتی اور اقتصادی غلامی، بھوک، جہالت، غربت، مگر کون سی تشکیک، کیسی تنہائی! جیسے جیسے آپ امیر ہوتے جائیں گے، ویسے ویسے رد و قبول کے جدلیاتی عمل سے آپ کی جمالیاتی حس بتدریج افضل تر ہوتی جائے گی۔ آپ پڑوس کو چھوڑ دیجئے جس نے راتوں رات دو نمبر کے دھندے میں لاکھوں کما لئے یا جس کی لاٹری لگ گئی۔ اور اس نے پورے گھر کو لال، نیلے، پیلے اور ہرے رنگوں سے پینٹ کر کے رکھ دیا۔

کچھ یہی ہوا جدیدیوں کے ساتھ۔ مغرب حادثات و واقعات کا شکار ہوا اور اس نے نئے احساسات کی آبیاری کی۔ مگر یار لوگ انجم کسی کا کو کسی کی اور اسکول میں ٹیسٹ ٹیوب بے بی کے ولدیت کے خانے میں اپنا نام لکھوا کر مفت میں باپ بن گئے۔ یونیورسٹیوں میں مغربی افکار کی تعلیم ٹھیک بات ہے لیکن محسوس کئے بغیر ہم کسی کے تجربات اخذ نہیں کر سکتے۔ کر نہ یہاں NUDE CAMPS ہیں اور نہ ہی آپ کو اجتماعی خودکشیوں کا تجربہ ہے۔

جدیدیوں نے مغربی اصطلاحیں اور موضوعات تو وافر مقدار میں درآمد کر لئے لیکن احساسات مستعار نہیں لئے جا سکتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ کافکا کے قلب ماہیت کے دیوقامت کیڑے کے جواب میں یہ لوگ شابل، کاکروچ اور مکھی وغیرہ بنا رہے ہیں۔ لغت میں سے نامانوس ترین اور کریہہ الصوت الفاظ تلاش کر کے بھدے اور تاریک مضامین کی ادائیگی کو جدیدیت کی معراج تصور کر لیا گیا ہے۔ ۷۰ اور ۸۰ کی دہائیوں میں شب خون کے اوّلین صفحات اس قسم کے اشعار سے مزین ہوتے تھے۔ ع

بکری میں میں کرتی ہے   بکرا زور لگاتا ہے

۱۹۹۳ء شب خون کے ایک شمارے کے اوّلین صفحات میں برصغیر کے ایک نامور شاعر نے "نثری شاعری" میں عورت کے کولہوں کی تعریف کچھ اس قسم کے الفاظ میں کی ہے۔

”...... مرد کی کمر میں چیتے کی کمر کا سا کس بل ہوتا ہے۔ مگر ہر دھکے (یا جھٹکے) کے ساتھ تھرکی کر (یا کر کے) اندر دھنس جاتا ہے۔ لیکن عورت کے کولہوں میں رس بھر جاتا ہے۔ عورت کے کولہوں کی گولائیاں دیکھ کر پتہ لگ جاتا ہے کہ اس نے کتنے وصل کئے ہیں....“
یہ جدید ادب کہلاتا ہے۔ کیوں صاحب! کیوں صاحب آپ بلو فلم بنا رہے ہیں۔ یا ادب تخلیق کر رہے ہیں؟ آپ سے تو بمبئی کا وہ فلمی شاعر اچھا ہے جو معصومیت سے ہر آنے جانے والے سے پوچھ رہا ہے ع ”چولی کے پیچھے کیا ہے؟“

کیا اس تلاش کی شاعری کے لیے جدیدیوں نے ترقی پسندوں سے بغاوت کی تھی؟ اور اب تو مجھے شک ہونے لگا ہے کہ جدیدیے واقعی ترقی پسندوں کی کمٹ منٹ وغیرہ سے متنفر تھے۔ یا ادب میں کسی قسم کی مقصدیت کے خلاف تھے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ترقی پسندوں کی طویل قامت سے خوفزدہ ہو کر جدیدیوں نے ایک گوریلا جنگ شروع کی جس کی ابھی تک کہیں کوئی ادبی فتح یابی نظر نہیں آتی۔ وہ دیکھ لو جیسے کہ اپنی تمام تر عالمانہ ذہانت اور خوش نمائی کے باوجود وہ آج تک ایک فیض یا کرشن چندر نہ دے سکے۔

افسانے کے ضمن میں سید محمد عقیل اور اشرف عالم ذوقی نے شاعر کے مذکورہ شمارے میں صاف کہا ہے کہ آخر ان کو سامنے کے مسائل کیوں دکھائی نہیں دیتے۔ اور میں کہتا ہوں آپ مغرب کے جھگڑے، غرفے اور تہذیبیاں اپنے گھر میں کیوں لا رہے ہیں! وہ آپ کا تجربہ ہی نہیں ہیں۔ وہ واردات آپ کے ساتھ ہوئی ہی نہیں۔ آپ کیسے ان کو محسوس کرنے کی اداکاری کر لیتے ہیں۔ کتنا عرصہ پہلے مغرب نے گلیلیو اور ڈارون کو گالیاں دی تھیں اور ہم سلمان رشدی اور نیرد چودھری کو آج معتوب قرار دے رہے ہیں۔ ہمیں گڑبڑ ہو گئی جدیدیے بیمار کیا گئے۔ انہوں نے مغرب سے سوچا اور مغرب کو محسوس کرنا شروع کر دیا۔ جو ممکن ہی نہ تھی۔ برطانیہ امریکہ کینیڈا اور دوسرے ممالک میں ہند و پاک کے تارکین وطن واک مین ڈسکو، STAG PARTIES اور PUBS میں جائیں۔ گھر جا کر وہ بچوں کو وہ اپنی ہی بولی میں لوریاں سناتے ہیں۔ جدیدیے بے شک اپنے بچوں کو انگلش میڈیم کے اسکولوں میں بھیجتے ہوں گے۔ مگر وہ انہیں چاند میں چرخہ کاتتی بڑھیا ہی کی کہانی سناتے ہیں نیل کی مانند، یا فوفلاذک کی نہیں۔ پھر یہ یادہ ہولی دیوالی کے تہواروں میں دھوم سے شامل ہو کر اپنی اور اپنے بچوں کی پہچان گم نہیں کرتے۔

کوئی بھی جدید افسانہ دیکھ لیجیے۔ ننگے کپڑوں والے شہنشاہ کی بات ہے۔ جسکے کپڑے تو دکھائی نہیں دیتے۔ کہاں ہیں کپڑے۔ وہ بیوقوف سمجھا جائے گا۔ چنانچہ شہنشاہ ننگا کھڑا ہے۔ اور درباری اونچی آواز میں کپڑوں کی تعریف کئے جا رہے ہیں۔ بڑا دانشور کہلانے کے شوق میں ایک دوسرے سے بڑھ کر لایعنیت کے سمندر میں نت نئے جزیرے تلاش کر رہے ہیں ان کا دانشورانہ انداز پروقار لہجہ نامانوس زبان، عجیب حرکات و سکنات ـــــ یہ لوگ بیسویں صدی کی آخری دہائیوں کی مخلوق معلوم ہی نہیں ہوتے۔ یوں لگتا ہے جیسے ازمنۂ وسطیٰ کی کسی چاندرات میں آبادی سے دور کسی ویرانے میں کسی الاؤ کی گرد حلقہ باندھے لمبے لمبے چغے پہنے دو لوگ ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر پس منظر سے ابھرتی ہوئی ڈھول کی ہلکی ہلکی تھاپ پر تھرکتے کسی پراسرار مذہبی رسم ادا کر رہے ہیں یا وچ کرافٹ کی مشق۔ یا ایسا لگتا ہے کہ یہ جدید افسانے، افسانے نہیں بلکہ کوڈ ورڈز میں ملٹری کے انتہائی خفیہ پیغامات ہیں جنہیں ڈی کوڈ کرنے کی KEY کھو گئی ہے۔

لیکن ایک بات ماننا ہوگی۔ کہ ہیگل، کانٹ، آرول، ایلیٹ وغیرہ کی دھونس جما کر یہ لوگ جو ایسے کم فہموں کی صفوں میں دہشت پھیلانے میں بڑی حد تک کامیاب ہو گئے ہیں۔ ثبوت ـــ؟ شاعر کا افسانہ نمبر ۱۹۹۲ء اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ افسانہ نگاروں کی ایک پوری کی پوری کھیپ کو جدیدیوں نے تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔

جب بات ہو رہی ہے تو چلتے چلاتے ستیہ پال آنند کی شکایات کا تذکرہ بھی ہو جائے۔ موصوف کو اس بات کی شکایت ہے۔ انہیں یہ غصہ ہے کہ اردو کا شعری ادب عالمی شاعری کے مقابل اپنی کوئی حیثیت کیوں نہیں متعین کر پایا!

ستیہ پال آنند کا سوال درست ہے مگر ان کے مخاطب غلط۔ اصل میں یہ سوال سر سید احمد خاں سے کیا جانا چاہیے تھا کہ انہوں نے علماء کی مخالفت کے باوجود مغربی علوم و فنون کو فروغ دینے کی ضرورت کیوں محسوس کی؟ یہ سوال ان شعراء و ادباء سے کیا جانا چاہیے جنہوں نے فلسطینیوں کی حمایت اور یہودیوں کی مخالفت میں ڈھیروں سیاہی ضائع کر دی۔ یہ سوال افتخار امام صدیقی سے کیا جانا چاہیے جنہوں نے سیاہ حاشیے اور بھورے رنگ لہجے میں اپنے غم و غصے کا اظہار کیا۔ یہ سوال ہند و پاک کے ان قلمکاروں سے کیا جانا چاہیے جو اپنی بساط کے مطابق دو قومی نظریے کو غلط یا صحیح ثابت کرنے کی کوشش میں اپنا وقت اور اپنی صلاحیتیں ضائع کئے جا رہے ہیں۔

اردو کے مشاہیر قلمکاروں اور اردو کے موقر جرائد کے مدیروں کا ادبی فریضہ ہے کہ وہ شعر و ادب کے نام پر سیاسی اور مذہبی شعور، ترنم اور صحافیانہ رپورتاژوں کو اہمیت نہ دیں کہ سنجیدہ ادبی رجحانات کی نشاندہی کریں اور ایک صحت مند ادبی

فضا کی درو سمت کی سعی کریں۔ وہ [illegible] یا حیاتی اقداروں اور [illegible] طلبا، پروفیسر اور انقلابی دانشور
پرولتاریت، بورژوائیت، سامراجیت اور پرولتاری جمہوریت کے مالک اللاپتے نظر آتے تھے۔ اب ساحر کی مری محبوب کہیں
اور طاکر جیسے یہ پرکشش نہیں رہی۔ ایک دن ہندوستان اور پاکستان کی کشمکش ختم ہو جائے گی۔ فلسطینیوں اور یہودیوں نے
بھی ایک میز پر بیٹھ کر گفتگو شروع کر دی ہے۔ ایک دن اقبال کے شاہین اور کبوتروں کی جنگ بھی ختم ہو جائے گی۔ پھر یہ احتجاجی ادب
کو ہضم ہوگا؟ پھر اس ادب کی کیا معنویت اور RELEVANCE رہ جائے گی۔

افسوس یہ ہے کہ ہم لوگ غالب اور میر کی روایت کو بھی آگے نہ بڑھا سکے۔ وہ لوگ زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے جدید علوم و
فنون سے نابلد تھے۔ وہ دقیانوسیت اور توہمات کا زمانہ تھا۔ لیکن ان لوگوں کی فکر کی آفاقیت اور ہمہ گیریت دیکھ کر عش عش کرنے کو جی
چاہتا ہے۔

آپ تو ان سے زیادہ پڑھے لکھے ہیں، آپ نے تو اپنی پیشانیوں پر دانشوری کی تختیاں آویزاں کر رکھی ہیں۔ آپ تو بات
بے بات سارتر، نطشے، یونگ اور فرائیڈ کے حوالے دے کر مرعوب کرتے پھرتے ہیں۔ آپ کو تو زیادہ کشادہ نظر اور وسیع القلب
ہونا چاہئے۔ آپ کا ذہن تو زیادہ BROAD ہونا چاہئے۔ ALL EMBRACINOT ہونا چاہئے۔ آپ کیوں ہزاروں
سال پیچھے لوٹ جانا چاہتے ہیں۔

جس زبان کے محافظ اپنے اجداد کی عظمت، اپنے اسطور کی برتری ثابت کرنے کی تگ و دو میں واپس گپھاؤں میں لوٹ جانا چاہتے
ہوں، جو زبان کے دانشور درپیش مسائل کا جواں مردی سے مقابلہ کرنے کے بجائے نئے راستے تلاش کرنے کی صعوبت اٹھانے کے بجائے ماضی
کی کوکھ میں آسائش محسوس کرتے ہوں وہ شعر و ادب کو کس قسم کی نظریاتی اساس دیں گے؟ ان کی سوچ کتنی یونیورسل ہوگی۔ اور وہ کس قسم
کی ادبی روایات قائم کریں گے اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ *

بقیہ صفحہ ۲۲ نگاہ نہ آشنا اور مصرعۂ مخدوم

ساتھ استعمال مخدوم کی بے مثل فنکاری اور مہارت پر دال ہے یہاں لفظ "ماتھے" کے استعمال پر بھی غور ضروری ہے۔
اب دیکھئے لفظ "ماتھے" کو اس کی تیکنیکی چستی کے تناظر میں۔ اس لفظ میں حرف "الف" کا استعمال صنعت گری کا نمونہ ہے کیونکہ
اس سے ایک طرح کے توازن کا احساس ہوتا ہے جب کہ دوسرا کوئی اور حرف اس توازن کا احساس ہی مجروح کر کے رکھ دیتا۔ پھر اب استعارے پر
غور فرمائیے۔ ایک طرف تورات کا بیان ہے اور دوسری طرف اس میں ستاروں کے ہجوم کا بھی ذکر۔ حالانکہ مصرعہ بجائے خود نہ تورات کے
متعلق ہے اور نہ اس کا مقصد ستاروں کی جھلملاہٹ سے کسی رومانی تصور کا احساس دلانا ہے۔ مقصد اصلی تو ایک خاموش گہرائی اور
تنہائی کے بے کراں احساس کی سنگینی ہے چنانچہ اس سے غم اور تنہائی کی ایک مکمل تجسیم جلوہ گر ہوتی ہے پورا مصرعہ ہی انتہائی بلیغ ہے شاعر
اپنے فن اور منصب سے پوری طرح واقف ہے اور اسے یہ احساس و ادراک بھی ہے کہ بہت زیادہ معنی پرور یا پیغام بردوش ہونا کسی
ایک نازک مصرعے کی شکست یا پوری نظم کے تاثر کو مجروح کرنے کا سبب بن سکتا ہے۔
مجھے لفظ "ماتھے" میں ایک طرح کے جھول کا بھی شائبہ ملتا ہے جس پر کسی قدر تاسف کرنا ناجائز بھی نہیں (میں خود ایک صوتی یا معنوی
لفظ "مانگ" کا انتخاب کرتا جس سے "دت" کی خوبی تو ضرور قربان ہو جاتی مگر چستی اور زیادہ بھرپور ہو جاتی) لیکن یہ بھی شاید میری اپنی ہی
خامی ہے کہ میں اپنے شاعروں سے ضرورت سے زیادہ توقعات وابستہ رکھتا ہوں یا یوں کہئے کہ غیر ضروری مطالبے کرتا رہتا ہوں۔ *
(انگریزی سے ترجمہ۔ قیصر تمکین)

ٹھوس غذا

میں موت کھاتا ہوں
کیوں کہ یہ ٹھوس غذا ہے
میں گولی چلاتا ہوں
جہاں پرندے ہیں

میں موت کھاتا ہوں
کیوں کہ یہ ٹھوس غذا ہے
گولی گھر کو دریافت کرتی ہے
ہم جیل کی کال کوٹھری ہیں
خواہشات کا گیت گاتے ہیں

میں موت کھاتا ہوں
کیوں کہ یہ ٹھوس غذا ہے
میری آنکھیں سورج کے خون میں ہیں
جہاں ایک گولی پھٹتی ہے
تمہارے ہتھیاروں کی گرہ ڈھیلی ہے
لہٰذا یہ چیزیں تم کو بام کر سکتی ہیں

میں موت کھاتا ہوں
کیوں کہ یہ ٹھوس غذا ہے
خون کو لمحوں میں دوڑتا ہے
کوٹھے جیل کی کال کوٹھری میں
میں اپنی زندگی کو تیزی سے کھودتا ہوں
کیوں کہ یہی ٹھوس غذا ہے

احتجاج

انسان اور کشتی بہتے ہیں
احتجاج سے احتجاج تک
ساحلوں کی طرف بڑھتے ہیں
اور تیز ریت .....

انسان اور کشتی بہتے ہیں
احتجاج سے احتجاج تک
ان کی روحیں لہروں پر گرداب بناتی ہیں

انسان اور کشتی بہتے ہیں
احتجاج سے احتجاج تک
اچانک وہ گہرائی میں دھکیل دیے جاتے ہیں

دو تیر
پیالے کو اٹھاتے ہیں
احتجاج سے احتجاج تک
اور کشتی سورج سے نبرد آزما ہے

خون کی قے

خون کی قے
تمہاری جدوجہد
نہیں روک سکتی

321 - WEST PALESTINE AVE PALESTINE TX 75801 U.S.A

تک پہنچا جہاں عورتوں اور لڑکیوں کا ہجوم تھا مگر سب بے لباس۔ راہل
چلا اٹھا نہیں نہیں یہ سب پاپ ہے۔ انہیں وستر پہنا دیجیے تو آپ بھولا
سے جسمی لیکھا پوتا تمانے اس طرح اپمان ستانا کرو۔

وہ کون ہے یہ۔ ؟ ایک آواز گونجی، کس نگری کا باسی ہے، ناری
تو سوم رس کی طرح ہے۔ پیو اور مدہوش ہو جاؤ۔ اس مدھر کو پھر بھی پتہ نہیں
شاید پھر تمھیں ستائی دے۔ فوراً سے اٹھا اور طرز کے پیر چلے۔ راہل نے
قدموں اٹھائے اور تیز تیز چلتا ہوا بستی سے باہر نکلا۔ اس کا سانس پھولا ہوا
تھا جسم پسینے سے شرابور تھا اور دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔
ناری صرف انسان کو کتنا زبح بنا دیتی ہے۔ راہل کو لگا کہ اس کے من
کی شانتی اور پوترتا کو ناری کے اس روپ نے ڈس لیا ہے۔ آہ میں
کس نگری میں جا نکلا تھا جہاں جیون پاپ ہی پاپ ہے۔ وہ اپنی بھوک
پیاس اور تھکن بھول گیا بس چلتا رہا، چلتا رہا تاکہ جلد سے جلد اس
نگری سے دور نکل جائے۔

اس کے حواس پراگندہ سے ہو گئے تھے۔ دھیان کی شکتی کمزور
پڑ گئی تھی۔ اس نے گھبرا کر اپنے ہردے کو ٹٹولا، اور یاں تبھی تو اس
کے اندر کی پوترتا کو گمان کر دیا تھا وہ تو انسان ہے۔ پھر یہ حیوانی جنون
کیوں جاگ گئے تھے؟ اب اسے چین تھا نہ قرار۔

پھر اس نے تین دن کا اپواس کیا۔ اور اپنی روح کو مانجنے میں
لگ گیا۔ شدت سے پانی سے اشنان کرکے وہ زیادہ وقت دھیان
میں لگانے لگا۔ ناری سوم نے جو کرنٹ اس کے آپ سے کا ہت ہنے
لگی تھی۔ وہ تو نجات پانے نکلا تھا۔ اپنے جیون کو لوبھ آدرشوں سے
سپھل کرنے نکلا تھا مگر کہاں جا پہنچا۔ عقل نے کہا تو نادان ہے کہ
کی راہ میں یہ کوہ راستہ ... تو روکیں گے ہی دھیان کا شاخ
بھی کریں گے ہی۔ گیان شکتی سے ان کا مقابلہ کرو ورنہ تیری اتنا سپھل
رہ جائے گا۔

رات آئی تو وہ سبز گھاس کے فرش پر لیٹ گیا اور آکاش دیکھنے
لگا ابھرتے چاند کی دھیمی اور ٹھنڈی روشنی نے اسے ایک سنئے سکھ
کا احساس دیا۔

اسے لگا کہ ناری سوم کی لالسا ختم ہو چکی تھی اس کا من بہت
ہلکا پھلکا ہو گیا۔ وہ ستاروں سے باتیں کرتا رہا صبح کا انتظار کرتے میں نہایا۔
چڑیوں کی سریلی چہکاروں نے سکون دے دیا تھی کہ وہ سوچنے لگا پہاڑ
کے پیچھے سے ابھرتا سورج، یہ جنگل کا گھنا گھنا سایہ، یہ پانی یہ پاس سے

پکھی اسی گاؤں میں دولت بھلے ہی نہ ہو لیکن سادھو ساد وولت
رات انسان کو کتنا سکھ دیتی ہے۔ کس بات سے من دیا کی جو گپ
کھا شانتی اور اپیلا شاؤں کی باڑھ میں انسان ڈوبتا ہے۔ سب سے
پیارا تو پسینہ تو سن کا سکھ ہے

جب راہل کو محسوس ہوا کہ اب اس کا من پہلے کی طرح شانت
اور پوتر ہو گیا ہے۔ تو اس نے پھر اپنی یاترا آرمبھ کی، وہ پھر چل پڑا۔ یہ
سفر تو ہیرا آتما کے لئے ضروری ہے۔ یہی سوچتا ہوا وہ آگے بڑھا۔ بیچ
بیچ راستے اونچی نیچی پگڈنڈیاں پار کرتا وہ چل رہا تھا۔ جسم تھکا
ہو گیا دھرم شالا میں آرام کرکے آدھی روٹی کھا کر بیریاگ پیال کا
بستر ہاتھ کا تکیہ، پیڑوں کی ٹھنڈی ہوا اپنی آتما کو سنوارنے میں گرو چرن
کی سیوا کتنی ضروری ہے۔

اس وقت بھی وہ ایک پنچھی شالا میں ایک پیڑ کے نیچے بیٹھا تھا۔ بھوک
لگی ہے وہ سوچنے لگا شریر کے اندر کا ایک الاؤ ہے اس پر پانی ڈالو گے تو
شانت ہو گا۔ بھوک کیا ہے؟ جسم کی ایک پکار۔ لیکن یہ جسم تو نت نئی
کھنائیں کرتا ہے۔ آتما کو بے چین کرتے نئے مگر اصل چیز تو آتما ہے
تو پھر شریر کی بھوک کے لئے آتما کو کیوں تھکایا جائے۔ اس نے
ایک نیا گیان پراپت کیا اور اٹھ کر قریب کی بستی میں پہنچا تاکہ اپنے
تھوڑی سی روٹی حاصل کرے اور پیٹ کی آگ بجھا کر پھر سفر شروع کرے۔

بستی میں پہنچا تو اسے لگا کہ جیسے جیون کا دوسرا نام کھانا ہے
ہر شخص اپنے جسم کو پال رہا تھا ہر طرف صرف کھانے پینے کی ہی چرچا تھی۔
بڑی دکانوں پر اعلیٰ غذاؤں کے بھنڈار سے تھالوں میں قسم
قسم کے پکوان۔ سوکھی روٹی۔ سوکھی روٹی کا تو نام و نشان بھی
نہیں تھا وہاں تو دودھ، دہی، گھی، تیل، مکھن، پنیر، مرغی، مچھلی
حلوہ پوری کیا کچھ نہیں تھا۔ ہر انسان کھانوں میں گم تھا۔ نہ دھیان نہ
گیان۔ نہ دیا کے لئے جگہ نہ تپسیا کا کشٹ اٹھانے کو کوئی تیار
بس کچھ تھا تو یہ خیال کہ کیسے وہ صبح شام اور ہر وقت اچھے
سے اچھا کھانا کھائیں۔ راہل حیران تھا کہ کس سے کہے اور کیا کہے
کیسے کہے کہ اسے صرف آدھی روٹی کی ضرورت ہے۔ اس شریر کو زندہ
رکھنے کے لئے تاکہ وہ عبادت کر سکے۔ اپنی آتما کو اس کال چکر سے
صحیح سلامت نکال سکے۔ اس لئے کہ نجات تو روح کی ہے۔ اصل
چیز آتما ہے اور اسے زندہ رکھ کر ہی موکش ملتا ہے جسم کے سکھ تو نا
کرشٹ اور روح کے لئے کچھ بھی نہیں۔

(باقی صفحہ ۱۹ پر دیکھئے)

اور خواہش کے آئینے میں دیکھتی تو لگتا تھا کہ وقت کہیں رکا ہوا ہے۔ [illegible]
میں باہیں ڈال کر ساحل کی ریت پر چاندنی راتوں میں ننگے پاؤں چلنے
کی تمنا ابھی جوان تھی۔ ہر بات پہ دل لرزنے لگتے ہیں۔ دل ایسا اندھا
کنواں ہو گیا تھا کہ چھوٹے چھوٹے ہتھیوں سے تعبیر تک رسائی نہیں تھا۔

مجھ کو چھوٹی چھوٹی تمنائیں بار بار دہرائے جانے کے باوجود پوری نہ ہوں
تو سرکش بچے کی طرح قابو سے باہر ہو جاتی ہیں۔ مگر کسی خواب کو
تعبیر دینا۔ کسی خواہش کو پورا کرنا۔ جاوید کی منت میں شامل نہیں۔ اور
ایسا کوئی کریڈٹ کارڈ نہیں تھا۔ جسے چارج کرا لی تو جاوید کے بیچ
میں سمٹا سمٹ جاتی۔ بڈ فورش گراسر ہو جاتا۔ اور دنیا کی خوبصورتی نظر
آنے لگتی۔

شاید اس کی وجہ ان کے پاس کی تنہائی تھی۔ جو میرے باپوں سے زیادہ
ملی تھی۔ اور جس کے خوف نے انہیں جلدی جلدی بڑے جلد سونے جلدی جاگنے
والا ایک ایسا مسافر بنا دیا تھا جس کی گاڑی چھوٹی جا رہی ہو۔ اور ایک
مسافر سے آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں۔ یہ مسلسل تنہائی یہ سب معرکہ آرائی
زہر قاتل ہے۔ میرے لئے پتہ نہیں سازا اگر کچھ بھی لیتا تو سمجھتا بھی! وہ
میرے جیسے نہ ہو سکے تو میں لاشعوری طور پر ان کے جیسی ہوتی گئی۔ وہی
ٹھکتا انداز اور پالش لہجہ۔ انشورنس کی سمٹ اور بلوں کی ادائیگی
ہی خاندان اب مشترکہ موضوع رہ گئے تھے۔

ٹوبی اور جیوژی نہ معلوم کب اور کہاں MOVE ہو گئے
تھے۔ اس بھاگ دوڑ میں بچے بڑے ہو گئے۔ تنگ گلی سے اکیلے رہ
جانے کا خوف تھا میں نے جاب چھوڑ دی کیونکہ بچے گھر کا کام SHARE
نہیں کرتے تھے۔ وہ ہاسٹل جانے کی باتیں کرنے لگے تھے۔ تو میں گھر تک
رک گئی اور زندگی کی گاڑی ہر ڈبے میں مختلف انجن توڑ بے جا گئی
چلی گئی۔

آج لگتا ہے کہ جیسے یہ سب کل کی باتیں ہیں۔ اور خدا جانے مجھے
یہ سب آج کیسے یاد آ گیا۔ ابھی تو مجھے کافی ڈرائیو کرنا تھا۔
SANTA MONICA BLD پر HAWARD کو ہٹ کرنے کے بعد
NORMONDE سے پہلے KINGSLEY پر دائیں
دائیں طرف ایک پرانی سی بلڈنگ ہے۔ اس بلڈنگ کا کلاسیکل
حسن چھپا ہوا نہیں آتا۔ بلکہ پچھلے چند سالوں سے میں پابندی سے یہاں
آتی ہوں۔ دراصل میرے پاس جتنا تو وقت ہوتا ہے۔ اس میں کچھ نہ
کچھ کر لیا کرتی ہوں۔ اس ملک کا کچھ قرض ہے۔ مجھ پر جس نے بہت
سی آسانیاں اور ایک عجیب سا احساس تحفظ دیا ہے۔ میں نے اب
بھی امریکہ کا نام کیش کر دیا ہے۔ مقصد منزلت کو کافی بڑی گاڑی ملی
ہے بچے سرد میں نے بھی احساس برتری کا صدقہ اتارنے کے لئے تھوڑا
سوشل ورک اپنے ذمے لگا لیا ہے۔ دراصل امریکہ کے ساحلوں کے
بارے میں لوگ دور دراز بیٹھ کر سب کچھ جانتے ہیں مگر ان کو
NORMANDE، KINGSLEY جیسی کسی عمارت کا پتہ نہیں یہ عمارت
ایک بوڑھے جوڑے کا عطیہ ہے۔ اور ان معزز لوگوں کے لئے ہے جن کا
اس دنیا میں کوئی نہیں۔ یہ لوگ بستر پہ لیٹے لیٹے۔ ٹی وی دیکھتے دوائیاں
کھاتے اور انجکشن لگواتے رہتے ہیں۔ اگر موت کا بھی انتظار کرتے
ہوں تو کیا عجب۔ مگر فی الوقت تو زندہ انسان ہیں۔ اور ملازمت
ساری عمر کے ضرورت مند بھی۔ میں خاص طور پر بیڈ نمبر ۸ کی مریضہ
کا بہت خیال رکھتی ہوں۔ پچھلے مہینے میں نے اس کی سالگرہ منائی تھی بہت
خوش تھی وہ۔ دنیا میں دیکھے وقت انسانوں کا رویہ مختلف ہوتا ہے
مگر جیتے وقت سب ایک جیسے ہو جاتے ہیں ممنون و مشکور۔ سو وہ بھی
ممنون و مشکور تھی۔ دراصل بے چاری کی بات سمجھنے میں بہت دیر
لگتی ہے۔ ایک ٹریفک ایکسیڈنٹ میں اس کے جبڑے اور منہ پر بہت
چوٹیں لگی تھیں۔ سرجری کے بعد بھی صورت حال عجیب ہے۔
کوئی نہیں آتا بے چاری کے پاس وہ کچھ اور باتیں ہوں گے جو مرے پر
سوالات کئے ہوتے ہیں۔ یہاں تو گزرے وقتوں کا خراج دینے
والا بھی کوئی نہیں تھا۔ ارے ہاں میں نے آپ کو بیڈ نمبر ۸ کی مریضہ کا
نام بتایا ہے کہ نہیں بات بتانے پر چھا ہی نہیں۔ اس کا نام
JOSPHINE TOBBY ہے

دراصل وہ لڑکی کے نام کو اب تک اپنی ذات کا حصہ سمجھتے ہیں ✽

بقیہ صفحہ ۲۹ تایا جی پلیز

کے شوہر ہیں۔ "ہاں جی ہاں جی ہاں" بچے کے منہ سے نکلا۔
"کیا تایا جی نے آتم ہتیا کر لی" برجیش نے جلدی سے پوچھا۔ "تایا جی نے
کنویں میں کود کر آتم ہتیا کی یا پیڑ سے لٹک کر" منجھلے نے پوچھا۔
"مجھلے نے زہر کھا کر آتم ہتیا کی یا ریل سے کٹ کر"
"ان کی لاش موقع واردات پہ ہے یا اسپتال میں" منجھلے نے جلدی جلدی پوچھا
عبداللہ نے بہت اطمینان سے کہا "سپنرو آپ کے تایا جی اس وقت تھانے
میں بیٹھے ہیں۔ رات انھوں نے اپنے ایک رشتہ دار کے یہاں گزاری اور
صبح انھوں نے تھانے میں آپ لوگوں کے خلاف رپورٹ درج کروائی ہے۔
ان کا الزام ہے کہ آپ لوگ مرکزی نوکری، اپنے مکان کی دولت اور جائداد
بٹورنے کیلئے انھیں خودکشی کرنے پہ مجبور کر رہے ہیں۔ "چلئے تھانے" ✽

...ے

...نے مجھے اپنا اصل دیا
...ہوتے ہوئے جیب کی طرح
...کی مرتیں
...نے اسے کھو دیا

...سہ واقعہ
...کی تو اصل کمال میں
...کے کمرے میں اندر تک
...گے
...اس کا رس
...ی انگلیوں پر بہتا رہا

...اب مجھے معلوم نہیں
...یہ کون سا شہر ہے
...میں نے کھایا ہے
...اس کا کون سا شہر ہے

...کہ کہیں اچانک
...ہوؤں میں کسی کی بھی
...اب اتنی بھی نہیں

...سوری کی دوپہر

...مصور' اٹھائے ہوئے
...تیلی رنگ' چلا جا رہا ہے
...ں میں گھر

...ت

...ختم جاتا ہے
...کہیں اتنی خاموشی ہو
...میں سو سکوں

...پھر سے جاری ہوا'
...اصلی ہو جاتی ہوں

علیحدگی

میرا سایہ مجھے چھوڑ کر جا رہا ہے
اس نے مجھے لکھوا دیا کہ میں جانا ہوں
وہ کہتا ہے کہ میں بے مصرف شخص ہوں
مجھ میں ابہام نہیں
وہ میری معمولی باتوں سے اکتا گیا ہے

میں نے اسے اختیار دیا
مگر وہ چاہتا ہے کہ آزاد رہے
پروں کی طرح بنا' موتیوں کی طرح ہوا کار
کہ اڑے اور ہوا میں اڑے جائے' رقص کرے
سب سے بڑھ کر یہ کہ رقص کرے' آزاد
میرے بوجھ سے آزاد

میں نے اسے بتا دیا
کہ بے زمینی میں خطرہ ہوتا ہے
مگر وہ میری نہیں سنتا

بے چارہ سایہ
جب میں جنگل سے گزروں
تو مجھے اس کی دھجیاں
سارے درختوں پر مل جائیں گی

زندگی کے معنی

تم خود کو پاتے ہو
اندھے مصوروں اور بہرے موسیقاروں کے درمیان
جہاں کا منظر بے رنگ ہے
اور سنگیت میں ایک ہی سر ہے' سسکی جیسا

بے آواز گلوکار
سنانے کی سرگم سے کھیل رہے ہیں
بے دست و پا مصور ساز
تجر چاٹ رہے ہیں

تمہارا دل ہڈیوں کے برج کے اندر
گھنٹی کی طرح بج رہا ہے مگر کوئی سن سکتا نہیں

تم خود سے کہتے ہو کہ تم یہاں کے نہیں ہو
تمہارے پاس یہاں ٹھہرنے کی کوئی وجہ نہیں

مگر جس صبح تمہیں یہاں سے روانہ ہونا تھا
تمہیں پتہ چلتا ہے کہ تمہارے پاؤں کے
تمہاری ٹانگیں گھٹنے پر آکر ختم ہو جاتی ہیں

تب اچانک تم سمجھ جاتے ہو
کہ زندگی میں تمہارا مقصد کیا ہے --
کہ تم جھاڑیوں اور سانپ پھنوں کے بیچ
دیکھتے رہو
اور پوچھتے رہو
کیوں؟ کس لئے؟

یہاں ہے

وہ مجھ میرا ہے یہاں ہے
یہ کتابیں
یہ کرسیاں
یہ میز
جب میں ان کی طرف ہاتھ بڑھاتی ہوں
وہ مجھے تھام لیتے ہیں
وہ میری حمایت کرتے ہیں
وہ میرا بوجھ اٹھاتے ہیں
وہ میری مرضی پر جھک جاتے ہیں

وہ میری حوصلہ افزائی کرتے ہیں
میری موجودگی میں اطمینان سے
اس کمرے میں

ہم میں سے کسی کو بھی یہاں ہونا لازم نہیں
مگر ہم سب ہیں

ہم کو یہاں اتنی مدت ہو گئی
کہ ہم جانتے ہیں یہی گھر ہے

کہ خاموش ہوں' مطمئن ہوں
اور قبول کر لیں کہ
چیزیں کس طرح آپس میں جڑ جاتی ہیں

صدیر

افتخار امام صدیقی

●

معاون

ناظر نعمان صدیقی

قیمت ۱۰ روپے

*

زرِ سالانہ ۷۵ روپے ◆ لائبریریوں سے ۹۰ روپے

تاحیات خریداری ۱۰۰۰ روپے ◆ معاونین سے ۱۰۰ روپے

ممالکِ غیر سے
۲۵ ڈالر — ۱۵ پونڈ

فکر امروز

شعر میں ادب کی جگہ بہت نازک اور بہت لطیف ہے۔ شعر و ادب کی مثال تصویر اور رنگ سے ایک حد تک سمجھی جا سکتی ہے۔ تصویر میں رنگوں کا امتزاج اگر غلط اور غیر مناسب ہے تو تصویر کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو نظر فریب نہیں ہو سکتی۔ ادب کے لیے نظر فریبی بھی کوئی چیز نہیں ـــ ادب وہ ہے جو دل نشیں اور روح فریب ہو۔ اس اعتبار سے ادب کی اہمیت ایک مصوّر کے شاہکار سے بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ شعر اگر ادب سے خالی ہے تو ایک بے رنگ تصویر سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا اور اگر خیالات کے ساتھ بندش بھی سست اور ترکیب بھی کمزور ہے تو پھر شعر ایک ایسی بگڑی ہوئی اور فرسودہ تصویر ہے جس کی کم عیاری مصوّر کو مصوّر کہلانے کا مستحق بھی نہیں رکھتی۔ جو شعر ادب سے خالی ہے ہم اسے شعر کہنے میں علمی و ادبی اور لسانی گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں۔

[خطبہ مشاعرہ جہلم (پنجاب) ۱۹۳۳ء]

سیماب اکبرآبادی

ماہنامہ

شاعر

کے زرِ سالانہ اور عام شمارے کی

قیمت میں معمولی اضافہ

کاغذ کے نرخ میں گذشتہ کئی ماہ سے تین بار اضافہ ہوا ہے جس سے پورے ملک کے اخبارات و جرائد بے طرح متاثر ہوئے ہیں۔ ہندوستانی نیوز پرنٹ ملوں نے تین تا پانچ ہزار روپے فی ٹن بڑھائے ہیں اس کے علاوہ درآمد شدہ نیوز پرنٹ کی قیمت میں بھی ۲۵۰ امریکن ڈالر (تقریباً ۸ ہزار روپے) فی ٹن کا اضافہ ہوگیا ہے۔ اس طرح دنیا بھر میں نیوز پرنٹ کے دام سو فی صد بڑھ گئے ہیں۔ انڈین نیوز پیپر سوسائٹی [INS] اور مدیرانِ جرائد و رسائل کی مختلف تنظیموں نے اس زائد بوجھ کو ناقابلِ برداشت قرار دیتے ہوئے وزیراعظم سے فوری مداخلت کا مطالبہ کیا تھا لیکن اب تک کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ اخباری قیمتوں میں اس تشویش ناک اضافے سے چھوٹے اخبارات و جرائد سخت ترین معاشی بحران کا شکار ہوئے ہیں جب کہ قیمتوں میں مزید اضافے کا امکان ہے۔

شاعر کے لیے ہر ماہ خریدے جانے والے کاغذ کے نرخ میں بھی اسّی تا نوّے روپے فی رِم کا اضافہ ہم کئی ماہ سے برداشت کر رہے ہیں۔ ایک غیر تجارتی خالص ادبی رسالے کی بساط ہی کیا۔ بڑھتے ہوئے بحران پر قابو پانے کی کوششوں کے باوجود یہ ناگزیر ہوگیا کہ شاعر کے زرِ سالانہ اور عام شمارے کی قیمت میں معمولی اضافہ کر دیا جائے۔ یقین ہے کہ شاعر کے باذوق قارئین اس معمولی اضافے کو قبول کرتے ہوئے ہماری دشواریوں کو کم کرنے میں معاونت کریں گے۔

فی شمارہ —●— ۷ روپے

زرِ سالانہ —●— ۷۵ روپے

لائبریریوں سے —●— ۹۰ روپے

ہم عصر اردو ادب نمبر کی اشاعت اور قیمت کا اعلان جلد کیا جا رہا ہے۔ نئے اور پرانے خریداروں کو ضخیم خاص نمبر رعایتی نرخ پر دیا جائے گا۔ جن خریداروں کی طرف شاعر کے واجبات ہیں وہ اور نئے خریدار اس سے فائدہ اٹھائیں۔ خاص نمبر کی قیمت کے اعلان کے بعد کوئی رعایت نہیں دی جائے گی۔ محبانِ شاعر اپنی مدتِ خریداری کا جائزہ لیں اور زرِ سالانہ ارسال کرنے میں تاخیر نہ کریں۔ نومبر دسمبر ۱۹۹۴ء کے شمارے سے اضافہ شدہ قیمتوں کا اطلاق ہوگا۔

[ادارہ]

ترتیب

موجودہ ادبی صورتِ حال — ۶ — عبدالسلام خلش

ترنت شور مچائیے، انعام لیجئے — ۱۱ — اشفاق مومنی
سیج — ۱۶ — مشتاق احمد نوری
دوزخ — ۲۰ — ابنِ اسماعیل

مقیم اثر بیاولی، عبدالرحیم نشتر، حسن فرخ — ۱۵
راجیش ریڈی، سہیل اختر، نعیم صبا — ۱۹
مظہر سعید، شین میم حنیف، طیب آزاد — ۲۲

چار غزلیں — ۵ — پرکاش فکری

غزل — ۱۰ — راگھو ندانشی
غزل — ۱۰ — امجد اسلام امجد

ابوالفضل صدیقی [بنام] — ۴ — مرزا حامد بیگ

۱۳ د ا س ٥

وحید اختر، کاوش بدری، حمید الماس
قاسم ندیم، ابنِ اسماعیل، نذیر فتح پوری
شاہد عزیز، مغیث رحمانی، سرور ساجد
جمال اویسی — ۲۳ — احمد حسین

*

شمارہ - ۱۱ [۱۹۹۴] جلد - ۶۵

محفلِ ادب

شاعر کا یہ مشترکہ شمارہ ۱۹۹۴ء کی آخری پیشکش ہے۔ اس طرح اگر ایک سال کا جائزہ لیا جائے تو شاعر کے صفحات پر غیر معمولی تنوع رہا۔ اسے قارئین شاعر کی طرف معروف رکھا خاص نمبر کے لئے شدید انتظار کے ساتھ عام شماروں کی ضخامت میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے۔ اللہ کا بے حساب کرم ہے کہ محدود وسائل اور ناسازگار حالات کے باوجود ہم اپنے قارئین کو کچھ بہتر تخلیقی ادب دے سکے۔ سچ پوچھئے تو ہم قطعی مطمئن نہیں ہیں۔ ابھی تو شاعر کے لئے بہت سارے خواب ہم نے سوچ رکھے ہیں اور انہیں تعبیر بھی کرنا ہے۔ شاعر نے تو اپنی ۶۵ سالہ زندگی میں اپنے قارئین کو شعر و ادب کی نئی تعبیرات سے آشنا ہی کیا ہے۔ ترتیب و پیشکش میں شاعر کا اپنا انفرادی حسن ہے۔ ایک نئی جمالیات کو شاعر کے قارئین نے محسوس کیا ہے۔ سراہا ہے۔ لیکن ہمیں تو شاعر کو اور آگے بہت آگے لے جانا ہے۔ ۲۱ ویں صدی میں شاعر کی صوری و معنوی جلوہ گری کو ایک نئی مثال دینا ہے۔ ایک نئی تاریخ رقم کرنا ہے۔

یہ مشترکہ شمارہ کسی خصوصی اشاعت ہی کا حکم رکھتا ہے۔ یہ شمارہ ہماری منصوبہ بند بے ترتیب سوچ کا ایک موثر تاثر ہے جو بہت کم وقت میں ترتیب پا گیا۔ اس شمارے کے تمام مشمولات کو قارئین شاعر ضرور پسند کریں گے۔ ہمیں اپنی گراں قدر رائے سے نوازیئے گا۔

شاعر کے عام شمارے اور زرِ سالانہ میں معمولی اضافے کا اعلان کو ضرور ملاحظہ کیجئے گا۔ رفیقانِ شاعر سے خصوصی توجہ کی درخواست ہے۔ کسی روایت کو روشن کرتے رہنا اب آسان نہیں رہا۔ سائنس [illegible] سے گزرتے ہوئے لمحوں میں آدمی کا جینا محال ہو رہا ہے۔ کسی غیر تجارتی خالص ادبی رسالے کو شائع کرنا تو اور بھی مشکل بلکہ ناممکن ہوتا جا رہا ہے۔ یہ لمحۂ فکریہ ہے اردو والوں کے لئے کہ شاعر ایسی روایت کو اب کس طرح باقی رکھا جائے۔ فی الحال تو اپنا زرِ سالانہ ارسال کرنے میں تاخیر نہ کیجئے۔ اگر ممکن ہو تو کئی سال کے لئے یک مشت رقم ارسال کیجئے۔ ضخیم و عظیم خاص نمبر کو رعایتی قیمت میں حاصل کرنے کا یہ نادر موقع ہے۔ جن خریداروں کی طرف کئی سال کے واجبات ہیں بلا تاخیر ہماری دشواریوں کو کم کرنے میں اپنا تعاون دیں۔ نئے قارئینِ شاعر رعایتی قیمت سے فائدہ اٹھائیں۔ اپنے دوستوں کو شاعر بطور تحفہ دیجئے۔ ہندوستان سے باہر اپنے دوستوں تک شاعر کی ترسیل کو ممکن کیجئے۔ ہمیں شاعر کے بے شمار قارئین کی محبتوں پر اعتماد ہے۔ اس اعتماد کو کچھ اور گہرا کیجئے۔ شاعر اردو کی ایک زندہ روایت کا نام ہے۔ شاعر آپ کے ادبی ذوق کا استعارہ ہے۔

نذرِ پروین شاکر شمارہ نمبر ۱۲ میں ملاحظہ کیجئے

مٹھی بھر غزلیں

◆

شام جنگل کی راہ سے آئی
ساتھ ٹھنڈی اداسیاں لائی
جانے کس بات کا اشارہ ہے
چھو کے گذری بدن کو پُروائی
شوخ رنگوں میں سب کو نہلا کر
رُت بہاروں کی خوب اِترائی
یہ تو ہونا تھا ہو گیا آخر
ہم تماشہ ہیں جنگ تماشائی
کچھ تو یادوں کے ہم ورق پلٹیں
ساتھ بیٹھے کبھی جو تنہائی
پر ہواؤں کے یوں سلگتے ہیں
جیسے سورج نے آگ برسائی
تن سے شعلے لپٹ گئے فکریؔ
سبز ساون کی جب گھٹا چھائی

◆

کتابوں کے اوراق پیلے ہوئے
لکھا جو اُن میں کہاں پڑھ سکے
وہ بچپن کے قصّے ابھی یاد ہیں
سُنائیں کسے کون ان کو سُنے
نہیں جس کا آخر یہی رات ہے
کبھی یہ جو سوچیں بڑا ڈر لگے
بہکنے کی لذّت اٹھائیں کبھی
کوئی سیدھے رستے کہاں تک چلے
ڈبونا اسے کھیل لگتا ہے کیوں
بتاتا سمندر تو ہم پوچھتے
پھولوں سے نہ رکھا کوئی واسطہ
ہمیں پیڑ گننے تھے گنتے رہے
سزا ہم کو فکریؔ اسی کی ملی
سبھوں پہ ہنسے ہم نہ خود پہ ہنسے

پرکاش فکری

◆

خوابوں کو بکھرنے سے بچانا ہوا مشکل
اب تیری طرف لوٹ کے آنا ہوا مشکل
بنتی نہیں تصویر اگر طرزِ بیاں سے
قصّۂ دلِ تنہا کا سُنانا ہوا مشکل
یہ کس سے بچھڑنے پہ بدن خاک ہوا ہے
پوچھا جو کسی نے تو بتانا ہوا مشکل
ہم اپنی تباہی کا کریں جشن بھی کیسے
آندھی میں چراغوں کا جلانا ہوا مشکل
فکریؔ کبھی کچھ بول ذرا جان لیں ہم بھی
کیا ایسا گنوایا ہے کہ پانا ہوا مشکل

◆

کوئی آیا نہ اور آئے گا
دن اُداسی میں بیت جائے گا
اب تو جانے کی ہے پڑی سب کو
اپنے قصّے کسے سُنائے گا
دھوم ہوگی نہ رت جگوں کی اب
چاند آئے گا ، جی جلائے گا
رکس کی خاطر ہے بے کلی تیری
پوچھ موسم سے وہ بتائے گا
چل سمندر کی سیر کو فکریؔ
کوئی طوفاں نہ اب ڈرائے گا

● پرکاش فکری ، ڈورنڈہ ، رانچی (بہار)

بدر عالم خلش

مکان نمبر ۲، بلاک-۳ شاستری نگر، کدما جمشید پور-۹

موجودہ ادبی صورت حال

آپ رسالہ شاعر کے جرأت اور اپنے خطوں کے ذریعے نئے تخلیق کاروں سے جس طرح علمی و ادبی مکالمہ کر رہے ہیں اس سے نئی نسل کی حوصلہ افزائی ہو رہی ہے۔ آپ نے میرے لئے جو سوال بنائے ہیں وہ بہت اہم ہیں لیکن ان دنوں میں کمیشن کے امتحانات کی تیاری میں حد درجہ معروف ہوں اس لئے چاہتے ہوئے بھی آپ کے بعض سوالات کا تفصیلی جواب نہیں دے سکا کچھ اہم کتابیں موضوع بحث بن سکتی ہیں یا جدید تنقیدی نظریات پر مکالمہ ہو سکتا ہے میں لکھوں گا تفصیل سے، پورے دلائل کے ساتھ۔ پھر بھی آپ محسوس کریں گے کہ میں نے آپ کے تمام سوالوں کے مرکزی نقطے کو چھو لینے کی پوری کوشش کی ہے آپ کے سوالوں کی نوعیت کچھ ایسی ہے کہ غور و فکر کرتے ہوئے ذہن بار بار موضوع سے دور چلا جاتا ہے کیوں کہ صرف ادب پر بحث کر کے ادبی مسائل کا حل تلاش نہیں کیا جا سکتا۔ ادب کا سرو کار ہزاروں طرح کے سماجی و سیاسی مسائل سے ہے۔ میں یہ بھی چاہتا تھا کہ موجودہ ادبی جمالیات کے مغربی اشکال کا جائزہ پیش کروں لیکن یہ موضوع بھی طوالت کا متقاضی ہے۔ سردست مغربی تنقید کے ایک رجحان پر مختصر نوٹ پیش کر رہا ہوں۔ اردو شعر و ادب کی موجودہ تنقیدی صورت حال کی مناسبت سے میں نے شرحیات HERMENEUTIC کے صرف ایک نمائندہ مفکر گڈامر کے خیالات کو FOCUS کیا ہے۔ بات آگے بڑھے گی تو دیکھا جائے گا۔ جارج گڈامر ہائیڈل برگ یونیورسٹی (جرمنی) میں فلسفہ کے استاد ہیں۔

میں نے اپنی گفتگو کا آغاز ایذرا پاؤنڈ کے کینٹو کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے سے کیا ہے جس میں چینی رسم الخط کے دو اینڈیوگرام (تصویری لفظ) ہیں۔ نقل مطابق اصل ہے پہلے کا مطلب ہے PRECEDE اور دوسرے کا FOLLOW اسے آپ اس طرح بھی لکھ سکتے ہیں:

TO KNOW WHAT PRECEDES 'PRECEUES' AND WHAT FOLLOWS 'FOLLOW'.......

THINGS HAVE ENUS OR SCOPES) AND BEGINNINGS. TO KNOW WHAT
PRECEDES 先 AND WHAT FOLLOWS 後 WILL ASSIST YR
COMPREHENSION OF PROCESS.

____EZRA POUND.

جدید ادب سے آپ کی مراد اگر ۱۹۶۰ء کے بعد کا ادب ہے یعنی ترقی پسند ادب کی معزولی کے بعد تخت نشیں ہونے والا ادب ہے تو میرے خیال میں اس کا سورج غروب ہو چکا بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ سورج کا سارا ہائیڈروجن ہیلیم میں بدل چکا ہے۔ یہ الگ بات کہ اب تک کوئی دوسرا روشن افق ہم تلاش نہیں کر پائے۔

اور اگر مراد موجودہ ادبی صورت حال سے ہے تو میری نظر میں یہ اطمینان بخش نہ سہی، خوش آئند ضرور ہے۔ ممکن ہے میرا یہ بیان آپ کے لئے باعث تعجب ہو کہ ہم عصر ادبی رجحانات کا جائزہ لیتے ہوئے میں اس قدر رجائیت پسند کیوں ہو گیا وجہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں تنقید کی بالادستی نے ادب کی تخلیق، ترسیل اور تفہیم کے پورے PROCESS کو ناقابل برداشت حد تک منفیت پسند اور قنوطی بنا دیا ہے۔ ہم فن پارے کو ویسا ہی دیکھنا چاہتے ہیں جیسا وہ نہیں ہے یا جیسا وہ نہیں بن سکا۔ یعنی ہم آہنی محاسن پر اصرار کرتے ہیں جو اس میں موجود نہیں ہیں۔ خصوصاً آج کل شاعری کے ساتھ یہ سلوک ہماری فطرت ثانیہ بن گیا ہے۔ ہم شعری تخلیقات کو اس طرح پڑھتے ہیں جیسے مہینے بھر کے راشن کی فہرست دیکھ رہے ہوں۔ کیوں کہ ہم نے پہلے سے یہ طے کر رکھا ہے کہ

تمام ترکیب پایۂ اعتبار سے ساقط ہو چکی ہیں اور تمام الفاظ بے جان، بے کار، فرسودہ اور کھوکھلے کلیشیز میں بدل چکے ہیں۔ بلکہ اب تو لفظ "کلیشے" بھی کلیشے میں بدل گیا ہے۔

شاعری سے بدگمانی کی ایک اور بڑی وجہ اردو ادب کا شاعرانہ مزاج ہے یعنی اردو زبان اب تک اپنی شاعری سے ہی پہچانی جاتی رہی ہے یہ امر ہمارے لئے باعث فخر بھی سہی لیکن ہماری اسی خود پسندی اور آسودہ خاطری نے ہماری زبان کے PROSIC TEMPERAMENT کو نہیں ہونے دیا۔ چونکہ ہماری آج تک کی ادبی روایت کا بڑا حصہ شاعری کا ہے اور چونکہ ہمارا شاعر ایک پھول کے مضمون کو سو رنگ سے باندھنا ہی کمال فن سمجھتا آیا ہے۔ اسی لئے ہمیں ایسا لگتا ہے کہ ہماری شاعری موضوعات سے ہی محروم ہو کر رہ گئی ہے۔

بدقسمتی سے ادب کے باہر کی صورت حال (میری مراد ہے سماجی اور سیاسی صورت حال) بھی کچھ ایسی رہی جس نے اردو ادب کے دائرۂ ترسیل کو محدود سے محدود تر کر دیا۔ میں نہیں مانتا کہ چونکہ ہمارے ادب نے عوامی ہونے سے انکار کر دیا۔ اس لئے آج اس کی یہ درگت ہوئی۔ کیوں کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ آج ہمارا شاعر اگر فیض کی طرح، قوالی بھی لکھے تو عوام کو ادب سے وابستہ نہیں کر پائے گا۔ کیوں کہ قوالی بھی اب کلیشے بن چکی ہے یہ زمانہ بابا سہگل کا ہے کندن لال سہگل کا نہیں ہے۔

مسئلے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ہمارے ادب کے آس پاس نئے نئے معریات کی چہل پہل کیا ہلکی سی آہٹ بھی ہمیں سنائی دیتی، ادب اور تنقید کے علاوہ دیگر علوم میں حالیہ برسوں میں جو بیش رفت ہوئی ہے ہمارے دانشوروں نے نہ معلوم کیوں قارئین کو اس سے باخبر نہیں کیا۔ مجھے اردو میں ایک بھی ایسی کتاب نہیں ملتی جو جدید ترین موضوعات مثلاً تجارتی انتظامیات، صنعتی تعلقات، علم حشرات الارض، جدید کونیات MODERN COSMOLOGY جدید فلکیات، مصنوعی ذہانت، کمپیوٹر پروگرامنگ، جینیات GENETICS اور ٹیکنولوجی کے رائج الوقت اصول و نظریات اور تکنیک کا احاطہ کرتی ہو عالمی معیشتی روابط یا خلیجی ممالک کی معیشت، صومالیہ، تنزانیہ اور یوگوسلاویہ کے مسائل یا یوگوسلاویہ کے سیاسی بحران پر بھی کوئی مبسوط تصنیف نظر نہیں آتی۔ پس ایک سوال زیر لب میں اپنے آپ سے اکثر پوچھتا ہوں کہ اردو میں مذکورہ کتابیں نایاب نہ بھی ہوتیں تو کیا اردو کا عام قاری یا تخلیق کاران کتابوں میں دلچسپی لیتا۔؟

ہمارے ادب کی زبوں حالی کے اور بھی اسباب ہیں لیکن چونکہ معروضیت کے ساتھ ساتھ اختصار کی بھی شرط لگا دی گئی ہے لہٰذا میں پھر اپنی تمہید کی طرف لوٹ رہا ہوں۔ آج کی صورت حال اگر ماضی کی فرد گزاشتوں کا نتیجہ ہے تو پھر مستقبل کے خوش آئند ہونے کی امید سے ہمیں کوئی محروم نہیں کر سکتا بشرطیکہ موجودہ نسل اپنے امکانات کو سمجھے اور صحیح سمت کا تعین کر کے سرگرم کار ہو جائے۔ مجھے یقین ہے کہ ہماری ادبی تاریخ کا بہتر حصہ ہمارے مستقبل میں ہے۔

گزشتہ دو تین برسوں میں اردو فکشن نے اپنے اسلوب میں جو تبدیلی پیدا کی ہے اگر یہ تبدیلی پرانی حقیقت نگاری کی محض کورانہ تقلید بن کر نہ رہ جائے تو آنے والے افسانوی ادب کو بیش بہا اضافوں سے ہمکنار کر سکتی ہے اسی BREAKTHROUGH کا نتیجہ ہے کہ لوگ ناول لکھنے کی طرف بھی مائل ہو رہے ہیں [مشرف عالم ذوقی، شموئل احمد، حسین الحق، عبدالصمد، غضنفر، وغیرہ]

ظاہر ہے ان تبدیلیوں سے دیر یا سویر شاعری بھی اثر قبول کرے گی افسانے کی بہ نسبت شاعری کی راہ پیچیدہ اور تنگ ہے اور رکاوٹیں بھی زیادہ پھر بھی امید ہے کہ آنے والے چند برسوں میں کوئی متبادل رجحان سامنے آجائے گا۔

نئی نسل میں تنقیدی شعور کی کمی نہیں بلکہ پہل کرنے کے حوصلے کی کمی ہے اور اس حوصلے کی کمی کی وجہ نفی ذات کا رجحان نہیں ہے بلکہ موجودہ نسل اثبات ذات پر اور اپنی انفرادیت پر اصرار کرنے سے گریز کر رہی ہے۔ نئے تخلیق کاروں میں جس کی تنقیدی بصیرت میری نظر میں معتبر ہے فی الحال ایک نام آصف فرخی ہے (حوالوں کے لئے شب خون، ذہن جدید اور سوغات کے گزشتہ چار پانچ شمارے کافی ہوں گے) کچھ اور نام میرے ذہن میں ہیں لیکن ان کے بارے میں قطعی طور پر ابھی کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا۔

(ب) ایسی بات نہیں کہ وہ خوبیاں جن کی بنیاد پر ہم کسی بھی تحریر کو ادب قرار دیتے ہیں آج کے ادب سے معدوم ہوتی جا رہی ہیں۔ یہ کہنا بھی غلط ہوگا کہ معیاری تخلیقات سامنے نہیں آرہی ہیں۔ کیوں کہ، اول یہ کہ ہر عہد میں معیاری تخلیقات کی تعداد کم رہی ہے۔ دوئم یہ کہ ہر عہد میں ہم عصر

ادب کو اس کے پیش رو ادب سے کمتر کہا گیا ہے اور اس کم نگاہی کے اسباب ہمیں معلوم بھی ہیں۔ لیکن آخر اس شبہے یا مغالطے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے کہ ہمارا ادب انحطاط پذیر ہے۔

موجودہ صدی کی دوسری اور تیسری دہائی کے منظر ناموں پر غور کریں تو ایسا لگتا ہے کہ وہ زمانہ تحریکوں اور آدرشوں، جلسوں اور جلوسوں کا زمانہ تھا۔ وہ روسی اشتراکیت کے عروج اور برطانوی سامراج کے زوال کا عہد تھا۔ اس پورے برصغیر پر ہندوستان کے خونریز بٹوارے تک جس بے چینی، اتھل پتھل اور افراتفری کی کیفیت غالب رہی ترقی پسند ادب کو ان تمام حالات سے علیحدہ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ ۱۹۵۰ء کے بعد ریڈیکل وابستگی کی تحریک نے بھی ادب میں ایک نئی ہلچل پیدا کی۔ پچھلے پندرہ بیس برسوں سے ہمارا ادب ہر طرح کی تحریک اور ہنگامہ آرائی سے خالی ہے (شاید یہی وجہ ہے کہ کوئی قد آور CHARISMATIC ادبی شخصیت بھی نظر نہیں آ رہی ہے) لیکن اگر سرگرمی اور ہلچل کے اس فقدان کو انحطاط سے تعبیر کیا جا رہا ہے تو مجھے افسوس ہے کہ میں اس خیال سے متفق نہیں ہو سکتا۔ ہم تحریکوں کا حشر دیکھ چکے ہیں پھر بھی تحریکوں کی عدم موجودگی کو انحطاط کا نام دیتے ہیں۔ موجودہ ادبی صورت حال کو انحطاط نہیں ٹھہرا، IMPASSE کہہ سکتے ہیں اور ایسے مرحلے دنیا کے ہر ادب میں آتے رہتے ہیں (مثالیں بکھری پڑی ہیں) تحریک کی ضرورت پر زور دینے کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم عام حالات میں اچھا ادب تخلیق کرنے کی صلاحیت سے عاری ہو چکے ہیں۔ برخلاف اس کے ہمیں آج کے اس جمود کی وجہ اپنی غلط ترجیحات اور خود فریبیوں میں ڈھونڈنی ہوگی۔

(ج) مغرب میں موجودہ ادبی تنقید فلسفیانہ، منطقی اور ریاضیاتی تحلیل بلکہ تحلیل در تحلیل میں بدل چکی ہے۔ موجودہ تنقیدی نظر میں ہر تحریر لفظ ہے خواہ وہ تخلیقی ادب کے زمرے میں آتی ہو یا نہ آتی ہو۔ یہاں تک کہ تشکیل نظریہ بھی ایک صنف ادب ہے۔ بیشتر تنقیدی مباحث SEMANTICS، SEMIOTICS اور SEMIOLOGY کے گرد گھومتے ہیں۔ ادب کی تفہیم اور تعین قدر کی کوشش آج کسی مخصوص شعبۂ علم یا نظریے اور تنہا نظریے تک محدود نہیں کی جا رہی ہے بلکہ آج کی تنقید کا دائرۂ کار کافی وسیع ہو چکا ہے جس میں بلا تفریق تمام علوم سے براہ راست یا بالواسطہ استفادہ کرنے کا رجحان دیکھا جا سکتا ہے۔ اگرچہ ساختیات اور لاتشکیل کا زور ٹوٹ رہا ہے اور ان کے رد میں کئی کتابیں شائع بھی ہو چکی ہیں۔ تاہم ان کے نتائج اور مضمرات پر بحثیں ہنوز جاری ہیں اور اس صدی کے اختتام کے بعد بھی خواہ اور کسی شکل اور کسی اور قرینے سے، ممکن ہے، جاری رہیں گی۔

ساختیات کے متوازی اور مخالف رویوں میں سب سے اہم یورپ کے مظہریاتی دبستان کی تنقید ہے جس کا سلسلہ نسب جرمن فلسفی ایڈمنڈ ہسرل EDMUND HUSSERL بلکہ اس سے قبل کے مفکرین شلائر ماخر اور ڈلتھی سے جوڑا جاتا ہے۔ موضوع اور معروض کے مسئلے پر رد عمل کا اظہار کرتے ہوئے ہسرل نے کہا تھا کہ شعور بذات خود کچھ بھی نہیں، شعور ہمیشہ کسی چیز کا شعور ہوتا ہے۔ ہسرل ہی کی تقلید میں سارتر نے شعور کی تعریف بڑے ہی دلچسپ اور بلیغ پیرائے میں اس طرح پیش کی تھی۔

" CONSCIOUSNESS IS A BEING SUCH THAT IN ITS BEING, ITS BEING IS IN QUESTION IN SO FAR AS THIS BEING IMPLIES A BEING OTHER THAN ITSELF."

ہسرل کے علاوہ مظہریاتی تنقید پر سب سے گہرے اثرات مارٹن ہائیڈگر MARTIN HEIDEGGER کے ہیں۔ انہیں مظہریاتی نقطہ ہائے نظر کے زیر اثر متن کی تفہیم کی ایک نئی ڈسپلن کا فروغ ہوا۔ جسے HERMENEUTICS یعنی شرحیات کا نام دیا گیا جو ساختیاتی طریقۂ کار کے علی الرغم متن کو کسی ماورائی SIGNIFIED سے DEFINE کر کے نہیں دیکھتی بلکہ متن کے پس پردہ شعور و ارادہ کی جلوہ گری کو تسلیم کرتی ہے۔ شرحیات کے مطابق متن کی زبان مصنف اور قاری کے درمیان رابطہ ہے لیکن یہ رابطہ وقت کے درمیانی فاصلے سے ہو کر قاری تک آیا ہے۔

اس لئے یہ تاویل متن کو زمانیت TEMPORALITY کا تابع قرار دیتی ہے۔ شرحیات بیک وقت متن کے HORIZON اور شارح (قاری) کے HORIZON کو ایک دوسرے میں ضم کرنے کا اور دونوں کے مابین مماثلت اور عدم مماثلت کو تلاش کرنے کا طریقۂ کار ہے جو اپنے اندر فکری اور تحقیقی دونوں پہلو لئے ہوئے ہے۔ ہم عصر شرحیاتی نظریہ سازوں HERMENEUTICAL THEORISTS میں تین اہم اور قابل ذکر نام آتے ہیں۔ ہینس جارج گڈامر HANS-GEORG GADAMER، یُرگن ہابرماس JURGEN HABERMAS اور پال ریکر PAUL RICOEUR

جدید لسانیاتی اور نشانیاتی افکار میں شعریات کا مقام انھیں مفکروں کے باہمی اثرات اور اختلافات کی وجہ سے ہی متعین ہو سکا ہے۔ یہاں اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ شعریات اگرچہ ساختیاتی طریقہ کار سے اس معنی میں الگ ہے کہ اس نے تفہیم متن کے مسئلے کو ایک دوسرے رخ سے دیکھنے کی کوشش کی لیکن بعض ماہرین شعریات نشانیاتی اور ساختیاتی نتائج سے استفادہ کرنے میں کوئی تامل بھی نہیں کرتے بشرطیکہ وہ نتائج تاریخی اور بین ثقافتی حوالے سے نئی تاویلوں کے لئے راہ ہموار کر سکیں۔

گڈامر کے نظریے کو بالاجمال اس طرح پیش کیا جا سکتا ہے۔

"...THE HERMENEUTICAL PROBLEM IS UNIVERSAL AND BASIC FOR ALL INTERHUMAN EXPRERIENCES, BOTH OF HISTORY AND OF THE PRESENT MOMENT, PRECISELY BECAUSE MEANING CAN BE EXPRERISNCED EVEN WHERE IT IS NOT INTENDED."

گڈامر کے پورے نظریۂ متن کا بنیادی نکتہ دراصل اس کے محولۂ بالا بیان کا آخری فقرہ ہے یعنی متن جہاں نہیں چاہتا ہے وہاں پر بھی پڑھنے والا معنی سے دوچار ہوتا ہے۔ کیوں کہ متن کے موضوع سے متعلق قاری پہلے سے ہی کچھ نہ کچھ جانتا ہے یا جاننے کی توقع رکھتا ہے۔

"ONE CAN ONLY UNDERSTAND WHAT ONE MIGHT MISUNDERSTAND."

اور اس سابقہ وقوف یا پیش فہمی PREUNDERSTANDING کی نوعیت کا دار و مدار اس کے اور اس کے عہد کے تاریخی شعور پر ہے۔ تشریح و تفہیم کا طریقہ کار یورپ کی روشن خیال ENLIGHTENMENT کی توسیع ضرور ہے لیکن اس پر یہ الزام بھی ہے کہ یہ اپنے اندر ان لائٹنمنٹ مخالف رجحان رکھتا ہے۔ بقول گڈامر روشن خیال کا پیغام محض نصف سچائی ہے کیوں کہ معاشرے کی پسند یا ناپسند اور مروجہ مفروضات سے بدظن ہونے کے پیچھے جو سچائی ہے وہ بیداری کی تمام روایتوں میں موجود ہے۔ چنانچہ اس لائٹنمنٹ نے ہمیں جس تنقیدی جرأت سے نوازا ہے وہ آج کی دانشورانہ فضا کے اس HORIZON کا ایک حصہ ہے جو کسی بھی متن کی تفہیم کے لئے پیش فہمی کا حکم رکھتا ہے کوئی بھی شارح خواہ کسی بھی شعبۂ علم سے منسلک ہو متن کی گتھیوں کو موضوعات سے متعلق پہلے سے قائم کردہ یا قبول کردہ تصورات (گڈامر کے الفاظ میں HISTORY OF THE EFFECTS OF INTERPRETER'S CULTURE) کے حوالے سے ہی سلجھانے کا کام شروع کرتا ہے۔

گڈامر کا کہنا ہے کہ نہ تو متن مستقل اور غیر متغیر ہے یعنی ماضی کی گزشتہ تبدیلیوں سے محفوظ ہے اور نہ اس کا قاری ان تاریخی اثرات سے عاری۔ ماضی ایک ایسی متحرک پرچھائیں ہے جسے زمانِ موجود پروجیکٹ کرتا ہے۔ اور یہ زمانِ موجود مصنف یا متن نگار کے عہد کی تاریخیت سے بے رشتہ ہو ہی نہیں سکتا کیوں کہ ماضی منجمد نہیں ہے اور نہ ماضی ہم سے الگ ہے۔

گڈامر کا یہ جملہ بڑا ہی معنی خیز ہے کہ

"EACH OF US BELONGS TO HISTORY FAR MORE THAN HISTORY BELONGS TO US." ✲

راہی فدائی

شہپر یارِ شہر کی یہ تاکید ہے
کُن، مرا نا قابلِ تردید ہے

راہ کاٹی آپ کی اس نے تو کیا!
آپ ہی کی محترم! تقلید ہے

سو چلو پہلے! جلاؤ پھر چراغ
شب کے آنگن میں ابھی خورشید ہے

ذہن میں ہیں مار و کژدم خوف کے
دل میں روشن کرمکِ امید ہے

جس لہو میں شر کا جُز لوثہ نہیں
وہ فرشتہ زندۂ جاوید ہے

اک مفصّل داستاں ہے کائنات
دل کی دنیا، مختصر تمہید ہے!

معجزاتی شعر راہی نے کہے تو کیا!
بالیقین اللہ کی تائید ہے

۱۸۳ اے، برہان الدین اسٹریٹ، کراچی ۵۱۶۰۰۱

امجد اسلام امجد

باغِ جہاں سے صورتِ شبنم چلے گئے
کیا کیا نگارِ وسعتِ عالم چلے گئے!

ہم تک خود اپنے گھر سے نہ آئی کوئی صدا
کیا سب نوائے درد کے محرم چلے گئے!

اُن کا حساب کون رکھے اے رقیبِ نطق و صوت
جو حرف ناشنیدہ و مبہم چلے گئے

تم نے زمانہ پھیر کے دیکھا نہیں یہ پل
اس ایک پل میں کتنے ہی موسم چلے گئے

عالم وہی ہے آج بھی لیکن جو دیکھیے
جتنے تھے لوگ زینتِ عالم چلے گئے

روشن اُسی طرح ہے ابھی ہجر کی خاک
ساغر کے ساتھ ساتھ ہی ساقی جم چلے گئے

جلتا نہ تھا دیارِ وفا پر کوئی چراغ
امجد تو سرگزشتِ کئے ہم چلے گئے

۲۲ ممتاز اسٹریٹ، گڑھی شاہو، لاہور (پاکستان)

مشتاق مومن

۲۹۸-۹۱، مورسیح نیشن نشاستہ مارکیٹ، کرلا، بمبئی۔

ترنت شور مچائیے، انعام پائیے

فانی بدایونی نے اپنے ایک شعر میں خدا کی وحدانیت اور وجودیت کو بیان کچھ اس طرح کیا ہے کہ خدا دل میں تو ہے لیکن سمجھ میں نہیں آتا۔ بس یہی خدا کی پہچان ہے۔ پچھلے دنوں میں سخت بیمار ہو گیا تھا۔ بس یوں سمجھئے کہ قبرستان سے لوٹ آیا۔ اب بفضل رب العالمین اچھا ہو گیا ہوں اور ایک نارمل انسان کی طرح زندگی گزار رہا ہوں۔ اب پہلے جیسی کوئی بات نہیں ہے۔ تمام علتوں کو ترک کر دیا ہے۔ اس بات پر چند لوگ جو مجھ سے ذرا قریب ہیں ضرور یہ کہتے ہیں ہمارے یار نے سب کچھ تو چھوڑ دیا۔ یہ دو کوڑی کی زندگی کو کیوں گلے سے لگائے بیٹھے ہو۔ میں نہیں کیا بتاؤں کہ جب بدن کا گوشت ہڈیاں چھوڑنے لگتا ہے تو پھر آدمی کو بہت کچھ ترک کرنا پڑتا ہے۔

مگر ان دنوں میں ایک عجیب و غریب مسئلے کا شکار ہوں۔ دل میں سوچتا ہوں کہیں ڈاکٹر داہیا کی گولیوں کا تو ری ایکشن نہیں۔ اس سے پہلے بھی میں آپ کو اپنے دکھ میں شریک کر چکا ہوں تو کیوں نہ اس غم میں بھی آپ کو شریک کروں۔ آپ بالکل مت گھبرائیے آپ کے بارے میں کچھ بھی نہ لکھوں گا۔ سر دست تو آپ میری سوچ میں شامل ہو جائیے۔ کیوں کہ یہ پرابلم اتنا نہیں ہے! جس تک یہ گھر اور قریبی رشتہ داروں تک ہی محدود ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ جب بھی کسی بات کا جواب دیتا ہوں یا کسی ایسے موضوع پر اظہار خیال کرتا ہوں جس پر عام لوگ اظہار خیال نہیں کرتے تو بیگم گھبرا کر پوچھ بیٹھتی ہیں کہ تم نے آج صبح گولیاں کھائیں یا نہیں۔

سسرال میں دوران گفتگو باتوں باتوں میں اپنی خوش دامن سے کہتا ہوں۔ "دیکھئے نماز پڑھنے کے لئے میں اپنے بچوں پر جبر نہیں کر سکتا۔ ان حال، ان کی نیکی ان کی نماز روزہ ان کے ساتھ جائے گی اور ویسے بھی ہمیشہ نصیحت اپنے آپ سے کرنا چاہیے۔" تو وہ یکلخت چونک اٹھتی ہیں۔ اور بڑی اپنائیت سے کہتی ہیں: "تم ٹائم ٹو ٹائم گولیاں تو لیتے ہو نا؟"

اس قسم کے دو چار واقعات اور ہوئے تو میں نے ڈاکٹر داہیا سے مشورہ کیا۔ اس نے ہمیشہ کی طرح بڑے سکون اور غور سے میری باتیں سنیں اور کہا۔

"گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ایسا ہوتا ہے۔ اس مرض میں ہاں تو تم ان دنوں کون سی گولیاں لے رہے ہو؟"

"فلوڈیک اور سنسی ول۔" FLUDAC AND SENSIVAL

"تو گولیاں جاری رکھو۔ اور ایسا کرو کہ دیوالی کی چھٹیوں میں کچھ دن کے لئے باہر چلے جاؤ۔ ذرا OUTING کر آؤ۔ اور روزمرہ کے ماحول سے کچھ دن الگ ماحول میں گزارو۔ دیکھو کیسا لگتا ہے۔"

"میں نے ڈاکٹر داہیا کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "یعنی ڈاکٹر تم سمجھتے اب تک ......"

"وہ پیشنٹ پلیز ـــــ پیشنٹ۔ تم بالکل نارمل ہو۔ اور تمہارے ساتھ کوئی گڑبڑ نہیں ہے۔ تم چاہو تو اپنے اطمینان کے لئے میں ابھی دوبارہ تمہیں لکھ کر دے سکتا ہوں کہ NOW YOU ARE PERFECTLY"

"میں نے پھر ڈاکٹر سے کہا: "نہیں مجھے تمہارے سرٹیفکٹ کی ضرورت نہیں۔"

تو میرا کہنا مانو اور کچھ دن کے لئے باہر چلے جاؤ۔ ذرا OUTING کر آؤ پھر بات کرتے ہیں۔ اور ہاں پلیز ذرا تمہاری وائف کو بھیج دو اور تم باہر ہی بیٹھو۔

تو اس طرح میں نے ڈاکٹر داہیا کی بات مان لی اور دلی کا رخت سفر باندھا۔ جہاں میرا دل ہمیشہ اٹکا رہتا ہے۔ نہ جانے کیوں اسلامی شان و شوکت کے اس قبرستان میں ایسی کون سی بات ہے!"

اب وہاں کا احوال سنو۔ صبح سویرے ہم دونوں دلی پہنچ گئے۔ اجمیری گیٹ پر بیگم نے آدمیوں کو سائیکل رکشا چلاتے دیکھا تو ششدر رہ گئیں۔ اور میں صرف مسکرا کر رہ گیا۔ البتہ مجھے ان کا یہ جملہ ضرور بھایا کہ "کم از کم راجدھانی میں تو......"

اجمیری گیٹ سے پہاڑ گنج جاتے ہوئے راستے میں ایک پل آتا ہے۔ پل کی چڑھائی شروع ہوتے ہی رکشا والا نیچے اتر گیا پہلے وہ رکشا چلا رہا تھا اب کھینچ رہا تھا۔ بیگم نے پھر چیں چیں کرنا شروع کر دیا۔ تو رکشا والے نے ان سے کہنا شروع کیا۔ مجبوری ہے نہیں کریں گے تو کھائیں گے کیا۔؟ وہ کچھ ایسے ہی لہجے میں بول رہا تھا گویا گنگنا رہا ہو۔ کہ

ہم نے مانا دلی میں رہیں گے کھائیں گے کیا

ان دنوں میں نکالے جا رہے تھے۔ رکشا والا اب ooer ہو رہا تھا ایک جگہ پر میں نے بیگم کو ٹھوکا دیا۔ وہ چونک پڑیں آنکھ اور بھنوؤں کے اشارے سے انہوں نے پوچھا کیوں کیا ہوا؟ میں نے ہاتھ سے سامنے اشارہ کیا۔ پر بھی وہ کچھ نہ سمجھ سکیں تو میں چپ ہو گیا۔ سوائے چپ رہنے کے میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ پل کی لوہے کی دیواروں پر لکھا ہوا تھا۔

۴۔ نومبر دلی بند، بھارت بند۔

مجھے پہاڑ گنج میں ایک عزیز سے ملنا تھا۔ اور اس کے ڈھابے پر ناشتہ کرنے کا بھی پروگرام تھا۔ مگر اس کا ڈھابا نہیں ملا۔ اسی سائیکل رکشے پر ہماری واپسی ہوئی۔ جامع مسجد کے پاس رکشے والے نے پان کی ایک پیک جامع مسجد کی سیڑھیوں کی طرف پھینکی اور منہ چلاتے ہوئے بولا۔ صرف تیس روپئے ہوئے صاحب۔ مخاطب وہ بیگم سے تھا۔ ہائیں تیس روپئے۔ بیگم نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔ رکشا والے نے بڑی معصومیت سے گردن ہلائی میں نے جیب سے بیس روپے کا ایک نوٹ نکالا اور اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ اس نے خاموشی سے پیسے لے لئے۔ بیگم احتجاج ہی کرتی رہ گئیں۔ مارے ہم تو حالی ادھر سے ادھر گئے۔ اور پھر ادھر سے ادھر .... مگر رکشا والا جھومتے ہوئے اور گنگناتے ہوئے چلا جا رہا تھا فقیرا چل چلا چل۔ فقیرا چل چلا چل۔

دراصل مجھے اس وقت جامع نگر ... ہاؤس میں ہونا چاہئے تھا جہاں ڈاکٹر خالد محمود رہتے ہیں۔ میں نے انہیں ٹیلیگرام کر دیا تھا۔ اور مجھے معلوم تھا کہ وہ میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ مگر میں کچھ اور ہی پروگرام بنا رہا تھا۔ میں نے بیگم سے کہا ابھی خالد محمود کے یہاں نہیں چلتے اس وقت میں نہیں۔ جامع مسجد کے آس پاس کسی لاج میں قیام کرتے ہیں۔ شام میں خالد محمود سے ملتے ہیں۔ اور یوں حسب وعدہ ان کے گھر شفٹ ہو جاتے ہیں بڑی مشکل سے ہوٹل گلستان میں ڈیڑھ سو روپئے یومیہ پر ایک کوٹھری نما کمرہ ملا' میں ان صاحب سے جو مجھے کمرہ دکھا رہے تھے، اور باتھ روم اور اس سے اٹیچ منڈاس پر زیادہ زور دے رہے تھے کہا بھی کہ بھئی یہ بارہ [illegible]

باتھ روم' اور اس سے اٹیچ۔

● جامع مسجد کے ایک ہوٹل سے ہم چھوٹے کا پایہ کھا کر نکلے تو دن چڑھ آیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ جامع مسجد کے چاروں طرف بازار میں بند و بست ہے اور جہاں مرغیاں، مچھلیاں، اور چھوٹے بڑے کا گوشت ملتا ہے۔ پولیس اگر کوڑا، دھکا رہی ہے، اور ... چھپڑیاں لگا رہی ہے۔ میرے ذہن میں ایک لمحے کے لئے خیال آیا کہ کہیں یہ سب صرف مجھے دھمکانے اور ڈرانے کے لئے تو نہیں کیا جا رہا ہے؟ کیوں کہ ہوٹل گلستان کے کاؤنٹر پر بھی ایک تختی لگی ہوئی تھی۔

"حالات کو دیکھتے ہوئے فلم کا آخری شو نہ دیکھیں"

شام میں تو ہم جامع نگر نہ جا سکے۔ بلکہ دوسری صبح ہم لال قلعہ کے سامنے والے بس اسٹاپ پر گئے جہاں سے ہمیں اوکھلا جانے والی بس مل سکتی تھی اور جس کے سکنڈ لاسٹ اسٹاپ پر ہمیں اترنا تھا اور خالد محمود سے یہ سننا تھا کہ

"لاج میں رہ کر تم نے ہمیں گالی دی ہے۔"

صبح کا سہانا وقت تھا سامنے کہرے اور دھند میں لپٹا لال قلعہ نظر آ رہا تھا جس پر ترنگا جھنڈا لہرا رہا تھا مگر مجھے ایسا لگا جیسے اس ترنگے سے سفید اور ہرا رنگ غائب ہو گیا ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں بس آ گئی۔ بس اسٹینڈ پر زیادہ بھیڑ نہیں تھی۔ میں جانتا تھا کہ OM پہ سے بس میں رش ہونا شروع ہو جائے گا۔ بس چلنا شروع ہوئی دوسروں کو جب ... کنڈکٹر کے پاس جا کر ٹکٹ لیتے دیکھا تو میں نے بھی لے لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے محسوس کیا کہ بوڑھے سے بس ڈرائیور سے بس سنبھل نہیں رہی ہے۔ بس اچانک کبھی تیز ہو جاتی تو کھڑکیوں میں لگی ہوئی کانچ سے ایسی آواز آتی جیسے وہ سردی سے کپکپا رہی ہے۔ اور کبھی اتنی آہستہ ہو جاتی کہ یوں محسوس ہوتا جیسے بس رینگ رہی ہے۔ خدا خدا کر کے بس بستی نظام الدین پہنچی۔ ایک باریش بزرگ اپنے آپ سے باتیں کرتے ہوئے بس سے اتر گئے۔

"کم بخت بس ڈرائیور ہے یا گھسیارہ؟"

بس رک گئی تھی۔ کنڈکٹر آواز لگا رہا تھا کہ بس کہاں کہاں جائیگی اچانک میری نظر سامنے والی سیٹ کی طرف پڑ گئی۔ میں نے دیکھا بس کے مسافروں کے لئے ہدایت تحریر تھی۔ بیگم چونکہ پہلی مرتبہ دلی آئی تھیں۔ اس لئے باہر کا نظارہ دیکھنے میں محو تھیں۔ میں نے جلدی جلدی جیب میں سے چشمہ نکالا اور ہدایت جو پہلے دھندلی نظر آ رہی تھیں۔ اب بالکل واضح تھیں میں نے اسے پڑھا تو میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ سیٹ کی

پشت پر لکھا ہوا تھا۔

LOOK UNDER YOUR SEAT
THERE COULD BE A BOMB
RAISE ALARM
EARN REWARD

ہندی میں یوں لکھا ہوا تھا
"اپنی سیٹ کے نیچے دیکھیے"
لاوارث وستو بم بھی ہو سکتی ہے۔
ترنت شور مچائیے
انعام پائیے۔"

میں نے بے خیالی میں ادھر ادھر نظریں دوڑائیں میں نے صاف دیکھا کہ میرے بازو والی سیٹ کے نیچے ایک چوکور بنڈل رکھا ہوا ہے۔ یہ بنڈل اس وقت بھی وہاں موجود تھا جب ہم دونوں بس میں سوار ہوئے تھے۔ بس بستی نظام الدین پر رکی ہوئی تھی۔ ہمایوں کا مقبرہ سے کہ حضرت امیر خسرو تک پولیس کی ڈیوٹی تھی۔ واکی ٹاکی، مشین گنز اور انسپکٹر پستولوں سے لیس تھے۔ یہی موقع ہے۔ میرے دل کی آواز آئی اور میں نے منہ پر دونوں ہاتھوں کا بھونپو بنایا اور پوری قوت سے چیخا۔

"بھاگو بس میں بم ہے۔" شاید زندگی میں پہلی بار میں اتنی زور سے چلایا تھا۔ میرا چلانا تھا کہ بس کے مسافر، کنڈکٹر اور ڈرائیور سمیت گھبرا کر بھاگے۔ چند منٹ میں ہی بس خالی ہو گئی۔ میں نے دیکھا ہتھیار بند پولیس سپاہی بس کے گرد مستطیل بنا رہے ہیں۔ تقریباً چار یا پانچ منٹ کے فاصلے پر میں بس میں دروازے پر ہی کھڑا رہا۔ انعام ملنے کے لالچ نے میرے قدم روک لیے تھے۔ تھوڑی دیر میں بم کو بیکار کرنے والا اسکواڈ بھی آ گیا۔ میں نے ہاتھ سے بم کی طرف اشارہ کیا۔ دو تین بڑے آفیسر بھی اس کے ساتھ تھے۔ ایک دیکھتے یوں چل کر بم کے قریب گیا جیسے بلقیس سلیمان کے محل میں چل کر آئی تھی۔ بنڈل کے پاس جانے کے بعد قریب دو منٹ تک اس نے اس کا مشاہدہ کیا۔ اسے اٹھایا پلٹا اور پھر بڑی آہستگی اور احتیاط سے اسے کھولنا شروع کیا۔ اور جیسے ہی اس نے اسے کھولا اس میں سے گیروے دھاگے سے بندھے ڈھیر سارے پوسٹر نکلے۔ اس نے ان پوسٹروں کو کھولنا شروع کیا۔

خون کی ندیاں بہائیں گے ۔ مندر وہیں بنائیں گے ۔ (پہلا پوسٹر)
دشمنوں کو ماتم بانٹیں گے، مندر وہیں بنائیں گے۔ (دوسرا پوسٹر)
تلوار نکلی میان سے، مندر بنائیں گے شان سے (تیسرا پوسٹر)
اس نے ان پوسٹروں کو میری طرف کرتے ہوئے کہا۔ "یہ بم ہے!"

"جی ہاں یہ بم ۔ ۔ ۔ ۔" ابھی میں نے اپنا جملہ پورا بھی نہیں کیا تھا کہ کہیں قریب ہی ایک خوفناک دھماکا ہوا۔ لوگوں کے چیخنے اور چلانے کی آوازیں اچانک سر اٹھانے لگی۔ دھماکہ شاید کہیں قریب ہی ہوا تھا کیوں کہ بس کی کھڑکیوں کے شیشے تک جھنجھنا گئے تھے۔ میں ابھی بس سے اترنا ہی چاہتا تھا کہ ایک نے مجھے کالر پکڑ کر اوپر کھینچ لیا

"YOU THINK TNT YOU ARE LOOKING VERY SMART BUT YOU ARE NOT SO" ایک آفیسر نے مجھ سے کہا۔

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا!"

"مطلب ابھی سمجھ میں آ جائے گا۔ بڑی مشکل سے ہاتھ آئے ہو۔ اب نہیں بچو گے۔" تب تک بس مسافروں کو چھوڑ کر چلی۔

"دہشت گرد ہو۔ اب تم نے نیا طریقہ استعمال کیا ہے۔ یعنی بستی والوں کو بہانے سے ایک جگہ جمع کیا تاکہ تمہارے ساتھی دوسری جگہ بم کا دھماکہ کر سکیں۔" دوسرا آفیسر بولا۔ بس مڑ رہی تھی۔

"بکواس بند کرو اور مجھے جانے دو۔ آپ لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔" میں نے اسی لہجے میں انہیں جواب دیا۔ اور دروازے کے قریب پہنچا لیکن بوٹ کی ایک ٹھوکر نے مجھے بے بس کر دیا تھا۔ مگر اس کے باوجود میں نے ایک کا گریبان پکڑ ہی لیا۔ اور چیخ کر اس سے کہا۔ آخر میرا قصور کیا ہے۔ اس نے جواب میں اپنا گریبان چھڑاتے ہوئے مجھے زور کا دھکا دیا۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ آپ لوگ نہیں جانتے میں کون ہوں — میں ایک پترکار ہوں۔ سیکولر ہوں۔

اس پر وہ سب ایسے انداز میں ہنسے جیسے میں نے انہیں کوئی لطیفہ سنایا ہو۔ پھر ان میں سے ایک بولا چپ چاپ بیٹھے رہو اسی میں تمہاری سلامتی ہے۔

"لیکن کیوں میں نے کیا کیا ہے؟ آخر کس جرم اور کس قانون کے تحت مجھے گرفتار کیا گیا ہے؟"

"تمہیں ٹاڈا کے تحت گرفتار کیا گیا ہے۔" دوسرے نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

"دیکھو بھائی۔ میں آتنک وادی نہیں ہوں۔ میری آواز اچانک مدھم ہو گئی۔ "تو پھر کون ہو؟"

"میں ایک امن پسند معزز شہری ہوں۔"

"زیادہ بک بک نہ کرو جب تمہیں الٹا لٹکا کر تمہاری کھال میں ڈنڈا کیا جائے گا تب خود بخود سچ بول دو گے۔"

"پلیز میری بات تو سنئے میں ایک اجنبی ہوں کل ہی دلی آیا ہوں۔

عبدالرحیم نشتر

فقت سے رہے شہر میں کہاں جاؤں
صورتوں پہ نئی صورتیں جہاں جاؤں

زمین ادھر آسمان روشن ہے
ایسی تیز چکاچوند میں کہاں جاؤں

اؤں جو ہر تلوار کس مقابل کو ؟
رہے ہوں سامنے دشمن تو درمیاں جاؤں

، چاہتا ہوں کوئی گیت بن کے بکھر جاؤں میں
جلتے ہیں فقط صورتِ فغاں جاؤں

ریا تھا کہ آفاق گم ہوئے مجھ میں
اپنے آپ سے نکلوں تو بے کراں جاؤں

اجیٹھ ۔ ۱-۲۱-۴۳ ضلع رائے گڑھ (مہاراشٹر)

حسن فرخ

ہیں چرائے ہوئے دن رات کہیں بھاگ چلو
چاک ہے پیرہنِ ذات کہیں بھاگ چلو

لمس ہی لمس ادھورا سا ابلتا ہوا، لمس
برف بن جائیں نہ جذبات کہیں بھاگ چلو

کوئی شکوہ ہے نہ دوری ہے نہ فرقت نہ وصال
رہ گئی صرف ملاقات کہیں بھاگ چلو

ہوتے ہیں مصلحتیں. ذہن کی گہرائی میں
موت جیتے ہیں یہ لمحات کہیں بھاگ چلو

دن تو سورج کی تمازت میں جلا اوڑھا
ہم سے کچھ پوچھ نہ لے رات کہیں بھاگ چلو

مکان نمبر ۱۶-۳-۱۰، ہمایوں نگر
حیدرآباد

مقیم اثر بیاولی

اسیرِ خاک تھا، شمس و قمر میں ڈوب گیا
فلک شکار، محیطِ نظر میں ڈوب گیا

نیازِ عشق، مجھے لے گیا حقیقت تک
وہ نازِ علم تھا، گردِ سفر میں ڈوب گیا

کہیں کنارہ نہیں ہے بدن کی کشتی کا
ثبات کشمکشِ بحر و بر میں ڈوب گیا

وہی تو منبعِ نور تھا جس سے نور بنتا ہے
وہ ہمنوائے سحر، سفر میں ڈوب گیا

چراغِ عرشِ معلیٰ ہے انجمِ خاک کی
کوئی تو بات تھی، دریا، گہر میں ڈوب گیا

درِ جمال تھا قصرِ جمالِ یار نہ تھا
وہ پل صراطِ جبیں، سنگِ در میں ڈوب گیا

وہ موسموں کو لئے کیا شجر میں اترے گا
جو سایہ سایۂ برگِ شجر میں ڈوب گیا

دل و نظر میں کھلی روشنی کو کیا جانے
وہ بے خبر جو شعاعِ خبر میں ڈوب گیا

مشتاق احمد نوری

ب ۱۴۰۴، آفیسرز ہوسٹل، بیلی روڈ، پٹنہ - ۱

سچ

گرمی اپنے شباب پر تھی اور گاؤں کی بجلی پر بھروسہ کرنا ویسے ہی ہے جیسے ریت کی دیوار پر کب آئی کب گئی، اس کا پتہ ہی نہیں چل پاتا۔

ایسی حالت میں جب بھی گاؤں جاتا ہوں، مسجد ہی کا سہارا لیتا ہوں۔ مسجد میرے دروازے کے بغل میں ہی ہے۔ سامنے کافی کھلی جگہ ہے۔ پورب سے بڑے مزے کی ہوا چلتی ہے۔ مسجد کے موزیک شدہ وراندے پر جو خنکی کا احساس ہوتا ہے وہ رگوں میں سرایت کر جاتا ہے۔ چنانچہ زیادہ تر خالی وقت وہیں گزارتا ہوں لیکن عصر کے بعد جب ملک کے نام پر پانچ منٹ رکنے کا اعلان ہوتا ہے تو نہ جانے ڈھیر سارے اچانک یاد آجاتے ہیں اور میں چپکے سے نکل بھاگتا ہوں۔

بقرعید کا دن تھا۔ ظہر کے بعد ہوا خوری کے لئے مسجد کے وراندے میں لیٹا ہوا تھا۔ مسجد کے موذن فکو (فقیر محمد) تیز تیز قدموں سے آتے دکھائی دیئے اور تیز سانسوں کے درمیان گھبرائے ہوئے لہجے میں کہنے لگے۔

"بابو جانتے ہیں! آج دو بجیا ٹرین سے عیدگاہ کے نزدیک ایک آدمی گر گیا ہے۔ اس کا سر پتھر پر پڑنے سے پھٹ گیا ہے جس سے بہت سارا خون رس رہا ہے۔"

میں یہ سنتے ہی اچانک ہڑبڑا گیا۔

"یہ کیسے ہوا؟"

"لگتا ہے کسی نے اسے ٹرین سے دھکا دے دیا۔ دھم سے گرا ہے۔ درد سے چھٹپٹا رہا ہے۔ وہاں بہت سے لوگ جمع ہو گئے ہیں۔"

"وہ ٹرین سے گرا ہے تب تو یہ ریل کا کیس ہو گیا ریل پولیس کو خبر کرنا چاہئے۔"

مدین بابو نے اپنی رائے دی وہ اکثر قانون کے مطابق رائے دینے میں ماہر مانے جاتے تھے۔

"ہاں! ریل کیس تو ہے لیکن اسے فرسٹ ایڈ کے طور پر کچھ تو دیا ہی جانا چاہئے۔" میں نے کہا۔

"پولیس آنے سے قبل کچھ بھی کرنا غیر قانونی ہے۔ اگر بعد میں کچھ ہو ہوا گیا تو پھر لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔"

ان کی بات میں بھی دم تھا۔ میں نے فکو سے پوچھا

"وہاں کوئی ہے کہ نہیں؟"

"بابو دھوپ کتنی تیز ہے۔ ایسی حالت میں وہاں کون کھڑا رہے گا۔ وہ تڑپ رہا تھا دو چار چرواہے وہاں کھڑے تھے۔"

"باقی لوگ؟"

"باقی جو بھی آتا افسوس کا اظہار کرتا اور کھسک جاتا۔ ہر کوئی پولیس کیس سے ڈرتا ہے۔"

لیکن وہ آدمی تڑپ رہا ہے، اس کے لئے کچھ کیا جانا چاہئے یہ کہہ کر میں جانے کے لئے اٹھا ہی تھا کہ چچا نے کہا۔

"یہ میری چھتری لیتے جانا دھوپ بہت تیز ہے۔"

میں نے ان کی طرف دیکھا ہی تھا کہ مدین بابو نے بتایا۔

"آپ ایک بڑے عہدے کے سرکاری افسر ہیں۔ آپ جائیں گے تو بات پولیس تک بھی پہونچے گی۔"

کون جانے گرنے والا ہندو ہے یا مسلمان۔ اگر ہندو ہوا اور خدا نخواستہ مر گیا تو پھر آپ کو بھی پولیس گواہی میں آنا پڑے گا۔

"ہاں یہ بات تو ہے، تم جاؤ گے تو ذمہ داری تو لینی ہی پڑے گی پھر پولیس کو بھی خبر کرنا ہوگا اس کے ساتھ رہنا بھی ہوگا۔ پھر اسپتال کا چکر

"اور اگر کچھ ہو گیا تو تم کہاں کہاں دوڑتے پھرو گے "

میرے اندر کا انسان اچانک آدمی بن گیا اور لمحہ بھر میں اتنی سوجھ بوجھ آ گئی کہ ساری اونچ نیچ نگاہوں میں پھر گئی اور اس تڑپتے ہوئے آدمی کی جگہ صرف پولس وردی میں ایک کڑک آدمی دکھائی دینے لگا پولس جس کا ڈر کس دل میں نہیں ہے آدمی کتنا ہی خونخوار ہو، چاہے ہزاروں کا قتل کرے ڈاکہ جابر ہو، خدا سے چاہے نہ ڈرے۔ لیکن پولیس سے ضرور ڈرتا ہے۔

میں بھی پولیس سے ڈر گیا واقعی سارا منظر نگاہوں میں پھر گیا میں جائے واردات پر جاؤں گا۔ گاؤں بھر کے لوگ مجھے جانتے ہیں۔ میرے جانے سے ساری ذمہ داری مجھ پر ہی آ جائے گی پھر سب مجھے ہی کرنا پڑے گا، وہ مر گیا اگر ہندو نکلا تو اور بھی جھمیلا ہوگا بقرعید کے موقع پر ایک مسلم گاؤں میں ایک ہندو کا قتل ہو جانے، فساد ہی ہو جائے اور وہ سب ہوگا جو ہوتا آیا ہے۔

میں مسجد کے ہی برآمدے پر بیٹھ گیا۔ لیکن بے چینی و بیقراری تھی۔ چھوٹے بھائی کو بلایا اور تازہ صورت حال جاننے کے لئے کہا آدھے گھنٹے کے بعد اس نے آکر بتایا کہ بھیڑ کافی بڑھ گئی ہے زخمی مسافر بہت تڑپ رہا ہے لوگوں نے اس کی گمچھی سے اس کا سر باندھ دیا ہے ایک چرواہے نے پانی لا کر پلایا ہے وہ مشکل ہی سے پی سکا وہ اتنے شدید کرب میں مبتلا ہے کہ اپنا نام بھی نہیں بتا سکتا۔ اس کے ساتھ صرف ایک تھیلا ہے جس میں اس کے کپڑے ہیں۔

"شکل سے کیا لگتا ہے "

میں نے جلدی سے پوچھا۔ میری بات سمجھتے ہوئے بھائی نے بتایا "شکل سے ہندو لگتا ہے نہ مسلمان۔ صرف آدمی لگتا ہے "

میری پریشانی کچھ اور بڑھی۔ اگر مسلمان ہوتا تو پریشانی کم ہو جاتی کہ کچھ ہو جانے پر کم از کم فساد کا ڈر نہیں رہتا۔

لیکن اگر ہندو نکلا ۔ اور مر گیا تو ؟

اس ادھیڑبن میں تھا کہ موذن نے عصر کی اذان دینی شروع کر دی اور مجھے اذان کے الفاظ بھی دہرانا یاد نہیں رہا۔ بس وہ زخمی ہی یاد رہا

نماز بعد میں نے مکھیا جی سے کہا۔

"مکھیا جی! ٹرین سے کوئی مسافر گر کر زخمی ہو گیا ہے ریلوے کراسنگ والوں سے ملنا دم کر دیتے تاکہ پولس آکر کاروائی شروع کر دیتی"

"دعت چھوڑیے نا آپ ـــ یہ سب بکھیڑا ہیں آپ کا ہے کو پڑتے ہیں۔ سرکاری افسر ہیں کچھ ہو گیا تو آپ پریشانی میں پڑ جائیے گا ۔ شام تک سب ٹھیک ہو جائے گا۔ "

"اگر وہ مر گیا تو ؟ "

"نہیں نا مرے گا ۔ ایسا کیس ہوتے رہتا ہے "

انہوں نے اتنے اطمینان سے کہا گویا یہ کوئی بڑا مسئلہ نہ ہو۔

نماز بعد میں نے ہمت کی۔ اب جو بھی ہو ایک آدمی کو یوں ہی مرنے کیلئے نہیں چھوڑا جا سکتا۔ میں سرکاری افسر ہوں تو ذمہ داری بھی تو ہے، میں اپنا بچاؤ تو کر ہی سکتا ہوں میری بات کا ایک وزن تو ہوگا ہی۔ یہی سوچ کر میں نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

"میں ایک چکر لگا آتا ہوں پولیس میرا کیا بگاڑے گی "

"پولیس ـــ " ایک لمبی سانس لے کر مدین بابو بولنے لگے۔

"گجرات کے چیف جوڈیشیل مجسٹریٹ کا قصہ ابھی پرانا نہیں ہوا۔ آپ نے بھی پڑھا ہوگا۔ کس طرح پولیس نے انہیں مارا پیٹا، ہتھکڑی لگائی اور لاک اپ میں بند کر دیا۔ شراب کے نشے میں دھت ہونے کا الزام لگایا۔ اور بے چارہ مجسٹریٹ ایک مجرم کی طرح سب سہتا رہا۔"

میں چونک گیا سارا کیس سامنے آ گیا۔ میں مدین بابو کی طرف دیکھنے لگا۔ انہوں نے بات جاری رکھی۔

"جو مجسٹریٹ مجرموں کو سزا دیتا ہے جس کے قلم کے اشارے پر مجرموں کے فیصلے کا دارومدار ہوتا ہے وہی پولس سے نہیں بچ سکا ۔ آپ تو ٹھہرے ایک مسلمان آفیسر۔ اور آفت آئے گی۔ "

میں ایک بار پھر چونک پڑا۔ دسمبر کے بعد سے تو پورے ملک کی سوچ میں اچانک تبدیلی کا احساس ہونے لگا تھا۔ ہر کوئی دوسرے سے خوف زدہ دکھنے لگا تھا۔ ایک دوسرے کو شک کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا تھا میرا عزیز دوست شکلا بھی کبھی کبھار مجھے چھیڑنے سے باز نہیں آتا تھا۔ وہ صرف "کیوں میاں جی کیا حال ہے " کہتا لیکن ایک جملہ میں کیا کچھ چھپا ہوتا تھا اسے یا تو وہ جانتا تھا یا پھر میں سمجھتا تھا۔ بلکہ میں تو کچھ زیادہ ہی سمجھتا تھا۔

میری انسانیت کے غبارے سے پھر ہوا نکل گئی۔ میں نے اس زخمی مسافر کے بارے میں سوچنے کا ارادہ ہی بدل دیا۔ اور چپ چاپ گھر آکر ایک کتاب کی ورق گردانی کرنے لگا۔ لیکن ہر صفحہ پر زخمی مسافر کی تصویر ابھرنے لگی۔

پھر اچانک سوچ نے ایک اور کروٹ بدلی اگر وہ زخمی مسافر

لیا تو پولیس پوری تحقیق کرے گی اور تحقیق کے درمیان یہ بات بھی سامنے
آئے گی کہ ایک سرکاری افسر بھی حادثے کے وقت گاؤں میں موجود تھا
اور اس نے اس سلسلے میں کوئی بھی کارگر قدم نہیں اٹھایا۔ وہ سرکاری
افسر تھا اس لئے سرکاری طور طریقوں سے اسے واقفیت تھی اس کی
کوتاہی اور لاپرواہی سے زخمی نے دم توڑا ہے اس لئے اس کے مرنے
میں اس کا بھی ہاتھ ہے۔ اگر خدانخواستہ مرنے والا مسلمان نہ
ہوا تو ۔۔۔؟

میں چاروں طرف سے گھر گیا اب کر بھی کیا سکتا تھا۔ رات تو
کسی طرح بسر کرنی ہے کل سویرے ہی ارریا چلا جاؤں گا وہاں بس
کا ریزرویشن کروا کر شام پٹنہ کے لئے روانہ ۔۔۔ بس نجات کی یہی
صورت دکھائی دینے لگی۔

رات کسی طرح گزر گئی۔ صبح سویرے تیار ہو ہی رہا تھا کہ رضی
اور انجم ارریا سے آگئے۔

"بھیا آپ گھبرا کر چپکے سے کیوں نکل جاتے ہیں اس بار سرکار
نے آپ کو ایک اہم ذمہ داری سے نوازہ ہے۔ اردو کی بھلائی کے ساتھ
اپنے چھوٹے بھائیوں کو بھی یاد رکھئے"

میں نے ان لوگوں سے وعدہ کر لیا کہ سب کچھ ہوگا۔ خوب سے
دھیان دوں گا، پھر ان لوگوں نے ارریا چلنے کی دعوت دی
اندھا چاہے دو آنکھیں ۔ میں تیار تھا ہی، گھر سے ارریا بھاگ
آیا۔

یہاں دوستوں کی محفل میں طبیعت کچھ بہل گئی۔ شام میں لوگوں
نے "ہم سب" کی طرف سے ایک اعزازی نشست کا انتظام کیا
اس میں کئی ایک مقررین نے میری ادبی خدمات، میری انسانیت
میری ہمدردی، میری غریب پروری، میری صلاحیت وغیرہ کے
خوب خوب چرچے کئے اور میری ان صلاحیتوں کا بھی ذکر کیا جن
سے میں بھی پہلی بار واقف ہوا تھا اور خود کو ہوا میں اڑتا ہوا
محسوس کر رہا تھا۔ جلسے کے آخر میں صدر جلسہ سے گزارش کی گئی
کہ وہ میری خدمات کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کریں۔
صدر جلسہ اپنی جوشیلی تقریر کے لئے خاصے مشہور تھے۔
انہوں نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے فرمایا۔
"یہ شخص جسے آج آپ نے اعزاز سے نوازہ ہے اسے میں ایک
عرصے سے جانتا ہوں۔ یہ شخص آسمان سے بڑا ہو کر نہیں ٹپکا۔
بلکہ اس نے غریبی کی دھند میں ہی آنکھ کھولی، بچپن سے جوانی تک نہ
جانے کتنی بار اس نے دکھوں کی آنچ محسوس کی ہوگی اور اس آنچ
ہی میں تپ کر یہ شخص کندن بنا ہے۔

"آپ نے ان کی ادبی خدمات کو سراہا۔ اچھا کیا۔ ان کی جتنی
تعریف کی جائے کم ہے میں ان کی انسان دوستی اور انسانیت
کی اعلیٰ قدروں سے ان کے لگاؤ کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں
یہ شخص بے حد کومل دل رکھتا ہے اتنا نازک احساس کا
مالک ہے کہ کسی کو تڑپتا نہیں دیکھ سکتا۔ یہ اپنی جان پر، اپنی
آن پر، کھیل کر تڑپتی انسانیت کی لاج رکھتا ہے کسی کو مرتا ہوا دیکھنا
تو دور کی بات ہے۔ یہ کسی کو روتا ہوا بھی نہیں دیکھ سکتا۔

"انسانیت کی جس بلندی پر یہ شخص براجمان ہے۔
وہاں .... وہاں ...."

"یہ سب بکواس ہے ۔۔۔ سب جھوٹ ہے یہ"
میں چونک پڑا۔ یہ آواز کس کی تھی؟ کہاں سے آئی؟
مقرر کی آواز بھی اب سنائی نہیں دے رہی تھی
میرا سر شرم سے جھک گیا پھر میں نے مقرر کی طرف دیکھا اور سوچا
"کتنا بڑا جھوٹا ہے یہ شخص۔ اور کتنا بڑا کمینہ ہوں میں" ✻

بقیہ صفحہ ۴۴ مکتوبات

مضمون "ہندی کہانی کی جانچ" کافی اہم ہے۔ اب تک اس کی ۵
قسطیں "مشکل" میں شائع ہو چکی ہیں۔ [illegible]
[illegible] "مشکل" [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] "شاعر" کے [illegible] "مشکل" کے
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

سہیل اختر

وجود اپنا کہاں تا ابد بھر تھا
وہ اقرار ازل تمہید بھر تھا

بس منظر ہوا ہے پیش منظر
دھندلکا بس ذرا تردید بھر تھا

چلو مانوسیت تھی تیرگی سے
کوئی تارہ کہاں امید بھر تھا

یہی اک گومگو کی کیفیت تھی
یقیں جتنا بھی تھا تقلید بھر تھا

کہاں اس میں سر و بیکرانی
وہ فن پیمانۂ تنقید بھر تھا

ہوا سارا انتظام اب کیسے برہم
مرا اصرار بس تجدید بھر تھا

● ۱۵۱۔ ستیہ نگر، بھوبنیشور، اڑیسہ ۷۵۱۰۰۷

نعیم صبا

نکل کے غم کے سمندر سے اک پری آئی
بہت اداس میرے ہاتھ زندگی سے آئی

بری رتوں کا عمل بھی نہ جانے کیسا تھا
ہر ایک رخ پہ شکن درد کی کھنچی آئی

سماعتیں بڑی حیراں ہیں اس تماشے پر
نئی زبان یہ کیا بولتی ہوئی آئی

مرے دکھوں نے تو یاروں کو شادمانی دی
مرے لبوں پہ مگر کس لئے ہنسی آئی

اندھیرے لے کے چلا اس طرف بدن اپنا
جہاں کہیں بھی نظر کوئی روشنی آئی

چہار سمت ہیں اکھڑے ہوئے نظارے اب
صبا بتائیے کیسے یہ برہمی آئی

● ۴۵۔ نور محل، جی پی او، بھوپال

راجیش ریڈی

عشق کی باتیں پیار کی باتیں
چھوڑو بھی بے کار کی باتیں

پھولوں جیسے بچے بھی اب
کرتے ہیں تلوار کی باتیں

سنتے سنتے ڈوب گئے ہم
کشتی اور پتوار کی باتیں

اس سنسار میں ڈھونڈ رہے ہیں
جانے کس سنسار کی باتیں

اس بستی میں اب بوڑھے ہی
کرتے ہیں کردار کی باتیں

روز انہیں لوگوں سے ملنا
روز وہی ہر بار کی باتیں

ہم کو جیت کا سکھ دیتی ہیں
اِس کی اُس کی ہار کی باتیں

● ۸-۷، فلیٹ نمبر ۴۴، کلیک انقلاب، ممبئی ۹۲

ابن اسماعیل

معرفت ورکنگ سروس، نوپورہ، سوپور کشمیر

دوزخ

ڈاکٹر نے حیرت سے اس نوجوان کو دیکھا جو چپکے چپکے چوروں کی طرح اس کے کلینک میں داخل ہوا۔ اور اس کی اجازت کے بغیر سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے الجھے بال اور میلے چیتھڑے، عجیب سے گندے لباس اور آنکھوں سے جھانکتے وحشی اور قریب قریب پاگل پن کی کیفیت کو دیکھ کر ڈاکٹر کچھ نروس سا ہو گیا۔

"کہیں یہ کوئی پاگل تو نہیں۔۔۔۔؟" اس نے سوچا۔

وہ پاگلوں سے بہت ڈرتا تھا۔ لیکن جب اس نوجوان نے لب کشائی کی اس کے بے حد شائستہ اور نرم لہجے نے ڈاکٹر کو اپنی سوچ پر اندر ہی اندر شرمندہ سا کر دیا۔

"جی۔۔۔ میں بیمار ہوں ڈاکٹر۔۔۔" نوجوان بولا۔

"اہم ہوں۔۔۔" منہ سے بے معنی سی آوازیں نکالتے ہوئے ڈاکٹر نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ پھر کہنے لگا۔

"دیکھئے۔۔۔ میں فیس پہلے لیتا ہوں بعد میں مریض کا معائنہ کرتا ہوں۔۔۔ لیکن خیر۔۔ میں معائنے کے بعد آپ سے فیس لوں گا۔ اگرچہ یہ میرے اصول کے منافی ہے۔۔۔۔ بتایئے۔۔۔ کیا تکلیف ہے آپ کو۔۔۔؟"

"شکریہ ڈاکٹر۔ میری تکلیف یہ ہے کہ کچھ دنوں سے مجھے میری زبان معمول سے زیادہ موٹی محسوس ہو رہی ہے۔"

"زبان۔۔؟ موٹی۔۔؟" ڈاکٹر نے استعجاب کا اظہار کیا۔ پھر ٹیبل سے ایک آلہ اٹھا کر کرسی سے کھڑا ہو گیا۔ اور نوجوان کے منہ کا معائنہ کرنے لگا۔ اس کے منہ سے نکلتی ناگوار بو سے، جو سڑے لہسن سے مشابہ تھی، ڈاکٹر کی طبیعت مالش کرنے لگی۔ خود پر قابو پانے کی جدوجہد کرتے ہوئے اس نے نوجوان سے کہا۔

"آپ کی زبان تو نارمل ہے۔ مجھے تو کوئی خرابی نظر نہیں آرہی۔۔۔"

"کچھ ہے ڈاکٹر۔ ضرور کوئی خرابی ہے اس میں۔ کبھی کبھار تو لگتا ہے کہ منہ سے باہر لٹک جائے گی، اور کبھی محسوس ہونے لگتا ہے کہ میرا منہ ہی بند ہو کر رہ جائے گا۔"

نوجوان بے حد سنجیدہ نظر آرہا تھا۔ اور ڈاکٹر حیران اور پریشان کہ کیا کہے اور کیا کرے! انتہائی بے دلی سے اس نے پوچھا۔

"آپ ایسا کب سے محسوس کر رہے ہیں؟"

صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ ڈاکٹر کو اس نوجوان کے مسئلے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ حقیقت میں اسے نوجوان نسل ہی سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ پرانی پیڑھی کا آدمی تھا۔ اور ہر شے کو اپنے ڈھنگ سے جانچنے کے خبط میں مبتلا نوجوانوں سے وہ سخت نفرت کرتا تھا۔

"میں نہیں جھکوں گا۔ کم از کم اس جھکی، مخبوط الحواس، سڑیل نوجوان کے آگے تو ہرگز نہیں جس کا مقصد صرف میرا مذاق اڑانا ہے۔ بہرحال اس کو سبق نہ سکھایا تو نام نہیں۔۔۔"

"کچھ دنوں سے۔ پہلے ہی عرض کر چکا ہوں نا۔" نوجوان غور سے ڈاکٹر کے چہرے پر پھیلے ہوئے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔

"آپ کا مشغلہ کیا ہے۔۔۔" واپس اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے ڈاکٹر نے پوچھا۔

"جی۔۔۔ مشغلہ۔۔۔؟ مشغلہ کچھ خاص نہیں ہے۔" نوجوان اس سوال پر کچھ مضطرب سا ہو کر کہنے لگا۔ "تعلیم ختم کر لی ہے۔ وقت گزاری کے لئے چھوٹی موٹی کہانیاں اور مضامین وغیرہ لکھتا ہوں۔ کوئی اچھا ناشر مل جائے تو ایک بڑا ناول تخلیق کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہوں۔"

"ہونہہ۔ صلاحیت۔" ڈاکٹر نے دل میں حقارت سے سوچا: "تم لوگوں میں ایک ہی صلاحیت ہے۔ ہر اچھی شے کو تہس نہس کرنے کی خطرناک صلاحیت۔"

ٹیبل پر رکھے ایک بڑے رجسٹر کی جگہ خواہ مخواہ تبدیل کرتے ہوئے مصنوعی تعجب آمیز آواز میں وہ نوجوان سے بولنے لگا۔

"اچھا لیکن یہاں تو — میرا مطلب ہے اس وادی کے لوگوں کو ایسی چیزیں پڑھنے کی زیادہ دلچسپی نہیں ہے —— ناول تو الگ رہے یہ تو چھوٹے موٹے افسانے تک پڑھنے سے گریز کرتے ہیں ـــ"

"آپ غلط فہمی میں مبتلا ہیں ڈاکٹر ـــ" نوجوان اپنا مرض بھول کر باقاعدہ بحث کرنے کے انداز میں بولا۔ "میری دانست میں دنیا کی یہ ایک قوم ایسی ہے جو پڑھنے لکھنے کا بے حد شوق رکھتی ہے۔"

"حیرت ہے بھئی ـــ" ڈاکٹر بولا "لیکن — لیکن — اچھا خیر — یہ بتائیے یہاں کے لوگ کون سی کتابیں بے حد شوق سے پڑھتے ہیں!"

"بہی کھاتے ـــ" نوجوان رسانیت سے بولا۔

ڈاکٹر نے حیرت سے دیکھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس طنز بھری تیز بات کا کیا جواب دے! چند لمحوں تک ٹیبل پہ بیٹھے بیٹھے ہی کھانستے کر دیکھ بائیں ہتھیلی سے ماتھے کا پسینہ پونچھا اور کچھ کھسیانا سا ہو کر بولا۔

"شاید زیادہ باتیں کرنے کی وجہ سے آپ کو اپنی زبان بوجھل محسوس ہو رہی ہے"

"نہیں تو — اس بات کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اگر ہو تو مجھے اس بات کی بڑی شکایت ہے کہ میں نہایت کم گو ہوں۔ زیادہ کلام نہیں کرتا۔"

"جلسے جلوسوں میں نعرہ بازی کا شوق تو نہیں ہے آپ کو —؟ جیسا کہ آج کل کے ہر نوجوان پر اس کا بھوت سوار ہے۔ انقلاب، جارحیت، غلامی، آزادی، تحریک وغیرہ وغیرہ کی نعرہ بازی۔ ـــ" ڈاکٹر نے طنز کرتے ہوئے کہا۔"

نوجوان کچھ سوچنے لگا۔ پھر طویل تکلیف دہ خاموشی کے بعد کہنے لگا "معاف کیجیے ڈاکٹر ـــ آخر اس بات میں کیا خرابی ہے کہ ایک ایسے متعفن نظام کے خلاف آواز اٹھائی جائے جو سراسر ظلم، عصیان اور ناانصافی پر مبنی ہو! ایسے لوگوں کے خلاف نعرہ بلند کیوں نہ کیا جائے۔ جو اپنی غرض کے لئے معصوم اور بھولے بھالے انسانوں کو سیدھی راہ سے بھٹکا دیتے ہیں ـــــ سنو ڈاکٹر ـــ" نوجوان کی جیسے جون ہی بدل گئی۔ آنکھوں سے جھانکتی دیوانگی کچھ اور نمایاں ہونے لگی۔ لہجے کی نرمی اور شائستگی بدل گئی۔ آواز کرخت اور اونچی ہو گئی۔ بالکل کسی لیڈر کی طرح جس کو برسوں بعد اپنی کتھا سنانے کے لئے ایک بڑا مجمع مل گیا ہو۔ "بہت عرصہ ہم انسانوں کے بنائے ہوئے احمقانہ نظام پر مٹتے رہے ہیں۔ بیہودہ قوانین کے ہیبت ناک پاٹوں کے درمیان بہت وقت پستے رہے۔ کیا آپ اس نظام کو خوش ہیں جس میں موت سستی اور زندگی مہنگی ہے۔ جس میں عزت شرافت اور اخلاق کا گذر نہیں۔؟ کیا آپ خود کو اس استحصالی نظام میں محفوظ سمجھتے ہیں ـــ! مجھے بتلائیے ڈاکٹر وقت سے پہلے ہی آپ کے چہرے پر موت کی نشانیاں کیوں ابھر آئی ہیں۔ اسی لئے کہ آپ بھی اس نظام کے خلاف ہیں اندر سے ہی سہی۔ لیکن یہی اندر کی کشمکش نے آپ کو کھوکھلا کر دیا۔ اب آپ کی ساری دنیا آپ کے اس بہی کھاتے میں سمٹ کر رہ گئی ہے۔ اور دن رات آپ اس کی تلاوت کرتے رہتے ہیں جیسے یہ کوئی آسمانی کتاب ہو۔ اس نے آپ کو آپ سے چھین لیا ہے ڈاکٹر ـــ وقت کی چاپ سے — وقت کی آہٹ —— میں سن رہا ہوں وہ چاپ —— وہ آہٹ —— جو اس نظام کو روند کر رہے گی۔ سیلاب آ رہا ہے۔ جو اقتدار کے بھوکے اژدروں کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے جائے گا۔ دست عدل اور یوم حشر کا خوف نہ رکھنے والوں کے خاتمے کا وقت آن پہنچا ہے۔ ضمیر کی خلش اور گھٹن سے بے نیاز استحصالی انسانوں کے استقبال کے لئے صور پھونکنے والا فرشتہ ساتویں آسمان سے اتر کر آسمانِ اول پر آگیا ہے۔"

ڈاکٹر کو اپنی پیٹھ پر ٹھنڈے پسینے کی لکیریں سی نیچے کی طرف آہستہ آہستہ کسی کنکھجورے کی طرح سرکتی محسوس ہوئیں۔ وہ خوف زدہ ہو کر چلایا۔

"خاموش — خاموش ہو جاؤ بے وقوف۔ کسی نے سن لیا تو تمہارے ساتھ میری بھی شامت آ جائے گی۔ میں — میں اس عمر میں زنداں کے کیڑوں کی غذا نہیں بننا چاہتا۔ . . . د . . دیکھو — کوئی آ رہا ہے ہو.."

کمرے کے باہر بھاری بوٹوں کے چلنے کی تیز آوازیں قریب آنے لگیں۔ نوجوان کی چیخ و پکار سن کر شاید کچھ لوگ اسی جانب دوڑ پڑے تھے۔ پھر دھڑام سے دروازہ کھل گیا۔

لیکن یہ کیا ـــ؟ ڈاکٹر کا منہ خوف، دہشت اور حیرت سے کھلا رہ گیا۔ یہ تو کوئی اور لوگ ہیں۔ ڈاکٹر نے ان لوگوں کو پہچان لیا تھا۔ یہ مقامی پاگل خانے کے لوگ تھے۔ جوں ہی ان کی نظر نوجوان پر پڑی وہ ایک آواز اس پر پل پڑے۔

"پکڑ لو سالے کو — ہمارے پاگل خانے سے بھاگنا آسان کام نہیں ہے بیٹا۔ تم جہنم میں بھی چلے جاؤ۔ وہاں بھی تمہیں نہیں چھوڑیں گے۔ بھاگتا ہے سسرا۔ پوری عمر سڑا دیں گے تجھے پاگل خانے میں۔ ہاں — چل —"

ان کو دیکھ کر نوجوان کسی پتلے کی طرح چیں چیں کرنے لگا تھا۔ اس کی ساری اکڑ فوں نکل چکی تھی اور وہ لوگ اسے کمرے سے اس طرح گھسیٹ کر لے گئے جیسے وہ کوئی مردہ کتا ہو۔

ڈاکٹر خوف زدہ بلی کی طرح کرسی میں دبکے سمٹ گیا تھا جیسے بڑی مشکلوں کے بعد دیر سے اپنے پیچھے لگے کتے سے نجات پائی ہو۔ ✻

شین۔ م حنیف

ستی میں گھر جاگ رہے ہیں
ذاب میں خنجر جاگ رہے ہیں

ب پہ گلِ تر جاگ رہے ہیں
ذہن میں نشتر جاگ رہے ہیں

دین دھرم ہیں موت کے منہ میں
مسجد مندر جاگ رہے ہیں

ادی سوئی فتنے کھوئے
بچے گھر گھر جاگ رہے ہیں

انکھوں کی چھاگل چھلکے گی
خشک سمندر جاگ رہے ہیں

ل جو قید کتابوں میں تھے
آج وہ منظر جاگ رہے ہیں

● ۱۲۴۔ بیکر اسٹریٹ جودھپور (راجستھان)

طیّب آزاد

سب اہلِ زندہیں یہاں لام قاف بے معنی
سمندروں کے بدن پر شگاف بے معنی

نہ مضطرب لب و لہجہ نہ منفعل آنکھیں
گناہگار تیرا اعتراف بے معنی

کچھ احتیاط ہمارے لئے بھی لازم تھی
ہر احتجاج ہوا کے خلاف بے معنی

ہماری رائے کوئی اہمیت نہیں رکھتی
تمہاری بات سے پھر اختلاف بے معنی

وہ سارے تیر تمہارے تھے زخم میرے ہیں
یہ مصلحت کا سنہرا غلاف بے معنی

جہاں ابھر نہ سکے تیرے خال و خد مجھے
کہانیوں کے وہ پیراگراف بے معنی

● محلہ قاضیان، شیرکوٹ ضلع بجنور (یوپی)

مظہر سعید

◆

جاگنے کے وقت غافل ہو گئے
ہم تو خود اپنے ہی قاتل ہو گئے

زخم کھانا، اشک پینا، ٹوٹنا
زندگانی کے مشاغل ہو گئے

زہر سا کس نے فضا میں بھر دیا
سانس لی جب بھی تو گھائل ہو گئے

شاید اک دن ظلم کی آندھی رکے
ہم اسی حسرت میں بزدل ہو گئے

جب سفینے نذرِ آتش کر دیئے
تیز رو طوفان ساحل ہو گئے

یادِ ماضی، حال کا غم اپنے خواب
ہم تو تنہائی میں محفل ہو گئے

ان سے اے مظہر بچھڑنا ہی پڑا
ہم بھی اب قسمت کے قائل ہو گئے

● شعبۂ اردو علیگڑھ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

مدیر

افتخار امام صدیقی

●

معاون

ناظر نعمان صدیقی

قیمت ✕ روپے

زرِ سالانہ ۷۵ روپے	لائبریریوں سے ۹۰ روپے
تاعمر خریداری ۱۰۰۰ روپے	معاونین سے ۱۰۰ روپے

ممالکِ غیر سے
۲۵ ڈالر ـ ۱۵ پونڈ

ٹکسالی زبان کے حامیوں کا ایک گروہ ہے جو چاہتا تو یہ ہے کہ زبان کی سالمیت پر حرف نہ آئے مگر فی الحقیقت اس کی ترقی کی راہیں بند کرنے کا خواہش مند ہے۔ نئے الفاظ نئے معنی اور نئے اسالیبِ بیان سے حد سے زیادہ ڈرنا ایک زندہ زبان کے لئے اس سے کچھ کم ہی ہلاک ہے جتنا کہ ان خطرات کی قطعی روک تھام نہ کرنا۔

[۱۴ ر اپریل ۱۹۳۳ء]

ــ سیماب اکبرآبادی

نذر پروین شاکر

مصنف	صفحہ	عنوان
اختر امام رضوی	۴	خوشبو کے پر کترنے گیا راستہ کہاں
خالدہ حسین	۷	کاپا کی گڑیا
آفتاب احمد	۱۴	پروین شاکر
ادارہ	۷	پروین شاکر ایک نظر میں ۔
[illegible]		
سردار جعفری	۶	پروین شاکر
پروین شاکر	۱۸	یہ میرے ہاتھ کی گڑی
پروین شاکر	۱۸	یہ کیسا خلا ہے
پروین شاکر	۱۸	سجاد زندگانی پر
پروین شاکر	۱۸	مگر اس دل کی ویرانی
پروین شاکر	۱۸	نہ میں نے چاند دیکھا
پروین شاکر	۱۹	ہوا جام صحت تجویز کرتی ہے
پروین شاکر	۱۹	ایک ساؤنڈ پروف نظم

* پروین شاکر کی ۱۰ غزلیں

مصنف	صفحہ	عنوان
کہانیاں		
سیدہ حنا	۳۳	برف
مہ جبین قیصر	۳۵	سیندور
[illegible]		
شفیقہ فرحت	۳۱	آلو ۔ ۹۴
نظمیں		
ساجدہ زیدی	۲۱	رنگِ خزاں
عرفانہ عزیز	۲۱	حدیثِ مہرووفا سے پہلے
بلقیس ظفیر الحسن	۲۳	دسمبر ۹۳
زاہدہ زیدی	۲۳	یہ وقت کا بیکراں سمندر
نسیم سید	۲۴	گاوری
عذرا پروین	۲۴	خاتم العدد
عذرا نقوی	۲۶	خواب ۔ ا ۔ خواب ۔ ۲
ساجدہ نسرین	۲۶	ایک خط تمہارے نام
آشا پربھات	۲۷	جنگل میری ہتھیلی پر

غزلیں

ادا جعفری	ناظمہ حسن	حمیرا رحمٰن	۲۰
ستر جہاں	شبنم شکیل	شاہدہ حسن	۲۲
ثمینہ راجا	شہناز نبی	پشپا ہاں	۲۵
پروین راجا ۲۷	نعیمہ ضیاء الدین ۲۷	عظمیٰ سحر عارف	۲۸
اسنیٰ بدر زبیرہ ۲۸	*	کنیز فاطمہ	۲۸

دھنک رنگ

یاسمین گل	منصورہ احمد	یاسمین حمید	۲۹
اسما نعت	فوزیہ راحا	نوشی گیلانی	۲۹
صغریٰ عالم	شگفتہ طلعت سیما	شاہدہ تیم ملک	۳۰
زہرہ نگاہ	ملکہ نسیم	عفت زریں	۳۰

سرورق
پروین شاکر

[illegible]

عبدالقوی ضیا ۔ سلیم شہزاد ۔ منصور اعجاز
راحی فدائی ۔ ساجد رشید ۔ منصور عالم
خورشید ملک ۔ شاہد اختر ۔ صفیہ صدیقی
شاہ جمیل ۔ قیصر علی ۔ محمد حامد
حمیدا ختر
۳۸

شمارہ ۵ ۔ ۱۲ [۱۹۹۴] جلد ۶۵

خوشبو لے کر نکلے کیا راستہ تھا

امتیاز امام صدیقی

۲۶ دسمبر کی شام میں عذرا پروین نے مجھے دہلی فون پر جب یہ اطلاع دی کہ پروین شاکر ایک سڑک کے حادثے میں انتقال کر گئیں تو اس غیر متوقع خبر پر یقین ہی نہیں آیا۔ عذرا کی سنجیدگی میں دکھ کی ملاوٹ نے مجھے بھی اداس کر دیا لیکن میں اسے محض ایک افواہ کے طور پر ہی محسوس کر رہا تھا۔ شب میں پاکستان ٹی وی کے خبرنامہ نے اس حادثے کی توثیق کر دی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ؟

مئی ۱۹۸۶ء میں دبئی اور العین (عرب امارات) کے جشن محفل مشاعروں میں پروین شاکر سے ملاقاتیں ہوئی تھیں تو کسے معلوم تھا کہ اس اہم شاعرہ سے یہ میری پہلی اور آخری ملاقاتیں ہیں۔ پاکستانی مشاعروں میں ہم کم کم ملتے تھے اور وہ بھی بہت سرسری لیکن العین کے مشاعرہ کے بعد جب وہ اپنے مداحوں میں گھری ہوئی آٹوگراف دے رہی تھیں تو مجھ سے بھی مخاطب تھیں۔ ندا فاضلی کے ایک شگفتہ مگر ان کے مزاج فقرے نے ہماری گفتگو کو کچھ اور دوست کر دیا تھا۔ لیکن کوئی مکالمہ بہت روشن ہوتے ہوتے اچانک یوں بجھ جائے گا، مجھے معلوم نہ تھا۔ بے اعتبار سانسوں سے کب کون سانحہ، سانحہ یا حادثہ بن جائے گا یہ کسی کو بھی نہیں معلوم ہوتا۔ پروین شاکر کو بھی نہیں معلوم تھا اور تخلیق ہونے والے کتنے لفظ آسمانوں میں کہیں گم ہو گئے۔

پروین شاکر کا اولین شعری مجموعہ خوشبو (۱۹۷۷ء) غالباً گزشتہ دو دہائیوں کا سب سے مقبول ترین شعری مجموعہ کہا جا سکتا ہے۔ پاکستان ایک چھوٹا سا لسانی ملک ہے وہاں کسی ادیب یا شاعر کا مشہور ہونا کوئی مشکل بات نہیں لیکن ہندوستان جیسے بڑے ملک میں جہاں لسانی اکھاڑے بھی بڑے ہوں وہاں کسی شاعر یا شاعرہ کی مقبولیت غیر معمولی واقعہ ہی کہا جا سکتا ہے۔ اردو والوں میں تو پروین شاکر مقبول و معروف رہی ہیں لیکن ہندوستان کی دیگر بڑی زبانوں میں بھی اس کی شاعری کی گونج رہی ہے۔ اس کے شعر گھر گھر پہنچے۔ ہندوستان کی کئی زبانوں میں بطور خاص ہندی میں "خوشبو" کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔ لفظ کسی کی میراث نہیں ہوتے بلکہ لفظ تو کسی کے بھی نہیں ہوتے لیکن پروین شاکر کے شعری مجموعے کا نام "خوشبو" تو جیسے اس کی میراث بن گیا۔ یہ لفظ تو کیا کا ہو کر رہ گیا ہے۔ پروین شاکر کے نام کا استعارہ بن گیا۔ اب یہ شعری تلازمہ جب بھی برتا جائے گا، اس کا نام پردۂ دل پر روشن ہو جائے گا۔ خوشبو کی پذیرائی بے مثال رہی کہ پروین کے بعد شعری مجموعے صد برگ، خود کلامی، اور انکار پر اس کے زبردست اثرات پڑے۔ حالاں کہ صد برگ، خود کلامی اور انکار تک آتے آتے اس کے اسلوب اور لہجے میں تبدیلیاں بھی آئیں۔ شعری مجموعوں کے عنوانات میں ایک تدریجی سوچ اور معنویت ہے وہ اپنے خیال لمحوں کے آس پاس منڈلاتی نہیں رہی اپنے خیال لمحوں میں خود کو جذب بھی کیا اور کبھی خود کو ان میں محو رہی۔ اس کا مکمل شعری سرمایہ، "ماہ تمام" (کلیات)، پروین شاکر کو از سر نو تخلیق کرے گا۔

ایک روایت کے مطابق اردو شاعرات کی موجد اوّل شاہزادی زیب النساء مخفی (پ: ۱۶۳۹ء م: ۱۷۰۱ء) بنت اورنگ زیب عالمگیر کو تصور کیا جاتا ہے [جس کے صرف تین شعر تذکروں میں ملتے ہیں] اور اردو شاعری کے روایتی دبستانوں میں دہلی اور لکھنؤ کے شعری تذکروں میں شاعرات کا ذکر بہت معمولی سا ملتا ہے وہ بھی میر اور سودا کے زمانے کی شاعرات کا۔ تذکرۂ شاعرات اردو کو کبھی معتبر نہیں سمجھا گیا۔ مذکورہ دو دبستانوں کے ذیل میں آنے والی شاعرات کے نام اور کلام اتنے خلط ملط ہو گئے ہیں کہ تحقیق کے بغیر حوالے نامعتبر ٹھہریں گے لیکن بیسویں صدی کی ابتدا سے کچھ نام ابھرنا شروع ہوئے تھے ان میں ادا جعفری (عزیز جہاں ادا بدایونی) کا نام خاصہ روشن ہوا۔ بلقیس تصدق، بیگم ثریا راختر، کوثر اقبال نور، خورشید اقبال حیا، سحاب قزلباش وغیرہ کے ذکر سے فہمیدہ ریاض اور کشور ناہید کے نام اعتبار حاصل کر چکے ہیں تاہم یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ اردو کی چار سو سالہ شعری روایت میں شاعرات کو کبھی بھی قابل اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ بیسویں صدی کے نصف آخر میں (آزادی کے بعد) اور حالیہ برسوں میں اردو شاعرات نے اپنے مختلف شعری رویے اور نسائی لہجوں سے پوری طرح متوجہ کیا اور بلاشبہ اس تبدیلی کا سبب پروین شاکر کی شاعری ہے اس نے پوری اردو شاعری کی روایت کو اپنی شاعری سے ایک نئی تاریخ دی ہے۔ شاعرات کی شعری روایت کی وہ شہزادی ہے اس پر اگر شاعری کی دیوی اس قدر مہربان تھی تو محبت اور عورت کی علامت کا سایہ بھی اس پر تھا۔ پروین شاکر نے اپنی پیش رو شاعرات سے نہ صرف اکتساب کیا بلکہ اس سے بہت آگے نکل جانے میں اپنی انفرادیت کے نت نئے افق بھی روشن کیے۔ اس سے قبل فہمیدہ ریاض اور کشور ناہید کی شعری برہنہ گفتاری اور دانشوری کا چرچا ہوا لیکن صرف نظم کے حوالے سے اردو شاعری میں یہ قطعی نیا تجربہ اور نئی آوازیں تھیں جنہوں نے چونکایا بھی اور پروین جیسی ذہین شاعرہ کو راستہ بھی دیا۔ کشور ناہید نے عورت کو کسی بھی خانے میں رکھنے سے انکار کیا اور احتجاج بھی کیا وہ کسی بھی تخصیص کی قائل نہیں وہ عورت اور مرد کے مابین فطری فرق کے باوجود یگانگت اور مساوات پر زور دیتی ہیں۔ فہمیدہ ریاض نے پہلی بار جنس کے حوالے سے ایک پوری عورت کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا

ایک پوری عورت اپنے اجتماعی اور انفرادی لاشعور کے ساتھ ان کی شاعری کا لوازمہ بنی۔ فہمیدہ ریاض کی شاعری نے پروین شاکر کو ذہنی قوت ہمت جرأت اور حوصلہ دیا۔ ان دونوں شاعرات نے عورت کے نفسیاتی، جذباتی اور مابعد طبیعاتی وجود کو تسلیم کئے جانے کا جو شعری اصرار کیا تھا پروین شاکر نے اپنے تخلیقی جوہر سے ان نسائی پیچیدگیوں اور صنفی مساوات کو پوری شدت سے فن بنا دیا اس نے اپنی فکر کو فلسفہ نہیں بنایا، شاعری بنایا وہ شاعری جو دماغ نہیں دل بن گئی تھی۔ پروین شاکر کی بے پناہ مقبولیت کی پہلی سطح تو غزل ہے۔ اردو شاعرات میں غزل و نظم کا رجحان قدیم سے جاری ہے کئی اردو شاعرات کو آزاد نظموں اور نثری نظموں نے معتبر بنایا۔ فہمیدہ، ناہید، شعری۔ ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی، ملکیس ظفر الحسن، عذرا عباس، نسرین انجم بھٹی، شائستہ حبیب صفیہ عریب، سارا شگفتہ، رعنا حیدری، میمونہ روحی، فرخندہ نسرین حیات کے نام بہت نمایاں ہیں۔ مگر کئی اہم نام نظم و غزل کے حوالے سے بھی ابھرے ادا جعفری، بانو داراب وفا، زہرہ نگاہ، فاطمہ حسن، پروین فنا سید، شبنم شکیل، نسیم سید، رفیعہ شبنم عابدی اور ثمینہ جمال کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان شاعرات نے اچھی شاعری تو کی لیکن بنے بنائے شعری اسالیب، لہجے، لفظیات اور موضوعات میں نئی چنگاریاں شعلے نہیں بن سکیں۔ سارا شگفتہ اور عذرا عباس جیسی منفرد نظم نگار اگر غزل کے سانچوں میں ڈھلتیں تو کچھ اور تخلیقی شعلے اپنی حدتوں کا احساس دیتے لیکن پروین شاکر کی ہم عصروں میں تو اس کے بعد آنے والی شاعرات میں شاہدہ حسن، شاہین مفتی، طلعت زاہدی، شمیم راہی، رخسانہ جبیں، مرجب قاسمی، عذرا پروین، پنہاں، ممتاز نیئر، قاسمی، نوشی گیلانی، منصورہ احمد اور ایسے ہی کئی نئے نام اپنے تخلیقی سفر میں پروین شاکر شعری کو توسیع کر رہے ہیں لیکن پروین شاکر کا اسلوب، ذہن، لہجہ اس کے سارے تلازمے بہت مختلف اور منفرد ہیں اس نے اپنی مختصر سی شعری عمر میں اپنا لہجہ دریافت کر لیا تھا۔ شاعری میں لہجے کی دریافت کا عمل مشکل ترین امر ہے بہت اہم شعرا بھی عمریں کھپانے کے باوجود اپنا کوئی لہجہ نہیں دریافت کر پاتے اور بے شمار شعرا تو شاعری کا خام مواد بنے رہتے ہیں۔
شاعرات میں یہ تاریخی کارنامہ بھی پروین کا مقدر ہوا۔ ہندوستانی مشاعروں اور عالمی سطح پر منعقد ہونے والے مشاعروں میں شریک ہونے والی بہت ساری نام نہاد شاعرات بھی پروین شاکر کا چربہ کرنے لگیں۔ مشاعروں میں پروین کی شرکت سے مشاعروں کے وزن و وقار میں اضافہ ہوتا تھا بہت زندہ لہجے کی شاعری کو تحت اللفظ سناتے ہوئے وہ جو لہجے کے زیر و بم سے ترنم جگاتی تھیں اس سے ایک ایک شعر سامع کی روح میں روشن ہو جاتا تھا وہ ایک جادوگرنی تھی۔ وہ اپنے مخاطب کو گرویدہ کرنے کا ہنر جانتی تھی۔ وہ صرف شاعرہ نہیں تھی، دانشور بھی تھی۔ اعلیٰ تعلیمی استعداد کے ساتھ اس نے اپنی روشن خیالی کو مشرقی تہذیب سے سجائے رکھا۔ پاکستان سے باہر حصول علم، درس و تدریس سے سرکاری ملازمتوں تک اس نے اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کا اظہار کیا۔ اخبار کا کالم نگاری ہو یا ٹی وی پر سنے جانے والے بار بار شعراء سے مکالمے و مصاحبے، اس کی طرز جدت ہر گفتگو رہی ہو وہ اپنے باطن میں نامعلوم گہرائیوں تک پھیلی ہوئی تھی اس کا وجدان اتنا نازک اور حساس تھا کہ وہ اپنے سوچ سمندر کی تہہ سے ایسے شعر نکال لاتی تھی کہ وہ شاعری کی اجتماعی پسند کا نغمہ بن جاتے تھے اس کی شاعری اس کی اپنی ذات کا سچا اظہار ہے ورنہ عموماً ہمارے شعرا اس ڈھب سے مصنوعی شاعری کرتے نظر آتے ہیں کہ زندگی کچھ اور ہے، شاعری کچھ اور، جھوٹ در جھوٹ کو نظم کرنے والے شعرا کی بھیڑ میں پروین نے اپنی شعری دنیا کو ماورائی زمانوں محفوظ کر دیا ہے۔ ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت یا شاعری کی پرکھ کے نئے آنے والا کوئی بھی نیا تنقیدی رویہ یا رجحان ساختیاتی پس ساختیاتی یا تخلیقیت شناسی کے تناظر ہوں پروین شاکر کی شاعری فرد و معیار بنے گی۔ صاحب اسلوب شاعرہ نے اپنی شاعری کے بارے میں کم کم کہا ہے مگر اسے اس کی ضرورت ہی نہیں پڑی کیوں کہ اس کی شاعری کی خوشبو سکہ بند نقادوں کے بغیر ہی خاص و عام تک پہنچ گئی تھی حالانکہ یہ بھی کہا جاتا رہا کہ پروین کی شاعری کی پختگی کسی استاد فن کی مرہون منت ہے یہ کہ شاعرہ کا بالغ شاعری کی نادر مثال ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ گروہی نقادوں کے پسندیدہ شعرا کی اچھی اور بری شاعری کے ساتھ پروین کی شاعری رکھی جا سکتی ہے۔

یہ چند بے ترتیب سوچ سطریں ان بے شمار لوگوں کی طرف سے تعزیت اظہار ہیں جو نقاد نہیں، شاعر اور ادیب نہیں قلم کار نہیں لیکن سخن فہم ہیں اور پروین شاکر کی شاعری کے مداح ہیں وہ پروین شاکر جس نے اردو ادب کی مختصر ترین عمر سے ابھرنے والی رشیدہ جہاں، ممتاز شیریں عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر اور ایسی ہی بہت ساری مشہور اور ثقہ قلم کار خواتین کے ساتھ اردو کی طویل شعری روایت سے نکل کر اپنا نام زندہ کر لیا

شاعر کے مختصر گوشہ پروین شاکر کی ترتیب میں رسالہ معاصر (لاہور) اور فنون (لاہور) سے استفادہ کیا گیا ہے۔ ادارہ ان رسائل کے مدیران کا شکر گزار ہے۔ *

خالدہ حسین

مکان نمبر ۹۔ اے، گلی ۲۸، ایف ۱/۸ اسلام آباد

کانچ کی گڑیا

قاعدہ ہے کہ کانچ کے قیمتی سامان کے باہر "بہت نازک ہے" "احتیاط سے ہاتھ لگائیں" لکھ کر سپرد سفر کر دیا جاتا ہے اب منزل تک پہنچتے پہنچتے وہ کیسے کیسے ہاتھوں میں جاتا ہے کہاں کہاں ٹھوکریں کھاتا ہے سب مقدر کی بات ہے۔

پروین شاکر کو دیکھ کر ایسے ہی آبگینوں کا خیال آتا ہے۔ مگر داد دیجئے کہ اس نے اپنے گرد سے نزاکت اور احتیاط کے اس ہدایت نامہ کو اتار پھینکا ہے شاید اس لئے کہ وہ زندگی کی جنگ میں رد رعایت کی قائل نہیں۔ اور یہ کچھ پروین شاکر ہی پر منحصر نہیں، عصری اردو ادب کو دیکھیں تو نظم و نثر دونوں ایوانوں میں بھرپور نسائی لہجوں کی تمکنت کا ایک سلسلہ سوا نظر آتا ہے۔ لگتا ہے کہ مستجاب گھڑی میں اس صنف نازک نے فلاطوں کے ساتھ ساتھ بکمات فلاطوں تخلیق کرنے کا چیلنج بھی قبول کر لیا ہے۔ ادا جعفری سے پروین شاکر تک کا سفر ایک شعری روایت اور تخلیقی رویے کا سفر ہے جس میں زہرہ نگاہ، کشور ناہید، فہمیدہ ریاض اور عشرت شکیل کے قد آدم سنگ میل گڑے ہیں۔

شعر ذات چھپانے کا فن ہے اور شعر کی کل کائنات شاعر کی اپنی ذات ہے۔ یہی اس کا جمال بھی ہے اور کمال بھی۔ پروین شاکر کے چار شعری مجموعے کچھ اور نہیں بس اس کی ذات کا نچوڑ ہیں۔ فرق محض یہ کہ زندہ جیتی جاگتی پروین شاکر تک ہر کسی کی رسائی نہیں۔ ہو بھی تو ہر کسی پر ہر کسی کا کھلنا ممکن نہیں۔ اور تخلیق ایک ایسا دروازہ ہے جس کے راستے آپ بغیر دستک دیئے ہر ایک کے حریم ذات میں داخل ہو سکتے ہیں جب تک جی چاہے براجمان رہیئے۔ سو یہ چار مجموعے وہ چار در ہیں جو اس دور کی ایک حساس ذہین اور خود اعتماد عورت کی سائیکی سمجھتے ہیں۔ ان سب میں ایک منطق رہا ہے۔ ایک تسلسل ہے جو تخلیق کار کی شخصیت کے کے سوئی عکاسی کرتا ہے۔

شعری روایت میں ایک اثنا عشری گھرانے میں آنکھ کھولنے والی بچی ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی شعر کے آہنگ کو خود ساخت بنا چکی ہوتی ہے۔ شاعری میں انیس کے اشعار غیر شعوری طور پر اس کی لفظیات کا حصہ بن چکے ہوتے ہیں۔ اور سوچنے بولنے میں اکثر سادہ لفظ آہنگ کی صورت اختیار

پروین شاکر ۔ ایک نظر میں

- **نام** ● پروین شاکر
- **والد** ● سید ثاقب حسین شاکر
- **پیدائش** ● ۲۴ر نومبر ۱۹۵۲ء (کراچی)
- **تعلیم** ● میٹرک۔ رضویہ گرلز ہائی اسکول (کراچی)
  بی۔ اے۔ سرسید گرلز کالج (کراچی)
  ایم۔ اے۔ (انگریزی) ادبیات جامعہ کراچی
  ایم۔ اے (لسانیات) جامعہ کراچی
  پی۔ ایچ ڈی۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ میں ذرائع ابلاغ کا کردار۔
  بینک ایڈمنسٹریشن میں ماسٹرز کی ڈگری (ہارورڈ یونیورسٹی)
- **ملازمتیں** ● درس وتدریس (عبداللہ گرلز کالج، ۹ سال
  سول سروسز کے امتحان میں اعلیٰ کامیابی کے بعد محکمہ کسٹمز سے وابستہ ہوگئیں۔
  ۸۶ء سے سیکنڈ سیکریٹری ۔سی۔بی۔آر (اسلام آباد) متعین ہوئیں۔
- **شعرگوئی** ● بچپن ہی سے شعرگوئی کا شوق تھا۔ ابتداء میں بینا تخلص اختیار کیا لیکن جلد ہی اسے اصل نام سے شعر کہنے لگیں تھیں۔ احمد ندیم قاسمی انکے پیرو مرشد تھے۔ ان کا احترام کرتی تھیں اور عمو جان کہتی تھیں پہلا شعری مجموعہ خوشبو انھیں عمو جان کے نام سے منسوب کیا تھا
- **شعری مجموعے** ● خوشبو (۱۹۷۶ء) صد برگ، خود کلامی، انکار، ماہِ تمام (کلیات) ۱۹۹۴ء
- **اعزازات** ● آدم جی ایوارڈ (خوشبو)، ہجرہ ایوارڈ (خود کلامی) پرائڈ آف پرفارمنس (حکومت پاکستان کا سب سے بڑا ایوارڈ)
- **ازدواجی زندگی** ● شوہر: ڈاکٹر نصیر احمد
  (کچھ سال قبل پروین نے طلاق لے لی تھی)
  بیٹا: سید مراد علی (عمر ۱۵ سال)
  اپنے بیٹے کو پیارسے گیتو پکارتی تھیں۔
- **انتقال** ● ۲۶ر دسمبر ۱۹۹۴ء کو اپنے دفتر جاتے ہوئے کار اور ٹرک تصادم میں جاں بحق ہوگئیں۔

کرتے چلے جاتے ہیں۔ سو زبان کی وہ تہذیب جو ہمیں اکثر شعوری طور پر کرنا پڑتی ہے پروین شاکر نے ورثے کے طور پر پائی ہے۔ گویا ایک بڑی منزل سفر شروع کرنے سے پہلے ہی طے ہو گئی۔ کہن کہتا ہے کہ گڑیا سی لڑکی اپنے ننھے سے وجود میں وہ شدید جذبے اور تجربات جن میں انسانی رشتوں کی تمام تر گہرائیوں کے ساتھ ساتھ عمومی طور پر جذبوں کا ارتفاع بھی تھا اور رزم و بزم کی دھڑکتی واردات بھی۔ عقیدت و اعتقاد کے تجربے بھی تھے اور واقعہ نگاری کے کمالات بھی۔ چپ چاپ اپنے اندر جذب کرتی رہی۔ یہیں سے اس کی شخصیت کے دو واضح رخ سامنے آتے ہیں۔

ایک متمول سے خاندان کی انتہائی محفوظ زندگی گزارنے والی بچی جو زمانے کی ہر شورش اوراس کی چیرہ کاریوں کی دسترس سے دور رہی ہو مگر عارضتاً" پر شور اور مضطرب زندگی کا بھی احساس رکھتی ہو کس طرح اس نے vicarious تجربوں سے اپنی زندگی کے ابتدائی حصے میں ہی ایک ایسی دنیا کا پتہ بھی چلا لیا ہو جو ہمہ وقت آندھی طوفان کی زد میں رہتی ہے۔ یہاں ہر لمحہ حق و باطل کی جنگ جاری رہتی ہے۔ اس کی یہ دو شخصیات آج تک ساتھ ساتھ چلتی نظر آتی ہیں۔ ایک دوسرے میں مدغم نہیں ہوئیں۔ ایک طرف حسیاتی طاقت کی وہ رنگین خوشبو بھری دنیا ہے جس میں چوڑیوں کی میٹھی کھنک اور چنری کے شگفتہ رنگ ہیں۔ پھولوں کے میلے اور چاند تاروں کے کھیت اگے ہیں۔ اس دنیا میں وسعت ہے' پھیلاؤ ہے۔ گہرائی نہیں۔ اور یہاں گہرائی کی ضرورت بھی نہیں کہ یہ ایک طلسماتی دنیا ہے۔ یاد رہے کہ میں پروین کے صرف پہلے مجموعے "خوشبو" کی بات ہی نہیں کر رہی بلکہ اس کے چاروں مجموعوں کے حوالے سے سوچ رہی ہوں۔ یہ طلسماتی فضا تو "انکار" تک برابر قائم ہے۔ ان میں پروین شاکر نے قدیم داستانوں اور Legends کا سحر تازہ کیا ہے اور یہ سب اس کے لئے اتنا فطری ہے کہ کہیں بھی بیگانگی اور تکلف کا احساس نہیں ہوتا۔ اس نے صرف مشرقی Legends کو ہی اپنے تجربے کا حصہ نہیں بنایا بلکہ مغربی لوک داستانیں بھی اس کے تخلیقی تجربے کا ایک جزو ہیں۔ اور اس طرح اردو شاعری میں زندگی ایک نئے اجتماعی لاشعور کے حوالے سے داخل ہوتی ہے۔ ہمارے قدیم استعارے جو فارسی ادب سے مستعار ہیں آج تک نئی سے نئی معنویت کے ساتھ شاعری میں ظہور پا رہے ہیں مگر عہد حاضر کی ایک نسائی ذہانت جس کی تربیت مغرب و مشرق کے امتزاج سے ہوئی ہے زندگی کو کن تمثالی پیکروں میں دیکھتی ہے پروین شاکر کی شاعری اس کی ایک مثال ہے۔ اس کے ہاں یہ خدشہ بھی موجود ہے کہ

دریا پار یہ سوچ کے چل
گھڑے بدل بھی جاتے ہیں

تو وہ شہزادی بھی ہے جس کے تمام جسم کو سوئیوں سے گوندھ کر ایک طلسمی خواب کا اسیر کر دیا گیا ہے۔ اور کسی شہزادے کا انتظار ہے کہ آئے اور یہ تمام سوئیاں نکالے کہ شہزادی پھر سے زندوں میں آ جائے۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ منظرنامہ بھی ہے جو اپنے طلسماتی چمکیلے اور عارضی شاہانہ لباس میں عظیم الشان ایوانوں میں رقص کرتی ہے۔ جس کے دل میں بارہ کا گھنٹہ بجنے کا دھڑکا بھی ہے

...تازہ نئی خوشبو میں لکھا چاہتا ہے
...اک اور محبت کا کھلا چاہتا ہے

...لمحے کی توجہ نہیں حاصل اس کی
...یہ دل کہ اسے حلقے سوا چاہتا ہے

...حجاب تہ اقرار ہے مانع ورنہ
...لو معلوم ہے کیا دست صبا چاہتا ہے

...بھی ریت سے اس دل میں مسافر میرے
...پھر اترا نقش کف پا چاہتا ہے

...خاموشی کئی رنگ میں ظاہر ہو گی
...کچھ روز کہ وہ شوخ کھلا چاہتا ہے

...کو مان لیا دل نے مقدر لیکن
...کے ہاتھ پہ اب کوئی دیا چاہتا ہے

...ے پیمانے میں گردش نہیں باقی ساقی
...تری بزم سے اب کوئی اٹھا چاہتا ہے

اور شہزادے کی جدائی کا خوف۔ اس پر اپنا آپ کھل جانے کا لرزہ بھی۔ مگر وہ رقص کے ایک ایک لمحے سے لطف اندوز بھی ہونا چاہتی ہے۔ اس کے ہاں آپ کو حسن خفتہ کا خیالی پیکر بھی ملے گا جو جنگلوں سے اٹے ایک ویران محل میں طلسماتی نیند میں محو کسی شہزادے کی آمد کا منتظر ہے کہ آ کر اس کو نیند کے اس حصار سے آزاد کرائے۔ میرا اندازہ ہے کہ کسی اور خاتون شاعر کے ہاں یہی رفتار مشکی راہوار اور اس کے نیلے راکب کا تذکرہ نہیں ملتا۔ پروین شاکر کے خواب بھی ایک داستانوی عہد کا پتہ دیتے ہیں۔ کبھی یوں لگتا ہے کہ وہ بھی کسی گم شدہ نسل کی شہزادی ہے جو محل کی چوکھٹ چھوڑنے کو مجبور کی گئی ہے مگر جس نے اپنے ماضی سے رشتہ نہیں توڑا۔ مشکی گھوڑے، شہزادے، شہزادیاں، غلام گردشیں، راہداریاں، پراسرار راستے، جنگل، کائی لگے حوض، خاموش طلسماتی خواب میں ڈوبے باغ اور ایوان، ان سب خیالی تصویروں سے مل کر وہ تاثر بنتا ہے جو پروین کی شاعری کا ایک اہم جزو ہے۔

جنگل کا استعارہ اس کے ہاں ایک مستقل صورت اختیار کر گیا ہے۔ جنگل ایک آسیب بھی ہے جس کی نوعیت اجتماعی بھی ہے اور ذاتی بھی۔ یہ جنگل شہر ذات سے راستے کو بھی مسدود کرتا ہے اور اپنی سرزمین پر بھی محیط ہے۔ تو میرا ارادہ تو تھا کہ پروین کی ذات کے بارے میں کچھ گفتگو کروں تو اس کی شاعری کی حکایاتی دنیا مجھے کھینچ رہی ہے کہ جا اینجا است۔ یہی میری کمزوری ہے خواہ وہ دن ہو یا رات میں کہوں گی نہ ٹالی جائے کہ مسافر راستہ نہ بھول جائیں۔ میں پروین کو پڑھتی ہوں تو ہر بار راستہ بھول جاتی ہوں۔ چاہتی ہوں کہ اس کے شعوری ارتقاء کا تجزیہ کروں اس نے خود بھی برملا ڈنکے کی چوٹ اس طلسماتی دنیا کو خیرباد کہنے کا اعلان کر دیا ہے۔ مگر میں اس کے اس اعلان کو زیادہ اہمیت دینے کے لئے تیار نہیں اس لئے کہ آدمی اپنے ضمیر میں سکون پاتا ہے اور اس دنیا میں آنا جانا کوئی عیب نہیں۔ میں اس کے سماجی شعور اور عصری تجربات کی طرف آنا چاہتی ہوں مگر اس کے شجر، ہوا، چاند، چڑیاں، گلاب، آبشار، مرا دامن پکڑتے ہیں۔ شجر ہمارے عہد کا ایک اہم استعارہ ہے پروین شاکر نے اس کو سماجی اور ذاتی دونوں حوالوں سے باندھا ہے۔

اس بار جو ایندھن کے لئے کٹ کے گرا ہے
چڑیوں کو بڑا پیار تھا اس بوڑھے شجر سے

یکلخت گرا ہے تو جڑیں تک نکل آئیں
جس پیڑ کو آندھی میں بھی ہلتے نہیں دیکھا

چکرا رہے تھے پرندے شجر کے گرد
بچے تھے آشیانوں میں طوفان سر پہ تھا

میں نے سوچا تھا شعر کا حوالہ نہ دوں گی مگر کچھ ایسے اشعار ہیں جن کی فضا خود بول اٹھتی ہے۔

چکرایا ہے دل یوں کہ کوئی اسم پڑھا جائے
اک شہر [illegible] نہیں جادو کے اثر سے

آنکھوں کے لئے جشن کا پیغام تو آیا
تاخیر سے ہی چاند لب بام تو آیا

اس باغ میں اک پھول کھلا میرے لئے بھی
خوشبو کی کہانی میں مرا نام تو آیا

پت جھڑ کا زمانہ تھا تو یہ بخت ہمارا
سیر چمن دل کو وہ گلفام تو آیا

اڑ جائے گا پھر اپنی ہواؤں میں تو کیا غم
وہ طائر خوش رنگ تہہ دام تو آیا

ہر چند کہ کم عرصۂ زیبائی میں ٹھہرا
ہر چہرۂ گل باغ کے کچھ کام تو آیا

واضح تو ہوا ترک محبت کا ارادہ
بارے دل آشفتہ کو آرام تو آیا

شب سے بھی گزر جائیں گے، گر تیری رضا ہو
دوران سفر مرحلۂ شام تو آیا

اس کی گلی میں بہت دیر تک رہا میرا محمد
میرے ساحر سے کہو اب مجھے آزاد کرے

مگر کون کے "اس ساحر" پر کسی کا اتنا اختیار ہے؟ ذہن پھر ایک طلسماتی فضا میں گم جاتا ہے۔ شاید اس نے کسی جادوگر شہزادے کو دیوار سے چپکا دیا ہے۔

اپنے گرد پھیلے موسموں اور رنگوں کا تجربہ پروین کی شاعری میں پلٹ پلٹ کے آتا ہے۔ خوشبو، ہوا، سمندر، پرندے۔ ان سب کے ساتھ اس کے احساس کا گہرا رشتہ ہے۔ یہ کوئی مابعد الطبیعاتی رشتہ نہیں۔ نہ ہی سطحی رومانوی اور فطرت پرست شعراء کا رویہ ہے کہ فطرت کسی حصول مقصد کا ذریعہ ہو۔ مناظر کے ساتھ یہ طرفہ وابستگی ہے۔ ان کے ساتھ کچھ تھوڑی بہت یادیں وابستہ ہوں تو ہوں ورنہ وہ ان سے بے غرض "بے ریا محبت کرتی ہے کہ ان مظاہر نے اس کی زندگی کو خوبصورتی اور محبت سے بھر دیا ہے۔

پروین شاکر کے ہاں نسائی تمثالوں "دلہن" حیا" سج "دھج" زیاں، افشاں، حنا" وغیرہ کا تذکرہ انکار تک کسی نہ کسی صورت میں پلٹ پلٹ کے آتا ہے۔ اس سے میں اسی نتیجہ پر پہنچی ہوں کہ پروین خواہ کیسی ہی بیوروکریٹ اور سماجی نقادہ ہی کیوں نہ بن جائے بنیادی طور پر وہ ایک روایتی عورت ہے اور روایتی عورت بننا ہمارا حق ہے" منصب ہے۔

دراصل بات یہ ہے کہ یہ جو ہم سب برہم سے ہیں۔ ایگزیوزم "لبرازم کے سلسلے میں تو اسی لیے ہمارے روایتی کردار و منصب کو وہ تکریم حاصل نہیں جو اس کا حق ہے۔ معاشرے کے ساتھ ہمارا تصادم اسی قدر ہے۔ پروین شاکر کو قدرت نے حیاتی تجربے کی ایک وسیع دنیا ودیعت کی ہے۔ اس کے ہاں جو اس سے لطف اندوز ہونے کی ایسی سکت ہے جو میدان کارزار میں سپاہی کو تازہ دم کرنے کے لیے لازمی ہوتی ہے۔ اس لیے ایک عورت ہونے کی حیثیت سے پروین زندگی سے کبھی پوری disillusioned نہیں ہوتی۔ جب صحرا میں کسی گلستان کی امید نہ ہو تو وہ اپنے ترکش میں سے کون سے اسباب عرصہ حیات میں پھیلا رہی ہے۔ اس سے یہ نکتہ بھی کھلا ہے کہ ایک داستان محبت ہے جو بار بار "پلٹ پلٹ کے آتی ہے۔ اور ہر بار ایک نئے حوالے سے اور حیاتی فضا کے ساتھ کسی ایک دلہن کے سراپے میں تو کبھی دوسرے کے آنگن کو حسرت سے دیکھنے اور احساس جرم میں گرفتار ہونے کی صورت میں "کہیں یہ ترک تعلق کا شعوری اور ہوش مندانہ فیصلہ ہے اور کہیں یہ ایک ایسا تعلق ہے جو ٹوٹ پھوٹ کے جڑتا ہے۔ ختم ہو کر بھی ختم نہیں ہوتا۔

صد برگ سے پروین شاکر اجتماعی نقطہ نظر کا اعلان کرتی ہے۔ گو اجتماعی احساس کے کچھ اشارے خوشبو میں بھی موجود ہیں مگر بات یہ ہے کہ تخلیقی فن کبھی اطلاعات کا پابند نہیں رہتا اور نہ ہی تخلیق کار کو اپنے آپ کو محدود کرنے کی فکر کرنی چاہیے۔ اس کا احساس خود ہی طوفان حوادث کے سامنے تک و تنہا کھڑا ہے تو ان آفتوں سے بے نیاز کیوں کر رہ سکتا ہے جو چاروں سمت سے یلغار کر جائیں۔ پروین شاکر نے اپنی ذات کا یہ دوسرا در وا کیا تو رکے ہوئے طوفان تمام خس و خاشاک سمیت اس کو بھی ریلے میں بہا لے گئے زمانے نے اسے تحریر "غرور" تمکنت" حسب ضرورت و بقدر ذائقہ"

کا حوصلہ نہیں، رکنا محال کر دیا
کے اس سفر نے تو مجھ کو نڈھال کر دیا

مری گل زمیں! تجھے چاہ تھی اک کتاب کی
تاب نے مگر کیا ترا حال کر دیا

ہوئے دلوں کے بیچ اور تھا فیصلہ کوئی
نے مگر بچھڑتے وقت اور سوال کر دیا

ے ہوا کے ساتھ ہے دامن یار منتظر
ئے شب کے ہاتھ میں رکھنا سنبھال کر دیا

فیصلوں میں ایک ہجر کا فیصلہ بھی تھا
نے تو ایک بات کی، اس نے کمال کر دیا

ے لبوں پہ مہر تھی، پر مرے شیشہ رو نے تو
کے شہر کو مرا واقف حال کر دیا

و نام ایک ساتھ آج نہ یاد آ سکے
ت نے کس شبیہہ کو خواب و خیال کر دیا

نوں بعد اس نے آج مجھ سے کوئی گلہ کیا
ب دلبری پہ کیا مجھ کو بحال کر دیا

خندہ گیری، طنز و تضحیک سب کو سمجھا دیا۔ سماجی نقاد کی حیثیت سے وہ عصری مسائل کا واضح ادراک رکھتی ہے۔ بالخصوص مجبور و منافقت کے خلاف اس کا قلم سربلند رہا اور "تی" "شب" "عقل اعلیٰ" پر اظہار کیا وطن اور اسی طرح کی اور بہت سی نظمیں لکھی ہیں جن میں فرمایا، ایک براہ راست انداز میں آمریت کے زیر سایہ پلنے والی حق سیاستوں کے خلاف اعلان جہاد ہے۔ اور اس کے لئے پروین شاکر نے زیادہ تر نظم کا سہارا لیا ہے۔ پروین شاکر کا یہ احتجاج دو سطحوں پر ہے۔ ایک معاشرے کے عام فرد کے حوالے سے دوسرے عورت کی زندگی میں۔ اس سلسلے میں اس کا ایک دفتری اور سرکاری تجربہ ہے جو اس کی نظموں کو انفرادیت دیتا ہے۔ اسٹینوگرافر، فیچ اور اس قبیل کی دوسری نظمیں۔ پروین شاکر نے ایک کارکن عورت اور اس کی روزمرہ زندگی کو موضوع بنا کر اردو شاعری کو عورت کا ایک نیا کردار دیا ہے گو یہ روایت کشور ناہید سے شروع ہوئی۔ مگر پروین نے اس کو ایک مستقل حیثیت دینے میں مدد کی۔ عورت جو اسٹینوگرافر بھی ہے اور افسر بھی۔ استاد بھی ہے اور سرونٹ بھی۔ شاعرہ بھی ہے اور مسودہ بھی۔ مگر ہر کہیں استحصال اور بدنیتی کے جال پھیلے ہیں۔ کہیں تشدد اور کہیں خوشامد کے عزیمت اپنے تیز نوکیلے دانتوں سے اس شہ رگ سے خون نچوڑنے کے لئے بیتاب ہیں۔ فقیہ شہر اور قاضی سلطنت کی کذ ذہنی اور اور منافقت پوری قوم کا سستے داموں سودا کرنے پر تلی کھڑی ہے۔ اس سلسلے میں پروین شاکر کی نثری نظمیں بھی آ جاتی ہیں جن میں براہ راست بات کی گئی ہے۔ زبان سادہ اور عام بول چال کے قریب، یہ تمام نظمیں غالباً وہ کتارسس ہے جو پروین شاکر اپنے تخلیقی جوہر کی مطابقت اور سرشاری کے صدقے میں پیش کرنا چاہتی ہے۔ حقیقت نگاری اور حالات کی سنگینی اور تلخی اوقات کے حوالے سے یہ نظمیں اپنے مقصد میں کامیاب ہوتی ہیں۔ اس منظرنامے کی تکمیل کرتی ہے جس میں پروین کی شاعری پروان چڑھتی ہے۔ ذاتی اور اجتماعی عداوت کے سائے بھی بھرے جاتے ہیں اور شاعری کے معصرو نقاد ہونے کا فریضہ بھی ادا ہو جاتا ہے۔

اب اس جگر سوز غزل کا ایک ٹکڑا باقی ہے، اس کو بھی لگا لیں کہ منظر مکمل ہو جائے۔

یہ ہے ماں کا المیہ۔ زمانے سے ٹکر لینے والی یہ کانچ کی گڑیا جب مزاحمت پر آتی ہے تو سنگ خارا بن جاتی ہے مگر محبت کے معاملے میں Total submission مکمل اطاعت کا روپ ہے۔ ماں میں بھی اتنی Possessive کہ کسی اور کے شریک ہونے کے خیال ہی سے بے کل ہو جاتی ہے۔ بیٹے میں بھی محبوب کا چہرہ دیکھتی ہے۔ اس ماں کی نظمیں پڑھ کے ڈی ایچ لارنس کی سنز اینڈ لورز یاد آتی ہے۔

پروین کے ہاں روایتی لفظیات کا بہت منفرد روپ نظر آتا ہے۔ اس سلسلے میں اس کی تراکیب خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ دراصل تراکیب ہی تخیل کی نئی صورتیں ہیں جو عام لفظوں کو معنی کی نئی منازل سے آشنا کرتی ہیں۔ پروین کے ہاں ایسی تراکیب خود رو پھولوں کی طرح بکھری پڑی ہیں۔ شاخ گریہ، فصیل شوق، حرف تحریص، موج خواب، شکن کا پہلا پرندہ۔

اس کا کینوس وسیع ہے جس میں موسموں کے رنگ، سمندروں کی نیلاہٹ، چڑیوں کی چہکار، میدان جنگ کی جھنکار، دشتوں کی زرد اکتاہٹ اور بارشوں کے حزن اور کمروں کی تنہائیاں بھی

[باقی صفحہ ۷۰ پر دیکھئے]

تخت ہے اور کہانی ہے وہی
اور سازش بھی پرانی ہے وہی

قاضیٔ شہر نے قبلہ بدلا
لیکن خطبے میں روانی ہے وہی

خیمہ کش اب کے ذرا دیکھ کے ہو
جس پہ پہرہ تھا، یہ پانی ہے وہی

صلح کو فسخ کیا دل میں مگر
اب بھی پیغام زبانی ہے وہی

آج بھی چہرۂ خورشید ہے زرد
آج بھی شام سہانی ہے وہی

بدلے جاتے ہیں یہاں روز طبیب
اور زخموں کی کہانی ہے وہی

حجلۂ غم یونہی آراستہ ہے
دل کی پوشاک شہانی ہے وہی

شہر کا شہر یہاں ڈوب گیا
اور دریا کی روانی ہے وہی

آفتاب احمد
مکان نمبر ۱۹۱، گلی ۹۶، سیکٹر ایف ۱۰/۲ اسلام آباد

پروین شاکر

"برسوں ہوئے گئی رات کے کسی ٹھہرے ہوئے سناٹے میں ایک کچی عمر کی لڑکی نے اپنے رب سے دعا مانگی کہ وہ اس پر اس کے اندر کی لڑکی کو منکشف کر دے۔ دعا قبول ہوئی اور اس لڑکی کو چاند کی تمنا کرنے کی عمر میں ذات کے شہر ہزار در کا اسم عطا کر دیا گیا۔ پھر جب موسم آیا تو شہر ذات کی گلیوں میں زندگی نے خوشبو کھیلی اور بہار نے آنکھوں پر پھول باندھ دیئے۔ انہی پھولوں کی پنکھڑیاں چنتے چنتے آئینہ در آئینہ خود کو کھوجتی یہ لڑکی شہر کی اس سنسان گلی تک آ پہنچی جہاں اس نے مڑ کر دیکھا تو دور دور تک کرچیاں بکھری ہوئی تھیں۔ اس لڑکی نے اپنے عکس کو جوڑنے کی سعی کی لیکن اسے اعتراف ہے کہ اس کھیل میں کبھی تصویر دھندلا گئی اور کبھی انگلیاں لہو لہان ہو گئیں۔"

یہ جو کچھ آپ ابھی سن رہے تھے اس میں میری طرف سے کچھ نہیں کہا گیا۔ یہ اس داستان کے چند منتخب جملے ہیں جو اس لڑکی نے اپنے پہلے مجموعہ کلام "خوشبو" کے پیش لفظ "دریچۂ گل" سے جھانکتے ہوئے اپنے بارے میں بپتا سنائی ہے۔ یہ لڑکی وہ شاعرۂ امروز ہے جس کے احترام کے لئے ہم آج یہاں جمع ہوئے ہیں۔

پروین شاکر نے اپنی شاعری کے سفر کا آغاز 'خوشبو کے وطن' یعنی خوش رنگ پھولوں، خوش نما رنگوں اور خوش نوا طائروں کی وادی سے کیا، مگر جلد ہی زندگی نے ان کی راہ میں کانٹوں کے جال بچھا دیئے۔ چونکہ وہ طبعاً گلشن پرست واقع ہوئی ہیں لہٰذا انہوں نے پھول ہی نہیں چنے، کانٹے بھی سمیٹ لئے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کی شاعری میں غم و خوشی کی لہریں بیک وقت ابھرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ تخلیق کی دیوی ان کے ہاں بہ چہرہ تبسم بہ چشم تر آتی ہے۔

ذات کے شہر ہزار در میں سے پروین شاکر نے جو در باز کئے ہیں ان میں عشق و محبت کے در کا ذکر خاص توجہ کے قابل ہے۔ بات یہ ہے کہ عشقیہ شاعری بیشتر مرد شاعروں نے کی ہے اور اس میں مردوں ہی کے دل کی بپتا اور انہی کی رام کہانی بیان ہوئی ہے۔ ہندی شاعری میں عورت عاشق ضرور ہے مگر شاعری کے خالق وہاں بھی اکثر مرد ہی رہے ہیں۔ لہٰذا عشقیہ شاعری مردوں کی چیز بن کر رہ گئی ہے۔ اردو کی حد تک تو یہ بات حتمی طور پر کہی جا سکتی ہے۔ اگلے وقتوں کے ایک اردو شاعر

بات ہے یاد کہ کا منظر دیکھ سکتی ہوں
کا چہرہ میں چھو کر دیکھ سکتی ہوں

ے لبوں پہ ذکر فصل گل نہیں آیا
پھول کھلتے اپنے اندر دیکھ سکتی ہوں

ی محبت نے عجب اک روشنی بخشی
دنیا کو اب پہلے سے بہتر دیکھ سکتی ہوں

ھونڈنے کی چاہ تک مجھ میں نہیں ہوگی
گرد اک ایسا سمندر دیکھ سکتی ہوں

ہجر اب یکساں ہیں وہ منزل ہے چاہت میں
یں بند کر کے تجھ کو اکثر دیکھ سکتی ہوں

ے سواد نیا بھی ہے موجود اس دل میں
و کس طرح تیرے برابر دیکھ سکتی ہوں

نے تو عشق کی بات کے بارے میں عورتوں کی زبانی یہ تک کہا تھا کہ:

ہم بھولیاں یہ کیا جانیں

خود میرے لڑکپن کے زمانے میں پردہ داری کا یہ عالم تھا کہ رسالوں میں خواتین کی سیدھی سادی، نہایت بے ضرر قسم کی نظمیں، غزلوں اور افسانوں کے ساتھ ان کے پورے نام شائع نہیں کیے جاتے تھے بلکہ صرف ناموں کے حروف اول، ایک شاعرہ ز۔ خ۔ شروانی صاحبہ تھیں۔ نہ جانے ان کا نام کیا تھا۔ شاید علی گڑھ کے شروانی خاندان سے تھیں۔ پھر ایک ح۔ ب صاحبہ تھیں وہ چونکہ رشتے میں میری پھوپھی تھیں لہٰذا مجھے معلوم ہے کہ ان کا نام حبیبہ بیگم تھا اور ان کی چھوٹی بہن ز۔ ب یعنی زہرہ بیگم افسانے لکھتی تھیں۔ اب تو ماشاء اللہ اہل قلم خواتین کی ایک پوری کھیپ کی کھیپ ہمارے درمیان موجود ہے اور صورت حال یہ ہے کہ مجھ ایسے نامحرم نیاز مند کو بھی ان میں سے اکثر سے ملاقات کا شرف حاصل ہے۔ ہمارے دور میں خواتین اہل قلم نے کوئی قدغن قبول نہیں کی اور سب بندھن توڑ دیے ہیں۔ شروعات اس کی عصمت چغتائی سے ہوئی۔ ان سے لے کر پروین شاکر تک جائیے۔ انسانی زندگی کا وہ کون سا پہلو اور انسانی نفسیات کا وہ کون سا گوشہ ہے جس کی تصویر کشی ان کی دسترس سے باہر رہی ہے۔ آج شام گفتگو چونکہ پروین شاکر سے ہے لہٰذا اس کے بارے میں عرض کروں گا کہ انہوں نے عشق و محبت کی بات کسی قسم کے تکلف اور جھجک کے بغیر کی ہے اور عورت کی حیثیت سے کی ہے۔ میں یہاں اس صنف میں نئے دور کی شاعرات میں اول و آخر کی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا ممکن ہے کل کوئی محقق میری بات کو غلط ثابت کر دے مگر یہ ضرور کہوں گا کہ پروین شاکر نے بڑی بے باکی اور لفظ و بیان کی خوبیوں سے سجی ہوئی عشقیہ شاعری کی ہے۔ اس شاعری کے تیور تو یہی بتاتے ہیں کہ یہ نہ محض زبانی جمع خرچ کی بات ہے اور نہ کوئی ایسا خیالی موضوع جو "برائے شعر گفتن خوب است" کے ذیل میں آتا ہے۔ پروین شاکر نے محبت کے تجربے کو اپنے رگ و پے میں محسوس کیا ہے اور اس کی مختلف حسیاتی اور نفسیاتی کیفیتوں کو کبھی کھلے صاف لفظوں میں بیان کیا ہے اور کبھی استعارے میں لا کر عام کو خاص بنا دیا ہے۔ اپنے مجموعہ کلام "خوشبو" کے پیش لفظ میں انہوں نے کہا تھا کہ وہ تخلیق کے تمام لمحوں میں صرف اپنے وجدان کے سامنے جواب دہ رہی ہیں، انہوں نے واقعی اس دعوے پر عمل بھی کیا ہے اور وہ سب کچھ ہمارے سامنے رکھ دیا ہے جس پر ان کی وجدان کی مہر ثبت تھی۔ اس میں وہ حسیات بھی شامل ہیں جو وصل و اختلاط کے لمحوں کا حصہ ہیں اور جنہیں پروین شاکر نے بڑے سلیقے اور ہنرمندی سے لفظوں میں اسیر کیا ہے:

خوشبو ہے وہ تو چھو کے بدن کو گزر نہ جائے
جب تک مرے وجود کے اندر اتر نہ جائے
خود پھول نے بھی ہونٹ کیے اپنے نیم وا
چوری تمام رنگ کی تتلی کے سر نہ جائے
ایسا نہ ہو کہ لمس بدن کی سزا بنے
جی پھول کا ہوا کی محبت سے بھر نہ جائے

چراغ مانگتے رہنے کا کچھ سبب بھی نہیں
اندھیرا کیسے بتائیں کہ اب تو شب بھی نہیں

میں اپنے زعم میں اک بازیافت پر خوش ہوں
یہ واقعہ ہے کہ تجھ سے ملا وہ اب بھی نہیں

حساب دربدری تجھ سے مانگ سکتا ہے
غریبِ شہر مگر اتنا بے ادب بھی نہیں

ہمیں بہت ہے یہ سادات عشق کی دولت
کہ یہ قبیلہ کوئی ایسا بے سبب بھی نہیں

جو میرے شعر میں مجھ سے زیادہ بولتا ہے
میں اس کی بزم میں اک حرف زیر لب بھی نہیں

اور اب تو زندگی کرنے کے سو طریقے ہیں
ہم اس کے ہجر میں تنہا رہے تھے جب بھی نہیں

خلقت نہیں ہے ساتھ تو پھر بخت بھی نہیں
کچھ دن ندی رہے گا تو یہ تخت بھی نہیں

اب کے بھٹک گئے تو پلٹنا محال ہے
اب کے تو ساتھ راحلہ و رخت بھی نہیں

اس بار ہم سے خیمہ کشی کیوں نہ ہو سکی
اس بار تو زمین بہت سخت بھی نہیں

مہتاب پر جو خاک نہ ڈالیں تو یہ کھلے
ہم جیسے لوگ اتنے سیہ بخت بھی نہیں

کھینچا ہے جب بھی طول حد آشتی جنگ نے
وارث بھی تخت پر نہ رہا، تخت بھی نہیں

نظم سے ظاہر ہوتا ہے کہ زندہ سماجی حقیقتوں اور ہیجان انگیز کے آس پاس کے متعلق اور دلچسپ واقعات و کوائف بھی پروین شاکر کی نظر میں ہیں اور وہ ان کو بیان کرنے کی قدرت بھی رکھتی ہیں۔ اس نظم کے کچھ اقتباسات سنئے اور دیکھئے کہ بطور شاعر یہاں پروین شاکر نے کیا نیا اور منفرد انداز اختیار کیا ہے۔

محل کے پیچھے
ہجوم مشتاق منتظر ہے
کہ خواب گر کا حریری پردہ ذرا ہٹے تو
سب اپنے اپنے شناخت نامے ہوا میں لہرائیں
اور یہ کہنے کا موقع پائیں
کہ علیا حضرت!
ہمیں بھی پہچانئے
کہ ہم نے
خزاں کی رت میں
سیاہ اپریل کے اوائل میں
شام بے وارثی اترنے کی ساعت بے لحاظ میں
دودمان عالی جناب کو چادر عزا نذر کی تھی۔

سولہ شہر صبا میں
خوشبو کی واپسی کے لیے
وہ ہم تھے
جو مثل خاشاک در بدر تھے
شمالی یورپ کے دور افتادہ یخ کدے میں
تمام تر مرکزی نظام حرارت و نور و تجلی میں
وہ ہم تھے جو
سخت اجنبیت کی برفباری میں جل رہے تھے
اور اپنے گھربار، اپنی املاک، اپنے پیاروں سے دور ہو کر
نئے وسیلوں سے رزق کی دوڑ میں تھے شامل
خمیری روٹی کی یاد میں
سینڈوچ پہ کرتے رہے گزارا
(یہ کار، قالیچہ و جواہر تو صرف فرصت کا مشغلہ تھے)

ہمارے انکار کے تعاقب سے
اب صلے کی نوید پہنچے
کسی بڑے، غزال چشم، گل عذاروں میں ہم کو تفویض ہو سفارت
منصب و مال و فضل و املاک کی وزارت
نہیں تو باب مشاورت ہی کھلے کسی پر
جو یہ نہیں تو
کسی علاقے کی صوبہ داری
کسی ریاست میں منصب چار دہ ہزاری
بکار خاص افسروں کی لمبی قطار ہی میں کوئی جگہ دیں
ہمیں صلہ دیں!

پروین شاکر کی شاعری کی ایک پہچان ان کے زبان کی سادگی و ... بھی ہے۔ ان کے ہاں الفاظ و تراکیب کے انتخاب اور استعمال میں ایک خاص رکھ رکھاؤ اور ... حسن پایا جاتا ہے۔ ان کی لغت میں بول چال کی زبان کا محاورہ اور روزمرہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ ہاں اس میں کچھ ہندی اور فارسی کی پٹ بھی ہے۔ جسے وہ حسب ضرورت کام میں لاتی ہیں۔ عام طور پر ان کی شاعری دھیمے لہجے' میٹھے بول کی شاعری ہے مگر جب بول ہی کڑوے ہو جائیں تو ظاہر ہے ... لہجہ بھی ویسا نہیں رہتا۔ اس کی کئی ایک مثالیں بھی ان کے کلام میں ملتی ہیں۔ خصوصاً وہاں جہاں ... نے اپنی زندگی کے بعض ناگوار تجربات اور محبوب سے خفگی کا اظہار کیا ہے۔

پروین شاکر کی شخصیت میں جو خود اعتمادی پائی جاتی ہے اور ... جھلکیاں ان کی شاعری میں بھی موجود ہیں' اس کے سہارے انہوں نے زندگی میں ہر طرح کی مشکلات کا مقابلہ کیا ہے۔ سر ہمیشہ اونچا رکھا ہے اور گیت بننے اور خوشبو پھیلانے میں کبھی کوئی کمی نہیں ... دی۔ محض ۱۸ برس کی مدت میں ان کے چار مجموعوں کی اشاعت اس کا بین ثبوت ہے۔ ✻

بقیہ صفحہ ۱۱ کانچ کی گڑیا

بقیہ صفحہ ۱۱

شامل ہیں۔ اس میں پھیلاؤ ہے۔ مابعد الطبیعاتی گہرائی نہیں۔ وجود و عدم کے مسائل تو کس میں نہیں آئے کہ پروین شاکر کار زیست سلجھانے میں یقین رکھتی ہے آسمان سے ٹکرا مول لینے کے موڈ میں نہیں۔ زبان و بیان میں امکانات کی تلاش اس کا محبوب مشغلہ ہے۔ کسی ہندی لب و لہجہ میں گوکل متھرا جا پہنچی' کبھی بسنتی چنری اوڑھے امیر خسرو کی چوکھٹ پکڑ لی۔ ورنہ میر و غالب' فیض و فراز کی مجلسوں میں کنول آس جلایا۔ مگر جہاں بھی گئے اپنے ذہن سے سوچا اپنی بات کی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اردو شاعری میں نسائی حسیت ایک مستقل صورت اختیار کر رہی ہے۔ اور اظہار و بیان دونوں اعتبار سے اگلا قدم ہے۔ اور بجا طور پر امید کی جا سکتی ہے کہ جب دور حاضر کی شعری تاریخ مرتب ہونے لگے تو کانچ کی گڑیا اپنی پوری دلاویزی اور خارا شگافی کے ساتھ اپنے مقام پر کھڑی ہو۔ ✻

لو چراغوں کی کل شب اضافی رہی
روشنی تیرے چہرے کی کافی رہی

اپنے انجام تک آ گئی زندگی
یہ کہانی مگر اختلافی رہی

ہے زمانہ خفا تو بجا ہے کہ میں
اس کی مرضی کے بالکل منافی رہی

ایسے محتاط ایسے کم آمیز سے
اک نظر بھی توجہ کی کافی رہی

صبح کیا فیصلہ حاکم تو کرے
جشن کی رات تک تو معافی رہی

پروین شاکر

میرے ہاتھ کی گرمی

میرے ہاتھ کی گرمی
ے چھو کر
ہاری آنکھ میں حیرت کے ڈورے ہیں
اس سے قبل
جب بھی تم نے میرا ہاتھ تھاما
رف کا موسم ہی پایا تھا
موسم میرے اندر کتنے برسوں سے فرد کش تھا
بار آئی تھی
در میرے دریچوں پر کبھی دستک نہ دیتی تھی
انی بارشیں میرے لئے ممنوع تھیں
رضح کی تازہ ہوا کا ذائقہ
بھول بیٹھی تھی
ے ملبوس سے سب گرم رنگوں کو شکایت تھی
بس برف کی چادر پہننے کی اجازت تھی
رجاناں!
ارے ساتھ نے تو زیست کا منظر بدل ڈالا
ں اب رنگ کا تہوار ہے
شبو کا میلہ ہے
ملبوس اب گہرا گلابی ہے
ے خوابوں کا چہرہ ماہتابی ہے
ے ہاتھوں کا موسم آفتابی ہے
ے چھو کر ....

یہ کیسا خلا ہے

یہ کیسا خلا ہے
جو خوابوں کے رستے مری روح میں آگیا ہے
میں جس پھول بن میں
ہری گھاس پر تتلیاں چن رہی تھی
وہ فرشِ گہر میرے قدموں سے کیسے جدا ہوگیا
میں جس آسماں کے
ستاروں میں اپنا ستارہ الگ کر رہی تھی
وہ تاروں بھری سقف
سر سے مرے کس طرح ہٹ گئی
زمیں پر ہوں میں اور نہ زیرِ فلک
نہ دھڑکا ہے دل میں نہ کوئی کسک
ترے ساتھ ہوں اور نہ تیرے بغیر!
جئے جا رہی ہوں میں اپنے بغیر!

سوادِ زندگانی میں

سوادِ زندگانی میں
ایک ایسی شام آتی ہے
کہ جس کے سرمئی آنچل میں
کوئی پھول ہوتا ہے
نہ ہاتھوں میں کوئی تارہ
جو آکر بازوؤں میں تھام لے
پھر بھی
رگ و پے میں کوئی آہٹ نہیں ہوتی
کسی کی یاد آتی ہے
نہ کوئی پھول پاتا ہے
نہ کوئی نغمہ سلگتا ہے
نہ کوئی زخم سلتا ہے
گلے ملتا ہے کوئی خواب
نہ کوئی تمنا ہاتھ ملتی ہے
سوادِ زندگانی میں
اک ایسی شام آتی ہے
جو خالی ہاتھ آتی ہے!

مگر اس دل کی ویرانی

تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ میں ہے
اور جگنو سی کی نرم اثر حدت
مرے اندر
طلسمی رنگ پھولوں کی نئی دنیا کھلانے میں مگن
تمہارے لب پہ میرے نام کا تارہ چمکتا ہے
تو میری روح ایسے جگمگاتی ہے
کہ جیسے آئینے میں چاند اتر آئے
مری پلکوں سے آنسو چوم کر
تم نے انہیں موتی بنانے کی جو ضد کی ہے
وہ ضد مجھ کو بہت اچھی لگی ہے
بہت خوش ہوں
کہ میرے سر پہ چادر رکھنے والا ہاتھ
میرے ہاتھ میں پھر آگیا ہے

یہ پھول اور یہ ستارے اور یہ موتی
مجھ کو قسمت سے ملے ہیں
اور اتنے ہیں کہ گنتی میں نہیں آتے
مگر اس دل کی ویرانی!
مگر اس دل کی ویرانی!

نہ میں نے چاند دیکھا

نہ میں نے چاند دیکھا
اور نہ کوئی تہنیت کا پھول کسی سے اٹھایا
مرا ملبوس اب بھی میلا ہے
حنا سے ہاتھ خالی
اور چوڑی سے کلائی
نہ میرے پاس تھے تم
اور نہ میرے شہر سے گزرے
میں کیا افشاں لگاتی
مانگ میں سیندور بھرتی
رنگ اور خوشبو پہنتی
کہ میری لذتِ دیدار تو تم ہو!
مرا تہوار تو تم ہو!

ہوا جامِ صحت تجویز کرتی ہے

مجھے معلوم تھا
یہ دن بھی دکھ کی کوکھ سے پھوٹا ہے
میری ماتمی چادر
نہیں تبدیل ہو گی آج کے دن بھی
جو ماتھے اڑتی تھی خوابوں کی مدفن میں
یوں ہی آشفتہ رہے گی
اور اداسی کی یہی صورت رہے گی
میں اپنے سوگ میں ماتم کناں
یوں سر بہ زانو رات تک بیٹھی رہوں گی
اور مرے خوابوں کا پُرسہ آج بھی کوئی نہیں دے گا۔
مگر یہ کون ہے
جو یوں مجھے باہر بلاتا ہے
بڑی نرمی سے کہتا ہے
کہ اپنے حجرۂ غم سے نکل کر باغ میں آؤ
ذرا باہر تو دیکھو
دور تک سبزہ بچھا ہے
اور ہری شاخوں پہ نارنجی شگوفے مسکراتے ہیں
ملائم سبز پتوں پر پڑی شبنم
سنہری دھوپ میں ہیرے کی صورت جگمگاتی ہے
درختوں میں چھپی ندی
بہت دھیمے سروں میں گنگناتی ہے
چمکتے زرد پھولوں سے لدی ننھی پہاڑی کے عقب میں
نقرئی چشمہ خوشی سے کھلکھلاتا ہے
پرندہ خوش گلو
شاخِ شگفتہ پر چہکتا ہے
گھنے جنگل میں بارش کا غبارِ سبز
سطحِ شیشۂ دل پر
ملائم انگلیوں سے مرحبا کے لفظ لکھتا ہے
کوئی آنچل سا
اگر چادرِ غم کو بڑی آہستگی سے
میرے شانوں سے ہٹا کر
سات رنگوں کا دوپٹہ کھول کر مجھ کو اڑھاتا ہے
میں کھل کر سانس لیتی ہوں

مرے اندر
کوئی پیروں میں گھنگھرو باندھتا ہے
رقص کا آغاز کرتا ہے
مرے کانوں کے آویزوں کو یہ کس نے چھوا
جس سے لویں پھر سے گلابی ہو گئی ہیں
کوئی سرگوشیوں میں پھر سے میرا نام لیتا ہے
فضا کی نغمگی آواز دیتی ہے
ہوا جامِ صحت تجویز کرتی ہے۔

ایک ساؤنڈ پروف نظم

بہت خوش شکل ہے یہ گھر
طلسمی ہے فضا اس کی
دریچوں کا سے رخ دریا کی جانب
اور دروازے بھی اکثر باغ کے پہلو میں کھلتے ہیں!
عروسِ نو کے خوابوں کی طرح نقشیں ہے ہر کمرہ
اور ان کے وسط میں الماسی شمعیں سحر تک جھلملاتی ہیں
بہت آراستہ مہمان خانے میں
طلائی قاب میں رکھے ہوئے اثمارِ تازہ، سبز و عنابی
منقش جامِ سیمیں میں شرابِ کہربائی
اور رکعت دلنشیں سے لے کر
مکینوں کے نگارین حجلہ گاہِ خواب
اور دیوان خانے تک
بچھے غالیچۂ شیراز و روما
آپ کے قدموں کی آہٹ اس طرح جذب کرتے ہیں
کہ جیسے خانہ زادِ تاج
محلوں میں چھپے رازوں کو اپنے گنگ سینوں میں
مکیں سرگوشیوں میں بات کرتے ہیں
صدائے شام کا زخمی پرندہ
شیشۂ در سے برابر سر کو ٹکراتا ہے
لیکن باریابی کی کوئی صورت نہیں بنتی
دریچوں پر کبھی
بارش کی ننھی سی ہتھیلی کی جھلک
مجھ کو دکھائی دے بھی جاتی ہے
مگر دستک نہیں آتی
جہاں میں ہوں
وہاں آواز کو رستہ نہیں ملتا

یہاں سے ایک شب کے فاصلے پر
دورِ آزادی کی مورت کے جلو میں
شاہراہِ شرق اول پر
طلسمی رنگ، جادوئی فضا
اک اور بستی ہے
جہاں دنیائے سوم کے
کسی کوچے سے آتے بین کو
پروانۂ رہداریٔ عظمیٰ نہیں ملتا
جہاں ہم ہیں
وہاں آواز کو رستہ نہیں ملتا

اداجعفری

نہ کرامتیں کسی خواب کی، نہ کسی یقین کا سائباں
مرے روز و شب میں کہیں نہیں مرے روز و شب کا بیاں

انہیں پڑھ سکو تو کتاب ہیں، یہ جو ریزہ ریزہ ہیں سسکیاں
انہیں چھو سکو تو گلاب ہیں، یہ جو خار خار ہیں انگلیاں

مرا غم بھی تو ہے خوشی بھی تو، سبھی راستے تری سمت ہیں
یہ بتا کہ کیوں مرے قد سے کم ہے مری زمیں مرا آسماں

کہیں کنجِ دل میں ابھی تلک انہیں نکہتوں کا خرام ہے
کسی ایک لمحۂ درد نے جنہیں لکھ دیا سرِ داستاں

یہ جو انتظار کے رنگ ہیں، یہ سبھی بہار کے رنگ ہیں
دلِ بے ہنر کے نصیب میں نہ لکھا گیا ہے کبھی زیاں

یہ جہانِ دانش و آگہی، یہاں کون دل کے قریں ملے
مگر آج بھی کوئی چشمِ نم، کسی چشمِ نم کی ہے رازداں

لبِ زخم سے جو ادا ہوئیں وہ حکایتیں کوئی اور تھیں
یہ کہانیاں ہیں کچھ اور ہی، جو سنا گیا مرا قصہ خواں

● ۳۴/۸/ری۔ بلاک ۶۔ پی ای سی ایچ سوسائٹی، کراچی

فاطمہ حسن

خود کو پھر اک بار تنہا کر دیا
اس نے جو چاہا تھا ویسا کر دیا

میں تو بس اک لہر تھی، دریا نہ تھی
اس کی گہرائی نے دریا کر دیا

آج کے بچوں نے اگلی نسل کو
وقت سے پہلے ہی بوڑھا کر دیا

لوگ دھوکا کھا گئے، آزاد ہیں
اس نے زنجیروں کو ہلکا کر دیا

لفظ کب اس کی گواہی بن سکے
میری خاموشی نے سچا کر دیا

دوریوں نے جسم کو جھٹلا دیا
روح کے رشتے کو گہرا کر دیا

● ڈی-۱۴ بلاک، گلشنِ اقبال، کراچی۔ (پاکستان)

حمیرا رحمان

ٹھہروں تو ساتھیوں سے مرا فاصلہ بڑھے
چلتی رہوں تو گرد مرے راستہ بڑھے

تحلیل ہو گئی ہے فضا میں اڑی جو بات
قبل اس کے میری سمت کوئی فیصلہ بڑھے

بچوں کی گفتگو میں بھی تتلیوں کے رنگ
دانائیوں سے پہلے اگر تجربہ بڑھے

بے شہر بے لحاظ میں ہر چیز دم بخود
رت بدلنے تو ہواؤں کا کچھ حوصلہ بڑھے

پھر کوششوں کے سارے ہنر ہو گئے تمام
خوابوں سے پھر حمیرا نیا دائرہ بڑھے

● 3-YOUNG AV
YONKERS N.Y 10719 (U.S.A)

ساجدہ زیدی

رنگ خزاں

کب سے جس چادرِ تنہائی کو اوڑھے ہوئے
اس دشتِ پرآشوب کی وزدیدہ مسافت طے کی
کھینچ لی سر سے مرے ـــــــ وہ بھی
زمانے کے عدو ہاتھوں نے
(پابرہنہ تھی، کھلے سر تھی، کہاں تک جاتی!)
وہ جو اک راہ پراسرار مرے قلب سے
دامانِ افق تک تھی رواں
چھپ گئی دھند میں ــ (کس طرح کی افتاد تھی وہ)

کورے منظرِ احساس، کوئی صبح نہیں، شام نہیں
لوحِ محفوظ کے پردے پہ کوئی نام نہیں
معبدِ جاں میں کوئی گونجتی آواز نہیں
لب کشا درد نہیں
شعلۂ رفتار کا انداز نہیں
دیدۂ خوں بار نہیں
جاحتِ الہام نہیں
آہ اے تشنگیٔ دل! ترے حصے میں
کوئی دردِ تہ جام نہیں

● گل برگ، دودھ پور، علی گڑھ (یو پی)

عرفانہ عزیز

حدیثِ مہر و وفا سے پہلے

ترانے جو آشنا تھے تیری ثنا سے پہلے
لبوں کے مرجاں، صدا کے نیلم
بکھر گئے ہیں جو دشتِ غم میں
قبولِ حرفِ دعا سے پہلے
وہ آج دردِ جہاں کی میراث بن گئے ہیں
نگارِ گیتی کے آستاں پر ہیں لعل افشاں
جو اشک واقف تھے تیرے رنگِ قبا سے پہلے

وہ پھول جو تیرے سنگِ در پر
برس کے خوشبو گنوا چکے ہیں
پیام بادِ صبا سے پہلے
وہ پھول اب بے کسوں کے دامن میں پھر کھلیں گے
عتابِ اہلِ جفا سے پہلے
وہ شمعیں جو ہم جلا چکے ہیں
وہ ظلم دیدہ سہنے والوں کی تربتوں پر رہیں گی روشن
ستم کشوں کے لہو کی صورت ہے سرکشیدہ
وہ سرخ آنچل جو مشک بو تھا شمیمِ رنگِ حنا سے پہلے

گلاب جتنے تھے دل کے گلزار میں وہ تقسیم ہو چکے ہیں
بہارِ تازہ کی انجمن میں
مہک رہا ہے نئے شگوفوں کے پیرہن میں
لہو تھا جتنا نزادِ تن میں
رقم ہے رخسار و لب کے اوراق پر غمِ دہر کا فسانہ
حدیثِ مہر و وفا سے پہلے۔

● 50-BRYN MAWR ROAD
WINNIPEG MANITOBA.
R3T 3SP CANADA

نیّر جہاں

پیام یار شوں کے پھر گھٹا نے لکھ دیئے
مگر کچھ اور فیصلے ہوا نے لکھ دیئے

جو بیچ کھلا تو دوستی کے سارے زائچے
منافقت کے باب میں خدا نے لکھ دیئے

بچھڑ کے تجھ سے زندگی محال تھی مگر
عذاب اور بھی کئی وفا نے لکھ دیئے

بدن ہے ٹھیک، روح سنگسار ہو گئی
محبتوں کے ضابطے، سزا نے لکھ دیئے

دلوں پہ جو لکھا تھا وہ خبر خدا کو تھی
ہتھیلیوں پہ فیصلے حنا نے لکھ دیئے

بہت قریب ہو کے بھی قریب ہم نہ تھے
بڑے عجب فاصلے، حیا نے لکھ دیئے

321 HILL STREET, SUITE NO.
SANTA MONICA, CA 90405 U.S.A

شبنم شکیل

لہو اس دل سے اب رستا نہیں ہے
یہ میرے واسطے اچھا نہیں ہے

خود اپنا ساتھ کب تک دے سکوں گی
یہ میں نے آج تک سوچا نہیں ہے

خوشی کا تاج واپس کر دیا ہے
یہ میرے سر پہ کچھ سجتا نہیں ہے

مجھے جانا ہے جس کو پار کر کے
ابھی رستے میں وہ دریا نہیں ہے

ہے سب کچھ آنکھ میں تحریر اس کی
مگر دل ہی اسے پڑھتا نہیں ہے

وہی اک بے بس بکنے والی ہے
یہاں جس کو کوئی بکتا نہیں ہے

کھڑی ہوں کب سے میں کشکول تھامے
مگر باب ہنر کھلتا نہیں ہے

۹- اسٹریٹ نمبر ۲، ایف - ۷/۲ اسلام آباد (پاکستان)

شاہدہ حسن

بے سود ہے شوق زخم دوزی
جو ضرب بھی ہے وہ ناگہاں ہے

جوں آئینہ دیکھتی ہوں اس کو
دل پر یہ بھی فاصلہ گراں ہے

وہ مجھ سے ہے اور میں ہوں اس سے
پھر کیا ہے جو اس کے درمیاں ہے

تاروں کی گرہ لگی ہے سر پر
پاؤں میں حصار کہکشاں ہے

شاید کوئی رت پلٹ کے آئے
گردش میں زمیں ہے، آسماں ہے

تمثال گری میں طاق ہے دل
خوابوں میں سجائے اک دکاں ہے

اس دشمن دل سے کب ملوں میں
ہر آن ہجوم دوستاں ہے

آر - ۸/۱۰، سیکٹر ۱۱- اے - ۱۴، بفرزون نارتھ کراچی (پاکستان)

بلقیس ظفیرالحسن

دسمبر ۹۲

ہم لوگ
بڑے عجیب ہیں ہم لوگ
جس شاخ پر آشیاں بناتے ہیں
اسی کو دھیرے دھیرے کاٹتے رہتے ہیں
یہ ہمارا محبوب مشغلہ ہے
اور جب کٹ کر گر جاتی ہے وہ شاخ
تو واویلا مچاتے ہیں، خوب چیختے چلاتے ہیں۔
ایک دوسرے کو دوشی ٹھہراتے ہیں۔
سچ مچ بڑے عجیب ہیں ہم لوگ
مل جل کر خوب گہری قبر کھودتے ہیں
پھر اس میں ایک دوسرے کو دھکّے مار مار کر
گرا دیتے ہیں
اپنے آپ کو اپنی ہی بنائی ہوئی قبروں میں
دفن کر کے
زور زور سے گاتے ہیں
"ہم سا کون جہان۔ بولو۔ ہم سا کون جہان"،
کتنے عجیب ہیں ہم لوگ ——— ہیں نا؟

۱۴ بی۔ جے بلاک ایم آئی جی فلیٹس، فیز ۱ اشوک وہار۔ دہلی

زاہدہ زیدی

یہ وقت کا بے کراں سمندر

یہ وقت کا بے کراں سمندر
جو میرے اطراف موجزن ہے
یہ تند و سفاک محشر بدوش دھارا
کہ جس کی زد میں ہیں
عہد ماضی کی وارداتیں
ہزاروں جلوہ طراز دن۔ سوگوار راتیں
گزشتہ ادوار کے سلگتے ہوئے سفینے
حیات نو کے کئی قرینے
پرانی تاریخ کی وہ سب حکایات پارہ پارہ
وہ سب کہ جن کا رہا کبھی اوج پر ستارہ
قدیم علم و ہنر کے دھارے
بلند افکار کے منارے
نوادرِ شعر و سخن کے دفتر
شکست پردار کے وہ شہپر
گداز نغمے جو سب دلوں کی دھڑکن بنے ہوئے تھے
حسین پیکر، نگار خانوں میں جو دلوں کے بسے ہوئے تھے
ازل سے خاشاک کی طرح وہ سب
اسی تند و تیز دھارے میں بہہ رہے ہیں
ابد کی تاریک وادیوں میں گر کے معدوم ہو رہے ہیں
مگر یہی تند و تیز دھارا
مری تمام تر کاوشوں کا ایک موہوم سا سہارا
اسی کی شعلہ زبان لہروں پہ چل کے شاید ملے کنارا
کہ اب
فنا کے تاریک غار بھی میرے منتظر ہیں۔

۵۴۔ ایچ آئی جی فلیٹس، سرسید نگر، علی گڑھ (یوپی)

ڈاوری

نسیم سید

کسے معلوم تھا!
وہ آگ ... جس کے سات پھیرے کر کے تم کو
سات جنموں کی وفاداری نبھانے کی گواہی میں چنا تھا
وہی اک تمہارے جسم کا صندل جلا کے راکھ کر دے گی
تو کیا تم بے خبر تھیں۔؟
تمہارے سوت کے آنچل سے مخمل کے دوشالے کا
جو بندھن تھا

رعونت کے رواجوں میں
اسی کو ٹاٹ کا پیوند کہتے ہیں
تمہاری حیثیت اونچی حویلی کے چھپر کھٹ پر بچھی چادر سے بڑھ کر
اور کیا ہوتی ؟
تو آخر کس یقیں پر تم
ہتھیلی کی لکیروں پر دھرے قدموں کو چھو کے بندگی کرتی رہیں
نہ جانے کیا سمجھ کے ہر صبح تم
اپنے احساسات کا صندل، وفا کے پھول
تھال میں سجائے آرتی کرتی رہیں
تمہارے صحن میں تلسی کا پودا
منتوں کے لال دھاگے سے لدا
اب بھی تمہاری ان دعاؤں کی گواہی میں کھڑا ہے
جن سے تم نے پیر دھرنے بھر جگہ اور ذات کی توقیر مانگی تھی۔
میری مظلوم ساتھی
وفائیں جب پھٹی چادر میں لپٹی ہوں تو ان کو دان میں
تحقیق ملتی ہے

رواجوں کے بھیانک دیوتا سے
زندگی کی بھینٹ کی تعبیر ملتی ہے
مدعو تم بے خبر تھیں
ہمیں تو ابتدا سے گھر کے بدلے قبر کی جاگیر ملتی ہے۔

666, COUNTER ST. KINGSTON ONTARIO
K7 M3 L6 CANADA.

خاتم العدد

عذرا پروین

میں گھڑی کی ایک سوئی ہوں
اور تم ہو خاتم العدد
یہ کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے کہ
میرا کوئی بھی نیا چکر
تم سے ملے بنا شروع ہو
اور ختم ہو جائے

یقین رکھو
کہ ہر اگلی گردش میں
پاؤں رکھنے سے قبل میں
تم تک آنے کے لئے بندھی ہوئی ہوں
آؤں گی ضرور آؤں گی!
تمہاری سرحدوں سے گزرے بنا
میرا کوئی نیا چکر

چکرویو بن سکتا ہے
اور میں چکرویو سے خوف زدہ رہتی ہوں۔
کہ اسے میں نے ابھی توڑنا نہیں سیکھا
اس لئے مجھے آنا ہے
اگلی ملاقات کے بارے میں
مایوسانہ سوچیں رکھنے سے پہلے
اتنا ضرور جان لینا کہ
تمہاری مرضی کے بنا
میرا کوئی چکر، کوئی گردش
کیسے شروع ہوگی
اور ختم ہونا کیوں کر ممکن ہوگا ؟
اتنا سوچ لینا کہ
میں گھڑی کی ایک سوئی ہوں
تم ہو آخری عدد
تم ہی خاتم العدد
ہم ایک دوسرے سے
ہر آغاز و اختتام پر ملنے کے لئے بندھے ہوئے ہیں۔

۳۱/۱۳۸ عبدالعزیز روڈ، چوک۔ لکھنؤ۔ ۳

ثمینہ راجہ

صرف اندھیروں کو ڈراتے رہنا
اک دیا سا ہی جلاتے رہنا

شاید اک خواب کا دروازہ کھلے
نیند کی آس لگاتے رہنا

دل کی مد میں کوئی راحت تو نہیں
آسرا پھر بھی دلاتے رہنا

سامنے دھوپ کا آئینہ ہے
برف پلکوں سے ہٹاتے رہنا

کینۂ شعر ہے اب تک خالی
خوں اسی طرح جلاتے رہنا

● ۳/۲۴-۱۱۱- رمنا ۲/۱۰، اسلام آباد (پاکستان)

شہناز نبی

خد و خال اپنی نگاہوں کو برے لگتے ہوئے
آئینے سے اب گزرتی ہے مری لڑتے ہوئے

وہ تو مجھ کو میرے ہونے کی خبر دیتا رہا
کس نے خوش ہو رہی ہوں میں اسے کھوتے ہوئے

اب اسے زندہ دلی یا بے حسی کہہ لیجئے
زندگی کو جھیل جانا تھا یوں ہی ہنستے ہوئے

اس طرف نوکِ قلم کی بے بسی تھی دیدنی
اور ادھر ہم نقشِ حیرت آپ میں بنتے ہوئے

کچھ کثافت سی فضا میں کچھ دلوں میں ہے غبار
سانس لینے کی تڑپ رفتوں میں ہے مرتے ہوئے

ہم بھی کوئی میر ہیں دیوانے لگ جائیں گے
بزم سے اس کی اٹھیں گے دل میں گھر کرتے ہوئے

● ۲۸-۱ اے، رچن لین، کلکتہ - ۱۶

پنہاں

حیرتوں کی تو انتہا ہے ابھی
عشق ہے اور نیا نیا ہے ابھی

سر پہ آنچل نہ آنکھ میں کاجل
چاند کیوں مجھ کو دیکھتا ہے ابھی

دل پہ دستک سی دے گئی خوشبو
پھول شاید کہیں کھلا ہے ابھی

نیند آنا تو چاہتی ہے مگر
دل میں اک درد جاگتا ہے ابھی

آگ سے کھیلنے کی ضد توبہ
دل کہاں میری مانتا ہے ابھی

کتنا معصوم ہے ابھی انساں
زندگی کیا ہے؟ سوچتا ہے ابھی

کل کوئی اور ہو، مگر پنہاں
یوں غزل کون کہہ رہا ہے ابھی

● ڈی ۷/، جیلانی ڈیوا اپارٹمنٹ بلاک ایم
نور تہ ناظم آباد - کراچی

ایک خط تمہارے نام

عذرا نقوی

خواب - ۱

میں اک اڑتا بہتا بادل
سب سے اوپر
نیچے پھیلے سات سمندر، دریا، جنگل
ملک، شہر، پربت، سیمائیں
وادی میں گڑیا جیسے گھر
میرے پاؤں تلے آکاش
آنکھ کھلے تو بانہوں میں سمٹے ہوتے ہیں
کھلی ہواؤں والے خواب
نیند کی وادی میں اڑتے ہیں، پنکھ لگائے کومل خواب۔

خواب - ۲

قلعے پرانے، اونچے زینے، بھول بھلیاں، ٹوٹے برج
سن سن کرتا سناٹا
آسیب زدہ بستی کی گونج
میں ڈرتی ہوں کھو جاؤں گی
اونچائی سے گر جاؤں گی
واپس گھر کیسے جاؤں گی
مورت بن کر کسی طاق میں رہ جاؤں گی
آنکھ کھلے تو چھت سے لٹکیں سیاہ قباؤں والے خواب
کیوں میرا پیچھا کرتے ہیں اکثر کالے کالے خواب

● پوسٹ بکس نمبر ۵۱۱۷، ریاض، سعودی عربیہ

پتہ نہیں کیوں
جب بھی تمہارا خیال آتا ہے
سینے کے اندر کچھ جل اٹھتا ہے
آنکھوں کی کوروں میں کچھ کسمسانے لگتا ہے
یکایک یاد تیز ہو جاتی ہے
——— میں عورت ہوں
جیسے عورت ہونے میں
کہیں انسان والا حصہ
کسی نے نوچ ڈالا ہو

بتاؤ تو!
ایسا کیوں ہوتا ہے
کہ جب کبھی جسم پر کھرونچ لگی ہے
آنکھوں میں کوئی درد چبھا ہے
مٹھیوں میں کوئی للکار جکڑی ہے
جب بھی بھوری مٹی کو میں نے چھوا ہے
اور کسی سونی صبح کو
سہم کر ہونٹ بھینچے دیکھا ہے
مجھے تم یاد آئی ہو

تم جو ایک مہک کی تقدیر بنی

انجانے سورج پر پھیل رہی ہو
پھر بھی، لگتا ہے
وہ ایک ہی آکاش ہے
جو تم سے مجھ تک پسرا
قہقہے لگاتا ہے

یہ ایک خط ہے
اگر پڑھ سکو ———
ایک انجانے دیش کا
ایک بے نام دھرتی کا
ایک بیگانے چہرے، پرائی آواز کا
اور اپنے غم کے اندھے کنوئیں کا
درد کی شاموں کی ایک گھونٹ
چہرے پر پھیلی لکیروں کا ایک ٹکڑا
یا اپنے خاموش پڑے کینوس کا
بس ایک رنگ
اگر ہو سکے تو میرے نام لکھ دو
میں منتظر ہوں۔

● افضل منزل کیمپس، مہندرو، پٹنہ،

آشا پربھات

جنگل مری ہتھیلی پر

تم نے!
ایک ساتھ ہی اُگا دیا
میری ہتھیلیوں پر جنگل
پھول، کلیاں،
بیا کے گھونسلے۔
ساری دنیا کو پرو دیا
میرے سامنے
بنا مانگے ہی، تھال میں
توڑ دیا سارے طلسم کا گوشہ گوشہ
میں مسکرائی، مجبور
اتنا کچھ پانے کے بعد
میں روتی رہی، دکھ سے

کھیل ہی کھیل میں تم نے کیا کچھ
کیا کیا نہ دکھا دیا
نہ سکھا دیا
وہ راستے بھی
جو صدیوں سے بند تھے
اب میں چل سکتی ہوں اکیلی
بنا تھوڑے...

وہ راستے
جو میرے قدموں میں نہیں۔

● کوٹر بازار وارڈ نمبر ۱۴ سیتامڑھی
(بہار)

نعیمہ ضیاء الدین

یہ ترا کرم کہ سراب ہے مرے آئینہ خیال کا
بنا اس فریب گزر نہیں شب و روز کا مہ و سال کا

رہِ عشق تیرے جمال کو کیا نذر ہم نے تھا خونِ دل
نہ شجر کہیں ملا دید کا نہ ہے سنگ میل وصال کا

تن حرفِ دار پہ کھینچ کے جسے نوکِ خامہ ہے سرخرو
وہی حرفِ درد کا تھا ثمر زرِ اقتباسِ مآل کا

تجھے کھو کے یہ رہِ زندگی کئی پیچ و خم سے گزر گئی
نہ خوشی میں پر وہ خوشی رہی نہ ہے غم کسی بھی ملال کا

ترے خط کے ہم رہے منتظر جو ہمیں کبھی نہ لکھا گیا
کبھی ہنس دیئے کبھی رو دیئے یوں ہی پڑھ کے نامہ خیال کا

ہمیں وقت سے ہے گلا کہاں کہ شکست دی دلِ زار نے
تھا فریب خوردہ یہ خوش گماں کسی آرزو کے وصال کا

AM-KALBSKOPF-1, 63263-NEU-ISENBURG, GERMANY.

◆

عظمیٰ سحر عارف

نہ اپنے گھر میں، نہ اس کے نگر میں رہنا تھا
ہمیں نصیب ہی شاید سفر میں رہنا تھا

کچھ ایسے لوگ تھے جن کو نہ بھول پائے کبھی
کچھ ایسے خواب کہ جن کو نظر میں رہنا تھا

قدم قدم پہ اٹھائیں ہزار دیواریں
خیال دیر سے آیا کہ گھر میں رہنا تھا

ہمیں یہ ضد کہ اسے مرکز سفر کرتے
سراب بن کے جسے رہ گزر میں رہنا تھا

سحرؔ یہ کیا کہ صدا بارشوں کی خواہش تھی
تمام عمر ہی جب کہ شہر میں رہنا تھا

1561 HARVEY RD. APT 450
COLLEGE STATION, TX 77840

پروین راجہ

اس شب بہت تکان تھی اونچے درخت کو
بانٹے تھے آسماں نے بھی کانٹے درخت کو

ممکن نہیں ہے آج پھر گلچیں سے ہو فرار
ظاہر سی بات ہے کہیں کیسے درخت کو

پھولوں کی اک قبا تھی اڑا لے گئی گھٹا
خوشبو میں اک کمال تھا اپنے درخت کو

پاگل بنا گئی مجھے سیلِ بلا.... مگر
دیکھا حصارِ سنگ پہ گونگے درخت کو

اڑتے نہیں ہیں اب کبھی بیہوش ڈال میں ہم
کہتے تھے سوگوار پرندے درخت کو

پھولوں کو رخصتِ زر ملا کلیوں کو نکہتیں
لیکن زرد اوڑھنی ملی سوکھے درخت کو

بٹ مالو، باراں چیمبر۔ سری نگر۔ (کشمیر)

اسنیٰ بدر زبیری

یاد کر یا اسے بھلا ہی دے
بے حسی آ مری گواہی دے

خواب دینا تو تیرے بس میں نہیں
میرے جذبات کو سلا ہی دے

آئینہ شکل دے نئی کوئی
یا مری حس کو کم نگاہی دے

میں بھی پندار کے قلعے توڑ دوں
اب تو اذنِ وفا سنا ہی دے

ہاتھ شل ہو گئے ہیں دستک سے
بند دروازے راستا ہی دے

عکس اپنا نظر نہیں آتا
میری تصویر کو جلا ہی دے

اماں شہید رڑکی، ہمیر پور (یوپی)

کنیز فاطمہ

دائروں سے غبارِ خواب اٹھا
حوصلہ رکھ، کلیدِ باب اٹھا

آئینہ بٹ چکا ہے کرچوں میں
جی میں آئے تو اب حجاب اٹھا

ایک لمحہ تھا آبگینہ سا!
آنکھ ملتا ہوا وہ خواب اٹھا

کتنی صدیوں کا کرب جینا ہے
موت سے پہلے اک عذاب اٹھا

نرم موسم کی کچھ تو آہٹ سن
دیکھ کہسار سے سحاب اٹھا

کتنی سادہ ہے منظروں کی زباں
من و تو کے سبھی حجاب اٹھا

چل! کہ گزری مسافتیں ناپیں
خون روتا ہوا جواب اٹھا

معرفت بشیر نواز محلہ گھاٹی، اورنگ آباد (مہاراشٹر)

دھنک رنگ

خوشی گیلانی

وہ بات بات میں اتنا بدلتا جاتا ہے
کہ جس طرح کوئی وعدہ بدلتا جاتا ہے
جو تیز دھوپ میں سر پر ربا دی آنچل
ہوا چلی ہے تو کتنا بدلتا جاتا ہے
وہ بات کر جسے دنیا بھی معتبر سمجھے
تجھے خبر ہے زمانہ بدلتا جاتا ہے
وہ قحط حرف و صدا تھا ہے اس کے آنے سے
سخن کے شہر کا نقشہ بدلتا جاتا ہے
رتیں وصال کی اب خواب ہونے والی ہیں
کہ اس کی بات کا لہجہ بدلتا جاتا ہے
یہ آرزو تھی کہ ہم اس کے ساتھ ساتھ چلیں
مگر وہ شخص تو رستہ بدلتا جاتا ہے

بہاول پور ۔ پاکستان

یاسمین گل

کبھی بے بال و پر اور بے صدا ہونا نہیں چاہا
تجھے چاہا، مگر تجھ میں فنا ہونا نہیں چاہا
قفس میں لاکھ آسائش ہو اور آسودگی لیکن
پرندوں نے کبھی بھی پر کشا ہونا نہیں چاہا
خدا نے خود فرشتوں سے مجھے سجدہ کرایا تھا
اسی نشے میں اکثر بے خطا ہونا نہیں چاہا
تمہیں نے عام چاہت کو پرستش کر دیا ورنہ
خدا شاہد ہے، میں نے تو خدا ہونا نہیں چاہا
پنیری پیڑ ہو جائے تو پھر مٹی نہیں چھپتی
ترے پہلو میں آ کر جا بجا ہونا نہیں چاہا
سماعت ہی کے رستے میں خدا سا تھا کوئی ورنہ
مرے لہجے نے حرف نارسا ہونا نہیں چاہا
نہ دو الزام یہ طینت بھی ہے، فطرت بھی، ہستی بھی
ہے ایسا کون جس نے خود نما ہونا نہیں چاہا

لاہور ۔ پاکستان

اسماء رفعت

ترے لہجے نے جب جی چھو لیا تھا
مرا اندر اکیلا کب رہا تھا
دلوں کو برف میں محفوظ کر لیں
جدا ہونے سے اس نے کہا تھا
کنارے پر کھڑی میں دم بخود تھی
سمندر تیرا چہرہ بن گیا تھا
اکیلی شام ہے، تم ساتھ دے دو
وہ جاتے سورجوں سے کہہ رہا تھا
میں اس جگنو سے خائف ہوں ابھی تک
جو میری روح کو گہنا گیا تھا
گلابوں کے دریچے سے اتر کر
مرا یہ خواب پھر کمہلا گیا تھا

حیدرآباد، پاکستان

یاسمین حمید

ترا عکس ندامت چاہتا ہے
دل آئینہ ہے، حیرت چاہتا ہے
برسنے دو وہیں پر بادلوں کو
سمندر اور وسعت چاہتا ہے
اندھیری رات ہے ماہ تمنا
چمکنے کی اجازت چاہتا ہے
مرے اعصاب کو اک بوجھ دے کر
ترا احسان قیمت چاہتا ہے
مرے اندر کوئی مجھ سے سوا بھی
ترے غم کی حفاظت چاہتا ہے
سماعت کے دریچے کھل نہ جائیں
بیاں شور قیامت چاہتا ہے

فوزیہ رعنا

جو صدا ابھر رہی ہے، یہ ابھی غنائیہ ہے
کوئی سوز انتہا بھی، مگر اس کا داعیہ ہے
کسی دوسری نظر سے کبھی اپنا آپ دیکھو
کہ تمہارے آئنے میں فقط ایک زاویہ ہے
وہ دکھوں پہ مسکرانا، یہ نگہ کا جگمگانا
مرے دل کے غم کدے میں کوئی شاید
کسی خواب کی نمو ہے، کسی خواب کا بکھرنا
یہی انتہائے ہستی، یہی ابتدائیہ ہے
رگ و پے میں بس چکی ہے، یہی بندگی کی صورت
مری ہر خوشی تشکر، مرا غم دعائیہ ہے
غرض و مفاد کیلئے، فقط ایک کھوکھلا پن
کہ فضائے زندگی میں یہ سزائے جاریہ ہے
مرا نقطہ نظر بھی ہے کشاکشوں سے برہم
ہے کبھی سدا قنوطی تو کبھی رجائیہ ہے

کراچی، پاکستان

منصورہ احمد

یہ میرا بھولا مورکھ دل اک ساتھ ہی چاہے دو باتیں
اک ساتھ ہی چاہے کچے گھر، اور جل تھل کرتی برساتیں
رگ رگ سے بولوں نام ترا اور ہونٹوں سے انکار کروں
جیتی بازی کے قصے میں کھو بیٹھوں دردکی سوغاتیں
جب آنگن میں چاند اترے تو کس چاؤ سے سنگھار کروں
پھر کورے ہاتھوں میں بھر لوں اک لمبے ہجر کی سوغاتیں
میں اپنی ہر ہر دھڑکن میں، اس کی آہٹ کا گیت سنوں
کیوں آہن گر کی بستی میں ڈھونڈوں خوشبو کی بارآتیں
سورج جیسے معیار چنوں، پھر ان کی آگ میں جل جاؤں
کرنوں کو پرو دوں سانسوں سے، جل تو اٹھیں کالی راتیں

مکان نمبر ۱۳۰۱، گلی نمبر ۹۸، آئی ۱/۱۰، اسلام آباد

رسالہ فنون، ۴۵۔ الف، مزنگ روڈ، لاہور

عفت زریں

ہمارے گھر میں دروازہ نہیں ہے
ہمیں چاہت کا اندازہ نہیں ہے
خیال و خواب میں باتیں کریں گے
تسلی ہے کوئی وعدہ نہیں ہے
نہیں لمحوں میں باقی اب وہ خوشبو
کہ تیری یاد اب تازہ نہیں ہے
انگوٹھی دے وہ کیوں اپنی نشانی
کہ قصوں کا وہ شہزادہ نہیں ہے
نہیں دیکھا اسے صدیوں سے زریں
یہ خوابوں کا تو خمیازہ نہیں ہے

۵۴۳ گلی حکیم جی چوڑی والان۔ دہلی نمبر ۶

شاہدہ نسیم ملک

یاد آئی ہے کوئی بات بہت
ہم پہ بھاری ہے آج رات بہت
لوگ لکھتے ہیں دل کی تختی پر
ایک ہی جیسے واقعات بہت
کوئی بستی میں اب نہیں باقی
کر چکے لوگ واردات بہت
رت بدلنے کا پھر سے ہے امکاں
آج چپ چپ ہے کائنات بہت
رو بہ رو ان کے کچھ نہیں پائی
دل کو ان سے ہے التفات بہت
راہ الفت کی پر خطر ہے نسیم
اس میں ہوتے ہیں حادثات بہت

8904 SAXTON DRIVE
WESTCHESTER, OHIO 45069

ملکہ نسیم

یہ شب ہے اور وہ خواب گراں ہے
ابھی بس میں ہوں یا در فغاں ہے
صدائیں بام و در دیتے ہیں تم کو
بچھڑ جانے کا موسم جاوداں ہے
تھکن میری رگوں میں جم چکی ہے
رواں ان کے لبوں پر داستاں ہے
مخاطب تھا وہ مجھ سے اور میں بھی
لہو کی آگ ہے اور صحن جاں ہے
کھلے ہیں جب سے خوابوں کے دریچے
بس اک خوشبو ہے اور میرا مکاں ہے
زمیں کا ذرہ ذرہ مٹ رہا ہے
فلک پر اک خدا ئے مہرباں ہے

پوسٹ بکس نمبر ۳۴۴۔ جی پی او، جے پور

صغریٰ عالم

ستائش ہی ستائش ہے ستائش ہی ستائش ہے
ہمارے نام میں شامل جہاں تھوڑی سفارش ہے
حنائی دست نے لکھا محبت کا بیاں لیکن
عروس شہر کے ہاتھوں لہو کی ہی نگارش ہے
ہماری قتل گاہوں کا ذرا جغرافیہ لکھ دیں
ہمارے عہد کی تاریخ سے اتنی گزارش ہے
زمیں پر آگ ہے اک بانسہ ہے اونچی اڑانوں میں
مری پرواز میں صیاد کی اتنی ہی سازش ہے
دریچہ ہے نہ دروازہ نہ ہی فرش و سقف صغریٰ
یقیں ہے مجھ کو اس گھر میں فرشتوں کی رہائش ہے

عالم بلڈنگ، شاہ بازار، گلبرگہ

زہرہ نگاہ

خوش جو آئے تھے، پشیمان گئے
اے تغافل! تجھے پہچان گئے
خوب ہے صاحب محفل کی ادا
کوئی بولا تو برا مان گئے
کوئی دھڑکن ہے نہ آنسو نہ امنگ
وقت کے ساتھ یہ طوفان گئے
اس کو سمجھے کہ نہ سمجھے لیکن
گردش دہر، تجھے جان گئے
تیری اک ایک ادا پہچانی
اپنی اک ایک خطا جان گئے
اس جگہ عقل نے دھوکا کھایا
جس جگہ دل ترے فرمان گئے

FLAT NO. 6 : WELLINGTON COURT
KNIGHTSBRIDGE LONDON SW

شگفتہ طلعت سیما

سات سمندر میرے خلاف
ہر اک منظر میرے خلاف
اندر اندر خوش بھی
باہر باہر میرے خلاف
شب، تنہائی، سونا پن
خواب و بستر میرے خلاف
ناقدروں کی بستی ہے
کانچ اور کنکر میرے خلاف
سچی بات کا ایک اثر
عالم اکثر میرے خلاف
دامن میرا چاک بہت
اور رفوگر میرے خلاف
سیما میرے ظاہر سے
میرا اندر میرے خلاف

۵/۹۹۔ مہتا اسٹریٹ، شبلی باغ، بنگلور

سیدہ حنا
الف ۔ ۲۹ بی ۔ اے ایس سی کالونی، نوشہرہ (پاکستان)

برف

وہ بخار میں تپ رہی تھی اور آنسو اس کے رخساروں پر بہہ رہے تھے۔ اس دن وہ سارا دن پیدل چلتی رہی تھی۔ اتنا اتنا کہ آخر اسے بخار سے آیا تھا۔

آخر۔ تم اپنا خیال کیوں نہیں کرتیں۔ میں نے اس کے تمتماتے ہوئے چہرے سے بالوں کی لٹیں ہٹائیں۔ اور وہ زندگی میں پہلی بار جیسے پھٹ پڑی اور ہذیانی کیفیت میں بولتی چلی گئی۔

میں کیا کروں۔ بتاؤ! میں کیا کروں۔ وہ ہر روز مجھے نیلام کرتے ہیں۔ ہر روز گاہک آتے ہیں۔ ہر دفعہ میری بولی لگتی ہے۔ مجھ میں اور طوائف میں کیا فرق ہے؟ بتاؤ۔ بولو۔!

تم جرأت کے ساتھ کام لے کر اپنی زندگی کا فیصلہ خود کیوں نہیں کرتیں۔

نہیں کر سکتی۔ نہیں کر سکتی۔

اس نے تیز سانسوں کے درمیان کہا۔ ایک دن بھائی نے ایک رشتے کے لئے یوں ہی اپنی طرف سے کہہ دیا تھا کہ یہاں تو زینی کی بھی مرضی ہے۔ تو ابا نے چیخ چیخ کر گھر سر پر اٹھا لیا تھا کہ میری بیٹی تو ایسی نہیں ہو سکتی۔ یہ جھوٹ ہے۔ تہمت ہے۔ الزام ہے۔ اور۔ اور۔ اگر یہ سچ ہوا تو میں اپنی جان مار لوں گا۔ میں تم سب کے سامنے دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر مر جاؤں گا۔ میں دریا میں کود جاؤں گا۔ میں زہر کھا لوں گا۔ مگر یہ سننے کے لئے زندہ نہیں رہوں گا کہ میری بچی ایسی ہے۔

"مگر یہ کوئی ایسی بری بات تو نہیں۔ شادی میں لڑکی کی رضامندی بہر حال شامل ہوتی ہے"

اب ابا کو۔ کون سمجھائے۔؟

مگر وہ ہر رشتے کو لوٹا کیوں دیتے ہیں۔؟

لوگ خود ہی ان کی شرائط سے ڈر کر بھاگ جاتے ہیں۔

اور شرائط کیا ہیں۔ ان کی۔؟

عرصے کی کمی ہے نا۔ اور میں ملازمت کرتی ہوں۔

اس نے نڈھال ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔

مگر تم تو اتنی پیاری ہو۔ تمہارے لئے تو ہر شرط قبول کی جا سکتی ہے۔

یہ کہتے ہوئے موقع دیکھ کر میں نے تاری کی بات چھیڑ دی۔ تاری میرا کزن، بہت مدت سے زینی کے خواب دیکھ رہا تھا۔ جب سے اس نے اسے ایک محفل میں دیکھا تھا۔ مجھ سے کئی بار کہہ چکا تھا۔

میں نے کہا۔ تاری کیسا ہے زینی۔؟

کیوں۔؟ اس نے کھوئے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

بس ایسے ہی پوچھ رہی ہوں۔ اگر وہ تمہارے ابا کی شرائط پوری کر دے۔ تو پھر تمہارے ابا انکار نہیں کریں گے۔؟

ان کی دو ہی شرطیں ہیں۔ ایک لاکھ روپیہ مہر۔ اور میری تنخواہ!

مگر مہر تو تمہارا ہوگا۔

نہیں وہ ابا لیں گے۔

اور تنخواہ۔؟

ہاں۔ وہ چاہتے ہیں کہ شادی کے بعد بھی میری تنخواہ انہیں ملتی رہے۔

اوہ۔ کچھ دیر میں نے سوچ کر کہا۔ میرا خیال ہے تاری یہ دونوں شرطیں مان لے گا۔ اور سچ مچ تاری نے دونوں شرطیں قبول کر لیں۔ وہ بہت خوش تھا۔ بار بار میرے گلے سے لپٹ جاتا۔ واہ باجی کمال کر دیا آپ نے۔ بھئی باجی ہو تو ایسی ہو۔ تو پھر کب ملوا رہی ہیں آپ مجھے زینی سے۔؟

مگر وہ زینی سے جتنا زیادہ ملا۔ اتنا ہی زیادہ چپ ہوتا گیا۔

کیا بات ہے۔؟ زینی پسند نہیں آئی!

ایک دفعہ میں نے پوچھ ہی لیا۔

نہیں پسند تو ہے۔ وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

ایک دن میں نے کہا۔
پھر سودا کروں اس کے باپ سے ۔؟
نہیں ابھی ذرا ٹھہر جائیے ۔!
وہ پھر کچھ کہتے کہتے رک گیا ۔
کیا بات ہے۔ کیا کہنا چاہتے ہو۔ کیوں رک جاتے ہو ۔؟
مگر اس نے مجھے پھر ٹال دیا ۔

ادھر زینی بہت خوش تھی ۔ وہ میری بہت احسان مند نظر آتی تھی گو اس نے کبھی منہ سے کچھ نہیں کہا۔ وہ ہمیشہ کی طرح چپ رہتی تھی مگر میں جانتی تھی کہ وہ کتنی خوش ہے ۔؟ میں جلد از جلد اسے گھر لانا چاہتی تھی۔ میں اس کے سوداگر باپ سے سودا کرنا چاہتی تھی۔ وہ کتنا حیران ہوگا۔ جب نوجوان نسل کو دولت سے اتنا بے نیاز دیکھے گا۔ اب اسے پتہ چلے گا کہ محبت کیسے کیسے رنگ دکھاتی ہے۔ جب میں کہوں گی کہ تاری کو زینی کے سوا کچھ نہیں چاہیئے۔ تو وہ کیسا کیسا حیران ہوگا۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آئے گا۔ اور ہم۔ میں اور تارہ زینی کو اس لالچی دیو کی قید سے چھڑا لائیں گے۔ اور پھر محبت کی فتح کا جشن منائیں گے۔ مگر جب بھی میں وہاں جانے کا ارادہ کرتی تاری مجھے روک دیتا

تھوڑا سا اور ٹھہر جائیے۔ مجھے تھوڑا سا موقع دیجئے۔

اس طرح کرتے کرتے تاری کا ویزا آگیا۔ اور وہ زینی سے ملے بغیر ابوظہبی چلا گیا اور میں زینی سے ملنے سے کتراتی رہی۔ میں نے اسے کیسے کیسے خواب دکھائے تھے۔ مستقبل کے خاکے میں کیسے کیسے روشن اور چمکیلے رنگ بھرے تھے۔ اور پھر تاری اس سے ملے بغیر چلا گیا۔ وہ دو دفعہ میرے پاس آئی۔ پرامید نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ میں اسے کیا کہتی اب تو تاری ابوظہبی میں تھا۔ اور جاتے وقت اس نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ جب تک میں ابوظہبی سے نہ آؤں۔ آپ رشتے کی بات نہ چلائیے گا۔ میں حیران تھی۔ کہاں تو وہ بے تابی اور کہاں یہ بے اعتنائی۔ مگر بہرحال یہ اس کا ذاتی معاملہ تھا۔ زینی نے مجھ سے کوئی گلہ نہیں کیا کہ وہ اس سے ملے بغیر کیوں چلا گیا؟ اس نے یہ گلہ بھی نہیں کیا کہ وہ اسے خط کیوں نہیں لکھتا۔ اس کی چپ مجھے شرمندہ کر رہی تھی۔ مگر میں اسے کیا کہتی۔ تاری کو ڈانٹ ڈانٹ کر خط لکھتی مگر وہ بھی سعادت مندی سے ہر خط کا جواب دیتا رہا مگر زینی کی بات صاف اڑا جاتا۔ اور اس دن تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب مجھے تاری کی شادی کا دعوت نامہ ملا۔ وہ کراچی میں شادی کر رہا تھا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں آ رہا تھا۔ تارہ نے ایسا کیوں کیا۔ غصے کے مارے میں نے اس کی شادی میں بھی شرکت نہیں کی۔ کچھ دنوں بعد وہ خود ہی دلہن کو لے کر چلا آیا۔ دلہن معمولی سی شکل و صورت کی شوخ و شنگ لڑکی تھی پارے کی طرح بے چین۔ ادھر سے ادھر۔ یہاں سے وہاں۔ مجھے اس کی یہ تیزی اور طراری ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ مگر مجبوری تھی۔ وہ میرے مہمان تھے۔ اور اب کچھ کہنا بیکار بھی تھا۔ کیونکہ ایک ادھیڑ عمر کے بہت بڑے افسر۔ نے جس کی پہلی بیوی مر چکی تھی اور اولاد کوئی نہ تھی۔ زینی کے باپ کے نام تین پلاٹ الاٹ کرا دیئے تھے۔ اور زینی کو بیاہ کر لے گیا تھا۔ اب زینی کے بہت ٹھاٹ باٹ تھے۔ ایک باوردی ڈرائیور اسے کالج پہنچانے اور لینے آتا تھا۔ گھر میں دولت کی ریل پیل تھی۔ نوکر چاکر۔ گھر بار۔ میں نے سنا تو جیسے میرے دل سے ایک بہت بڑا بوجھ اتر گیا۔ اور جب۔ میں کالج کی لڑکیوں کو Debate کے لیے زینی کے کالج لے گئی تو میں نے زینی کو خوب بھینچ بھینچ کر گلے لگایا۔ بہت بہت مبارکباد دی۔ میں نے کہا۔

زینی! خدا کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے۔ ہم شاید کیا یقیناً تمہیں یہ سب کچھ نہیں دے سکتے تھے خدا کا شکر ہے اس نے تمہیں دنیا کا ہر سکھ دے دیا۔ میں بہت خوش ہوں ۔

پھر میں نے کہا۔ تاری آیا ہوا ہے۔ میں پارٹی دے رہی ہوں تم بھی اپنے میاں کے ساتھ آنا۔ تمہاری شادی کا تحفہ بھی تو قرض ہے مجھ پر۔ اچھا۔ ضرور آنا۔ میں اپنی رو میں کہے گئی۔ بلکہ میں خود آ کر تم دونوں کو لے جاؤں گی۔

میرے ہاتھوں میں پکڑا ہوا اس کا ہاتھ سرد پڑتا جا رہا تھا۔ میرے آخری جملے پر وہ ہسٹریائی انداز میں چیخ اٹھی ۔

نہیں نہیں۔ خدا کے لئے ایسا نہ کرنا ۔

وہ تاری کو بھولی نہیں تھی۔ یہ جان کر میرے دل پر جیسے دگنا بوجھ بڑھ گیا۔ گھر آ کر میں تارہ پر برس پڑی۔

تم نے مجھے کتنا شرمندہ کیا ہے۔ اگر تمہیں زینی سے شادی نہیں کرنی تھی تو مجھے بیچ میں کیوں ڈالا۔ میں کچھ کہتی ہوں۔ تمہیں زینی نہیں اس کی تنخواہ چاہیئے تھی تم بھی اس کے باپ کی طرح لالچی ہو۔ مگر میں پوچھتی ہوں تم نے اس سے دھوکہ کیوں کیا۔ اسے شادی کی آس کیوں بندھائی۔ اور یہ۔ جس لڑکی سے تم نے شادی کی ہے۔ اس میں کیا خوبی ہے۔ نہ سیرت نہ صورت۔ زینی تو اس سے لاکھ درجے بہتر تھی سلجھی ہوئی۔ سیدھی سمجھدار والی۔ بے چاری لڑکی۔ وہ اب بھی تم سے محبت کرتی ہے۔ تاری! پتہ ہے تمہیں۔؟ تاری دوسرے ہی دن کراچی چلا گیا۔ جاتے وقت وہ میری ملازمہ کو ایک لفافہ میرے نام دے گیا۔ لکھا تھا۔

"باجی! میں مجبور تھا۔ زینی کی قربت مجھے برف میں دفن کر دیتی تھی" ❋

معین قیصر
بنگلو نمبر ۳۴ سی، سیکٹر اے ۔ ۲۸۰، اسکیم نمبر ۳۳، یونیورسٹی روڈ کراچی

سیندور

میں نے ہریش سنگھ کو اس روز پہلی بار ریلوے اسٹیشن پر دیکھا تھا۔ دبلا پتلا کلین شیو، سفید پینٹ پہن رکھی تھی اور دھاری دار شرٹ پہنے ہوئے تھا۔ سر کے بال انگریزی طرز سے کٹے ہوئے تھے۔ وہ اپنے دوست رمیش کمار کے ساتھ دونوں ہاتھ جوڑے میرے سامنے کھڑا تھا۔

"تارا! یہ دونوں یہاں اسٹیشن ماسٹر ہیں اور اب یہ میرے دوست بھی ہیں۔" میں مسکرا دی۔ مجھے جاوید کی جلد بازی پر ہنسی آ رہی تھی۔ دوست بنانے میں ان کا جواب نہیں۔

"نمستے بھابی جی" رمیش نے مخاطب کرتے ہوئے کہا لیکن ہریش یونہی مسکراتا رہا۔

"تارا! گاڑی تو نکل چکی اب تو صبح ہی گاڑی ملے گی۔" جاوید نے ہنستے ہوئے کہا

اوہ! تو اس پلیٹ فارم پر رات گزارنی پڑے گی۔ میں پریشان ہو گئی

"تارا جی! ہمارے ہوتے ہوئے آپ کو تکلیف نہیں ہو گی۔" ہریش نے کہا تو میں چونکی "تارا جی" میں بڑبڑائی۔

"بھابی جی! یہ ہمارا لوکیشن ہے"

رمیش نے کہا تو جانے کیوں مجھے اس جملے میں محبت کے گہرے نشتر چبھے ہوئے لگے۔

"تارا جی! آپ تو ہمیں اپنی لگتی ہیں اور یہ دیش تو ہم سب کا ہے اور یہ زمین ہم سب کی ہے"

اس نے جھک کر مٹھی زمین کو دیتے ہوئے کہا: "زمین کی گود سب کے لیے ہے جس کا نہ کوئی دین ہے نہ دھرم نہ ذات نہ پات!" ہریش جانے کیسے لگا۔

جاوید اور رمیش نے سامان اٹھایا اور ویٹنگ روم کی طرف بڑھ گئے۔ میں بچوں کی انگلی تھامے پیچھے پیچھے چلتی رہی مگر جانے کیوں میرے ذہن میں ہریش کا چہرہ اور اس کی باتیں گھوم رہی ہیں۔ وہ مجھے پہلے ملے میں ہی عجیب عشق خیز دکھائی دیا تھا۔ کچھ ایسے ہوتے ہیں جن کی شخصیت کا تعین کرنا بڑا مشکل ہے۔

گاڑی جب امرتسر ریلوے اسٹیشن پر رکی تھی تو سکھوں کا ایک گروہ اترا تھا۔ چہرے چہرے سرخ و سفید رنگتوں پر سیاہ داڑھیاں اور رنگین پگڑیاں دیکھ کر مجھے اپنا پھولوں کا وہ گملا یاد آ گیا تھا جسے میں نے بڑی محنت سے لگایا تھا۔ مختلف قسم کے پھول اس کے پودوں پر اگے، ساتھ کھلنے والے پھول بالکل ایسے ہی خوبصورت نظر آتا تھا۔

اگر اس کا نام ہریش سنگھ نہ ہوتا تو وہ سکھ تو کیا ہندو بھی نہ سمجھا جاتا۔

موسم بہت خوشگوار اور پرکشش تھا۔ اور اس [illegible] کی پیشن گوئی ہوئی تھی۔ میں بچوں کو لے کر [illegible] میں سے ایک سیٹ پر بیٹھ گئی تھی۔ آدھا گھنٹہ گزر چکا تھا مگر جاوید کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ بچے بے چین ہو گئے تھے۔ "ماما بھوک لگی ہے۔" "آؤ دیکھتے ہیں تمہارے پاپا کہاں ہیں۔" میں بچوں کی انگلی تھامے پلیٹ فارم پر نکل آئی تھی۔ ہر طرف روشنی ہر طرف بکھری ہوئی تھی اور خوانچہ فروش زور زور سے چلا کر اپنا سامان بیچ رہے تھے۔ کچھ زمین پر بیٹھے تھے اور کچھ گلے میں لٹکائے ادھر ادھر چکر لگا رہے تھے۔ ایک کونے میں دیوار سے لگا ایک کیبن رکھا تھا۔ اس پر پوریاں تلی جا رہی تھیں۔ اس کے اوپر ایک آدمی اتنی تیزی سے کام نمٹا رہا تھا لگتا تھا وہ انسان نہ ہو کر کوئی مشین ہو۔ دوکان کے سامنے لوگوں کی ایک لمبی قطار تھی۔ وہ کڑھاؤ سے گرم پوریاں نکال کر کاغذ پر رکھتا اور قریب رکھے بادام کے پتوں سے ایک پتہ اٹھا کر چمچ سے پیالی بناتا اور آلو کی ترکاری اس پتے کی پیالی میں ڈال کر پوری کے ساتھ گاہک کو پکڑا دیتا۔

"تارا تم بور تو نہیں ہوئیں!" جاوید کے پوچھنے پر میں نے مڑ کر اسے غصے سے گھورا مگر میرے کچھ کہنے سے پہلے بچوں کو رمیش نے گود میں اٹھا لیا۔ "تم لوگ پوریاں کھاؤ گے نا" وہ بچوں کو لے دکان

کی طرف چلا گیا۔ ہریش پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالے مسکراتا رہا۔ میں ویٹنگ روم میں آگئی۔ اب یہ وقت بھی آگیا کہ کھانا چھوٹوں میں کھانا پڑے گا۔ میں دل ہی دل میں جلتی بھنتی رہی۔

"بیگم صاحب! یہ آپ کے لئے ہے۔" ایک گندا سا لڑکا صاف ستھرے جس میں دھلی ہوئی پلیٹ میں ترکاری اور پوریاں تھیں رکھ کر چلا گیا۔ میں آہستہ آہستہ نوالے حلق سے اتارنے لگی۔

"تارا جی! آپ کو بہت تکلیف ہوئی آپ کو یہ سب عجیب لگ رہا ہوگا۔"

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔" میں خجل سی ہو رہی تھی، "آپ لوگ واقعی محبت کے لوگ ہیں۔"

"تارا جی: بس ایک رات کی بات ہے پھر آپ کہاں اور ہم کہاں" اس کی آواز میں بلا کی اداسی گھلی ہوئی تھی۔ میں گلاس نکالنے کے بہانے سے وہاں سے کھسک گئی۔

اب کمرے میں کچھ سکھوں کے خاندان آگئے تھے۔ اور سیٹوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ بچوں کو میرے پاس چھوڑ کر جاوید ٹکٹ لینے جا چکے تھے ایک سیٹ پر بچوں کو سلا کر میں ان آنے والوں کو بغور دیکھ رہی تھی۔ تمام مردوں کے چہروں پر لمبی لمبی داڑھیاں اور سر پر رنگین پگڑیاں بندھی ہوئی تھیں۔ مجھے تعجب تھا تو ان کی داڑھیوں پر کسی کی داڑھی کا ایک بال بھی بے ترتیب نہیں تھا۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ یہ سوال میرے ذہن میں کھنکھجورے کی طرح چپٹ گیا تھا۔ میرے سامنے والی سیٹ پر ایک سکھ خراٹے لے رہا تھا۔ میں بچوں کے پاس تھوڑی سی جگہ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ تب ہی جاوید کے ساتھ وہ دونوں بھی آگئے۔ "ارے بھابی جی! آپ یہاں بیٹھی ہیں۔؟" رمیش نے ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں مگر اس سے پہلے ہریش سنگھ نے ایک سکھ سے سامنے والی سیٹ خالی کروالی تھی۔ "تارا جی! آپ اس پر سو جائیں۔" میں دل ہی دل میں ان لوگوں کی مہمان نوازی کو سراہتی ہوئی لیٹ گئی۔

جب میری آنکھ کھلی تو صبح کے سات بج رہے تھے۔ میں نے نیند سے بوجھل آنکھوں سے اطراف کا جائزہ لیا اور پھر ایک دم ہی اپنی آنکھوں کو نیم وا کر کے سامنے کا منظر دیکھنے لگی۔ میرے سامنے ایک سادھو بیٹھا تھا جس کی بکھری ہوئی اور لمبی داڑھی سینے تک پھیلی ہوئی تھی اور سر کے بال کندھوں تک لہرا رہے تھے۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میرے دماغ میں چھپا ہوا کھنکھجورا نکلتا جا رہا ہے۔ اس نے تمام بالوں کو سنوار کر سر کے بیچ جوڑے کی شکل میں باندھ لیا پھر کالی ڈوری سے داڑھی کی نوک پر باندھ کر اسے گول کرتا گیا۔ پھر سر کے بیچ بنائے گئے جوڑے میں لپیٹ لیا۔ اور سر پر پگڑی پہن لی۔ میرے دماغ میں چھپا ہوا کھنکھجورا خود بخود نکل گیا۔ میں نے گھڑی دیکھی آٹھ بجنے والے تھے میں نے بچوں کو اٹھایا تب ہی ناشتے کی ٹرے لئے وہ تینوں ایک ساتھ آن پہنچے۔

"آپ رات بھر جاگتے رہے ہیں؟" میں نے جاوید کی سرخ آنکھوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "تارا! تم یقین کرو۔ ان لوگوں کے ساتھ رات کا کچھ پتہ ہی نہیں چلا۔" بچوں کو تیار کرتے دیکھ کر ہریش بولا۔ "تارا جی! آپ بہت سگھڑ ہیں۔ آپ کے بچے کتنے اچھے لگتے ہیں۔۔!!" میں جاوید کو منہ چڑاتی باتھ روم میں گھس گئی۔

لکھنؤ جانے والی گاڑی پلیٹ فارم پر لگ چکی تھی۔ سامان گاڑی میں رکھوایا جا چکا تھا ہم نے ان دونوں کا شکریہ ادا کیا۔ میں نے دیکھا ہریش کے چہرے پر اداسی ابھر آئی تھی۔

"تارا جی! آپ کی واپسی کب تک ہے؟" ہریش کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔

"یہی کوئی دو ماہ بعد۔"

"بھابی جی واپسی پر آپ کو ہمارے گھر چلنا ہوگا۔" رمیش نے کہا۔

"ایک وقت کا کھانا آپ میرے ساتھ کھائیں گی تارا جی۔"

گاڑی کی پہلی وسل پر جاوید نے مجھے اور بچوں کو گاڑی میں بٹھا دیا۔ اور خود دروازے پر کھڑے ہو گئے۔ ہریش سرخ آنکھوں کے ساتھ میری کھڑکی کے سامنے کھڑا تھا۔ گاڑی آہستہ آہستہ پلیٹ فارم چھوڑنے لگی ہریش بھی گاڑی کے ساتھ ساتھ چلتا رہا پھر گاڑی نے رفتار پکڑی تو ہریش آخری سرے پر کھڑا ہاتھ ہلا کر الوداع کہتا رہا۔ راستے بھر جاوید مجھے چھیڑتے رہے۔ اور میں خجل سی بیٹھی رہی۔

اس طرف آہ زیر لب بھی نہیں
اس طرف پیچ و تاب ہیں کیا کیا

دو ماہ بعد واپسی پر وہ دونوں پھر مل گئے۔ سامان اتروانے کے بعد جاوید اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں گئے تو ساتھ ہی وہ دونوں بھی چلے آئے۔ ہریش کے چہرے پر بڑی گمبھیر مسکراہٹ تھی۔

"گاڑی کب آئے گی؟" میں نے جاوید سے پوچھا۔

"تارا جی! گاڑی آئے یا جائے، آج آپ ہماری مہمان ہیں۔"

"ہاں! بھابی جی آج آپ لوگ ہمارے ساتھ کھانا کھائیں گے۔"

اور پھر تارا مجھ سے بھی ملنے ؛ میں مسکرا دی۔

"تارا جی! آج رات کا کھانا اور پھر چائے آپ کو ہمارے گھر پینی ہوگی"

"بھابی جی! آپ ہریش کا مان رکھیں۔"

"چلو جیسے تم لوگوں کی مرضی جاوید نے فیصلہ کر دیا۔"

"رات بھر اسی ویٹنگ روم میں گذارنی پڑے گی۔ میں نے جاوید کو دیکھتے ہوئے اقرار کیا

ہم لوگ ایک سستے سے ہوٹل میں آ بیٹھے ـ کیوں کہ یہ ہوٹل اسٹیشن سے قریب تھا کھلے برآمدے میں کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ ہم سب نے ایک قدرے بڑی میز کا انتخاب کیا۔ میز پر بیٹھے ہریش کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ وہ باتیں عجلت کم کر رہا تھا۔ لگتا تھا کہ کسی گہری سوچ میں مبتلا ہے۔ "یار ہریش! اب کھانا بھی منگواؤ گے یا صرف نگاہوں سے ہی تواضع کر دو گے۔" جاوید نے قہقہہ لگایا۔ تو وہ نروس ہو گیا۔ جلدی سے اٹھ کر کھانا کہنے چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد بیرا ایک ٹرے اٹھائے آگیا۔ دو پلیٹ کالی مسور کی دال ڈیڑھ پلیٹ مکس ترکاری ایک پلیٹ انڈوں کا آملیٹ میز پر رکھ کر چلا گیا۔ ہر چیز کی ایک ایک پلیٹ اور آملیٹ ہمارے حصے میں آیا۔ میں نے کنکھیوں سے دیکھا ہریش صرف دال کھا رہا تھا۔ اور رمیش ترکاری ہمارے پاس دال ختم ہو گئی۔ تو میں نے خاموشی سے ہریش کی پلیٹ اٹھا کر تھوڑی سی دال اپنی پلیٹ میں ڈال لی۔ رمیش چلایا۔ بھابی جی یہ کیا کر دیا۔ دال اور منگا لیتیں۔ یہ دال جھوٹی تھی۔

"آپ کا دھرم!" میں نے پوچھا تو اس نے سر جھکا لیا۔ میں نے ہریش کی طرف دیکھا وہ ساکت بیٹھا میری طرف گھور رہا تھا۔ میں نے ہریش کو دیکھتے ہوئے چوٹ کی کہ میرا ایمان شیشے کا کھلونا نہیں جو ذرا سی ٹھیس سے ٹوٹ جائے اور پھر ہم سب کی ایک ماں ہے یہ دھرتی جو ہم سب کو سمیٹے ہوئے ہے۔ کیا اس کا کوئی دین دھرم اور ذات ہے؟۔ میں نے ہریش کی کہی ہوئی بات دہرا دی۔

"تارا جی پھر کب آئیں گی۔" سامان ٹرین میں رکھتے ہوئے اس نے بڑے دکھ سے پوچھا۔

"پتہ نہیں" میں نے دیکھا۔ وہ سامان رکھ کر میرے مقابل سیٹ پر بیٹھ گیا اس کا چہرہ ہلدی کی طرح پیلا ہو رہا تھا۔

"تارا جی یہاں تو نہ کہیں"

"آپ ہمارے ملک آئیں نا۔"

"وہاں آنے کے لئے ہمیں ۔ c.o.بد ۔ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور میرا تو وہاں آپ لوگوں کے علاوہ کوئی اور نہیں"

"تو میں تو ہوں" پھر کیا فکر۔"

"مگر تارا جی! آپ تو مسلمان ہیں۔"

"ہوں! تو کیا ہوا میں آپ کو c.o.بد بھیجوں گی میں تارا سے پیشاپن جاؤں گی"

"تارا جی! اگر یہ سچ ہو جائے تو!" اس کی آنکھوں سے قطرے ڈھلک کر گالوں پر آگئے۔

"ارے آپ تو رونے لگے!"

"آپ نہیں سمجھیں گی تارا جی۔"

رمیش میرے اور بچوں کے لئے بہت سی چیزیں لایا تھا جسے میں نے خوشدلی سے قبول کر لیا۔ جب ہی سرخ آنکھوں کے ساتھ ہریش میرے قریب چلا آیا۔ اس نے پتلون کی جیب سے ہاتھی دانت کی بنی ہوئی ڈبیہ نکال کر دیتے ہوئے بولا۔ تارا جی! یہ ہمارے یہاں سہاگ کی نشانی ہوتا ہے"

"اوہ! یہ تو سیندور ہے" میں نے خوش ہوتے ہوئے ڈبیہ لے لی۔ رمیش اور جاوید مسکرا رہے تھے۔ ہریش کی آنکھیں اب بھی نم تھیں۔ جاوید نے مسکراتے ہوئے ڈبیہ میرے ہاتھ سے لی۔ اور ہریش کو بلا کر کہا۔ جو قدرے دور کھڑا تھا "یار ہریش تم میرے دوست ہی نہیں بھائی بھی ہو۔

اپنے ہاتھوں سے تارا کی مانگ بھر دو" ہریش نے آہستہ سے چٹکی سیندور اٹھا کر میری مانگ میں پھیلا دیا اور آہستہ آہستہ گاڑی سے نیچے اتر گیا۔ *

نذیر پروین شاکر

اور

قلم کار خواتین پر مشتمل

یہ شمارہ

آپ کو کیسا لگا؟

اپنی کتب کی نکاسی کے لئے شاعر میں

- شاعر — ہندوستان کی تمام چھوٹی بڑی لائبریریوں میں جاتا ہے
- شاعر — ہندوستان کے بیشتر اسکول، کالج اور یونیورسٹیوں میں منگوایا جاتا ہے
- شاعر — ملک اور بیرون ملک کے تمام علمی وادبی حلقوں میں بڑی تعداد میں پڑھا جاتا ہے
- شاعر — ہر مکتبہ فکر کے قارئین میں یکساں مقبول ہے

—— اس لئے آپ کی

کا اشتہار کتاب کی نکاسی میں معاون ثابت ہوگا

کم شرح ✻ بہترین خدمات

تفصیلات کے لئے لکھئے

ماہنامہ شاعر، مکتبہ قصر الادب، پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶، ممبئی ۱

J. No. MH-B.Y.W. 311 Price Rs.10/=

THE "SHAIR" (MONTHLY) BOMBAY-400 008

Years of Publication ❁ Publishing Date 27-28 ❁ Issue No11 - 12 -1994 ❁ Tel. No. 382 99 04

Registererd with the Registrar of Newspapers at R N No 14482/57.